خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
اکتوبر 2016
خواتین ڈائجسٹ

اکتوبر 2016

جلد 44 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط وکتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91 بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

خواتین کا اکتوبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

زندگی کا کھیل بھی کتنا عجیب ہے۔

اختیار و بے اختیاری کی کش مکش میں الجھا انسان سمجھ نہیں پاتا کہ کہاں اختیار کی حدیں ختم ہوتی ہیں اور کہاں بے اختیار ہے۔ بے اختیاری اور بے بسی کا احساس 'زندگی کا سفر کہاں سے شروع ہوتا اور کہاں ختم ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا۔

ماں شفقت 'محبت 'چاہت کا بحر بیکراں۔ ایثار و قربانی کی مجسم تصویر.... خود تکلیف اٹھا لیتی ہے۔ دکھ جھیل لیتی ہے۔ مگر اولاد پر ذرا سی بھی آنچ آئے 'اسے یہ گوارا نہیں ہوتا۔ اولاد کو سکون اور راحت پہنچانا ہی اس کی زندگی ہے۔ شاید اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ماؤں کو یہ شرف بخشا ہے کہ ان کے قدموں تلے جنت رکھ دی ہے۔

رضائے الٰہی سے ہم اس نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ لب جو ہر لحہ ہمارے لیے دعا گو رہتے تھے 'خاموش ہو گئے ہیں۔

اولاد سے محبت تو ہر ماں کرتی ہے 'لیکن ہماری ماں کی محبت صرف اپنی اولاد تک محدود نہیں تھی۔ وہ بلا امتیاز و تفریق سب سے محبت کرتی تھیں۔ وہ کسی کو تکلیف دینے کی قائل ہی نہ تھیں 'ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ان کی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ وہ اپنی ذات سے سب کو خوشیاں دینا چاہتی تھیں۔ خدمت اور محبت ان کا شعار تھا۔

ان کی زندگی ہمارے لیے ایک مثال ہے۔ صبرو تحمل 'بے غرضی اور محبت کی مثال.... پہاڑ جیسے دکھ سہ کر بھی وہ اللہ کی رضا پر راضی اور حوصلہ مند رہیں۔ ہر مشکل وقت میں انہوں نے ہمیں سنبھالا 'حوصلہ دیا 'سچائی اور محبت کی راہ پر چلنے کی تلقین کی۔ صبرو تحمل اور برداشت کا سبق دیا۔ دل ان کی یاد سے روشن ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

شفقت و عنایت 'درگزر 'برداشت 'کشادہ دلی کے راستوں پر وہ ہمارے لیے ایک مثال بن کر ہمیں راہ دکھاتی رہیں گی۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ ان کے درجات بلند کرے اور ابدی زندگی میں انہیں اعلا مقام سے نوازے۔ (آمین)

قارئین سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

دعائے مغفرت

ماں زمین پر اللہ تعالیٰ کی رحمت۔۔۔ سراپا محبت و شفقت، مجسم خیر و برکت، زندگی کی کڑی دھوپ میں مہیاں سایہ۔ محمود ریاض کی اہلیہ اور ہماری والدہ انور جہاں رضائے الٰہی سے اس جہان فانی کو الوداع کہہ گئیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

دکھ کی اس گھڑی میں جو ہمارے ساتھ رہے۔ ہمارے غم میں شرکت کی۔ ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ہماری والدہ کی مغفرت کے لیے دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

عامر محمود

ناصر ریاض

آزر ریاض

شگفتہ سلیمان

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابو داؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

پلیٹ صاف کرنا

حضرت ام عاصم رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ حضرت نبیشہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ہمارے ہاں تشریف لائے جب کہ ہم ایک پیالے میں کھانا کھا رہے تھے۔ انہوں نے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص پیالے میں کھانا کھائے' پھر اس (پیالے) کو چاٹ لے تو پیالہ اس کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہے۔" (ترمذی)

فائدہ:

1۔ مذکورہ باب کی دونوں روایتیں سنداً "ضعیف ہیں' تاہم پیالے اور پلیٹ وغیرہ کو انگلیوں سے صاف کرنے کا ذکر صحیح مسلم کی روایت میں موجود ہے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم پلیٹ کو انگلی سے صاف کر لیا کریں۔ نیز صحیح مسلم کی اسی روایت میں پلیٹ کو انگلیوں سے صاف کرنے کا سبب وہی بیان ہوا ہے جو گزشتہ باب میں انگلیاں چاٹنے کا بیان ہوا تھا۔

2۔ خاص طور پر آج کل کے ماحول میں جس طرح بعض لوگ برتن میں زیادہ کھانا لے لیتے ہیں اور تھوڑا سا کھا کر باقی ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ انتہائی بری عادت ہے۔ اس سے کھانے کی بے قدری ہوتی ہے۔ اور بلا ضرورت ضائع کرنا تبذیر میں شامل ہے۔ جس کے مرتکب کو قرآن نے "شیطان کا بھائی" کہا ہے۔ اسلامی اخلاق کا تقاضا ہے کہ کھانا کھاتے وقت پلیٹ میں صرف ضرورت کے مطابق لیا جائے اور اس میں بچایا نہ جائے۔ اور جو پکا ہوا کھانا بچ جائے' وہ پھینکنے کے بجائے ضرورت مندوں' غریبوں اور ہمسایوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

ثرید کے درمیان سے کھانا منع ہے

حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت

ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک پیالہ پیش کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس کے کناروں سے کھاؤ۔ اس کی چوٹی چھوڑ دو' اس میں برکت ڈالی جائے گی۔" (ابوداؤد)

فوائد و مسائل :

1۔ چوٹی سے مراد برتن کے درمیان کا کھانا ہے جو برتن بھرا ہوا ہونے کی صورت میں کناروں کی نسبت کچھ بلند ہوتا ہے۔

2۔ جب ایک برتن میں کھانے والے اپنے اپنے سامنے سے کھائیں تو اس حدیث پر بھی عمل ہو جاتا ہے کیونکہ درمیان کا کھانا کناروں سے کھائے جانے کے بعد کھایا جاتا ہے۔

3۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے سے رزق میں برکت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کھانا رکھا جائے تو اس کے کنارے سے لو اور اس کا درمیان چھوڑ دو کیونکہ برکت اس کے وسط میں نازل ہوتی ہے۔" (ابوداؤد)

کھانوں پر ثرید کی فضیلت

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مردوں میں سے بہت افراد کامل ہوئے لیکن عورتوں میں سے صرف مریم بنت عمران (علیہ السلام) اور فرعون کی بیوی آسیہ (رضی اللہ عنہا) کامل ہوئیں۔ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کو دوسری عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے جس طرح ثرید کو دوسرے کھانوں پر فضیلت ہے۔" (مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"عورتوں پر عائشہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ایسے ہی ہے' جیسے دوسرے کھانوں پر ثرید کی فضیلت ہوتی ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ انسانوں میں کمال کا سب سے بلند مقام نبوت کا ہے جو عورتوں کو حاصل نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وما ارسلنا من قبلک الا رجالا۔ "(اے نبی!) ہم نے آپ سے پہلے صرف مرد ہی (رسول بنا کر) بھیجے ہیں۔" اس لیے حدیث میں وہ کمال مراد ہے جو صرف وہبی نہیں بلکہ اس میں کسب کا بھی حصہ ہے' یعنی صدیقیت کا مقام۔ گزشتہ امتوں کی عورتوں میں صدیقیت کا اعلیٰ ترین مقام حضرت مریم علیہ السلام اور حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا۔ امت محمدیہ میں یہ مقام حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا۔

ثرید' روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے شوربے میں بھگو کر بنایا ہوا ایک قسم کا کھانا ہے۔ اس دور کے ماحول میں یہ بہترین کھانا تھا جو غذائیت کے لحاظ سے بھی بہترین ہے اور لذت کے لحاظ سے بھی' اس کے علاوہ آسانی سے تیار ہو جاتا ہے' جلدی ہضم ہو جاتا ہے اور بہت سے فوائد کا حامل ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر دعا

حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے موجود کھانا (فارغ ہونے پر) اٹھایا جاتا تو آپ فرماتے۔

"الحمدللہ حمدا" کثیرا" طیبا مبارکا' غیر مکفی ولا مودع ولامستغنی عنہ ربنا۔"

"تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں' ایسی تعریف جو بہت زیادہ ہو' پاکیزہ ہو اور اس میں برکت دی گئی ہو نہ کفایت کیا گیا (کہ مزید کی ضرورت نہ رہے) نہ یہ آخری کھانا ہے' نہ اس سے بے نیازی ہو سکتی ہے' اے ہمارے رب!" (بخاری)

فوائد و مسائل : اس دعا کا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے: "یہ تعریف کافی نہیں سمجھی گئی (کیونکہ انسان

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ 78/5.L تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر:03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کما حقہ حمد کر ہی نہیں سکتا) نہ چھوڑی گئی (بلکہ یہ حمد و شکر مسلسل ہے کیونکہ رب کی نعمتیں مسلسل حاصل ہو رہی ہیں) نہ اس تعریف سے بے نیاز ہو سکتی ہے (کیونکہ حاصل نعمتوں کو قائم رکھنے کے لیے اور مزید نعمتوں کے حصول کے لیے بندے کو حمد و شکر کی ضرورت رہتی ہے۔" کھانے کے آخر میں یہ دعا پڑھنا مستحب ہے۔

گزشتہ گناہ

حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے کھانا کھا کر یہ دعا پڑھی: "ہر قسم کی تعریف اللہ ہی کے لیے جس نے یہ (کھانا) مجھے کھلایا اور مجھے یہ (کھانا) عطا کیا بغیر میری کسی طاقت کے اور بغیر میری کسی قوت کے۔" اس کے گزشتہ (تمام) گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ کی نعمت پر اس کا شکر ادا کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

شکر گناہوں کی معافی کا باعث ہے۔

2۔ رزق کے حصول کے لیے اگرچہ ایک حد تک انسان بھی کوشش اور تدبیر سے کام لیتا ہے' تاہم اس کوشش کو کامیاب کرنا اور تدبیر بجھانا بھی اللہ ہی کا فضل ہے اور اسی کی توفیق سے ہے۔

مل کر کھانا کھانے کا بیان

حضرت وحشی بن حرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! ہم کھانا کھاتے ہیں تو سیر نہیں ہوتے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "شاید تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟"

انہوں نے کہا: "جی ہاں۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

فوائد و مسائل

"مل کر کھانا کھایا کرو اور اس پر اللہ کا نام لو' تمہارے لیے اس میں برکت ہو جائے گی۔"

مل کر کھانا برکت کا باعث ہے' تاہم الگ الگ کھانا بھی جائز ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ لیس علیکم جناح ان تاکلوا جمیعا" او اشتاتا"۔ "تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم مل کر کھاؤ یا الگ الگ۔"

2۔ بسم اللہ پڑھنا بھی برکت کا باعث ہے۔

مل کر کھانا

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مل کر کھاؤ' الگ الگ نہ کھاؤ کیونکہ برکت جماعت (اور اجتماعیت) کے ساتھ ہے۔"

کھانے کی چیز میں پھونک مارنا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کھانے پینے کی چیز میں پھونک نہیں مارتے تھے اور برتن میں سانس نہیں لیتے تھے۔" (ابو داؤد)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ حدیث صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔

حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پینے کی چیز میں پھونک مارنے سے منع فرمایا۔ ایک شخص نے کہا: اگر برتن میں کوئی ناپسندیدہ چیز (تنکا وغیرہ) نظر آجائے تو؟ آپ نے فرمایا: "اسے انڈیل دو۔" (تھوڑا سا پانی انڈیل دو تاکہ وہ بھی نکل جائے) اس نے کہا: میں ایک سانس سے (پیتا ہوں تو) سیر نہیں ہوتا۔ فرمایا: "پیالے کو منہ سے ہٹا لیا کرو۔" اس سے معلوم ہوا کہ برتن کو منہ سے ہٹا کر سانس لینا چاہیے۔

جب خادم کھانا لائے تو اس کو کھانا دینا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب کسی کے پاس اس کا خادم اس کا کھانا لے کر آئے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھائے اور وہ (خادم) اس (مالک) کے ساتھ کھائے۔ اگر ایسے نہیں کر سکتا تو اسے اس میں سے کچھ (کھانا) دے دے۔"

ملازم کو کھانا دینا

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب تم میں سے کسی کا خادم اس کا کھانا لائے تو اسے چاہیے کہ اسے اپنے ساتھ بٹھائے یا اسے تھوڑا سا کھانا دے دے کیونکہ اس نے اس کی گرمی اور دھواں برداشت کیا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ خادم اور نوکر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ حسن سلوک کرنا چاہیے۔
2۔ اگر کوئی خاص کھانا تیار کیا گیا ہو تو نوکر اور ملازم کو بھی گنجائش کے مطابق دیا جائے تاکہ اس کے دل میں حسرت نہ رہے۔ اس سے اس کے دل میں مالک کی محبت اور عزت و عظمت بڑھے گی' نیز ایسا کرنے سے اس کے دل میں اپنے مالک کا مال وغیرہ چوری کرنے کی خواہش بھی پیدا نہیں ہو گی۔
3۔ فیکٹری کے مالک کو چاہیے کہ پیداوار میں سے کچھ نہ کچھ ملازمین کو بھی تحفے کے طور پر دے۔
4۔ ملازم کو تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ نہ کچھ حسن سلوک کے طور پر دینا چاہیے۔
5۔ ملازمین سے کام لیتے وقت ان کے جذبات اور حالات کا لحاظ رکھنا چاہیے' نیز مالک کو ان کی خوشی اور غمی میں شریک ہونا چاہیے۔

میز اور دستر خوان پر کھانا کھانے کا بیان

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی میز پر رکھ کر کھانا نہیں کھایا اور نہ طشتری اور تھالی میں۔ قتادہ رحمتہ اللہ نے کہا: پھر لوگ کس چیز پر رکھ کر کھانا کھاتے تھے؟ انہوں نے فرمایا دستر خوان پر۔ (بخاری)

فوائد و مسائل :

مولانا عبدالغنی رحمتہ اللہ سنن ابن ماجہ کے حاشیہ نجاح الحاجہ میں خوان کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس پر رکھ کر کھانا دولت مندوں اور متکبروں کی عادت ہے تاکہ انہیں کھانا کھاتے وقت جھکنے یا سر جھکانے کی ضرورت نہ پڑے۔" اس لیے اس کا ترجمہ چھوٹی میز یا تپائی وغیرہ کیا جا سکتا ہے۔
2۔ سکرجہ چھوٹی پلیٹ یا تھالی اور رکابی وغیرہ کو کہتے ہیں جس میں چٹنی وغیرہ رکھی جاتی ہے۔ یہ لذت پسندی اور عیش پرستی کا مظہر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کھانا سادہ اور زود ہضم ہوتا تھا' اس لیے چٹنی وغیرہ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔
3۔ سفرہ (دستر خوان) سے مراد وہ کپڑے یا چمڑے کا ٹکڑا ہے جسے بچھا کر اس پر کھانا رکھا جاتا ہے۔ اہل عرب اب بھی میز کرسی استعمال کرنے کے بجائے زمین پر دستر خوان بچھا کر کھانا کھانے کے عادی ہیں۔

کھانا اٹھائے جانے سے پہلے اٹھنا

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جب دستر خوان (پر کھانا) لگا دیا جائے تو کوئی آدمی (فارغ ہو کر) نہ اٹھے حتی کہ دستر خوان اٹھایا جائے۔ اور اپنا ہاتھ نہ روکے اگرچہ سیر ہو گیا ہو حتی کہ لوگ فارغ ہو جائیں۔ اور (اگر اسے ضرورت نہ ہو تو)

چاہیے کہ (اپنا) عذر بیان کردے) کیونکہ آدمی (ہاتھ روک کر) اپنے ساتھی کو شرمندہ کردیتا ہے اور وہ بھی (شرم کی وجہ سے) ہاتھ روک لیتا ہے۔ ممکن ہے اسے ابھی کھانے کی (مزید) ضرورت ہو۔"

ہاتھ میں (کھانے کی) چکنائی کی بو ہو تو (بغیر ہاتھ دھوئے) سو جانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اگر کوئی شخص اس حال میں سو گیا کہ اس کے ہاتھ میں چکنائی کی بو تھی اور اس نے ہاتھ نہیں دھویا تھا' پھر اسے کوئی تکلیف پہنچ گئی تو وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔"

فوائد و مسائل:

1۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینے چاہئیں۔

2۔ گھی والا کھانا یا مٹھائی وغیرہ کھا کر بغیر ہاتھ دھوئے سونا منع ہے۔

3۔ اس ممانعت میں یہ حکمت ہے کہ چکنائی کی بو کی وجہ سے چیونٹیاں بستر پر آسکتی ہیں' ان سے سونے والے کو نقصان یا تکلیف پہنچنے کا خطرہ ہے۔ بعض اوقات چوہا وغیرہ بھی کاٹ لیتا ہے جو خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

4۔ روزمرہ معاملات میں ایسے کاموں سے پرہیز کرنا چاہیے جن سے نقصان کا خطرہ ہو۔

بھوک اور جھوٹ

حضرت اسماء بنت یزید انصاریہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کھانا حاضر کیا گیا۔ آپ نے ہمیں کھانے کی پیش کش کی۔ ہم نے کہا۔

"ہمیں خواہش نہیں (بھوک نہیں ہے۔)" آپ نے فرمایا۔ "بھوک اور جھوٹ کو اکٹھا نہ کیا کرو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ کھانا کھاتے وقت موجود افراد کو کھانے کی پیش کش کرنا اچھی عادت ہے۔

2۔ کھانے کی پیش کش کرنا اچھی عادت ہے۔

3۔ کھانے کی پیش کش کی جائے تو بھوک ہونے پر قبول کرنے میں تکلف نہیں کرنا چاہیے۔

4۔ بھوک نہ ہو تو ایسی پیش کش قبول نہ کرنے میں حرج نہیں۔ شکریہ ادا کردینا چاہیے' تاہم بہتر ہے کہ ایک دو لقمے لے لیے جائیں۔

5۔ جھوٹ تکلف کے موقع پر بھی اچھا نہیں۔ معذرت کے لیے کوئی اور مناسب انداز اختیار کرلیا جائے۔

شرف

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جن کا تعلق قبیلہ 'بنو عبدالاشہل سے تھا' ان سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا۔

میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ دوپہر (صبح) کا کھانا کھا رہے تھے۔ آپ نے فرمایا: "آیئے' کھانا کھایئے۔" میں نے کہا: میں روزے سے ہوں۔ افسوس! کاش میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں سے کچھ کھالیتا۔

فوائد و مسائل:

1۔ اس روایت کے راوی وہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے بلکہ یہ ایک اور صحابی ہیں' اس لیے راوی نے وضاحت کردی کہ ان کا تعلق بنو عبدالاشہل کے قبیلے سے ہے۔

2۔ روزے دار کو اگر کھانے کی دعوت دی جائے تو نفلی روزہ چھوڑ کر دعوت قبول کرلینا بہتر ہے' تاہم روزہ مکمل کرنا بھی جائز ہے۔

باندھ سہرا کر شادی

انشا جی

ایران میں آذر بائیجان کے گورنر نے منادی کرادی ہے کہ ملک بادشاہ کا، خلقت خدا کی اور حکم میرا۔ آج کے بعد سے ان پڑھ کو دلہن نہیں ملے گی۔ اگر کوئی شخص ناخواندہ ہے تو بیوی کی طرف سے بھی درماندہ رہے گا۔

ہمیں معلوم نہیں یہ حکم کس نیت سے جاری کیا گیا ہے۔ نیت نیک ہی ہو گی لیکن ہمیں تو یہ پڑھ کر کرشن چندر کی کہانی "بدصورت راجکماری" یاد آئی۔ کہانی کی ہیروئن لاڈوں پلی راجکماری ویسے تو گنوں کی گتھلی تھی، پانچ انگلیاں پانچوں چراغ۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ شکل و صورت میں بس آدمی کا بچہ تھی۔ بڑا بڑا راجکمار ہمہ تن اشتیاق آتا تھا اور راجکماری کے رخ زیبا کی ایک جھلک دیکھ کر پہلی گاڑی یا پہلی رتھ یا پہلے گھوڑے سے واپس چلا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دینے کا رواج نہ تھا، کیونکہ اخبار ہی نہ تھے۔ لہذا یا تو عقل کے اندھے گانٹھ کے پورے راجکمار طوطے مینا سے یا کسی آتے جاتے سے کسی راجکماری کے حسن کا شہرہ سن کر غائبانہ عاشق ہو جایا کرتے تھے یا راجے مہاراجے سوئمبر رچایا کرتے تھے اور یاران نکتہ داں کو صلائے عام دیا کرتے تھے۔

شاید سیتا کا سوئمبر تھا جس میں یہ شرط تھی کہ جو شخص نیچے پانی میں عکس دیکھ کر اوپر گھومتی ہوئی مچھلی کی آنکھ میں تیر مارے گا، اسے سیتا کا ڈولا اٹھانا ہو گا۔ رام جی نے آگے چل کر اپنی زندگی میں اور کوئی تیر مارا یا نہ مارا، اس امتحان میں ضرور پاس ہو گئے۔ اس سے ضمناً" یہ بھی معلوم ہوا کہ اس زمانے میں راجکماروں کو مداری کے کرتب بھی سیکھنے پڑتے تھے۔ سیدھی سیدھی شمشیر زنی اور گھوڑے کی سواری کافی نہ تھی۔

خیر ہم کہانی کہتے کہتے پٹڑی سے اتر گئے۔ ہاں تو ان راجکماری صاحبہ کے ابا حضور یعنی راجہ صاحب نے بھی بیٹی کا سوئمبر رچایا۔ امیدوار کو ایک سوال کا جواب

دیتا ہوتا تھا اور گھوڑے کی سواری کرکے دکھانا ہوتا تھا۔

بہت سے لوگ جنہوں نے شہزادی کی جھلک دیکھ لی تھی انٹرویو میں آئے ہی نہیں۔ ایک بے چارا کہ تاب گریختن نہ رکھتا تھا۔ پکڑا آیا۔ راجہ جی کے مہامنتری نے اس سے سوال پوچھا کہ "وہ کون سا جانور ہے۔ جس کی ایک دم اور چار ٹانگیں ہیں اور جو بھونکتا ہے۔" امیدوار، جس کی نظروں میں راجکماری کا جمال جہاں افروز سا ہوا تھا، بہت دیر سوچ کر بولا۔ "کبوتر۔"

درباریوں نے جو شہزادی سے گلوخلاصی کرانے پر تلے ہوئے تھے واہ واہ، سبحان اللہ کے ڈونگرے برسائے۔ اب اس غریب نے گھوڑے پر چڑھتے وقت دانستہ نیچے گرنے کی کوشش کی لیکن درباریوں نے اٹھا کر کاٹھی پر بٹھا دیا بلکہ باندھ دیا۔ وہ پھر بھی ہاتھ ہلا ہلا کر کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن شادیانے اس زور سے بجنے شروع ہو گئے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

لوگ اپنی شخصی آزادی کے تحفظ کے لیے کیا کیا نہیں کرتے اور اب شادی کی ہتھکڑیوں، بیڑیوں سے بچنے کے لیے کیا کیا نہ کریں گے۔ یہاں پھر ہمیں ایک قصہ یاد آتا ہے۔ ایک ماسٹر جی دو بچوں کو حساب پڑھایا کرتے تھے۔ بہت کوشش کی لیکن ان برخورداروں کے تعلیم کی جونک نہ لگی۔ ایک روز ماسٹر جی نے چھوٹی بچی سے کہا کہ یہ بتاؤ اگر تمہارے ابا بازار سے دس سیب لے کر آئیں اور چار خود کھالیں تو باقی کتنے بچے؟

بچی نادان منہ کھولنے کو تھی کہ بڑے بھیا بولے۔

"مت بتانا، مت بتانا۔ ماسٹر جی اس بہانے تمہیں حساب سکھا دیں گے۔"

لہٰذا ہماری تصور کی آنکھیں یہ منظر دیکھتی ہیں کہ آذربائیجان میں پڑھے لکھوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی ہے کہ چلو باندھو سہرا، کرو شادی۔ تمہاری یہی سزا ہے۔ لوگ ہزار عذر کرتے ہیں کوئی مسموع نہیں ہوتا۔

ایک پروفیسر صاحب پکڑے آتے ہیں۔ فرد جرم لگتی ہے کہ پڑھا لکھا آدمی ہے اور شادی نہیں کرتا۔ وہ بے چارا صفائی پیش کرتا ہے کہ جناب میں تو فٹ پاتھ کا پروفیسر ہوں، فلسفہ نہیں پڑھاتا۔ ممیرے کا سرمہ بیچتا ہوں اور پڑھنے کے نام سے انگوٹھا لگاتا ہوں۔ ان کے بعد ایک اخبار نویس کی پیشی ہوئی ہے۔ وہ بھی اپنی جان بچانے کو عذر کرتا ہے کہ حضور اخبار نویسی تو مشینی کام ہے۔ آپ سے کس نے کہا کہ اس کے لیے پڑھا لکھا ہونے کی قید ہے۔ عذر معقول تھا لہٰذا یہ چھوٹے۔ اب ایک اسکول ماسٹر لائے گئے اور ان سے ایک عبارت پڑھنے کو کہا گیا۔ انہوں نے کتاب الٹی پکڑی اور آنکھیں جھپک کر کہنے لگے کہ "جناب، بے گناہ پکڑا آیا ہوں۔ میں تو بالکل کندۂ ناتراش ہوں۔ پڑھا لکھا ہوتا تو اسکول ماسٹری کیوں کرتا۔ دنیا میں اور کوئی کام نہیں کیا؟"

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ لوگ شادی سے اسی طرح بھاگنے لگے جس طرح امریکا میں ویت نام کے لیے بھرتی ہونے سے بھاگتے ہیں۔ تو کیا عجب جا بجا ناخواندگی پھیلانے کے مدرسے قائم ہو جائیں جن میں لوگوں کو ان پڑھ بننا سکھایا جائے۔ ان کے ذہن سے اچھ اچھ کر تمام علم نکالا جائے۔ یہ بات ناممکن نہیں ہمارے ہاں بھی بعض لوگ، جو ڈگری اور نوکری پانے کے بعد کتاب اور اخبار کے سائے سے بھی بھاگتے ہیں اور ہمارے کالم تک بیویوں سے پڑھوا کر سنتے ہیں ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔

ہم آذربائیجان کے گورنر کی خدمت میں عرض کریں گے کہ بھائی جان، اتنی سختی مت برتیے۔ پڑھے لکھوں کے لیے کوئی نرم تر سزا مثلاً "خالی سزائے قید" تجویز کیجیے، بامشقت کی شرط نہ رکھیے۔ وہ چاہیں تو شادی کریں، چاہے نہ کریں۔ زبردستی نہ کیجیے ورنہ کوئی دن میں آپ کے صوبے میں ایک بھی آدمی پڑھا لکھا نہ ملے گا اور آپ کو خط پڑھوانے کے لیے ہمارے پاس آنا پڑا کرے گا۔

✡

روبینہ عارف ایک اچھی فنکارہ ہیں یہ ٹی وی ڈراموں کی بہترین فنکارہ ہیں۔ ماں کے رول میں ہمیشہ پوزیٹو رول کیے کیونکہ ان کی شخصیت پہ شاید نیگیٹو کردار سوٹ بھی نہیں کریں گے۔ ان کا ایک اور تعارف بھی ہے کہ یہ معروف کھلاڑی مرحوم تسلیم عارف صاحب کی بیگم ہیں... بڑے عرصے سے خواہش تھی کہ ان کا انٹرویو کریں... اور کئی ماہ کے انتظار کے بعد ہم یہ انٹرویو کرنے میں کامیاب ہوئے۔

"جی کیا حال ہیں روبینہ صاحبہ... شکر ہے آپ کو فرصت ملی؟"

"اللہ کا شکر ہے... اور بہت معذرت کہ میں آپ کو اتنی دیر سے انٹرویو دے رہی ہوں۔ میں واقعی بہت مصروف رہتی ہوں اتنی کہ چوبیس گھنٹے کا دن بھی مجھے چھوٹا لگتا ہے۔"

"گڈ... چلیں کوئی بات نہیں... آپ کی معذرت قبول کی، بہت خوش رہیں آپ... یہ بتائیں کہ اس فیلڈ میں کتنا عرصہ ہو گیا آپ کو؟"

معروف کرکٹر تسلیم عارف کی بیگم

روبینہ عارف سے ملاقات

شاہین رشید

"مجھے اس فیلڈ میں تقریباً" انیس بیس سال ہو گئے ہیں اور میں نے بے شمار سوپ، سیریلز، ٹیلی فلمز، سنگل ڈرامے، اور یوں سمجھیں کہ ہزاروں ڈرامے کر چکی ہوں... آج کل بھی میرے دو تین پروجیکٹ آن ایئر ہیں اور تین چار کی ریکارڈنگز چل رہی ہیں۔ تو الحمدو للہ میرے کام کا سلسلہ کچھ ایسا ہے کہ ایک "چین" بنی ہوئی ہے ڈراموں کی، یعنی ڈراموں کے ختم ہونے سے پہلے ہی نئے ڈرامے اسٹارٹ ہو جاتے ہیں۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیے؟"

"میں لاہور میں پیدا ہوئی۔ وہیں پلی بڑھی لاہور سے ہی اپنی تعلیم مکمل کی، لاہور کالج سے بی اے کیا اور پھر پنجاب یونیورسٹی سے سائیکلوجی میں "ایم اے" کیا۔ میری چار بہنیں اور ایک بھائی ہے اور بہنوں میں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ میری امی ڈاکٹر تھیں اور میرے والد بزنس مین تھے۔ والد صاحب حیات ہیں۔ اللہ انہیں لمبی عمر عطا فرمائے۔ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔ جبکہ والدہ صاحبہ کا انتقال ہو چکا ہے... میری شادی 1981ء میں ہوئی اور جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ میرے شوہر معروف کرکٹر "تسلیم عارف" صاحب تھے میرے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے اور ماشاء اللہ تینوں کی شادی ہو چکی ہے اور میں نانی، دادی بن چکی ہوں... آج کل میں اپنی بیٹی کے پاس امریکہ آئی ہوئی ہوں۔"

"تسلیم عارف صاحب کے انتقال کو کتنا عرصہ ہو گیا اور ان کے ساتھ زندگی کیسی گزری؟"

"جی تقریباً" آٹھ سال ہو گئے ہیں ان کے انتقال کو ۔۔۔ اور ماشاء اللہ میں نے بہت اچھی بہت خوب صورت اور بہت خوش حال زندگی تسلیم عارف صاحب کے ساتھ گزاری' وہ بہت اچھے انسان تھے' بہت اچھے باپ اور شوہر اور بہترین کرکٹر تھے۔۔۔ ہمارا گھر ایک آئیڈیل گھر تھا۔"

"ان کے جانے کے بعد کوئی مالی پریشانی ہوئی؟ بچوں کی تربیت میں کوئی مسئلہ ہوا؟"

"نہیں' ایسا کچھ نہیں ہوا۔۔۔ الحمدو للہ وہ ہمارے لیے اتنا کچھ چھوڑ گئے کہ ہمیں مالی طور پر کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ ہاں ان کی کمی تو ساری زندگی کوئی پوری نہیں کر سکتا۔ ہمارا اپنا گھر ہے اور الحمدو للہ سب ہی کچھ ہمارے پاس ہے۔۔۔ کرکٹ بورڈ سے مجھے بہت اچھی پنشن ملتی ہے اور چونکہ یہ نیشنل بینک میں تھے تو نیشنل بینک نے ایک ہینڈسم اماؤنٹ میرے اکاؤنٹ میں منتقل کر دی تو میں بہت شکر گزار ہوں نیشنل بنک کی اور کرکٹ بورڈ کی بھی اور لوگوں کے رویے بھی بہت اچھے رہے اور ہیں اور بچوں کی تربیت میں بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔۔۔

اور مجھے تو اکثر ایسا لگتا ہے کہ لوگ تسلیم عارف صاحب کی زندگی میں بھی ہمارا اتنا خیال نہیں رکھتے تھے جتنا کہ اب رکھتے ہیں۔۔۔ تسلیم صاحب کے نام کی عزت پہلے بھی ہمیں ملتی تھی اور الحمدو للہ آج بھی ملتی ہے ہم جہاں بھی ان کا نام لے لیتے ہیں لوگ ہمارے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ہماری بہت پذیرائی ہوتی ہے۔ میری بھی اور ہمارے بچوں کی بھی' خواہ وہ میرے اطراف کے لوگ ہوں یا تسلیم صاحب کے اطراف کے لوگ۔

"جب تسلیم صاحب کا انتقال ہوا تو میرا چھوٹا بیٹا سولہ سال کا تھا۔ باقی دو بڑے تھے۔ بچوں کو اپنے والد سے اور تسلیم صاحب کو اپنے بچوں سے بہت زیادہ محبت تھی۔ ایک بیٹا بیس سال کا اور بیٹی اکیس سال کی تھی۔۔۔ الحمدو للہ میرا بڑا بیٹا کمپیوٹر انجینئر ہے۔ وہ لندن میں رہتا ہے۔ اس کا اپنا بزنس ہے۔ اپنا گھر ہے۔ بیٹی امریکہ میں رہتی ہے۔۔۔ میرا چھوٹا بیٹا نیشنل بینک میں جاب کرتا ہے۔ وہ کرکٹر ہے اس کا نام ایمان عارف بڑے بیٹے کا نام "عمران عارف ہے۔ بیٹی کا نام "مریم عارف" ہے۔

"فیلڈ میں کیسے آئیں اور تسلیم عارف صاحب خوش ہوتے تھے آپ کے کام سے؟"

"اس فیلڈ میں ان کی مرضی سے ان کی اجازت سے آئی۔ وہ بہت خوش ہوتے تھے' مجھے ہمیشہ سے ہی شوق تھا اور میں اپنے کالج میں بھی ڈرامیٹک سوسائٹی کی ممبر تھی اور دیگر ایکٹویٹیز میں بھی حصہ لیتی تھی۔۔۔ فیلڈ میں آنا اتفاق تھا اور کاظم پاشا صاحب نے موقعہ دیا اور پی ٹی وی کے ڈرامے "آنچل" سے شروعات ہوئی اور اسی سیریل نے مجھے شہرت دی۔ اسی نے پہچان دی۔ اس کے بعد پھر سلسلہ چل نکلا اور میں نے کافی کام کیا اور کر رہی ہوں۔۔۔ پی ٹی وی کے لیے بھی اور پرائیویٹ پروڈکشن کے لیے بھی۔

"ہمیشہ سے ماں کے رول کیے۔۔۔ ایک روایتی ماں کے رول؟"

"جی شروع سے ہی ماں کے رول کر رہی ہوں اور آج تک کر رہی ہوں اور بہت شوق سے کرتی ہوں۔ اور روایتی ماں کوئی بھی نہیں ہوتی' ماں' ماں ہی ہوتی ہے۔ ماں کے رول میں بہت وریی ایشن ہوتی ہیں۔۔۔ ماں کے رولز کے علاوہ بھی میں نے بے شمار رولز کیے ہیں۔ میرا ایک سیریل تھا "مل کر بچھڑا نہ کرو" اس میں میں نے ایک غنڈا ٹائپ عورت کا کردار ادا کیا تھا میڈم گوگی یہ ایک بہت بولڈ کردار تھا۔ یہ سیریل ٹی وی ون سے ٹیلی کاسٹ ہوا تھا۔"

"آپ کے علاوہ بھی فیلڈ میں کوئی ہے؟"

"میرے۔ بہن بھائیوں میں سے تو کوئی بھی اس فیلڈ میں نہیں آیا' سوائے میرے البتہ میرا چھوٹا بیٹا ایمان

(Ainan) کرکٹر بھی ہے اور اس نے فلم "میں ہوں شاہد آفریدی" میں کام بھی کیا ہے اور بہت اچھا رول کیا ہے۔ بہت پسند کیا ہے اس کو سب نے۔۔۔ مگر وہ اپنی پڑھائی اور اپنی کرکٹ میں اتنا مصروف رہتا ہے کہ ڈراموں کی طرف آ ہی نہیں سکا' حالانکہ اسے بہت آفرز ہوتی ہیں۔۔۔ اور میری بہت خواہش ہے کہ وہ ڈراموں میں بھی کام کرے اور ان شاء اللہ آپ اسے بہت جلد کسی نہ کسی ڈرامے میں دیکھیں گے۔"

"کیا آپ چھوٹی اسکرین تک ہی محدود رہیں؟۔۔۔ اپنی فلموں کے بارے میں آپ کچھ کہیں گی؟"

"ایسا نہیں ہے۔ ڈراموں اور کمرشلز کے علاوہ میں نے فلم میں بھی کام کیا ہے۔ جس کا نام "بھائی لوگ" ہے' فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے اور فلموں کا جو ریوائیول ہوا ہے' وہ بہت خوش آئند ہے۔۔۔۔ ایک دن پھر ایسا آئے گا کہ ہماری فلم انڈسٹری بہت ترقی کرے گی۔ ہاں میں نے وائس اوور نہیں کیا مگر خواہش بہت ہے۔۔۔ فلم کی بات پر میں یہ ضرور کہوں گی کہ اب ہمارے یہاں بھی بڑے اچھے سینما ہاوسز بن گئے ہیں۔ جہاں ہم عزت کے ساتھ جا کر فلمیں دیکھتے ہیں۔ سیکیورٹی کا اچھا انتظام ہوتا ہے۔۔۔ پاکستان کے جو حالات ہیں ان کو مد نظر رکھا جائے تو فلم تفریح کا بہترین ذریعہ ہے۔"

"آج کل ہمارے ڈرامے پسند کیے جا رہے ہیں۔ مگر شاید اس وجہ سے کہ عورت کو بہت مظلوم دکھایا جاتا ہے۔۔۔ کیا حقیقت میں بھی عورت مظلوم ہے؟"

"اگر پوری دنیا کا جائزہ لیا جائے تو عورت مظلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے پاس نہ صرف وسائل ہوتے ہیں بلکہ اتنی تعلیم بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے پیروں پہ کھڑی ہو سکتی ہے اور اچھی زندگی گزارتی ہے۔ مگر ہمارے پاکستان اور انڈیا کی اور ترقی پذیر ممالک کی عورت واقعی بہت مظلوم ہے۔ نہ اسے گھر سے نکلنے دیا جاتا ہے نہ تعلیم۔ کم عمری میں اس کی شادی کر دی جاتی ہے تو پھر جو اس پر گزرتی ہے اسی لحاظ سے وہ زندگی گزارتی ہے۔ تو ہمارے معاشرے میں عورت مظلوم ہے مگر یورپ' امریکہ اور عرب ممالک کی عورت بالکل بھی مظلوم نہیں ہے بلکہ وہ بہت اسٹرونگ ہوتی ہے۔ اپنے سارے کام وہ خود کرتی ہے اور بہت اچھی زندگی گزارتی ہے۔ اور اب معاشرہ بدل رہا ہے۔ اب لڑکیوں کو آگے پڑھنے دیا جاتا ہے ورنہ تو پہلے لڑکوں کو ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مگر گاؤں دیہات کی عورت تو ابھی بھی مظلوم ہے۔۔۔ مگر دکھائی شہر کی عورت جاتی ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔۔۔ آس پاس کی بستیوں میں دیکھیں۔۔۔ گاؤں دیہات کی لڑکیوں کو دیکھیں۔ اندرون پنجاب میں دیکھیں' عورت کی بہت بری حالت ہے۔ بس اللہ رحم کرے۔ ہمارے مذہب نے عورت کو جتنے حقوق دیے ہیں وہ اگر مل جائیں تو عورت بالکل بھی مظلوم نہیں ہے۔"

"ڈراموں کے موضوعات سے آپ مطمئن ہیں؟"

"میں ڈراموں کے موضوعات سے مطمئن ہوں اور ہمارا ڈرامہ حقیقت کے بہت قریب ہے۔ ڈراموں کی کہانیاں ہمارے اردگرد واقعات پر ہی مبنی ہوتی ہیں۔ جنہیں ہمارے ڈرامہ رائٹر بڑی مہارت سے لکھتے ہیں ___ اور میں یہ بھی کہوں گی کہ ڈرامہ تفریح کا ذریعہ ہے اسے اتنا سنجیدہ نہ بنائیں کیونکہ ہماری اردگرد ویسے ہی بہت دکھی لوگ بس رہے ہیں ___ ایسے ڈرامے بھی پیش کیے جائیں جن سے لوگوں کو تھوڑا ریلیکس ملے ___ لیکن حد میں رہ کر ڈراموں میں میں عریانی اور فحاشی کے سخت خلاف ہوں۔ غلط اور گندے مکالموں کے سخت خلاف ہوں کیونکہ ٹی وی تو ڈرائنگ روم میڈیا ہے اور سب مل کر ڈرامے اور دیگر پروگرام دیکھتے ہیں ___ ہمارے چینلز کو کم سے کم ایسا ضرور ہونا چاہیے کہ ہم بے جھجک دیکھ سکیں۔"

"نئے ٹیلنٹ کے لیے کیا کہیں گی آپ؟"

"نئے ٹیلنٹ میں ہر طرح کے رول کرنے والے بے شمار لوگ میرے سامنے آئے اور چلے بھی گئے۔ پیا وہی جو اپنے کام کے ساتھ سنجیدہ تھا جس کو لگن تھی اور جو واقعی میں کام سیکھنا بھی چاہتے تھے وہ آج بہت کامیاب ہیں۔ اور جو تفریح کا ذریعہ سمجھ کر یا کمائی کا ذریعہ سمجھ کر آئے تھے وہ جیسے آئے تھے ویسے چلے بھی گئے۔ کسی کو وہ لوگ یاد بھی نہیں ہیں۔ یہاں وہ ہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جنہیں اس کام کا جنون ہوتا ہے ___ یہ کوئی سائیڈ بزنس نہیں کہ کر لیا۔ یہ فل ٹائم جاب ہے اس میں خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے تب ہی کامیابی ملتی ہے۔ اور نئے ٹیلنٹ سے میں یہ ضرور کہوں گی کہ اپنی تعلیم مکمل کر کے آئیں کیونکہ اس فیلڈ میں تعلیم بھی بہت ضروری ہے ___ یہ فیلڈ اب ایک پروفیشن بن گئی ہے اور اپنے پروفیشن میں کامیابی کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔"

"سنا ہے کہ کام کرتے وقت بچارے فنکار کبھی اس سیٹ پہ تو کبھی اس سیٹ پر ___ تو مسئلہ نہیں ہوتا کیا؟"

"اب کوئی مسئلہ نہیں ہوتا اور اب مسئلہ ہو بھی نہیں سکتا کیونکہ باقاعدہ ڈیٹس دی جاتی ہیں۔ صبح 10 سے رات 10 بجے تک کام ہوتا ہے۔ تو اس میں کوئی ادھر ادھر جا ہی نہیں سکتا اور اگر جاتے بھی ہیں تو ڈائریکٹر کی مرضی سے جاتے ہیں۔ پروڈکشن ہاؤس کی اجازت سے جانا پڑتا ہے ___ ورنہ تو پورا کام کر کے ہی جاتے ہیں سب۔ اب سب کام بہت آرگنائزڈ طریقے سے ہوتے ہیں۔ اب کوئی افراتفری نہیں ہوتی۔"

"سینئرز کے ساتھ رویہ کیسا ہوتا ہے نئے لوگوں کا؟"

"رویہ اور تربیت تو لوگ گھر سے ہی لے کر آتے ہیں۔ تو جب لوگ آتے ہیں اور سینئرز کے ساتھ آکر بیٹھتے ہیں تو پتا چل جاتا ہے کہ یہ لوگ کتنے دن ٹکیں گے۔ کتنے دن اس فیلڈ میں رہیں گے اور اب ماشاء اللہ اس فیلڈ میں بہت پڑھے لکھے نوجوان آگئے ہیں ___ اور اپنی جگہ بنا رہے ہیں اور جو سنجیدہ نہیں ہوتے پھر ان کی کہیں بھی جگہ نہیں ہوتی۔"

"آپ نے بتایا کہ صبح 10 سے رات 10 تک کام ہوتا ہے۔ وقت کی پابندی کرتے ہیں لوگ؟"

"میں تو اپنے کام کو بہت سیریس لیتی ہوں اور وقت کی بہت پابندی کرتی ہوں۔ وقت پر جاتی ہوں اور وقت پر فارغ ہو جاتی ہوں۔ آپ کسی سے بھی میرے بارے میں پوچھیں وہ میرے بارے میں اچھی بات ہی کرے گا۔ باقی دوسروں کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"فارغ اوقات کس طرح گزارتی ہیں آپ؟"

"مجھے سینما میں جا کر فلم دیکھنے کا شوق ہے ___ تو اکثر چلی جاتی ہوں' ہوٹلنگ کرنا بھی اچھا لگتا ہے۔ اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے ___ گھرداری کا بہت شوق ہے۔ گھر کو صاف ستھرا رکھنا' سجانا' سنوارنا اچھا لگتا ہے۔ اگرچہ میرے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ گھر میں باقاعدگی سے کھانا پکاؤں ___ مگر جب بھی ٹائم ملتا ہے کوئی اچھی سی ڈش ضرور پکاتی ہوں اور بچوں کو ضرور کھلاتی ہوں۔ میرے بچے میرے ہاتھ کے کھانے بہت پسند کرتے ہیں ___ میری کوشش ہوتی ہے کہ میں

جب فارغ ہوں تو اپنے بچوں کو اور اپنے رشتے داروں کو ضرور ٹائم دوں۔"

"کھیلوں سے لگاؤ ہے آپ کو؟ کون سے گیمز شوق سے دیکھتی ہیں؟"

"جی جی..... گیمز سے بہت لگاؤ ہے۔ کرکٹ اور فٹ بال کے میچز بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔"

"انوشے آپ کی بہو بھی ہے اور بہت اچھی آرٹسٹ بھی..... آپ کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتی ہے؟"

"انوشے" میری بہو ہے، مگر ابھی رخصتی نہیں ہوئی ہے۔ صرف نکاح ہوا ہے۔ اور چونکہ ہم فیملی فرینڈز ہیں تو گھر میں آنا جانا تو بہت رہتا ہے۔ لیکن "انوشے" کے اوپر ابھی گھرداری کی ذمہ داری ہے نہیں البتہ میرے بڑے بیٹے "عمران عارف" کی شادی ہو چکی ہے اور ماشاء اللہ اس کی ایک بیٹی بھی ہے۔ پوتی کا نام "پریشے" ہے اور بہو کا نام "ماریہ" ہے۔ وہ ڈبل ایم بی اے ہے، لندن سے بھی پڑھ کر آئی ہے اور ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے، لندن میں ہی رہتے ہیں بیٹا بہو پاکستان آنا جانا لگا رہتا ہے اور میں اپنی بہوؤں کو بالکل اپنی بیٹی اور دوست سمجھتی ہوں۔ اس سے ٹائم بہت اچھا گزرتا ہے۔ کھانا وغیرہ بھی مل جل کر پکاتے ہیں اور دوستوں کی طرح باتیں بھی کرتے ہیں اور جو بیٹی امریکہ میں رہتی ہے اس کا بھی ایک بیٹا ہے، جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے روبینہ عارف صاحبہ سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ ہمیں ٹائم دیا۔

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

سمیرا گل عثمان

ا- لکھنے کا شوق کہانیاں پڑھنے سے ملا۔ میں جب بھی رسالہ پڑھتی' پھر سوچتی کہانی تو میں بھی لکھ سکتی ہوں' اپنی صلاحیت پہ مجھے اعتماد تھا۔

یہ بہت بچپن کی بات ہے' جب میں چھوٹی تھی تو مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ میری باجی اخبار جہاں پڑھتی تھیں اور میں بس بچوں والی کہانی کا صفحہ۔ آٹھویں کلاس تک یہی معمول رہا' تب میں مدرسے جاتی تھی' قرآن پاک حفظ کرنے کے ساتھ ساتھ اسکول کا بھی پڑھتی تو زیادہ ٹائم نہیں ملتا تھا۔

رسالے خواتین' شعاع اکثر میں اپنے گھر میں دیکھتی تھی جو میری باجی' ساتھ والی آنٹی سے لے کر پڑھتی تھیں۔ پھر وہ رسالے ہمارے سارے محلے میں گھومتے۔ میری دلچسپی رسالوں میں محض اتنی تھی کہ کبھی کبھار لطیفے پڑھ لیتی۔ جب قرآن پاک حفظ کیا تو مجھے یہ تھا کہ میرا سال ضائع نہ ہو جائے تو ایک سال میں میٹرک کی تیاری کرکے امتحان دیا۔ میں سامنے والے گھر میں ٹیوشن پڑھنے جاتی تھی' وہ میری سہیلی سدرہ کی نانو کا گھر تھا۔ وہ ٹوٹل سات کزن تھیں' ہر وقت ہنگامہ مچائے رکھتیں۔ رسالہ پڑھنے پہ نوک جھونک' پھر کہانیوں پہ تبصرے' میں اکتا جاتی' ان کے ذوق شوق سے۔ ان کی چھوٹی خالہ تو عالم شاہ کی باقاعدہ فین تھیں۔ اس کی موت پہ بے حد روئیں' میں نے سمجھا کوئی عزیز چل بسا ہے' پھر معلوم ہوا عالم شاہ ناول کا ہیرو تھا۔ اف ساری رات پیٹ میں ہنسی سے بل پڑتے رہے۔

میری باجی رسالہ پڑھتے ہوئے اکیلے ہی ہنستیں' فائزہ افتخار کی "منے" والی کہانی انہوں نے باقاعدہ امی کو پڑھ کر سنائی' میں ان کے سامنے ہاتھ جوڑتی رہی کہ اب خاموش ہو جاؤ۔ مگر وہ بضد بس یہ پیراگراف سن لو' یہ جملہ دیکھو' ہائے بے چارہ اکلوتا بھائی' ساتھ افسوس بھی جاری تھا۔

مجھے خود کلامی کی عادت تھی' ایک تصوراتی' خوابوں کی دنیا میں' روز چھت پر جاتی تھی' بس خود سے خوابوں سے اور اپنی کہانیوں سے باتیں کرنے' میں چھت پہ واک کرتی تھی۔ ساتھ باتیں کرتی' ہنستی' یہاں تک کہ باقاعدہ اشارے بھی۔ مجھے ایسا لگتا جیسے کوئی میرے ساتھ ہے اور اس دوران اگر کوئی اوپر آجاتا تو میرا موڈ خراب ہو جاتا تھا۔

ایک بار امی نے اشارے کرتے دیکھ لیا' بہت پریشان ہوئیں۔ مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔"

میں نے بتایا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے' مجھے عادت ہے۔

"پوچھا کب سے؟"

"میں نے کہا بچپن سے۔"

"کہنے لگیں کوئی دور سے دیکھے تو کیا سمجھے کہ ان کی لڑکی شاید پاگل ہے۔ اکیلے ہنستی ہے' خود سے باتیں کرتی ہے۔"

"میں نے کہا۔ اکیلے نہیں۔ میرے ساتھ اور لوگ بھی ہوتے ہیں۔" بادل' گھوڑا' جنگل' پری' شہزادہ اور امی! آپ مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔ میری کہانی خراب ہو جائے گی۔"

امی نے سر جھٹک دیا کہ خود ہی سمجھ جائے گی۔

میٹرک کا امتحان دیا۔ اب میں فارغ تھی میں نے سوچا کون ہے یہ عالم شاہ' جس نے میری باجی کو رلا دیا۔

پہلی بار جو رسالہ میرے ہاتھ میں آیا وہ شعاع تھا اور جو کہانی پڑھی وہ شاید ثمو بخاری کی تھی۔ کہانی شادی

کے فنکشن سے شروع ہو رہی تھی۔ اتنی اچھی مزے کی کہانی تھی کہ میں ایک ہی نشست میں ختم کر کے اٹھی پھر ہنستے ہوئے سوچا میں بھی کتنی پاگل ہوں جو ابھی تک ٹارزن عمرو اور شہزادے والی کہانیاں ہی پڑھتی رہی ہوں۔ اصل میں میرا بچپن بہت طویل تھا۔ میں آٹھویں کلاس تک گڑیا اور گڈے سے کھیلا کرتی تھی۔

میٹرک تک محض بچوں والی کہانیاں ہی پڑھیں مگر اب جو شعاع کا چسکا لگا تو اس نے باقی ہر چیز بھلا دی۔ پڑھتے پڑھتے ایک روز لکھنے کا شوق ہوا تو ایک افسانہ لکھا اتفاق سے کرن میں لگ بھی گیا تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ صلاحیت قدرتی ہے ہمارے خاندان میں سات نسلوں تک کوئی شاعر یا ادیب نہیں ہے گھر میں کسی اور کو لکھنے کا تو نہیں ہاں پڑھنے کا شوق ضرور تھا۔

2۔ جی ہاں گھر والے خاندان والے بلکہ محلے والے اور شہر والے سب میری کہانیاں پڑھتے ہیں لیکن دوستوں کے معاملے میں (بدقسمتی) ساری کی ساری انتہائی بدذوق' کسی کو رسالوں سے مطلب نہیں تو' میری کہانیوں سے کیا ہوگا' لیکن میں یہ کام ڈنڈے کے زور پہ کرواتی ہوں۔ امی پڑھتی تو نہیں لیکن بہت خوش ہوتی ہیں۔ میری باجی' خالہ ضرور پڑھتی ہیں۔ بھائی بھی کبھی کبھار کوئی کہانی پڑھ لیتا ہے۔ عثمان سے کہوں تو کہتے ہیں تم نے لکھنے سے پہلے بھی سنائی تھی اس کے دوران ابھی مکمل کرنے کے بعد بھی اب پڑھنے سے معذرت (باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہیں) اور سسرال میں بھی تقریباً سب ہی پڑھتے ہیں اور بہت سے لوگ جن سے جان پہچان ہے تو منہ پہ تو تعریف ہی ملتی ہے پیچھے کا پتا نہیں۔

3۔ مجھے ہر کہانی مکمل کرنے کے بعد اطمینان محسوس ہوتا ہے "چلو جی کام ختم ہوا۔" میری عادت ہے میں ایک وقت میں ایک ہی کہانی لکھتی ہوں پھر اسے درست کرنے کے بعد جب تک پوسٹ نہیں کروالیتی اگلی کہانی شروع نہیں کرتی' لیکن جس اطمینان کی آپ بات کر رہی ہیں' ابھی ایسا کوئی شاہکار تخلیق نہیں کیا جس کو لکھ کر اطمینان محسوس ہو۔ اب تک بہت کہانیاں لکھ چکی ہوں اور اگر پسند کی بات کریں تو۔۔۔ "ساتھ دل کے چلے"

"اجالوں کا سفر" میری فیورٹ تھی اور ایک افسانہ تھا "میں سے تم" جو مجھے بہت پسند تھا۔

4۔ ویسے تو میں نمو بخاری' فائزہ افتخار' ماہا ملک' فرحت اور عمیرہ کو شوق سے پڑھتی ہوں۔ ان کے نام فہرست میں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ لیکن آج کل سمیرا احمد' یار! تم تو چھا گئی ہو۔ تمہارے "یارم" نے میرا دل لوٹ لیا۔ "محبت سرما کی دھوپ سی" یہ جملہ ابھی تک دل کو گدگداتا ہے اور سائرہ رضا کو پڑھ کر لگتا ہے کہ جیسے فائزہ اور نمو لوٹ آئی ہوں۔ بنت سحر بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔ اس کے علاوہ سب بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ میں کبھی بھی کسی تحریر کو پڑھتے ہوئے بور نہیں ہوتی ہاں بھئی میری سیکنڈ فیورٹ نایاب جیلانی اور نبیلہ عزیز ہیں۔

5۔ یہ سوال میرا فیورٹ ہے لیکن میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کروں گی۔ کوئی شعر یا اقتباس نہیں' ہیں قارئین سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔

میں زیادہ تر حقیقی کہانیاں ہی لکھتی ہوں' ماورائی اور تصوراتی میں نے بہت کم لکھا ہے لوگ مجھے خود کہانیاں سناتے ہیں۔ "محبت کا رنگ" "ڈوبتے کنارے" اور "تم دل کا مقدر ہو" (جو ابھی شائع نہیں ہوئی) تو بالکل حقیقی کہانیاں تھیں تو آپ کے پاس بھی اگر ایسی کوئی اچھی سی کہانی ہے تو آپ میرے ساتھ شیئر کر سکتی ہیں۔

ایک بار کسی بہن نے خط لکھا تھا کہ ایسی کوئی بندی بتائیں جن سے ہم اپنی کہانی لکھوا سکیں۔ تو اس کے لیے آپ میرا ایڈریس ادارے سے لے سکتی ہیں۔ ایسی کہانیوں میں لکھنے کا مارجن زیادہ ہوتا ہے اور خود سے بنانے سے زیادہ میں حقیقی کہانیاں لکھنے کو زیادہ انجوائے کرتی ہوں۔

✡

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com

نائلہ زیب۔۔۔ ایبٹ آباد

خط پوسٹ کروانا میرے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ ہے' اور یہ۔۔۔ ڈر بھی ہے کہ امی' ابو سے چھپ کر ڈائجسٹ پڑھتی ہوں کیونکہ ہمارے گھر میں ڈائجسٹ پڑھنے کو برا سمجھا جاتا ہے' بقول میری امی کے "ڈائجسٹ پڑھنے سے لڑکیوں کا دماغ خراب ہوتا ہے۔"

مجھے نمرہ احمد کے ناول "نمل" نے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ نمل کو بار بار پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ نمرہ جی! کیا خوب صورت تفسیر کرتی ہیں۔ قرآن پاک کی' تعریف کے لیے الفاظ نہیں۔ آبدار پر بہت غصہ آتا ہے۔ عمیرہ احمد کا ناول "آب حیات" بھی بہت دلچسپ ہے۔ سالار اور امامہ بہت اچھی طرح اپنے بچوں کی پرورش کررہے ہیں۔

معاویہ کا کردار بہت پسند ہے۔ خوش نصیب پر بہت غصہ آتا ہے کیونکہ وہ اتنے پیار کرنے والے شخص (کیف) کی بالکل قدر نہیں کرتی۔ کیف اور خوب نصیب کی نوک جھونک اچھی لگتی ہے۔ "آتو شمتی" کیا ہے' آخر یہ راز کب فاش ہوگا۔

پیاری نائلہ! اپنی امی کو کبھی خواتین یا شعاع کی کوئی کہانی پڑھ کر سنائیں تب ہی تو انہیں اندازہ ہوگا کہ شعاع اور خواتین میں لڑکیوں کا دماغ خراب کرنے والی کوئی بات نہیں ہوتی۔

آتو شمتی کا راز بھی کھلے گا' تھوڑا سا انتظار کرلیں ناول میں ابھی بہت کچھ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ۔ آمنہ ریاض کے اس ناول کا شمار ہمیشہ یاد رہنے والے ناولوں میں ہوگا۔

امتل گیلانی۔۔۔ نامعلوم شہر

شروع ہی سے مجھے ان ڈائجسٹ میں چھپنے والی تصاویر بہت اچھی لگتی ہیں' میں خود بھی ایسے اسکیچ بناتی ہوں' میں چاہتی ہوں کہ میرے بنائے ہوئے اسکیچ ان ڈائجسٹ میں شائع ہوں۔

ج۔ پیاری امتل! آپ اپنے اسکیچز بھجوادیں اگر اچھے ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

حمیرا افتخار۔۔۔ سرگودھا

میں کئی سال سے درس و تدریس جیسا مقدس کام کررہی ہوں' مگر ہمارے ہاں استاد کا مقام کچھ خاص نہیں اگر میں اپنی ہائر ایجوکیشن اور اپنی انتہائی قلیل تنخواہ کا بتاؤں تو آنکھیں غم و غصے سے پھیل جائیں۔ عید کے دنوں میں اپنے پیارے رسالوں سے مستفید ہوئی سو عید بھی اچھی لگی' سب سے پہلے اپنی موسٹ فیورٹ "آب حیات" پڑھی۔ بھئی مزہ آگیا۔ "نمل" ایک بہترین کہانی ہے' مگر خدارا نمرہ احمد اسے اب ختم ہوجانا چاہیے۔ بہرحال اس قسط میں مجھے صرف حنین کے آبدار پر طنز اچھے لگے' مکمل ناول میں بہت عرصے اور انتظار کے بعد کنیز نبوی آئیں اور اپنے مخصوص انداز میں کئی بار کی پڑھی ہوئی کہانی کو سندھی لفظوں کے جامے میں خوب صورتی سے الجھایا۔ البتہ ام طیفور کا "ہوک" پنجاب کے گاؤں کا منظر کافی کھلا محسوس ہوا۔ کچھ اجلا نیا نیا سا۔ افسانے ویسے تو سارے اچھے لگے۔ "خوابوں کا رنگ" فرح طاہر نے اچھا لکھا' مگر بتایا نہیں کہ حالات کس طرح سے بدل گئے۔ ارے ہاں! خالی مکان' حجرہ' ریحان۔ ارے بی بی! آپ

نے تو خاصا اودھم لکھا بلکہ لپیٹ دیا۔ مجھے یہ کہانی خاصی عجیب اور بچکانہ لگی اور جناب ہماری ہیروئن سائرہ کا "ہیرو"... وہ تو ہمارے ہیرو بھی ہیں، آج مجھے "اک تھی مریم" خوابوں میں نظر آتی ہے اور اب ہیرو بھی دکھائی دینے لگا شاباش۔

ایمل رضا کا سروے اچھا تھا اور میں بھی ایمل کی بات کی بات سے اتفاق کرتی ہوں، مگر انہوں نے مصباح علی کو موسموں سے تشبیہ دی ہے اور میں 29 کے چاند سے دیتی ہوں جو بمشکل چڑھتا ہے وہ بھی پشاور میں۔ مصباح علی پلیز خواتین میں بھی لکھیں۔

ج۔ پیاری حمیرا! پرائیویٹ اسکولوں کا یہی حال ہے، کیا کہیں جہاں کوئی قانون نہ ہو وہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔

خوابوں کا رنگ ماضی اور حال کی کہانی تھی اور حال ماضی سے مختلف ہی ہوتا ہے۔

ماضی میں وہ بچے تھے۔ پڑھا لکھا، کام کیا۔ حالات بدل گئے۔ کیونکہ افسانہ تھا اس لیے وضاحت ضروری نہیں تھی۔ تبصرہ بہت اچھا کیا اس کے لیے شکریہ۔

امینا خضر۔ عائشہ اخلاق۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

سب سے پہلے ٹائیٹل دیکھا بہت پسند آیا۔ کرن کرن روشنی میں سب ہی احادیث اچھی تھیں۔ پڑھ کر بہت سی غلط فہمیاں دور ہوئیں۔ معلومات میں اضافہ ہوا، انشاء جی کی باتیں سنیں، محمد جنید کا انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔ کچھ نئے چہروں کا انٹرویو بھی لیں۔ آب حیات پڑھا، مگر اس دفعہ کہانی کچھ سمجھ میں نہیں آئی، ایک دم سے کہانی کا انداز بدل گیا۔ صفحات بھی کم تھے۔ "نمل" کو ہم پڑھتے ہی نہیں کیونکہ میں قاری بہن سے ایگری کرتی ہوں کہ یہ واقعی مجھے جنت کے پتے کی طرح لگتی ہے اور اس لیے بھی میں نے کچھ ماہ ڈائجسٹ نہیں پڑھا۔ اس لیے بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ ایک دو کہانیاں ایسی ہیں ان پرچوں کی کہ ایسا لگتا ہے جیسے ان کہانیوں کو پہلے بھی پڑھا ہوا ہے۔ تبصرہ صرف خواتین پر صرف اس لیے لکھ رہی ہوں کہ آب حیات مجھے بہت پسند ہے۔ خطوط پڑھ کر بے حد مزہ آتا ہے۔ اتنا مزہ کہانی پڑھ کر نہیں آتا جتنا تبصرے پڑھ کر آتا ہے۔ ہم نے ناول منگوانا ہے آپ برائے مہربانی ہمیں تفصیل سے اس بارے میں جواب دیں کہ کیا کیا کرنا ہے کس طرح سے ہمیں ناول مل جائیں گے اور کتنے پیسے لگیں گے۔

ج۔ پیاری امینا اور عائشہ آپ کو نمل "جنت کے پتے" کی طرح اس لیے لگتی ہے کیوں کہ دونوں کی تخلیق کار ایک ہے، لیکن نمل کی کہانی جنت کے پتے سے یکسر مختلف ہے، دونوں کا موضوع بھی مختلف ہے۔ دیگر کہانیاں بھی غالباً" اس لیے پڑھی ہوئی لگتی ہیں کیوں کہ ایک جیسے موضوعات پر لکھی ہوئی ہوتی ہیں۔

ناول منگوانے کے لیے آپ درج ذیل نمبر پر فون کریں۔ آپ کے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔

021-32735021

سمعیہ عبدالجبار۔۔۔ میرپور خاص، سندھ

سب سے پہلے "کہنی سنی" میں عیدالاضحیٰ کی مبارک باد وصول کی۔ پہلی بار شرکت کررہی ہوں۔ انگلش کی لیکچرار ہوں۔ میرے خط لکھنے کی وجہ "نورشے" ہے۔ وقت کی کمی اور مصروفیات کی وجہ سے پہلے خط نہ لکھ پائی۔ دراصل "نورشے" کا پیغام صرف علاقائی، ملکی یا بین الاقوامی حدود تک نہیں بلکہ یہ آنے والی نسلوں اور آنے والے زمانوں کے لیے خضر راہ کا کام کرے گا۔ انسان اور روح کے فلسفے پر لکھی ہوئی یہ تحریر تاریک اور سنسان زندگی میں روشنی کا کام کرگئی اور ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس کے علاوہ نمرہ احمد کی "نمل" کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ان کی منظر نگاری، جزئیات نگاری میں ایسا سحر پایا جاتا ہے کہ قاری خود کو اس کہانی کا ایک حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ "شیریں انور" سے ملاقات بہت بہترین رہی۔ آمنہ ریاض کا "دشت جنوں" بھی قابل تحسین اور سسپنس سے بھرپور ہے۔ ام طیفور کی "ہوک" بھی خوب تھی۔ اگلی چھلانگ "آب حیات" کی طرف واہ عمیرہ جی! عمدہ الفاظ، جامع اور مکمل معلومات۔ کنیز نبوی نے "عمر ماروی" کے کردار میں شاہ لطیف کی پیروی کرتے ہوئے تھر کے تلخ حقائق سے پردہ اٹھایا۔ تھر کے ریگستان، بھوک، مایوسی، افلاس اور ان کی بے بسی، مگر عورت کے اعلا کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل ستائش ہے۔ سائرہ رضا کی "ہیرو" اچھی کہانی تھی۔

ج۔ پیاری سمعیہ! بہت خوب صورت الفاظ میں بہت جامع تبصرہ کیا ہے آپ نے۔ ہمیں خوشی ہوگی کہ آپ

باقاعدہ شرکت کریں۔ آپ کے اگلے خط اور اکتوبر کے شمارے پر تبصرہ کے منتظر رہیں گے۔

میمونہ عروج۔۔۔ ملتان

آپ کا خواتین ڈائجسٹ میں تب سے پڑھ رہی ہوں جب نمرہ احمد کے "مصحف" کی پہلی قسط شائع ہوئی تھی۔ آپ کا شمارہ ہر لحاظ سے بہترین ہے اس میں ہر بات ہوتی ہے چاہے دین ہو یا دنیا' ہر ٹاپک پر معلومات ملتی ہیں۔ "سفال گر' عہد الست' توبہ' مرگ وفا' جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' جو چلے تو جان سے گزر گئے' ساری بھول ہماری تھی' زمین کے آنسو' مصحف" اور بھی بے شمار۔۔۔ یہ سب وہ شاہ کار کہانیاں ہیں جو آج بھی دل پر نقش ہیں۔ میں بی ایس سی کیمسٹری سے کر رہی ہوں اپنے خشک مضمون کے ساتھ میں نے آپ کے شمارے سے بھی خاص الخاص رشتہ جوڑا ہوا ہے۔ میری دوستیں صائمہ اور صبا بھی آپ کے سارے شمارے نہایت ذوق و شوق سے پڑھتی ہیں۔

آپ کا ستمبر کا شمارہ بہت زبردست ہے۔ اس بار سلسلے وار ناولز نمل' آب حیات اور وحشت جنوں کی اقساط شان دار تھیں' لیکن ان سب خوبیوں کے علاوہ یہ امر بھی افسوس ناک ہے کہ ہماری بہت سی رائٹرز انتہائی فضول قسم کے افسانے یا مکمل ناولز لکھ رہی ہیں' ہر ہر افسانہ یا ناول ایک دوسرے کا عکس لیے ہوئے ہے۔ سب شادی' محبت اور رومانس کے گرد ہی گھومتے ہیں زندگی ان سب کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

ج۔ پیاری میمونہ! اتنی ٹف روٹین میں سے آپ نے ہمارے لیے وقت نکالا اور ہمیں خط لکھا اس کے لیے ممنون ہیں' جہاں تک کہانیوں کی یکسانیت کی بات ہے تو شاذ ہی ایسا ہوتا ہے ورنہ ہر کہانی الگ مزاج رکھتی ہے۔ بہرحال آئندہ کوشش کریں گے کہ ایسے افسانے منتخب کریں جو آپ کو بھی پسند آئیں۔

خمائل صابر۔ کہکشاں صابر۔۔۔ کویت

شمارہ ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے اپنا موسٹ فیورٹ ناول "نمل" پڑھا۔ نمرہ آپی دی گریٹ' بہت خوب صورت لکھ رہی ہیں۔ زمر پھپھو اور فارس ماموں کی خوب صورت گفتگو بہت ہی مزے کی ہوتی ہے۔ فارس کا آبدار کو یہ کہنا کہ "اگر آپ سمجھتی ہیں کہ ہم ایک ہیرے کی خاطر لڑیں گے تو آپ ہم دونوں کو جانتی نہیں ہیں ہم نے آگ اور خون کا دریا ایک ساتھ طے کیا ہے۔ موت کے علاوہ ہمیں کوئی چیز الگ نہیں کر سکتی۔" اف دل چاہا آپی کو ہاتھ Bingo لکھ کر دکھائیں۔ اور ایک فرمائش بھی کرنی تھی الوداع کے ایکٹر "زاہد احمد" کا انٹرویو شامل کریں۔ آپی ہماری فیورٹ رائٹر کہاں کھو گئیں؟ فرحت آپی' نایاب جی' فائزہ جی' آسیہ رزاقی انہیں کہیں نا ہمارے لیے کچھ لکھیں اور ایک اور بات مجھے ناول منگوانا ہے طریقہ بتائیں۔

ج۔ خمائل اور کہکشاں! اتنی دور سے خط لکھا' اتنے دل سے لکھا اور اتنا مختصر؟ کیا نمل کے علاوہ پرچے کی کسی تحریر' کسی سلسلے نے متاثر نہیں کیا؟ آپ کی فرمائش جلد ہی پوری کردیں گے' مگر اب آپ سے فرمائش ہے کہ اگلی دفعہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ آئیے گا۔ ناول منگوانے کے لیے آپ 021-32735021 پر فون کرلیں۔

ایمان جلبانی۔۔۔ گاؤں دریا خان جلبانی

اس دفعہ ٹائٹل بہت پیارا تھا۔ سب سے پہلے کنیز نبوی کے "عمر ماروی" کی طرف چھلانگ لگائی۔ ابتدا میں ہی شاہ صاحب کا شعر پھر عمر ماروی اور ندائے ملیر کی اس گہرائی اور خوب صورتی سے تعریف' ابراہیم نشی کی پرسوز آواز نے کسی اور ہی جہان میں پہنچا دیا محبت سے گوندھی یہ داستان لکھنے پر ادی کنیز تمہارا بہت شکریہ۔ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی۔ اس خوشی میں بابا سائیں کی نظر کمزور ہونے کے باوجود میں نے یہ کہانی شروع سے بابا کو پڑھوائی میرا جگر (بھائی) اور بابا سائیں بہت خوش ہوئے۔ ابتدا میں ہی شاہ صاحب کا کلام پڑھا۔ ادی کنیز دیر لگی تم کو آنے میں شکریہ ہے تم آئے۔ اب پلیز پھر سے روپوش نہ ہونا اور یہ کیا معاویہ اور آئے کت کے پیچھے بھی لگتا ہے اڑن طشتری (سوری وہ سفید روح اڑتی ہوئی) ہے اور اب ماموں کے گھر بھی آ گئی؟ یار آئے کت معاویہ تم لوگ نہ دم کر کے نہیں سوتے جب ہی تو یہ سب ہو رہا ہے۔ پر پلیز اس خوش نصیب کو ان "بابوں" کے چکروں سے دور رکھیں اور اسے کیف کا ہی رہنے دیں۔ ویسے بھی آج کل معاشرے میں تعویذ علم' پیر فقیر مزاروں پہ جانا چمٹنا بہت بڑھ گیا ہے۔ "نمل" میں اشعار کی سخت قلت تھی قسط شاندار تھی۔

ام طیفور کافی عرصے کے بعد آئی ہیں اور مریم تو مجھے اپنی کرن بھک القساء جیسی معصوم لگی۔ "آب حیات" کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں خانہ کعبہ کے سامنے کھڑا سالار ہوتا ہے اور روتی میں ہوں۔ افسانوں میں بس "ہیرو" پڑھا بہت اچھا تھا‘ بے خبری جیسی کوئی نعمت نہیں‘ آگہی سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں۔

ج۔ پیاری ایمان! آپ کا خط پڑھ کر آپ بھی ہمیں معصوم لگیں۔ ویسے کنیز نبوی کو سراہنے کا آپ کا معصوم اور بے ساختہ انداز بہت اچھا لگا۔ آئندہ پورا پرچا پڑھ کر تبصرہ بھیجیے گا۔

کانٹ چھانٹ تو کرنی پڑے گی سو ہم نے بھی کانپتے دل سے کی ہے۔ (مجبوری جو ہے)۔ اور ہاں صرف خوش نصیب ہی نہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ کوئی بھی ان جھوٹے بابوں کے چکر میں نہ پھنسے‘ اسی لیے تو اس موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

عائشہ باجوہ..... سیالکوٹ

اپنی ساری رائٹرسے صرف یہی کہنا چاہوں گی کہ آپ کے قلم کے سہارے جی رہے ہیں۔ لفظوں کی خوشبو زندگی دیتی ہے۔ مابدولت سیالکوٹ کے ایریا میں نہر کے اوپر واقع گاؤں میں رہتے ہیں‘ ڈائجسٹ پڑھنا کب اسٹارٹ کیے یاد نہیں۔ اب B.A کر رہے ہیں اب جا کے لکھنے کی ہمت ہوئی۔

ج۔ پیاری عائشہ! ہم آپ کی فرمائش پر خط شائع کر رہے ہیں‘ لیکن آپ کا خط بہت مختصر ہے۔ کسی بھی تحریر پر کوئی تبصرہ نہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے خواتین کی اس بزم میں شرکت کی۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ آمنہ رئیس ہانیہ عمران..... گجرات

سرورق ہر لحاظ سے پرفیکٹ لگا مجھے۔ مسکراتی ہوئی لڑکی مہندی سے سجے ہاتھ اور ہاتھوں میں محبتوں کے امین پھول اچھے تھے۔ کرن کرن روشنی میں احکامات و مسائل معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ معروف شیف شیریں انور سے ملاقات بھی اچھی لگی۔ جشن عید سب کا جشن اسپیشل لگا خاص کر چتوکی کی ثمرہ احمد کی باتیں اچھی تھیں۔ حرف سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ۔ ایمل رضا کے بارے میں جان کر اچھا لگا خاص کر اقتباسات بہت پسند آئے۔ جب محبت کا یوسف ہجر کے کنویں میں گرتا ہے تو اس کے چاہنے والے کی آنکھیں یعقوب ہو جایا کرتی ہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے عمر ماروی پڑھا۔ بہت اچھی لگی۔ اینڈ پر باقی آئندہ اچھا نہیں لگا۔ "نہوک" ام طیفور کا پرلطف ناول تھا۔ دو دوستوں کی محبت بھری کہانی۔ ناولٹ قربانی پورے ڈائجسٹ میں یہ تحریر تھوڑی مزاحیہ لگی۔ شکر ہے ایان قربان ہوتے ہوتے رہ گیا۔ افسانے سب ہی اچھے لگے۔ چوتھے نمبر والا افسانہ خوابوں کے رنگ کچھ عجیب سا لگا۔ رائٹر نے جو غربت کا نقشہ کھینچا ہے شاید آج کے دور میں کہیں ایسا بھی ہوتا ہو گا اور رائٹر نے جو حلیم کی ترکیب بتائی ہے‘ مجھے تو ناقابل یقین ہی لگی۔ چلیں سب کچھ سچ‘ روٹی کے باسی ٹکڑے خشک کرکے پکالیں‘ مگر رائٹر نے یہ وضاحت نہیں کی کہ کئی کئی دن کے بچے کھچے سارے سالن جو حلیم میں ڈالے ہیں وہ کہاں سے لائی ہیں کرداروں کی غریبی کی جو منظر کشی کی ہے‘ وہاں تو فریج کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا اور پھر کفایت شعاری کی انتہا ہی کردی۔ درزی کی کترنوں سے کپڑے بنالیے۔ میری معصوم بھولی رائٹر صاحبہ آج کل تو لوگ قربانی کے گوشت کی بوٹیاں بھی تین سے اوپر نہیں دیتے اور آپ کہاں کترنوں سے عید کے سوٹ بنا رہی ہیں۔ ہاہاہا۔ ہاں یہ بات ماننے والی ہے

پرانے کپڑوں کو بلیچ لگا کر کلف لگا کر نیا کیا جاسکتا ہے اور پھر پچاس روپے میں کہانی کے ہیرو نے کھایا پیا۔ جھولے بھی لیے‘ ذرا کنفرم تو کرو دیتیں کہ رائٹر کس دور کی داستان حمزہ سنا رہی ہیں تاکہ ہمارا دل بھی ان تمام باتوں پر بلاشک و شبہ کے یقین کرلیتا۔ تیسرا نمبر والا افسانہ بڑا پن بھی اچھا لگا‘ باتیں اکرام عباسی کی ان کا 52 واں سوال قابل توجہ ہے اور نہیں تو ملک کے غداروں کا پروٹوکول کا سسٹم ختم ہونا چاہیے۔

ج۔ پیاری فوزیہ! آپ کا تبصرہ بے حد دلچسپ ہے‘ بہت مزہ آیا‘ اندازہ ہوا کہ کتنی دلچسپی سے آپ رسالہ پڑھتی ہیں۔ تنقیدی نظر بھی خوب ہے۔ افسانوں میں کچھ مبالغہ تو ہوتا ہی ہے۔ ویسے یہ افسانہ "خوابوں کا رنگ" موجودہ زمانے کا تھا ہی نہیں‘ یہ اس وقت کی بات ہے جب دس روپے عیدی ملتی تھی اور وہ بہت زیادہ لگتی تھی۔ اور اس زمانے میں بچے کچھے کھانے بھی سنبھال کر نعمت خانے

میں رکھ دیے جاتے تھے۔ انہیں بار بار گرم کیا جاتا تھا۔ کہانی بے شک آپ کو عجیب لگی ہوگی مگر ہمارے ملک میں غربت ہولناک عفریت کی طرح اس سے بھی زیادہ بُرے حال میں لوگوں کے سر پر مسلط ہے۔ ہماری تو دعا ہے کہ اللہ سب کے دسترخوان بھرے رکھے اور انہیں سجانے اور کھانے والے سدا خوش اور آباد رہیں۔ آمین۔

ہاجرہ عمران..... لاہور

دل نشین مسکراہٹ سے سجا چہرہ ہمارے دل کو خوب خوب بھایا۔ پورا مہینہ جس تحریر کا انتظار ہوتا ہے وہ "نمل" ہے، تبصرہ سب سے پہلے کروں گی "جشن عید مبارک" کی اور اس میں چھپے اس سروے کی جس کے جوابات "نمرہ احمد بٹ" نے پتوکی سے بھجوائے ہیں۔ بہن نے بتایا کہ چالیس سال عمر ہے اسی عمر میں زندگی کی رونقوں سے منہ موڑ کر سفر آخرت (خدانخواستہ) کا انتظار ہے۔ بہن نمرہ کے لیے خاص پیغام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی انسان کو نعمت کے طور پر انعام فرمائی ہے۔ چالیس سال کی عمر میں تو انسان زندگی جینا شروع کرتا ہے اور آپ خاتمے کی بات کررہی ہیں۔ آپ اتنی اچھی اور سادہ دل ہیں (خط سے ظاہر ہے) مایوسی کا لبادہ اتار پھینکیے اور زندگی کے رنگوں کو انجوائے کیجئے۔ انٹرویو میں شیریں انور سے ملاقات معلومات افزا رہی۔ ایمل رضا، حرف سادہ کی طرح اچھی سادہ اور سمپل لگیں۔ اب اگر انتظار ہے تو ان صفحات پر نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کا۔ افسانوں میں بہترین افسانہ "ہیرو" رہا۔ اگر میں پڑھنے والوں کو عجیب ترین نہ لگوں تو بتانا چاہوں گی کہ میرے گھر یا رشتے داروں کے گھروں میں بھی انڈین ڈراموں میں کام کرنے والے کانے بھینگے ناٹے ہیروز (نقلی) کو ہمارے ہاں کوئی بھی آئیڈیلائز نہیں کرتا۔ ہمارے اصل ہیروز راشد منہاس، میجر عزیز بھٹی ہیں۔ (الحمدللہ) سائرہ رضا کی یہ کاوش بلاشبہ شاندار رہی۔ "میری قربانی" ہلکا پھلکا اور عید کا سا سماں بنائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ فرح طاہر کا "خوابوں کے رنگ" بھی اپنا رنگ جمانے میں کامیاب رہا۔ امت العزیز کی کہانی میں تجسس اور غیر معمولی پن کی کمی محسوس ہوئی۔ مکمل ناول میں "ہوک" اچھا رہا، بابا فرید، بلھے شاہ اور بھی وارث شاہ کلام دل گرماتا رہا۔ عمر ماروی کو تھر کے تناظر میں پڑھنے کا خوب مزہ آیا۔ ماروی (روح) اور عمر (نفس) ہے۔ آج کے دور میں کتنی ہی مارویاں نفس کی چاہ میں "لوئی لج" کے سبق سے ناآشنا ہیں۔ "دشت جنوں" کے صفحات کچھ کم معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے تو پہلی قسط سے "آئے کت" پر شک تھا کہ قلعہ فلک بوس کا بھوت "آیوشمتی" کے پیچھے آئے کت کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ عمیرہ احمد کے نام میں عجیب سی کشش ہے۔ عمیرہ احمد نے "امامہ" اور "سالار" کی شخصیات کا پرتو جبریل، عنایہ، حمین اور تربیت کا رنگ نفیسہ میں برابر بانٹ دیا ہے۔ نمرہ احمد وہ ہستی ہیں کہ دل چاہتا ہے وہ لکھتی رہیں اور ہم پڑھتے رہیں۔ آج خواتین ڈائجسٹ میں انشاء جی کی غزل پڑھی تو دل ان کے بے ساختہ اظہار قوت کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ زمانہ یاد آیا جب میں اسکول پڑھاتی تھی اور ایک بار کلاس کی فرمائش پر میں نے ابن انشاء کی غزل سنائی۔ "فرض کرو" اس کے بعد کئی دن تک اسٹوڈنٹس مجھ سے وہ غزل بار بار سننے کی فرمائش کرتی رہیں اور اپنی ڈائریوں میں نوٹ کرتی رہیں۔ بہت خوب صورت زمانہ تھا وہ، جو آج بھی یاد آتا ہے۔

ج۔ پیاری ہاجرہ! آپ کے ناول کا پلاٹ تو دلچسپ ہے۔ اب آپ نے اسے کس انداز سے لکھا ہے، یہ تو پڑھنے کے بعد ہی اندازہ ہوگا۔ کہانیوں کے بارے میں آپ کی بے چینی جائز ہے، لیکن ہماری بھی مجبوری ہے ہمیں ڈاک سے بے شمار کہانیاں موصول ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہم ساری کہانیاں فوری طور پر پڑھ نہیں پاتے ہیں۔ آپ کی کہانی جلد پڑھنے کی کوشش کریں گے۔ آپ فون کرکے پتا کرلیں۔

قلعہ فلک بوس کا آسیب آیوشمتی.... ایک بھٹکتی روح جس کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔
معاویہ فلک بوس آتا ہے تو اسے وسامہ کی ڈائری ملتی ہے۔
فلک بوس میں وسامہ اپنی بیوی آئے کت کے ساتھ رہتا ہے۔ وسامہ بہت اچھا اور ذہین مصنف ہے۔ وہ باوقار اور وجیہہ شخصیت کا مالک ہے لیکن ایک ٹانگ سے معذور ہے۔ وہ غیر معمولی حساس ہے۔ اسے قلعہ فلک بوس میں کوئی روح محسوس ہوتی ہے۔ آوازیں سنائی دیتی ہیں لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ معاویہ' وسامہ کا پھوپھی زاد بھائی ہے' آئے کت اور وسامہ' معاویہ کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ قلعہ فلک میں آیوشمتی کی روح ہے لیکن معاویہ مضبوط اعصاب کا مالک ہے' اسے اس بات پر یقین نہیں آتا۔
کہانی کا دوسرا ٹریک جہاں تین بھائی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت رہتے ہیں۔
صابر احمد سب سے بڑے بھائی ہیں۔ صابر احمد کی بیوی صباحت تائی جان ہیں اور تین بچے' رامین' کیف اور فہمینہ ہیں۔ رامین کی شادی ہوچکی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ملائیشیا میں ہے۔
شفیق احمد کی بیوی فضیلہ چچی ہیں۔ مالی لحاظ سے وہ سب سے مستحکم ہیں۔ شفیق احمد نے ان سے پسند کی شادی کی تھی۔ دو بیٹیاں صیام اور منہا ہیں اور دو بیٹے شاہجہاں اور شاہ میر ہیں۔ بڑے بیٹے شاہ جہاں عرف مٹھو بھائی کا دماغ چھوٹا رہ گیا ہے۔

باسط احمد تیسرے بھائی کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی بیوی روشن امی اور دو بیٹیاں خوش نصیب اور ماہ نور ہیں۔۔ خوش نصیب کو سب منحوس سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ تنگ مزاج ہو گئی ہے۔ خوش نصیب کی نانی بھی ان کے ساتھ رہتی ہیں۔ خوش نصیب کو دونوں چچاؤں سے شکایت ہے کہ انہوں نے ان کا حق نہیں دیا ہے۔ گھر کا سب سے خراب حصہ ان کے پاس ہے۔ صباحت تائی جان اور روشن امی خالہ زاد بہنیں ہیں۔ صباحت تائی جان کے چھوٹے بھائی عرفات ماموں جو بہت نرم گفتار اور دل موہ لینے والی شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ کیف کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا آئیڈیل بھی ہیں۔

کہانی کا تیسرا ٹریک منفرا اور تیمی ہیں۔ منفرا امریکہ میں پڑھنے آئی ہے۔ ہاسٹل میں رہتی ہے۔ زیر زمین ٹرین میں ان کی ملاقات معاویہ سے ہوتی ہے۔ منفرا کی نظریں معاویہ سے ملتی ہیں تو اسے وہ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی سفاکی اور بے حسی ہے۔ منفرا چونک سی جاتی ہے۔

نویں قسط

"بول بچی! کیا چاہتی ہے۔۔؟ بابا تیرے من کی ہر مراد پوری کرے گا۔" بابا نے اپنی چنی منی سی آنکھیں اس کی آنکھوں میں گاڑ دیں اور ایک پل میں خوش نصیب اس دنیا سے غافل ہو گئی۔ ایسے جیسے خلا میں بھٹک رہی ہو۔ بظاہر وہ وہیں بیٹھی تھی، وہ سب سن رہی تھی، دیکھ رہی تھی مگر اس کے ذہن نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

وہ جو خود کو تمیس مار خان ذہین و فطین اور پتا نہیں کیا کیا سمجھتی تھی اس وقت ایک بت سی بن گئی تھی۔

بات یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی انسان کو لے ڈوبتا ہے اور شاید خوش نصیب بھی ڈوبنے کو تھی۔

"مانگ لے۔۔۔ آج بابا دینے کا ارادہ کیے بیٹھا ہے۔۔۔ بتا کیا چاہتی ہے؟" ملنگ بابا اپنا سر ہولے ہولے ہلا رہا تھا۔

"مم۔۔۔ میں چاہتی ہوں مشا میر سے میری شادی ہو جائے۔ کک۔۔ کچھ ایسا کر دیں بابا جی!۔۔۔ وہ، وہ میرے علاوہ کسی مرن جوگی کو نہ دیکھے۔"

ادھر لرزتے ہوئے جملے خوش نصیب کے ہونٹوں سے ادا ہوئے ادھر عقیدت مندی سے سر جھکائے بیٹھی فریحہ کے سر پر بم پھوٹا اور ایسا پھوٹا کہ اس کے پرخچے ہی اڑ گئے۔ وہ ہکا بکا ہو کر خوش نصیب کو دیکھنے لگی۔ لیکن اگلا جھٹکا اس سے بھی زیادہ شدید ثابت ہوا کیونکہ خوش نصیب وہ نہیں لگ رہی تھی جو کہ اصل میں وہ تھی۔

گو کہ اس کا چہرہ' بات کرنے کا انداز' اس کا لباس سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا لیکن کہیں کوئی تبدیلی آئی تھی۔ کوئی ایسی تبدیلی جسے فریحہ جیسی ناسمجھ لڑکی فی الحال کوئی نام نہیں دے سکتی تھی۔

وہ آنکھیں کھولے بابا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر ہولے ہولے لرز رہا تھا بالکل غیر محسوس انداز میں۔ آنکھوں کی پتلیاں بار بار سکڑ اور پھیل رہی تھیں۔

ویسے اس سے تو اچھا تھا کہ خوش نصیب کے سر پر سینگ ہی نکل آئے ہوتے۔ کم سے کم فریحہ کو ایسا زوردار جھٹکا تو نہ لگتا اور یقیناً" پہچاننے میں بھی آسانی ہو جاتی کہ اصل میں تبدیلی آئی کہاں ہے؟

"مایا ہے... سب مایا ہے۔" ملنگ بابا نے استہزائیہ ہنسی کے ساتھ اپنے پیلے دانتوں کی نمائش کر ڈالی اور ایسے کہا جیسے اپنی طرف سے بڑی بات کی ہو۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بابا جی کی اس بات پر سر دھننے والے وہاں بہت سے لوگ موجود تھے۔

"کیوں اس مایا دنیا کے پیچھے بھاگتی ہے... خود کو برتر کر لے... دنیا تیرے پیچھے آئے گی۔"

"اتنی محنت نہیں ہوتی مجھ سے..." تنویم زدہ ہو کر بھی وہ خوش نصیب ہی تھی اس نے ثابت کیا۔

"محنت کرنے سے ڈرتی ہے؟"

"محنت سے نہیں ڈرتی محنت کا پھل نہ ملنے سے ڈرتی ہوں۔ آج تک محرومیاں ہی دیکھی ہیں۔ اب زندگی میں سکون چاہیے... ایسا سکون جو ہر دکھ' ہر پریشانی سے چھٹکارے کے بعد حاصل ہو سکتا ہے۔" وہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا اپنی قوت گویائی پر وہ خود بھی قادر نہیں ہے۔ اور الفاظ کو اس کے اندر سے باہر آنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔

"مجھے شامیر چاہیے بابا! کسی بھی طرح' کسی بھی قیمت پر۔" بولتے بولتے وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔

فریحہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بری طرح حواس باختہ ہو گئی۔

"خوش نصیب! خوش نصیب!"

بابا کا خاص بندہ جلدی سے آگے بڑھا اور فریحہ کے ساتھ مل کر خوش نصیب کو اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔ اردگرد کھڑے لوگ بھی مدد کے لیے آگے آ رہے تھے۔ اس نے سب کو پیچھے ہٹایا اور سہارا دے کر وہاں سے کچھ دور خوش نصیب کو ایک ستون کے سہارے بٹھا دیا۔ خوش نصیب کا بے ہوش ہو جانا فریحہ کے لیے باعث پریشانی تھا۔ ورنہ یہاں ایسے' بہت سے لوگ تھے جن کے ساتھ ایسے معاملات ہو رہے تھے۔

"خوش نصیب! آنکھیں کھولو۔" فریحہ نے اسے ستون کے سہارے بٹھا کر اس کا گال تھپتھپایا لیکن خوش نصیب ایک طرف کو لڑھک گئی۔ فریحہ نے اسے جلدی سے دوبارہ سنبھالا۔

"مجھے لگتا ہے یہ مر گئی ہے۔" وہ فکر مندی سے پیلی پڑ گئی۔

"او نئیں بی بی!"

لیکن بی بی کو کہاں سکون۔ پٹر پٹر بولنے والی خاموش' ہوش و خرد سے بیگانہ نظر آ رہی تھی اتنے تو ریڈیو پر بیک ٹو بیک گانے نہیں چلتے ہوں گے جتنا اکیلی خوش نصیب ایک وقت میں بول لیتی تھی۔ قیاس تھا کہ سوتے میں بھی اس کی زبان کو سکھ کا سانس نصیب نہیں ہوتا ہو گا۔

تو معاملہ کچھ یوں تھا کہ خوش نصیب بے ہوش تھی اور خاموش تھی اور فریحہ کا بس نہیں چل رہا تھا کسی طرح اسے آنکھیں اور زبان کھولنے پر مجبور کردے۔ دو تین بار تو وہ جھک کر اس کے دل کی دھڑکن بھی سن چکی تھی۔

"دس پندرہ منٹ تک ہوش آجائے گا۔ اتنی وی کوئی پریشانی دی گل نئیں۔" (اتنی بھی کوئی پریشانی کی بات نہیں) وہ بولا۔

"بب... بابا سے کہو... اسے ہوش میں لائیں۔"

"بابا بے ہوش کرسکتے ہیں... ہوش اسے اپنے وقت پر ہی آئے گا۔"

"اس دن تو بابا کہہ رہے تھے۔ مردے میں جان ڈال سکتا ہوں... یہ تو پھر بے ہوش ہوئی ہے۔"

"بی بی! بحث نہ کر۔" معتمد خاص آہستہ باتیں کرنے لگا۔ "یہ تعویذ ہے۔ دروازے کی چوکھٹ میں دبا دینا۔ اور یہ چینی... اگلے پندرہ دن کسی چیز میں ڈال کر کھلانا ہوگی۔"

"یہ تو بات نہیں کررہی۔ چینی والی میٹھی چیز کھانے کے لیے منہ کہاں کھولے گی۔" حواس باختہ فریحہ بولی۔

"اوہو..." اس نے سر پیٹ لیا۔ "یہ چینی اسے کھلانی ہے، جس کا ابھی نام لے رہی تھی... جس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"اچھا اچھا، سمجھ گئی۔" فریحہ نے جلدی سے پڑیاں لے کر دوپٹے کے پلو سے باندھیں۔ اسی وقت خوش نصیب کسمسانے لگی۔ فریحہ کے ہاتھ پیروں میں جان آگئی۔

"اٹھو خوش نصیب! آنکھیں کھولو۔"

"میں... میں کہاں ہوں؟" اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہم بیری پیر آئے تھے خوش نصیب! تم... تم ٹھیک ہو نا۔" وہ جب تک اس کے منہ سے سن نہ لیتی اسے سکون نہیں مل سکتا تھا۔ خوش نصیب کی سہیلی تھی اور اس سے کچھ کم بھی نہیں تھی۔

خوش نصیب نے پورا زور لگا کر آنکھیں کھول دیں تو بیری پیر کے صحن کی محرابی چھت آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ ذرا دیر گھومتی رہی پھر ٹھہر گئی۔ اسی مدت میں خوش نصیب کو یاد آگیا کہ وہ کہاں آئی تھی اور کس مقصد کے لیے آئی تھی۔ سب یاد آتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"میں زندہ ہوں۔" ایسی خوشی سے کہا جیسے اپنے تئیں مر ہی چکی ہو۔

"تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا۔ میں سمجھی واقعی مر مرا گئی ہو۔" فریحہ نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا اور ایسے پرسکون ہو کر بیٹھ گئی جیسے بڑی دیر تک سولی پر ٹنگی رہی ہو۔

"فٹے منہ تمہارا... انسان کوئی اچھی بات ہی سوچ لیتا ہے۔" وہ کپڑے جھاڑ کر کھڑی ہوگئی۔ "اب چلو تمہارے پیر بابا سے پھر کبھی مل لیں گے۔ ابھی مجھے نیند آرہی ہے۔" اس نے قدم بڑھا دیے۔

"ہائیں!!" فریحہ کو اس کی بات سن کر ایک اور جھٹکا لگا۔ کیا اسے یاد نہیں، بے ہوشی سے پہلے وہ بابا سے مل چکی ہے۔ اس نے جاتی ہوئی خوش نصیب کو دیکھا جو اسی لاپروائی سے دربار سے نکل گئی تھی جو اس کا شیوہ رہا تھا۔

"خوش نصیب! میری بات تو سنو۔" وہ اس کے پیچھے بھاگی۔

✡ ✡ ✡

طالب ماموں کے ایک تھپڑ نے کافی کام کیا۔ معاویہ غصے میں گھر سے نکلا اور واپس آنے کا سوچا تک نہیں۔ غصہ پہلے ناراضی میں ڈھلا پھر پچھتاووں نے گھیر لیا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

بارش بھی اس روز وقفے وقفے سے برستی رہی۔ وہ جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسائے سڑکوں پر پھرتا رہا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ مڑ کر وہاں نہیں جائے گا جہاں ایک دو ٹکے کی لڑکی کے لیے اس پر ہاتھ اٹھایا گیا ٗاسے جھوٹا قرار دیا گیا تھا۔ لیکن ایسی جذباتی قسموں کی عمر کم ہی ہوتی ہے سو شام ڈھلے جب وہ واپس پلٹا تو نہ صرف غصہ اتر چکا تھا بلکہ دل میں دبے غم کا منہ زور طوفان بھی اپنا زور کم کر چکا تھا۔

طالب نگر جو بظاہر ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا اس وقت خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اتنا سناٹا تھا کہ لگتا تھا کبھی یہاں کسی کی ہنسی کی آواز گونجی ہی نہیں ہوگی۔ اس نے دستک دینے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن اس سے پہلے ہی گیٹ کھلتا چلا گیا۔ صاعقہ ممانی کی آنکھیں جہاں اب ہمہ وقت اداسی ڈیرے ڈالے رکھتی تھی اسے دیکھتے ہی ایسے روشن ہوئیں جیسے دل کی زمین پر سکون اتر گیا ہو۔

"میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔۔۔ کہاں چلے گئے تھے تم۔" انہوں نے بے قراری سے پوچھا۔

معاویہ چھوٹے بچوں کی طرح آگے بڑھا اور ان سے لپٹ گیا۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو یاد ہے ممانی! آپ ہمیشہ کہا کرتی تھیں معاویہ کا قد لمبا ہوتا جا رہا ہے لیکن اس میں عقل چھوٹے بچوں جیسی ہے۔ آپ سمجھیں میں بچہ ہی ہوں۔۔۔ پلیز میری صبح والی بدتمیزی کو اگنور کر دیں۔" وہ آہستہ آہستہ لیکن لجاجت سے بولتا چلا گیا۔

صاعقہ ممانی پہلے حیران ہوئیں پھر جیسے ان کی حیرانی کے رنگ جھڑ گئے اور وہ ساری بات سمجھ گئیں۔

"میں نالائق ہوں ممانی! ہمیشہ ہر بات مجھے وسامہ ہی سمجھاتا تھا۔ میں نے انسانوں کو اب تک اس کی نظروں سے دیکھا تھا۔۔۔ دنیا کو اس کے پوائنٹ آف ویو سے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔۔۔ اب وہ نہیں ہے تو میں خود کو بھٹکا ہوا محسوس کرتا ہوں۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے میں خلا میں معلق ہوں۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہے۔۔۔ کہاں جانا ہے میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔۔۔ مجھے تو اس پہ بھی یقین نہیں کہ وسامہ اس دنیا میں نہیں رہا۔۔۔" اب وہ رونے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"آپ اور ماموں بھی مجھ سے ناراض ہو گئے تو میں کہاں جاؤں گا۔" وہ بلک بلک کر رونے لگا تھا۔

صاعقہ ممانی نے تڑپ کر اسے سینے سے لگا لیا۔

"کون ناراض ہے تم سے؟ کون چھوڑ رہا ہے تمہیں؟ ہمیں تو تمہاری اتنی فکر تھی۔ تمہارے ماموں ابھی بھی تمہیں ڈھونڈنے باہر نکلے ہوئے ہیں۔"

معاویہ نے ذرا چونک کر ان سے الگ ہوتے ہوئے انہیں دیکھا۔

"ماموں ناراض نہیں ہیں؟"

"پتا نہیں میں نے نہیں پوچھا۔" وہ قدرے بیزاری سے اور جان چھڑانے والے انداز میں بولی تھیں۔

"تم اندر آؤ۔۔۔ کپڑے بدلو۔ ٹھنڈ لگ جائے گی تو بیمار ہو جاؤ گے۔"

معاویہ قدرے ہلکا پھلکا ہو کر اندر آگیا۔ گھر خالی تھا۔ جب تک اس نے کپڑے تبدیل کیے ممانی اس کے لیے تازہ بیک کیے ہوئے چیز پیٹز اور کافی بنا لائیں۔ جب تک وہ کھاتا رہا ممانی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اس کے بعد اسے کچھ دیر سونے اور آرام کرنے کی تلقین کر کے چلی گئیں۔

معاویہ کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ ممانی کے دل میں اس کے لیے شکایت نہیں ہے، یہ بات اسے پرسکون کرنے کے لیے کافی تھی۔

وہ بے سدھ ہو کر سویا۔ جب دوبارہ آنکھ کھلی تو شام گہری رات میں بدل چکی تھی۔ اور پورے چاند کی روشنی

کھڑکی کے شیشے سے اندر تک آرہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پردے برابر کیے اور باہر آگیا۔ نیچے لاؤنج سے کسی کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ذرا آواز واضح ہوئی تو پتا چلا ٹی وی پر خبرنامہ نشر ہو رہا تھا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ تینوں افراد وہیں موجود تھے لیکن غیر معمولی طور پر سنجیدہ اور خاموش۔

معاویہ نے کن اکھیوں سے طالب ماموں کو دیکھا۔ وہ ٹی وی دیکھنے میں منہمک تھے۔ آئے کت سنگل صوفے پر پیر اوپر کیے، ہتھیلی پر چہرہ رکھے بیٹھی تھی۔ اس کے کتھئی سنہری سے دکھائی دینے والے بال، بے ترتیبی اور لاپروائی سے بندھے تھے۔

معاویہ نے اسے بری طرح نظر انداز کیا اور گلا کھنکھار کر ماموں کو متوجہ کیا۔ جوں ہی انہوں نے اس کی طرف دیکھا، معاویہ استحقاق سے آگے بڑھا اور ماموں کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

وہ آہستہ سے مسکرائے پھر ان کا داہنا ہاتھ معاویہ کے سر پر آرکا۔ اب وہ بھی انہماک سے ٹاک شو سن رہا تھا۔

آئے کت نے ناراضی سے بھرپور نظر اس پر ڈالی اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ محبت کے یہ مظاہرے اسے ایک آنکھ نہیں بھار ہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے اتنی زیادہ نیند آرہی ہے کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہو رہی ہیں۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے میں گر جاؤں گی۔"

چھوٹی گلی سے نکل کر وہ مین روڈ کے کنارے آئیں تو خوش نصیب نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ اس سڑک کو عبور کر کے سامنے کی لین میں کچھ آگے جا کر ان کے گھر تھے۔ ادر ابھی کافی دور ہی تھے۔

"آؤ یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔" وہ اسے لے کر ایک گھر کے باہر بیٹھ گئی۔

"تم نے تو مجھے پریشان ہی کر دیا تھا خوش نصیب!"

"اچھا۔۔۔ واقعی؟"

"لو یہ کوئی مذاق تھوڑی ہے۔" فریحہ برا مان گئی۔ "مذاق تو وہ تھا جو تم نے میرے ساتھ کیا؟"

"اب میں نے کیا کر دیا؟" اس کا سر چکرا رہا تھا اوپر سے ایسی باتیں۔

"بابا جی سے بات کرتے کرتے ایک دم سے بے ہوش ہو گئیں۔۔۔ تم سے۔ میرے تو ہاتھ پیر ہی پھول گئے تھے۔"

"میں بے ہوش ہو گئی تھی؟" اس نے ذہن پر زور ڈالا۔

"صرف یہی نہیں، تم نے تو بابا جی کو یہ بھی بتایا کہ تم شامیر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" جو بم فریحہ کے سر پر پھوٹا تھا اس نے وہ اس کے بچے کھچے ٹکڑے جمع کر کے اسی شدت سے خوش نصیب کے سر پر دے مارے اور نتائج بھی حسب منشا حاصل کر لیے۔

خوش نصیب اپنی جگہ سے دو فٹ اچھل کر دوبارہ بیٹھی تھی۔

"یہ کس نے کہا تم سے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹنے کے قریب ہو گئی تھیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے آپ کے دل کی بات دوسرے کی زبانی ادا ہونے لگے۔

"تم نے۔۔۔ اور کس نے۔" فریحہ تنگ کر بولی۔ "اور تم ایسی بدتمیز سہیلی ہو کہ مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔ میں ناراض ہوں تم سے۔"

"کیا نہیں بتایا؟" وہ گم صم سی پوچھ رہی تھی۔ شکل پر ایسے تاثرات تھے جیسے بس ابھی رو دے گی۔

"یہی کہ تم شاعری کی محبت میں ناک تک ڈوب چکی ہو۔"
"یہ سچ نہیں ہے۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔
"ہائیں... اگر سچ نہیں ہے تو بابا جی کے سامنے اقرار کیوں کیا تھا... " وہ ناک چڑھا کر بولی۔ "انہوں نے تو تعویذ بھی لکھ دیا ہے اور چینی پر دم بھی کر دیا ہے۔"
"چینی... اخ تھو۔" خوش نصیب کو سنتے ہی کراہیت ہوئی۔ "بات سنو! مجھ سے ذرا دور ہو کر بیٹھو' ایسی گندی چیز ہاتھ میں پکڑے بیٹھی ہو' میرے ساتھ بھی نہ لگنا۔" وہ کھسک کر ذرا دور ہو گئی تھی۔
فریحہ نے دانت کچکچائے۔ اسے ایسے گھورا جیسے آنکھوں سے ہی کچا چبا جائے گی۔ لیکن ابھی وہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی' کیونکہ اسے اس راز کی حقیقت معلوم کرنا تھی جو اس سے پوشیدہ رکھا گیا تھا اور خوش نصیب کسی اور ہی کیفیت میں دی گریٹ بابا جی کے سامنے اگل آئی تھی۔
"مجھے بتاؤ... آخر معاملہ کیا ہے؟"
"کوئی معاملہ نہیں ہے۔" اس نے یکایک آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔
"اچھا! اب مجھ سے جھوٹ مت بولو۔" اسے اب یقین ذرا مشکل سے ہی آتا تھا "میں تو سمجھتی تھی' تم کیف سے ہی شادی کرو گی۔"
خوش نصیب نے ناراضی سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
"تم اور تمہاری سمجھ... میں کیوں کرنے لگی کیف سے شادی؟ ایسا کرو۔" ماتھے پر انگلی رکھ کر ذرا دیر کو سوچا۔ "تم کرلو۔"
"ہیں؟... سچ؟" فریحہ تو خوشی سے مرنے والی ہی ہو گئی۔ "دیکھو' بعد میں مکر تو نہیں جاؤ گی؟"
خوش نصیب کو اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔
"اتنا اچھا لگتا ہے تمہیں؟"
"وہ ہے ہی اچھا... کس کو برا لگ سکتا ہے؟" وہ شرارت سے ہنسی۔
"اچھا..." خوش نصیب نے پھر سوچا اور بولی۔ "اگر تم کہو تو میں اس سے تمہارے لیے بات کروں؟"
"ہرگز نہیں۔" فریحہ کے جواب نے اسے حیران کر دیا تھا۔ "کیف مجھے اچھا لگتا ہے لیکن میں نے اس سے شادی کے بارے میں کبھی نہیں سوچا... ویسے بھی۔" وہ جان بوجھ کر بولتے ہوئے رک گئی' خوش نصیب کا کیا پتا۔ ناک پر مکا ہی دے مارے۔
"ویسے بھی کیا؟" وہ متجسس ہوئی۔
"کیف کی آنکھوں میں تمہارا عکس ہے... وہ تمہارے علاوہ ساری زندگی کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" یکدم فریحہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
خوش نصیب نہ چونکی نہ حیران ہوئی۔ بس چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔
"بالفرض تمہارے علاوہ کیف کی زندگی میں کوئی لڑکی شامل ہوئی تو یہ اس لڑکی کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہو جائے گی۔ کیف تمہارے علاوہ کسی سے محبت نہیں کر سکے گا... ساری زندگی۔"

خوش نصیب یک دم ہنس دی۔
"لو... اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" فریحہ نے ناک چڑھائی۔
"مذاق کرنا کیف کی عادت ہے... اسے مجھ سے کوئی محبت وحبت نہیں ہے۔" اس نے جیسے بڑے راز سے پردہ

اٹھایا تھا۔

"اور اگر ایسا کچھ ہے۔" ڈرامائی توقف کے بعد بولی۔ "تو وہ اپنے ساتھ بہت ناانصافی کر رہا ہے۔ سمجھو' سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہے ہمارے خاندان والے اسے کبھی مجھ سے شادی نہیں کرنے دیں گے۔ میں اگر دنیا میں رہ جانے والی آخری لڑکی بھی ہوئی تب بھی تو کیف کو مجھ سے شادی کرنے سے روک دیا جائے گا۔ اتنا ہی ناپسند کرتے ہیں مجھے سب۔ سو خوش نصیب باسط کیف بن حسان کے لیے ایک سراب ہے۔ صحرا میں پانی کی طرح نظر آتا ہوا سراب... جس کی تمنا میں اس کے پیچھے ہلکان ہوا جا سکتا ہے لیکن اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔"

اسی وقت پورب سے آندھی کا تیز بگولہ اٹھا اور آن کی آن میں سارے آسمان پر پھیل گیا۔ زمین سے آسمان تک مٹی کی چادر تننے لگی۔ وہ دونوں موسم کے تیور دیکھ کر گھبرائیں نہیں لیکن گھر جانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

فریحہ کے ماتھے پر سوچ کی پرچھائیں نظر آتی تھی۔ وہ جیسے دکھی سی ہو گئی تھی۔

"تمہیں کیا ہوا۔" خوش نصیب نے اس کا لٹکا ہوا منہ دیکھ کر پوچھا۔

"تم پسندیدہ کیوں نہیں بن جاتیں خوش نصیب! میں کیا بتاؤں تم اور کیف ساتھ ساتھ کھڑے' کتنے اچھے' کتنے پیارے لگتے ہو۔"

وہ کتنی اچھی' کتنی پیاری سہیلی تھی۔ خوش نصیب کو اس کے خلوص پر پیار آیا لیکن بات پر ہنسی۔

"یہ ممکن نہیں ہے۔ میرے پیدا ہوتے ہی میرے ماتھے پر ناپسندیدگی کا ٹیگ لگا دیا گیا تھا... جب ایک چھوٹی سی بچی پر کسی کو رحم نہیں آیا تو اب کوئی کیوں مجھے پسند کرے گا۔ دوسری بات میں نے کبھی کوئی ایسی کوشش بھی نہیں کی کہ کسی کی پسندیدگی کی لسٹ میں میرا نام شامل ہو سکتا۔ مجھے ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ ایسی ہر کوشش ناکام ہی رہے گی۔" وہ لاپروائی سے بول رہی تھی۔

"تمہیں پتا ہے... میری عادت ہے میں کسی ایسے کام کو کرنے کی کوشش نہیں کرتی جس میں کامیابی کا مجھے یقین نہ ہو۔ اس لیے میں نے کبھی کیف کی باتوں پر دھیان ہی نہیں دیا۔"

"کیف پر دھیان کیسے دیتیں تم... سارا دھیان تو شامیر کی طرف لگا ہوا ہے۔" فریحہ کو جیسے برا بڑا لگ رہا تھا اس کا ذکر۔

"وہ تو اب آیا ہے... لیکن خیر تم نہیں سمجھو گی۔" اس نے ناک سے مکھی اڑائی اور تیز ہوا سے چہرے پر آتے بالوں کی لٹوں کو کانوں کے پیچھے اڑستی آگے بڑھی۔ فریحہ تیزی سے اس کے ساتھ چلنے لگی۔

"میرا دل کہتا ہے وہ تمہارے لیے اچھا نہیں ہے۔" وہ فکر مند ہو رہی تھی۔

"لیکن اس کی دولت میرے لیے اچھی ہے... اور مجھے وہی چاہیے۔" خوش نصیب نے گہری سانس بھر کر جیسے ہر راز سے پردہ اٹھانے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو... مجھے نہیں پتا یہ بات میں پیر بابا کے سامنے کیسے بول گئی۔ شاید مجھے ہپناٹائز کیا گیا ہو گا... میں نے سنا ہے۔ ہپناٹزم کے ذریعے کسی بھی انسان کے دل کا حال اس کی زبان سے جانا جا سکتا ہے... لیکن مجھے شاہ میر کی دولت میں دلچسپی ضرور ہے میں اس سے شادی بھی کرنا چاہتی ہوں کیونکہ ایک یہی راستہ ہے جو مجھے اس سارے ماحول سے باہر نکال سکتا ہے... میری محرومیوں کا ازالہ کر سکتا ہے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے میں ہر حد تک جانے کا ارادہ بھی کر چکی ہوں... لیکن محبت...؟ محبت نہیں ہے مجھے شامیر سے۔"

فریحہ چپ سی رہ گئی۔ یہ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔

اسی وقت آندھی نے زور پکڑ لیا اور درختوں اور بل بورڈز کو زور زور سے ہلانے لگی۔ راہ چلتے لوگ بھی جلدی

جلدی اپنی منزلوں کی طرف بڑھنے لگے۔

"جلدی چلو۔" خوش نصیب نے فریحہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا لیکن ہوا اتنی زور آور تھی کہ وہ دو قدم آگے بڑھتی تھیں تو چار قدم پیچھے آتی تھیں۔ لباس ہوا سے بے قابو ہو رہے تھے۔ الجھن سی الجھن تھی۔ دھول مٹی آنکھوں میں گھس رہی تھی۔

کالی اوڈی کے ٹائر عین اس کے عقب میں چرچرائے تو دونوں ہی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ شامیر انہیں اندر بیٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ خوش نصیب نے فریحہ کا ہاتھ کھینچا اور غڑاپ سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔

شامیر نے گیئر بدلا۔ بریک سے پاؤں ہٹا کر ایکسیلیٹر پر رکھا اور زن سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

لڑکیوں کو اپنی ناک، آنکھوں اور کپڑوں سے مٹی جھاڑنے میں کچھ وقت لگا۔

خوش نصیب نے مٹی سے چھٹکارا حاصل کر کے گاڑی کی طرف دھیان دیا۔ ہائے... اف، کس قدر نرم سیٹ تھی۔ اچھا تو اس گاڑی میں بیٹھ کر ایسا لگتا ہے... واہ!! یونہی دل ہی دل میں جھومتے ہوئے نظر بیک ویو مرر پر پڑی اور وہ سٹپٹا گئی۔

شامیر مسکراہٹ ہونٹوں کے کناروں میں دبائے دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ نظر ملنے پر نہ وہ سٹپٹایا نہ نظر پھیری۔ الٹا خوش نصیب نے ہی رخ بدل لیا۔ اور اس طرح دروازے سے لگ کر بیٹھ گئی جیسے شامیر کی نظروں کی دسترس سے دور نکل جانا چاہتی ہو۔

☆ ☆ ☆

ایک بوجھل، بیزار اور ڈپریشن سے بھرپور دن گزار کر وہ اس وقت کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ طالب ماموں، صاعقہ ممانی اس سے خفا نہیں تھے، اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ باقی بچی آئے کت تو اس کی اسے کوئی خاص پروا ہی نہیں تھی۔ ہاں... بار بار وہ خود کو یہی باور کروا رہا تھا۔

ماموں، مامی کے ساتھ بیٹھ کر اس نے ڈھیروں باتیں کیں۔ گزرے دنوں کو یاد کیا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ ماضی کو دہرایا جاتا اور اس ماضی میں وسامہ کا ذکر نہ ہوتا۔ پرانی باتیں، پرانی شرارتیں۔ ایک دوسرے کو ہنسانے کے لیے ان تینوں نے اپنی یادداشت میں محفوظ سارے لطیفے ایک دوسرے کو سنا ڈالے تھے۔

پھر صاعقہ ممانی کو کچھ خیال آیا تو ہڑبڑا کر اٹھیں۔ انہیں رات کے کھانے کی فکر ستانے لگی تھی۔ معاویہ نے کہا کہ انہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کھانا باہر سے لے آئے گا لیکن صاعقہ ممانی نے صاف منع کر دیا۔

"میں اور تمہارے ماموں تو باہر کا کھا لیں گے لیکن آئے کت نہیں کھائے گی۔"

"وہ نہیں کھائے گی تو اسے کہیں، اپنے لیے خود کچھ بنا لے... آپ اس کی ملازمہ نہیں ہیں کہ اس کے کھانے کے لیے فکر مند ہوتی پھریں۔" اس نے اپنے مخصوص اکھڑ انداز میں کہا تھا۔

"اس نے مجھے کھانا بنانے کے لیے نہیں کہا معاویہ! میں اپنی خوشی سے بناتی ہوں۔" وہ نرمی سے بولیں۔

"چلیں پھر آج میری خوشی کے لیے باہر کا کھا لیں۔" وہ بضد تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے... تم ہم تینوں کے لیے باہر سے لے آؤ... لیکن آئے کت کے لیے میں گھر میں ہی کچھ بنا لوں گی۔" اس کی ضد کے آگے ہار مانتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"پھر وہی بات۔" وہ ناراض ہی ہو گیا۔

"ایک تو تم خفا بہت ہوتے ہو۔" وہ ہنس کر بولیں جیسے معاویہ چھوٹا سا بچہ ہو۔ "وہ بھی اس حالت میں آئے کت

کے لیے باہر کی غذا اچھی نہیں ہے۔" انہوں نے ذرا جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"اس حالت میں؟ کس حالت میں؟" وہ ناسمجھی اور تسلسل سے بولا۔ اس پر ممانی اور ماموں دونوں ہی ہنس دیے۔

اس کے بعد ممانی کچن میں چلی گئیں۔ ماموں نے ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا۔ معاویہ ناسمجھی سے بیٹھا رہا اور اس بات پر غور کرتا رہا پھر سر جھٹک کر اٹھا اور مارکیٹ چلا گیا۔ کھانا لے کر آنے تک وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسی ایک بات پر غور کرتا رہا تھا۔ کھانا لے کر آیا تو ممانی کے ساتھ آئے کت بھی کچن میں تھی اور کچن ٹیبل پر بیٹھی بددلی سے کھانا کھا رہی تھی۔ ممانی اسے پیار سے مزید کھانا کھانے اور اپنا خیال رکھنے کی تلقین کر رہی تھیں۔

"وسامہ کو بھی بھلایا نہیں جا سکتا آئے کت! مجھے دیکھو 'ماں ہوں اس کی لیکن دل پر صبر کی سل رکھ لی ہے۔ اللہ نے تمہیں اس بچے کی صورت میں جینے کی آس دی ہے۔۔۔ آنے والا بچہ وسامہ نہیں ہو گا لیکن اس کا پرتو تو ہو گا بیٹا! ایسی مایوسی کی باتیں کر کے اللہ کو ناراض نہ کرو۔"

"اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔" معاویہ کو جیسے ہر بات سمجھ میں آنے لگی اور وہ دروازے کی اوٹ میں ہی رک گیا تھا۔ دروازے کی جالی سے اس نے دیکھا' آئے کت نے خود کو ایک کالی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ سر جھکائے آئے کت گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ اس کے سامنے کھانا رکھا تھا۔ صاعقہ ممانی ہاتھ بڑھا کر اس کا سر تھپتھپانے لگیں۔

معاویہ اندر آیا اور کھانے کا سامان اس نے شیلف پر رکھ دیا۔

"میں کھانا لے آیا ہوں ممانی!"

اس کی آواز پر وہ دونوں چونکیں۔ آئے کت نے تیزی سے آنکھیں صاف کیں اور اپنے کھانے کی پلیٹ اٹھا کر سرعت سے کچن سے نکل گئی۔ اس کا انداز صاف بتاتا تھا کہ وہ معاویہ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔

صاعقہ ممانی نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر شیلف کے پاس آگئیں۔

"یہ تو بہت سارا کھانا اٹھا لائے ہو تم۔ ہم تین افراد کتنا کھا سکتے ہیں۔"

معاویہ ابھی تک گردن موڑے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے ایک آن میں آئے کت غائب ہوئی تھی۔ اس نے ممانی کی بات پر ذرا چونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور ان کی بات سمجھنے میں اسے کچھ وقت لگا۔

"آں۔۔۔ جو کھانا بچ جائے وہ صبح کام والی ماسی کو دے دیجیے گا۔"

"ہاں۔۔۔ یہ ٹھیک ہے۔" وہ کھانا پلیٹوں میں نکالنے لگیں۔ تب ہی ان کی نظر میز پر پڑی جہاں پانی کا گلاس جوں کا توں رکھا تھا۔

"یہ پانی کا گلاس تو یہیں رہ گیا۔ میں آئے کت کو دے کر آتی ہوں۔" انہوں نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ معاویہ نے ان کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

"میں دے آتا ہوں۔"

"معاویہ!"

"جی؟" وہ دروازے کے قریب رک کر پلٹا۔

"بیٹا! کوئی تلخ بات مت کرنا۔" صاعقہ ممانی نے منت سے کہا۔ "آئے کت پریگننٹ ہے۔ اس حالت میں پہلے ہی بہت صدمے اٹھا چکی ہے۔ اب رحم کرو اس پر۔"

معاویہ کا دل ایک دم جیسے خالی ہو گیا۔

"جی۔" اس نے گہری سانس بھر کر کہا اور باہر نکل گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

فریحہ کے گھر کے سامنے جب کالی اوڈی رکی۔ تو خوش نصیب بھی فریحہ کے ساتھ ہی اتر گئی۔
شامیر نے کھڑکی سے جھانک کر ذرا سنجیدگی سے کہا۔
"میں فضل منزل جا رہا ہوں... اتفاق سے آپ کی اور میری منزل ایک ہی ہے... تشریف رکھیے۔" اس نے آٹومیٹک شیشے چڑھا دیے اور اسٹیئرنگ پر انگلیاں بجاتے ہوئے اس کا انتظار کرنے لگا۔
اب اتنی عقل تو خوش نصیب میں بھی تھی کہ عام بات اور طنز میں فرق سمجھ سکتی۔ ایک بار پھر شرمندہ ہو گئی۔
البتہ فریحہ نے خوب ہی ناک منہ چڑھائے۔
"توبہ کتنا نخرہ ہے اس میں۔" خود کلامی پھر خوش نصیب کو دیکھ کر بولی۔ "مجھے یہ ایک آنکھ بھی اچھا نہیں لگ رہا... تم کیف کے بارے میں ہی سوچو۔"
"اور تم سوچو میری شادی میں کس رنگ کا جوڑا پہنو گی۔" وہ اتنی پر اعتماد تھی کہ شاید آج تک زندگی میں کبھی ایسی نہ ہوئی ہو گی۔
فریحہ نے بڑے دکھی دل سے اسے دیکھا۔ "کوئی تو ایسا راستہ ضرور ہو گا کہ اس کا خیال تمہارے دل سے نکل جائے۔"
"صرف ایک۔" اس نے شہادت کی انگلی کھڑی کر کے کہا۔ "یا تو اس کی ساری دولت کسی دریا میں بہہ جائے یا کیف کے پاس اتنا روپیہ آ جائے کہ اس کے علاوہ مجھے کوئی دکھائی ہی نہ دے۔" ہنس کر کہا۔
فریحہ دل مسوس کر رہ گئی پھر چونکہ خوش نصیب اسے پیاری بھی بہت تھی سو دوپٹے کے پلو سے پیر بابا کی دی ہوئی پڑیاں اور تعویز کھولتے ہوئے بولی۔
"تعویذ اس کے کمرے کی چوکھٹ میں دبا دینا۔ اور چینی پندرہ دن تک اسے کھلائی ہو گی۔"
"تعویذ تو میں پھر بھی لے لوں... لیکن اس گندی چینی کو دور کرو مجھ سے۔" اسے گھن آ رہی تھی۔ "میں تو کہتی ہوں گٹر میں بہا دو۔"
"ہائے توبہ... تم تو سیدھی دوزخ میں جاؤ گی... کیسی فضول باتیں کرتی ہو۔" فریحہ چڑ گئی۔
"یہ گند بلا کھانا بھی تو خود کشی کرنے جیسا ہی ہے اور خود کشی کی تب بھی تو دوزخ میں ہی جانا پڑے گا... اس لیے بہتر ہے کہ تم ہی رکھو۔" اس نے تعویذ لے کر مٹھی میں دبایا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔
شامیر نے فوراً" ہی گاڑی چلا دی۔
خوش نصیب گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ ایسی اعلیٰ سواری اور پھر اے سی کی کولنگ سے بھرپور۔ آندھی کے زور سے گرتے پڑتے لوگ چیونٹیوں جیسے دکھائی دیتے تھے۔ بند شیشوں کے اس پار پورا شہر آندھی کی مٹی سے اٹا ہوا تھا اور میلا سا دکھائی دیتا تھا۔ عجیب فینٹسی تھی جو لگژری گاڑیوں میں بیٹھ کر ہی تخلیق ہو سکتی تھی۔ خوش نصیب کے لب خود بخود مسکرانے لگے۔ یعنی شامیر کے متعلق کیا ہوا اس کا فیصلہ کسی صورت بھی گھاٹے کا سودا ثابت نہیں ہو گا۔
وہ شامیر سے شادی کرے گی۔ شامیر اپنا سارا پیسہ اسے دے دے گا۔ وہ امی، ماہ نور اور نانی کو اپنے محلوں جیسے گھر میں لے جائے گی اور ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی... گئے زمانوں کی بات ہے، سنا ہے ایک شیخ چلی ہوا کرتا تھا۔

اس نے اپنے سرپرائزوں کی ٹوکری رکھ کر کچھ ایسے ہی مستقبل کی منصوبہ بندی کی تھی۔ وقت کو فکر لاحق ہوئی کہیں آنے والے دور میں خوش نصیب کو شیخ چلی نہ پکارا جانے لگے۔

وقت کے تفکر سے دور 'سوچ سوچ کر اس کی مسکراہٹ گہری ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ شامیر کے کھنکھارنے سے چونکی۔

"تم نے میری انسلٹ کی ہے۔" وہ بہت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

خوش نصیب نے تڑپ کر اسے دیکھا۔ "اچھا؟ یہ کب کی بات ہے؟" اس نے سوچا۔

"گھر میں تم مجھے اگنور کرتی ہو۔۔۔ دیٹس اوکے 'اٹس ناٹ اے بگ ڈیل (ٹھیک ہے۔ یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے) لیکن ابھی میں نے تمہاری اور تمہاری سہیلی کی مدد کی۔ کم سے کم تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا لیکن تم گاڑی سے اتر گئیں اور ایسے اجنبی بن کر کھڑی ہو گئیں جیسے مجھے جانتی ہی نہیں۔۔۔ کیا تم نے مجھے کوئی ٹیکسی ڈرائیور سمجھ لیا ہے جو ہر کسی کو اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دیتا رہتا ہے۔۔۔" اس کا لہجہ تیز اور تلخ تھا۔

خوش نصیب پہلے تو کچھ بول ہی نہ سکی۔ پھر اس نے تھوک نگل کر اپنا سوکھتا ہوا حلق تر کیا۔ کھنکھار کر اپنی آواز بحال کی 'بالکل ایسے جیسے مائیک پر بولنے سے پہلے ون 'ٹو 'تھری کے بعد "ہیلو 'ہیلو ٹیسٹنگ" بولا جاتا ہے اور پھر بولی۔

"آ۔۔۔ مجھے نہیں لگتا 'میرا ایسا کوئی ارادہ تھا۔"

"تو تم نے غیر ارادی طور پر ایسا کیا ہو گا۔۔۔ یہ تو اور بھی بری بات ہے۔" اس کا موڈ بحال نہیں ہو رہا تھا۔

"سائیکالوجی کہتی ہے ہم غیر ارادتاً" بھی وہی کام کرتے ہیں جن کا خیال ہمارے لاشعور میں ہوتا ہے۔۔۔ اس کا مطلب تم نے کبھی نہ کبھی میرے ساتھ مس بی ہیو کرنے کا ارادہ تو کیا ہو گا۔" وہ جیسے قائل ہونے کو تیار ہی نہیں تھا۔

"ایک بات بتاؤ۔۔۔ کیا تم واقعی آسٹریلیا سے آئے ہو؟" خوش نصیب نے الجھ کر پوچھا۔

"ہاں۔" وہ اس سے زیادہ الجھ گیا۔ "لیکن میں اور بھی ممالک میں رہا ہوں۔۔۔ پورا بچپن امریکا میں گزرا ہے۔۔۔ میں تمہیں اپنا پاسپورٹ بھی دکھا سکتا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔

اور خوش نصیب کے دل میں پھلجھڑیاں چھوٹنا شروع ہو گئیں۔ اپنا مستقبل روشن بنانے کے لیے اس نے غلط بندے کا انتخاب نہیں کیا تھا۔ سیٹ پر ذرا سا ترچھا ہو کر خوش نصیب نے خود کو چپکے سے لیکن پرجوش طریقے سے شاباش دی اور بولی۔

"پاسپورٹ دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ پورا بچپن امریکا میں گزار کر بھی تم اتنی مشکل اردو کیسے بول لیتے ہو۔۔۔ میں اگر ایسے لفظ بولوں تو دو دن تک میری زبان دکھتی رہے گی۔" اس نے اتنی بے چارگی سے کہا کہ پہلے شامیر نے اسے تعجب سے دیکھا اور اگلے ہی پل قہقہہ لگایا۔ ہنستے ہوئے وہ جیسے دل ہی دل میں خوش نصیب کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔

خوش نصیب نے انتظار کیا کہ وہ جی بھر کر ہنس لے تو اگلی بات کی جائے۔ لیکن شامیر کی ہنسی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ دراصل اسے ان تمام لطیفوں پر ہنسی آنے لگی تھی جو وہ فضل منزل آنے کے بعد سے لے کر اب تک سن چکا تھا اور بہت سوں کا عملی مظاہرہ بھی اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔

وہ ہنسا تو ہنستا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ پہلے خوش نصیب کے ہونٹوں پر دبی دبی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جو ہنسی میں بدلی اور جسے چھپانے کے لیے اس نے رخ بھی موڑا لیکن پھر ان دونوں کی ہنسی ایسی پھلجھڑیوں میں بدل گئی جو ایک بار شعلہ پکڑ لیں تو جلدی بجھنے کا نام نہیں لیتیں۔

جب وہ دونوں دیر تک ایک بے تکی سی بات پر جی بھر کر ہنس چکے تو شامیر نے اپنا تنفس بحال کرتے ہوئے گیئر پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

"میں کچھ عرصہ چائنا کے شہر شنگھائی میں بھی رہا ہوں اور وہاں کے مقامی لوگ کہتے ہیں کہ جب دو افراد کسی ایک بات پر ہنستے ہیں تو الگ ہونے سے پہلے انہیں دوستی کا اعتراف کر لینا چاہیے کیونکہ مستقبل قریب میں ان کے درمیان دوستی کی بنیاد رکھی جا رہی ہوتی ہے۔" اس کی مسکراہٹ پر کشش اور دل موہ لینے والی تھی۔ حصار کھینچ کر بے بس کر دینے والی۔

خوش نصیب مسکرائی اور اثبات میں سر ہلایا۔

"مجھے تو کوئی اعتراض نہیں لیکن شاید صیام اور فضیلہ چچی کو اچھا نہ لگے۔" اس نے اپنی طرف سے ہوشیاری دکھائی۔

"کیا اچھا نہ لگے؟"

"تمہارا مجھ سے دوستی کرنا۔" وہ دوبارہ مسکرائی۔ "آفٹر آل۔۔۔ تم ان کے مہمان ہو۔"

"میں ان کا مہمان ضرور ہوں لیکن ان کی پسند ناپسند کو فالو کرنے کا پابند نہیں۔" اس نے دوٹوک کہا اور گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ویسے ایک بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔۔۔ یہ سب لوگ تمہارے اتنے خلاف کیوں ہیں؟"

خوش نصیب کو جھٹکا لگا۔ "کیا کسی نے تم سے کچھ کہا ہے؟"

وہ ہنس دیا۔ "ہرگز نہیں۔۔۔ لیکن میں بچہ نہیں ہوں کہ رویوں کو محسوس نہ کر سکوں۔"

خوش نصیب اپنے آپ میں چور سی بن گئی اور دبک کر بیٹھ گئی۔

"بتاؤ گی نہیں؟" وہ جان بوجھ کر اس سفر کو طویل بنا رہا تھا۔

"لمبی کہانی ہے۔" وہ گہری سانس بھر کر بولی۔

"کیوں نہ یہ لمبی کہانی کسی آئس کریم پارلر میں بیٹھ کر آئس کریم کھاتے ہوئے سنی جائے۔"

اس نے آنکھیں چمکا کر ایسے کہا جیسے چھوٹے سے بچے کو لالچ دیا جاتا ہے۔ اور اس سے پہلے کہ خوش نصیب کوئی جواب دیتی اس نے گاڑی کا رخ موڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

معاویہ اسے سارے گھر میں ڈھونڈتا ہوا باہر نکلا۔ آئے کٹ لان سے منسلک برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی اور سر اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اب رو نہیں رہی تھی لیکن آنکھیں بوجھل دکھائی دیتی تھیں۔ چھوٹی سی ستواں ناک کچھ سردی اور کچھ رونے سے لال ہو رہی تھی۔ براؤن بال جنہیں دیکھ کر ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے مٹھی بھر سونا اس کے سر پر پھینک دیا ہو اس وقت ڈھیلے سے جوڑے کی صورت میں پشت پر پڑے تھے۔ کچھ بال چہرے پر پھیل گئے تھے۔ وہ ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسے کہ لان میں لگے ہوئے لیمپ پوسٹ کی روشنی اس کی پشت پر بکھر رہی تھی اور دور سے دیکھنے پر بالوں کا سنہرا پن اور بھی نمایاں ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ننھے منے کئی جگنو اس کے بالوں پر آنکھ مچولی کھیلنے آگئے ہیں۔

یہی سنہرا پن اس کی بے حد سفید رنگت میں بھی تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور بالوں کی رنگت سے میل کھاتی تھیں۔ پلکیں اتنی گھنی اور سیاہ تھیں کہ ایسا لگتا تھا جیسے قدرت نے آنکھوں کی حفاظت کے لیے باڑھ لگا دی ہے۔ بھنویں کمان کی طرح تنی ہوئی تھیں اور پیشانی چھوٹی لیکن روشن تھی۔

معاویہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا چلا گیا اور اس لمحے رات کے اس پہر میں اس نے اعتراف کیا کہ وسامہ اگر اسے دیکھ کر دیوانہ ہوا تھا تو یہ کوئی ایسی ان ہونی بات بھی نہیں تھی۔ وہ اتنی خوب صورت اور دلکش تھی کہ اس کے لیے کوئی بھی دیوانہ ہو سکتا تھا۔

آئے کت کو کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ معاویہ کو پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑے دیکھ کر اسے عجیب سا لگا۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کے لیے پانی لایا تھا اس لیے کیونکہ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنے گرد لپٹی چادر سمیٹی۔ اور قریب رکھی پلیٹ اٹھا کر جانے لگی۔

معاویہ نے اب غور کیا کھانا پلیٹ میں جوں کا توں رکھا تھا۔ باہر آکر بھی اس نے یقیناً ایک بھی لقمہ نہیں کھایا تھا۔

"کیا ہم تھوڑی دیر یہیں بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں؟" گلا کھنکھار کر صاف کرتے ہوئے معاویہ نے قدرے جھجک کر پوچھا۔

آئے کت نے ذرا حیرانی سے اسے دیکھا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دوبارہ بیٹھ گئی۔

معاویہ اس سے کچھ فاصلہ پر ایک دوسری سیڑھی پر بیٹھ گیا۔ خاموشی ان دونوں کے درمیان کچھ دیر حائل رہی پھر معاویہ نے پانی کا گلاس آئے کت کے قریب رکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"کانگریچولیشنز... وسامہ ہوتا تو بہت خوش ہوتا۔" اس نے ذرا۔ جھجکتے ہوئے کہا حالانکہ جس سوسائٹی اور معاشرت میں وہ پلا بڑھا تھا وہاں ایسی باتوں کھلے عام کی جاتی ہیں۔

"تھینک یو..." آئے کت نے ذرا دیر بعد آہستہ سے کہا۔ "یقیناً وہ بہت خوش ہوتا... اسے اولاد کی بہت خواہش تھی۔" دکھ ہوا کے جھونکے کی طرح ان دونوں کے درمیان آکر ٹھہر گیا تھا۔

"ممانی صحیح کہتی ہیں... تمہیں اپنا خیال رکھنا چاہیے۔" معاویہ نے اس کی پلیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں کوشش کر رہی ہوں۔" اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو گئی تھی۔

"لیکن میرا دل نہیں چاہتا معاویہ! مجھے بھوک نہیں لگتی۔ پیاس نہیں لگتی۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ وسامہ مجھے چھوڑ کر جا چکا ہے... مجھے ایسا لگتا ہے کسی روز میں سو کر اٹھوں گی تو وہ میرے سامنے کھڑا ہو گا۔ مسکراتا ہوا... اور کہے گا... دیکھو آئے کت! میں نے تمہیں بیوقوف بنا دیا کاش! اے کاش! وہ مجھے بیوقوف ہی بنا رہا ہو۔ کاش! کسی روز وہ مجھے آکر نیند سے جگا دے... کاش! کاش!"

وہ گھٹ گھٹ کر رونے لگی۔ آنسوؤں کے ساتھ سسکیوں اور آہوں کے ساتھ۔

معاویہ کے سینے میں سسکیاں اودھم مچانے لگیں۔ آنسو آنکھوں کے کنارے آن لگے تھے لیکن اس نے ضبط کیا۔ وہ دل سے تسلیم کر چکا تھا کہ آئے کت کا دکھ بہر حال اس کے دکھ سے بڑا اور ناقابل برداشت ہے۔ لیکن پھر ضبط کے باوجود اس کے آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آئے کت بلک بلک کر رو رہی تھی اور وہ گھٹ گھٹ کر۔

آسمان ستاروں سے بجے تھال کی طرح خاموشی سے ان پر جھکا ہوا تھا اور وقت رک کر انہیں اداسی سے تکتا تھا۔ بلاشبہ ان دونوں نے ایک ایسی عزیز ہستی کو کھو دیا تھا جس سے ان دونوں کو ہی بے انتہا محبت تھی ایسی محبت جس کا کوئی نعم البدل ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک دوسرے کو اول دن سے ناپسند کرنے کے باوجود ان کے دل گداز ہو چکے تھے۔ مشترکہ دکھ نے انہیں ایک دوسرے کے لیے قابل برداشت بنا دیا تھا۔

دیر تک دونوں روتے رہے پھر انہوں نے آنسو پونچھ لیے۔ اور دل ہی دل میں خود کو صبر کی تلقین کرتے آنے

والی زندگی کے متعلق سوچنے لگے۔

"مجھے معاف کردو.... غصے میں میں کافی کچھ الٹا سیدھا بول گیا تھا۔" معاویہ نے شرمندگی سے کہا۔

"تمہیں پتا ہے' جب ہم دکھی ہوتے ہیں تو بہت کچھ بول دیتے ہیں.... دل' دماغ اور زبان انسان کے قابو میں نہیں رہتی.... مجھے نہیں پتا اس بارے میں سائیکالوجی کیا کہتی ہے.... لیکن ایسا ہوتا ہے.... ہمیشہ ہوتا ہے۔" وہ اناڑی پن سے بول رہا تھا۔

اس کی بات پر آئے کت بے ساختہ ہنس دی۔ معاویہ نے دیکھا' سنہری رنگت میں سفید دانتوں کی قطار اتنی ہی خوب صورت دکھائی دی جتنا کہ چاند کے گرد ہالہ دکھائی دیتا ہے۔

"میں جانتی ہوں.... میں نے بھی غصے میں کافی کچھ بول دیا تھا.... سوری۔" وہ واقعی شرمندہ نظر آرہی تھی۔

"تم نے بھی سوری بول دیا میں نے بھی۔ کیا میں یہ سمجھوں ہماری درمیان دشمنی ختم ہوئی۔" معاویہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"اسے دشمنی کہہ کر تم مجھے شرمندہ کررہے ہو.... وہ ہم دونوں کی جذباتیت تھی اور کچھ نہیں۔"

"وہ دشمنی ہی تھی آئے کت! اگر ماموں نہ روکتے تو شاید میں تمہیں قتل کرچکا ہوتا.... یا ایک' آدھ گھاؤ تو ضرور لگا دیا ہوتا۔" وہ جھجکتے ہوئے لیکن سچائی کے ساتھ بولا۔

آئے کت گہری سانس بھر کر بولی۔ "میں پھر بھی یہی کہوں گی ہم کبھی ایک دوسرے کے دشمن نہیں تھے۔"

"ہم دوست بھی نہیں تھے۔" اس نے ترنت کہا۔

"میں نے تم سے دوستی کرنے کی کوشش کی تھی.... تم نے بہت بری طرح دھتکارا تھا مجھے۔" آئے کت نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

ماضی کی ایک یاد چپکے سے ان دونوں کے درمیان آکر کھڑی ہوگئی اور آنکھیں پھاڑ کر ان دونوں کو دیکھنے لگی۔ یادوں کو اپنا دہرایا جانا پسند ہے۔ گزرے لمحوں کو یاد کرکے معاویہ چپ سا رہ گیا پھر اس نے سر جھٹک کر کہا۔

"اس بات کو' اس وقت کو بھول جاتے ہیں۔ آؤ ہم اپنی کہانی کو ایک نئے سرے سے شروع کرتے ہیں۔" اس نے سادگی سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے آگے پھیلا دیا۔ "ویسے بھی وسامہ کہتا تھا کوئی کہانی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ جہاں کوئی کہانی ختم ہوتی ہے وہیں سے کوئی دوسری کہانی شروع ہورہی ہوتی ہے.... بس یہ ہے کہ ہمیں اس آغاز کا پتا تھوڑی دیر سے چلتا ہے۔"

اس کے منہ سے وسامہ کا ذکر سن کر آئے کت کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا اور اس کے ہاتھ پر اپنا ننھا سا خوب صورت ہاتھ رکھ دیا۔ اور مسکراتے مسکراتے رو دی۔

"میں وسامہ کو مارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی.... اگر قدرت مجھے موقع دیتی تو میں اپنی زندگی اسے دے دیتی لیکن اس کی سانسوں کا تسلسل ٹوٹنے نہ دیتی۔" وہ بڑے دکھی انداز میں اور روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

معاویہ پھر افسردہ ہوگیا۔ اس کے دل پر بھاری سل آرکی تھی۔

"ہم سب یہی کرتے آئے کت! لیکن قدرت موقع نہیں دیتی' کبھی نہیں دیتی۔" معاویہ نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"وہ آسیب...." آئے کت نے کہنا چاہا۔ مگر معاویہ نے بات کاٹ دی۔

"اس آسیب کی حقیقت بس اتنی ہے کہ ہم نے بچپن میں اس کی کئی کہانیاں سنی تھیں.... جھوٹ اور سچ پر مبنی.... من گھڑت' مجھے نہیں لگتا فلک بوس آسیب زدہ ہے۔"

"لیکن وسامہ کو اس آسیب پر یقین تھا۔" وہ افسردہ ہوگئی۔

"ہم دوبارہ اس بارے میں بات نہیں کریں گے۔" وہ ہر حال میں اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔
"ہاں۔۔۔ ہم نہیں کریں گے۔"
تب ہی ایک جگنو کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور اس کی آنکھوں کے عین سامنے جھومنے لگا۔ معاویہ کے دل میں جانے کیا سمائی۔ اس نے سرعت سے ہاتھ لہرایا اور جگنو کو مٹھی میں قید کرلیا اور ایک آنکھ ہتھیلی کی درز سے لگا کر اندر دیکھنے لگا۔ پھر مسکرا کر بند مٹھیاں آئے کت کے سامنے کردیں۔ اشارے سے وہ اسے بھی اندر جھانکنے کا کہہ رہا تھا۔ آئے کت کو یہ بچکانہ کھیل دلچسپ لگا۔ معاویہ کے اکسانے پر اس نے بھی ایک آنکھ بند کرکے دوسری کھلی آنکھ سے معاویہ کی بند مٹھیوں کی درز سے اندر جھانکا۔
تاریک کوٹھڑی میں جیسے امید کی لو جگمگا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس روز جب خوش نصیب فضل منزل واپس آئی تو اس کی مٹھی میں بیری پیر کے ملنگ بابا کا دیا ہوا تعویذ دبا تھا اور مستقبل کے خوش نما خواب آنچل سے بندھے تھے۔ شامیر کے آنے کا سن کر اس کے ذہن نے کوئی پلاننگ نہیں کی تھی لیکن جب فضیلہ چچی اور دیگر اہل خانہ کو محتاط ہوتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اسے شامیر سے دور رکھنے کی حتی المقدور کوشش کی جارہی ہے تو اس کے اندر کی جذباتی خوش نصیب جو کافی دنوں سے اونگھ رہی تھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سوچا۔ وہ جی جان سے شامیر کو اپنی طرف متوجہ کرے گی اور اس سے شادی کرکے سارے خاندان کو سر پیٹنے پر مجبور کردے گی۔ جب ساری زندگی وہ سب مل کر بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے تو اب وہ کیوں ان کا فائدہ ہوجانے دے۔ وہ انہیں نقصان ہی پہنچائے گی اور اس طرح اسے دو فائدے حاصل ہونے والے تھے۔
نمبر ایک اسے امیر لڑکے سے شادی کرکے اس کی دولت مل جاتی۔
نمبر دو اب تک اپنے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا حساب بھی صاف ہوجاتا۔
بدلہ لینے کے لیے پیچھے سے حملہ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ ذہین اور بہادر انسان وہ ہوتا ہے۔ جو مدمقابل آکر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ صرف حملہ کرتا ہے بلکہ ایک ہی وار میں اگلے پچھلے حساب بھی بے باق کردیتا ہے۔ خوش نصیب بھی کچھ ایسا ہی ارادہ کیے بیٹھی تھی۔ وہ جانتی تھی جب حیا کے بجائے شامیر اس کا نام لے گا تو پورے خاندان میں ایک قیامت ہی آجائے گی۔ اسے وہی قیامت درکار تھی۔ اس میں بڑی بات بھی کون سی تھی۔ چھوٹی قیامتیں تو آتی ہی رہتی ہیں تو چلو اب کی بار بڑی ہی سہی۔
لیکن ابھی وہ کوئی رسک نہیں لے سکتی تھی سو احتیاطاً "فضل منزل سے کچھ دور ہی گاڑی سے اتر گئی تھی۔
چونکہ اپنے حالات زندگی شامیر کے گوش گزار کرچکی تھی سو اسے بھی تاکید کردی تھی کہ گھر جاکر کسی کو نہ بتائے۔
شامیر کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ خوش نصیب کے ارادوں سے بے خبر اس نے خوش نصیب کو دوست بنایا تھا اور وہ دوستوں کے لیے ہر طرح کی مدد کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہنے والوں میں سے تھا۔
خوش نصیب محتاط ہوکر فضل منزل میں داخل ہوئی۔ فضیلہ چچی اور صباحت تائی جان وہیں صحن میں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اسے آتے دیکھا لیکن کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ خوش نصیب پہلے نارمل انداز میں چلی پھر بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔
"تم دیکھ لینا صباحت بھابھی! جتنی روشنی نے اسے ڈھیل دے رکھی ہے نا' یہ خوش نصیب کوئی نہ کوئی چاند ضرور چڑھائے گی۔" پیچھے فضیلہ چچی نے تنفر کے ساتھ کہا تھا۔

صباحت بیگم کو فوراً" سے بھی پیشتر اپنا کیف یاد آ گیا۔
"اللہ کرے کوئی نہ کوئی چاند چڑھا ہی دے۔۔۔ میرے کیف کی تو جان چھوٹے گی۔" انہوں نے دل مسوس کر سوچا تھا۔
خوش نصیب نے چاند تو پتا نہیں چڑھانا تھا یا نہیں۔ لیکن سیڑھیاں ضرور بھاگتی ہوئی چڑھ گئی۔
کمرے میں پہنچی تو پسینے پسینے ہو رہی تھی اور دل بے ہنگم ہو کر دھڑک رہا تھا۔ مٹھی میں بند تعویذ گیلا ہو چکا تھا۔
"سلام نانی!" اس نے بھاگتے دوڑتے نانی کو سلام کیا اور گیلری میں آ گئی۔ گیلری میں بالکونی کی طرز کی کھڑکی سے روشنی پوری کی پوری اندر آ رہی تھی اور چارپائیوں پر سندھی ایپلک والی چادروں پر پھیل گئی تھی۔ یہ ماہ نور کے سگھڑ ہاتھوں کا کمال تھا اور خوش نصیب کو یقین تھا اس کی بہن کسی اچھے (مطلب امیر اور قدر دان) خاندان میں پیدا ہوئی ہوتی تو اب تک فیشن انڈسٹری میں اپنا نام ضرور منوا چکی ہوتی۔ اندرون شہر کے ان گلی محلوں میں ایسے ٹیلنٹ کی بس اتنی ہی قدر تھی کہ کپڑا اور دھاگے فراہم کر کے اپنا مطلوبہ ڈیزائن بنوا لیا جاتا تھا۔ لیکن خیر یہ ایک الگ قصہ ہے۔
تو خوش نصیب افتاں و خیزاں نانی کو سلام جھاڑ کر آئی اور گیلری میں آ کر اپنی سانس بحال کی ساتھ ہی مٹھی سامنے کر کے کھولی تو ہتھیلی پر ننھا سا تعویذ رکھا تھا۔ سلور پتری میں لپٹا ہوا کہ کھول کر دیکھا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اندر کیا لکھا ہے۔
"جب اللہ میری مدد کر رہا ہے۔۔۔ تو میں غیر اللہ کی مدد لینے کیوں جاؤں۔ اچھا بابا جی! آئندہ کے لیے رب راکھا۔۔۔ فریحہ ناراض ہوتی ہے تو ہوتی رہے۔" ہتھیلی پر رکھے تعویذ کو دیکھتی وہ دل ہی دل میں بول رہی تھی کہ اچانک اسے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ایسے جیسے کوئی چپکے سے اس کے عقب سے آگے جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔
خوش نصیب نے مٹھی بند کی اور تڑپ کر پلٹی۔
صیام جو اس کے کندھے سے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش میں تھی بدک کر چار قدم پیچھے ہٹ گئی۔
"تم یہاں کیا کر رہی ہو۔" خوش نصیب نے غصے سے پوچھا۔
"پہلے تم بتاؤ۔۔۔ تم کہاں سے آ رہی ہو؟" وہ بھی سوا سیر تھی۔ رعب سے پوچھا۔
خوش نصیب ایک پل کے لیے سٹپٹا گئی لیکن بس ایک ہی پل کے لیے۔ پھر تعویذ والی مٹھی اور مضبوطی سے بند کی اور گردن اکڑا کر بولی۔
"تم سے مطلب؟ اور تم کون ہوتی ہو مجھ سے ایسے سوال کرنے والی؟"
صیام نے ایک انداز سے بازو سینے پر باندھے اور جانچتی نظروں سے اسے دیکھ کر بولی۔
"مجھے ایسا کیوں۔ لگ رہا ہے خوش نصیب! تم کچھ چھپا رہی ہو۔"
خوش نصیب نے رخ بدل لیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"
"ذرا اپنا ہاتھ تو دکھاؤ۔"
خوش نصیب کو غصہ آنے لگا۔ وہ پلٹی اور طمانچہ مارنے والے انداز میں داہنا ہاتھ لہرا کر بولی۔
"یہ دیکھو۔۔۔ اگر چاہو تو تمہیں اپنے پیر بھی دکھا سکتی ہوں۔ وہ بھی جوتے سمیت۔"
صیام کو غصہ آیا اور فوراً" ہی سوا نیزے پر پہنچ گیا۔ وہ سرعت سے آگے بڑھی اور زبردستی خوش نصیب کا بایاں ہاتھ اپنے سامنے کرنے کی کوشش کرنے لگی۔
"دکھاؤ مجھے کیا ہے اس ہاتھ میں۔"
"فکر مت کرو۔ کم سے کم تمہاری گردن نہیں ہے۔" اس نے پورا زور لگا کر اپنا بازو اس کے لمبے ناخنوں والے

شکنجے سے چھڑانے کی تگ و دو کی۔ لیکن آج صیام کسی اور ہی موڈ میں تھی۔ پیچھے ہٹنا اسے منظور نہیں تھا۔

"نہیں کہتی ہوں دکھاؤ مجھے۔"

"اور میں کہتی ہوں دفع ہو جاؤ یہاں سے..... چھوڑو میرا ہاتھ۔"

ایسی کھینچا تانی ہوئی کہ مٹھی میں دبا کوہ نور خوش نصیب کے ہاتھ سے چھوٹا اور اڑتا ہوا بالکونی کے چھجے میں پڑے کاٹھ کباڑ میں غائب ہو گیا۔ دونوں دم بخود۔ "ہاہ" کی صورت ایک بے یقین سانس خوش نصیب کے لبوں سے نکلی اور گیلری کی حبس زدہ فضا میں مدغم ہو گئی۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے صیام کو گھورا جو اس وقت موقع واردات سے بھاگنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ لیکن خوش نصیب اس پر پل پڑی۔ بال کھینچے۔ دو چار گھونسے بے دریغ اس کے پیٹ اور کمر پر جڑ دیے۔

صیام کی چیخوں نے ساری فضل منزل سر پر اٹھالی۔

کمرے میں کہیں فہمینہ، منہا اور ماہ نور بھی موجود تھیں۔

ان دونوں کی آوازوں پر وہ تینوں ہی دوڑی چلی آئیں اور دنگ رہ گئیں۔ ساتھ ہی ان دونوں کو اس کھینچا تانی سے روکنے کے لیے آگے بڑھیں۔

"ارے ہٹو..... چھوڑو ایک دوسرے کو۔"

گیلری لڑکیوں کی آوازوں سے بھر گئی۔ منہا، صیام کو منع کر رہی تھی۔ فہمینہ اور ماہ نور، خوش نصیب کو قابو کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دراصل سب ہی خوش نصیب کے ٹیلنٹ سے واقف تھے۔ دو چار مکے وہ رسید کر چکی تھی۔ اب کچھ پتا نہیں کہ نرخرہ بھی دبا دیتی۔ بچپن میں مار کٹائی والے کاموں میں وہ ایسے کئی کارنامے انجام دے چکی تھی جن پر اب تک فخر کرتی ہوئی پائی جاتی تھی۔

بہرحال دونوں میں سے کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ صیام نے اس کے بال کھینچ کر جڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی۔ اس نے صیام کا چہرہ اپنے چھوٹے چھوٹے ناخنوں سے بھی ایسا کھسوٹا کہ کیا ہی کھسیانی بلی کھمبے کو نوچتی ہو گی۔

"ہائے..... میری اسکن..... تم سمجھتی کیا ہو خود کو..... میں دیکھ لوں گی تمہیں۔"

"ہاں ہاں دیکھ لینا..... بلکہ میں اپنی تصویر بھجوا دیتی ہوں، کمرے میں ہی لگا لینا پھر صبح شام دیکھنا۔" بال کھنچوا کر بھی اسے سکون نہیں آیا تھا۔

چند منٹ بعد یہ لڑائی اپنے اختتام کو پہنچی اور صیام اپنا کھرونچیں لگا چہرہ لے کر روتی ہوئی رخصت ہوئی۔ اور خوش نصیب نے بال کھنچوا کر بھی ایک آہ تک نہ کی اور یوں وہ فاتح مان لی گئی۔ منہا بہن کے پیچھے ہی دوڑ گئی۔ یہ الگ بات کہ پورا قصہ جانے بنا اس کی ہمدردیاں صیام کے کھاتے میں جانے والی نہیں تھیں۔

ماہ نور ابھی تک شاکڈ کھڑی تھی لیکن فہمینہ نے صیام اور منہا کے جانے کا انتظار بھی مشکل سے کیا اور جوں ہی وہ دونوں گیلری سے نکلیں وہ چارپائی پر گری اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "ایسی مزے دار لڑائی..... ہاہاہا ہاہاہا....."

"تمہیں ہنسی آ رہی ہے؟ یہ کوئی ہنسنے کی بات ہے۔" ماہ نور نے ناراضی اور صدمے سے فہمینہ کو دیکھا جس کے قہقہے قابو میں ہی نہیں آ رہے تھے۔

"تو کیا رونے کی بات ہے؟" اس نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کے بمشکل کہا۔ "مجھے تو فخر محسوس ہو رہا ہے خوش نصیب پر..... اچھی درگت بنائی اس صیام کی۔ ہر ایک کے معاملے میں بولتی ہے۔"

"دیکھا.....!" وہ جو صیام کی لگائی کھرونچوں کو ٹٹول رہی تھی اور اس جھگڑے سے خود بھی سخت بیزار ہوئی تھی، اس

نے جتا کر کہتے ہوئے ماہ نور کو دیکھا۔

"یہاں تو کسی کو میرے ٹیلنٹ کی قدر ہی نہیں ہے۔"

"تم نے اپنے ٹیلنٹ کا مظاہرہ کرلیا۔۔۔ اب دیکھنا اس مظاہرے پر کیسی قیامت کا رد عمل سامنے آتا ہے۔" وہ چڑ کر اور فکر مندی سے بولی۔

"میری بلا سے۔" اس نے ہاتھ جھاڑ کر کہا۔ "صیام کو تھوڑی سزا تو ملنی ہی چاہیے تھی۔۔۔ پتا نہیں تعویذ کہاں گرا ہو گا۔" بالکل دھیمی آواز میں بڑبڑاتی ہوئی وہ بالکونی کے چھجے پر خطرناک حد تک آگے جھک گئی اور نیچے کاٹھ کباڑ میں پڑے تعویز کی تلاش میں نظریں گھمانے لگی۔ لیکن اس جگہ سے تعویز بر آمد کر لینا ایسا ہی تھا جیسے کوئی بھوسے کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈ نکالے یا آٹے کی پرات میں غوطہ لگا کر نمک نکال لائے۔

"لیکن تم چھپا کیا رہی تھیں؟" ماہ نور نے پوچھا۔

"کچھ نہیں بھئی۔" وہ بیزار ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔

"میں کیف کو بتاؤں گی۔۔۔ دیکھنا اسے بھی تم پر ضرور فخر ہو گا۔" فہمینہ نے کہا تو خوش نصیب ہنس دی۔ ماہ نور البتہ ایسے ہی سنجیدہ اور پریشان سی شکل بنائے کھڑی رہی۔

☆ ☆ ☆
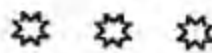
وسامہ کا بھلایا جانا آسان نہیں تھا لیکن اس رات کے بعد ان دونوں کی دوستی ہو گئی۔

معاویہ اپنی کہی ہوئی باتوں اور اپنی طرف سے لگائے گئے الزامات پر اس قدر شرمندہ تھا کہ اس شرمندگی سے نکلنے کا اسے ایک ہی راستہ سجھائی دیا اور وہ آئے کت کے ساتھ نرمی سے پیش آنے لگا۔ وہ دونوں اکثر شام کو واک کے لیے نکل جاتے اور تین چار گھنٹوں تک واپس آتے۔ دیر رات تک باہر بر آمدے یا ٹی وی لاؤنج میں کوئی موضوع چھڑ جاتا اور بڑی دیر تک صحت مند بحثیں ہوتی رہتیں۔ اس نشست میں طالب ماموں اور صاعقہ ممانی بھی ان دونوں کے ساتھ شامل رہتے۔

کبھی وہ دونوں مل کر وسامہ کو یاد کرنے لگتے اور یادیں آنکھوں میں آنسوؤں کی برسات چھوڑ کر رخصت ہو جاتیں۔ تب معاویہ موضوع بدل دیتا۔ اسے شدت سے وسامہ سے کیا ہوا وہ عہد یاد آنے لگا جو اس نے آئے کت کا خیال رکھنے کے حوالے سے معاویہ سے لیا تھا۔

آئے کت جانتی تھی کہ معاویہ 'وسامہ کو کتنا عزیز تھا اور معاویہ جانتا تھا کہ آئے کت' وسامہ کے لیے کیا تھی۔ غیر محسوس انداز میں وہ دونوں محض وسامہ کی خواہش پوری کرنے کے لیے ایک دوسرے کا خیال رکھتے رہے اور خیال رکھنے کے اس کھیل میں ان دونوں کی درمیان ایک بے نام سا تعلق پیدا ہونے لگا۔ جو بظاہر دوستی لگتا تھا لیکن دوستی سے کچھ بڑھ کر تھا۔

اردشیر ازی اسے کئی بار کال کر کے واپس جانے اور اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کا کہہ چکے تھے۔ معاویہ نے ان کی کالز زیادہ تر ریسیو نہیں کیں اور دو چار کالز جو اس نے اٹینڈ کیں ان کی ساری باتوں کو نظر انداز کر دیا۔

"یہ تمہاری ماں کے غریب رشتے دار آخر کب تمہارا پیچھا چھوڑیں گے۔" ایک دن انہوں نے فون پر غصے سے کہا۔ وہ خود اتنے دولت مند تھے کہ انہیں اپنے آگے ہر کوئی غریب ہی لگتا تھا۔ پہلی بیوی کے رشتہ داروں سے تو ویسے بھی پرانی ٹسل تھی ان کی۔

"میری ماں کے ان غریب رشتہ داروں نے مجھے اس وقت سہارا دیا تھا جب آپ مجھے چھوڑ کر دوسری شادی کر چکے تھے اور آپ کو یاد بھی نہیں تھا کہ آپ کا کوئی بیٹا بھی ہے۔" کچھ عرصے سے وہ منہ پھٹ ہوتا جا رہا تھا۔ اس

وقت بھی اس نے بڑی صاف گوئی سے ایک تلخ سچائی ان کے منہ پر کھینچ ماری تھی۔
وہ جسے ہم سچ کہتے ہیں بسا اوقات دوسرے کو ذلیل کرنے کی ہماری ننھی منی سی ایک کوشش ہوتی ہے۔ معاویہ نے بھی اس وقت سچ بول کر ایسی ہی ایک کوشش کی تھی۔ اس کی کوشش کامیاب رہی۔ اردشیر ازی بھڑک اٹھے تھے۔

"میں نوٹ کر رہا ہوں۔ کچھ عرصہ سے تم منہ پھٹ اور بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔"
"میں پہلے بھی ایسا ہی تھا۔" اس نے تحمل سے کہا۔
"میں اچھی طرح جانتا ہوں تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے۔ میں خود بات کروں گا طالب سے۔" اس نے فون ہی بند کر دیا۔ انہیں زچ کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہی آتا تھا اسے۔
پھر ان ہی دنوں جب معاویہ واپس جانے کا خیال جیسے بالکل فراموش کر چکا تھا تو ایک روز شام کو چہل قدمی کرتے ہوئے آئے کت نے اس سے ایک بات کرنے کی اجازت مانگی۔
اس روز موسم عجیب ہو رہا تھا۔ آسمان پر بکھرے بکھرے کالے' سفید اور بھورے سے بادل اڑتے پھر رہے تھے۔ ایک سفید بادل کا ٹکڑا ان دونوں کے سر پر آن ٹھہرا اور دھوپ کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔
"تمہیں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کہنا ہے بلا جھجک کہو۔" معاویہ نے سرسری انداز میں ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
"نہیں۔ پہلے تمہیں وعدہ کرنا ہو گا کہ تم ناراض نہیں ہو گے۔" وہ بہت زیادہ ڈر رہی تھی بات کرتے ہوئے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے اس نے آنکھوں پر ہتھیلی کا چھجا سا بنا لیا تھا۔ دھوپ کے ذرات اس کے بالوں کے سنہری پن کو نمایاں کر رہے تھے۔
"اچھا ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں ناراض نہیں ہوں گا۔"
"بات یہ ہے کہ۔" وہ بہت زیادہ جھجک کر بول رہی تھی اور ایسے بول رہی تھی جیسے دل ہی دل میں خود کو معاویہ کے ردعمل کے لیے تیار کر رہی ہو۔
"آئے کت! مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنی بات مکمل کرو۔"
"دراصل میرے دل میں کچھ شک ہے۔"
"کیسا شک؟" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
"وسامہ کی موت سے چند روز پہلے تمہارے فادر نے وسامہ کو فون کیا تھا۔" بالآخر اس نے کہہ دیا اور معاویہ واقعی حیران سا رہ گیا۔
"بابا نے؟ لیکن کیوں؟ مجھے یاد نہیں پڑتا انہوں نے پہلے کبھی وسامہ کو فون کیا ہو۔"
"یہی زیادہ حیرانی کی بات ہے۔" آئے کت نے کہا۔
"ان کی کال کے بعد وسامہ بہت پریشان رہنے لگا تھا۔" اس نے پھر کہا۔
"ایسی کیا بات ہوئی تھی ان دونوں کے درمیان؟" معاویہ حیرانی کی ریت میں دھنسنے لگا۔
"میں نہیں جانتی۔ میرے پوچھنے کے باوجود وسامہ نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ لیکن معاویہ! میرا دل کہتا ہے وسامہ کی موت سے تمہارے بابا کی کال کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے۔" جھجکتے ہوئے اس نے بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی تھی۔
معاویہ کی پیشانی پر ایسے بل پڑ گئے جیسے پہاڑی علاقوں میں تہہ در تہہ سڑکیں بچھی ہوتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"بیڑا غرق ہو جائے خوش نصیب کا۔ کچھ نہ رہے جنم جلی کا، کیڑے پڑیں منحوس کو۔ کیا حال کر دیا ہے میری بیٹی کے چہرے کا۔"

ہر بار صیام کے چہرے پر نظر پڑتے ساتھ ہی فضیلہ بیگم کی زبان ایسے ہی کوسنے دینے لگتی تھی۔

"صرف چہرہ ہی نہیں۔۔۔ یہ گردن پر بھی ناخن مارے ہیں اس نے۔" صیام نے ایک بار پھر رو نکھی ہو کر بتایا بلکہ ساتھ ہی آگے ہو کر ماں کو گردن بھی دکھائی جس پر زخم تو نہیں تھے لیکن خراشیں بہر حال نظر آ رہی تھیں۔

"تو صبر کر جا صیام! فکر ہی نہ کر کسی بات کی۔۔۔ جب تک ایسی خراشیں اب خوش نصیب کے نہیں لگیں گی مجھے بھی سکون نہیں آئے گا۔" فضیلہ بیگم نے دھمکی دیتی عورتوں کی طرح منہ پر ہاتھ پھیر کر اور دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

"ایسا بدلہ لوں گی کہ تینوں ماں بیٹیاں بیٹھ کر روتی رہ جائیں گی۔"

"بس کر دیں اب۔" منہا نے بالآخر چڑ کر کہا۔ وہ ان دونوں کے پاس بیٹھی تھی اور جیسے مجبوراً "یہ کوسنے اور تباہ و برباد کر دینے کے بلند و بانگ دعوے بھی سن رہی تھی۔

"غلطی تو صیام کی بھی ہے۔۔۔ جب خوش نصیب ہاتھ میں پکڑی چیز نہیں دکھانا چاہ رہی تھی تو اس نے کیوں زور زبردستی شروع کی۔۔۔"

"تم اپنا منہ بند ہی رکھو۔۔۔ جب دیکھو خوش نصیب کی طرف داری کر رہی ہوتی ہو۔" صیام پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

"میں طرف داری نہیں کر رہی صرف تمہیں تمہاری غلطی بتا رہی ہوں۔" وہ سیدھے سبھاؤ بولی۔ "دوسروں کے معاملات میں جا کر ٹانگ پھنساؤ گی تو یہ سب تو ہو گا۔۔۔ خوش نصیب نے صرف ناخن مارے ہیں اس کی جگہ میں ہوتی تو شاید تمہاری ٹانگ ہی توڑ دیتی۔"

"امی! سن رہی ہیں آپ اس کی باتیں۔" وہ رونے والی آواز بنا کر ماں کی طرف پلٹی۔

"سو دفعہ سمجھا چکی ہوں تم دونوں کو۔۔۔ آپس میں لڑ لڑ کر مر جاؤ گی۔۔۔ اور فائدہ دوسرے اٹھائیں گے۔" ان کی اپنی منطق تھی۔

"ہاں۔۔۔ ہمارا تو سلطان سلیمان کے خاندان سے تعلق ہے۔۔۔ آپس میں لڑ لڑ کر مر جائیں گے اور شاہی تخت کسی اور کو مل جائے گا۔" منہا نے میٹھے انداز میں طنز کیا تھا۔

"تو کبھی سیدھی بات نہ کرنا منہا!" ان کی منہا کی صاف گوئی سے زیادہ بنتی نہیں تھی۔

"اور آپ اپنی اس لاڈلی بیٹی کو کبھی کوئی سیدھا سبق نہ پڑھائیے گا۔ اسے سکھائیں کہ ان کے معاملات میں دخل نہ دیا کرے۔ روشن چچی والوں کی ٹوہ میں رہنا آپ نے ہی سکھایا ہے اسے۔" وہ تختی سے تجزیہ کر گئی۔

"اچھا زیادہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ فوراً" ہی برا مان گئیں۔

"چل اٹھ' میرے لیے چائے بنا کر لا اور صیام! تو میری بات سن۔"

منہا منہ بنا کر چلی گئی۔ جانتی تھی وہ دونوں اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دیں گی۔

"مجھے بتا کیا دیکھا تھا تو نے خوش نصیب کے ہاتھ میں۔" دونوں ماں بیٹیاں سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئیں اور اندازہ لگانے لگیں۔ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے جسے خوش نصیب اتنی شدت سے چھپا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اور یہ محض اتفاق ہی تھا کہ محض دو دن بعد اردشیر آفریدی خود معاویہ کو لینے آ گئے۔ پتا نہیں وہ اس کی مستقل مزاجی

سے خائف ہوئے تھے یا زبان درازی سے۔

"میں بشام جا رہا ہوں۔۔۔ سوچا تم سے ملتا ہوا چلا جاؤں۔" جوان بیٹے سے بات کرنے کے لیے انہیں اب جس تحمل کی ضرورت تھی وہ اسی کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ اس کا بدلا ہوا انداز تو فون پر ہی بھانپ چکے تھے۔

"آپ نے اچھا کیا۔۔۔ میں بھی آپ سے ملنے کا سوچ رہا تھا۔" سنجیدگی سے کہتا وہ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس وقت وہاں طالب ماموں اور صاعقہ ممانی بھی موجود تھیں۔

"واہ! یہ خوب بات ہوئی۔ ہم دونوں باپ بیٹے کو ایک ساتھ ایک ہی خیال آیا۔" انہوں نے خوش ہو کر اور ہنس کر کہا۔ ساتھ ہی اپنی بات کی تائید کے لیے سب کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ مجھے بتائیں گے۔۔۔" ان کی ہنسی اور خوش مزاجی کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے معاویہ نے روکھے انداز میں کہنا شروع کیا۔

"وسامہ سے آپ کی فون پر کیا بات ہوئی تھی؟"

معاویہ نے اس سوال پر ارد شیرازی کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ انہوں نے اپنی ٹائی کو غیر محسوس انداز میں ڈھیلا کیا تھا۔

"میری اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔"

"کیا اس کے انتقال سے چند روز پہلے آپ نے اسے کال نہیں کی تھی؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"مجھ سے اس انداز میں سوال مت کرو معاویہ! باپ ہوں میں تمہارا۔" یکدم وہ ناراضی سے بولے۔

"میرے انداز کو فی الحال چھوڑ دیں۔ صرف یہ بتائیں کس لیے کال کی تھی آپ نے؟"

"مجھے کام تھا اس سے۔" انہوں نے بات سمیٹی۔

"کیا کام؟" وہ جرح پر آمادہ تھا۔

"مجھے فلک بوس کے بارے میں بات کرنا تھی۔" وہ چڑ کر بولے۔

"کون سی بات؟"

وہ بری طرح جھنجلا گئے۔ "میں چاہتا تھا کہ وہ فلک بوس کو چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔"

"آپ نے وسامہ سے فلک بوس چھوڑنے کی بات کی؟" وہ جیسے شاکڈ ہو کر بولا تھا۔ "میرے منع کرنے کے باوجود؟"

"تمہارے منع کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے معاویہ! فلک بوس میری ملکیت ہے میں اسے بیچنا چاہتا تھا۔ اور وسامہ کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے کہا کہ وہ فلک بوس کو خالی کر دے۔" وہ سکون سے بولے۔

"فلک بوس آپ کی نہیں میری ملکیت ہے بابا! آپ بھول رہے ہیں، دادا نے بطور امانت آپ کو دیا تھا۔" وہ صدمے سے بولا۔

"اور فلک بوس وسامہ کو کتنا پسند تھا۔۔۔ وہ ہمیشہ وہاں رہنا چاہتا تھا۔"

"انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہو سکتی۔ مجھے افسوس ہے، وسامہ کی خواہش بھی ادھوری رہ گئی۔" ارد شیرازی نے کہا۔

"اس کی خواہش اس لیے ادھوری رہ گئی کیونکہ آپ نے اس کی خواہش کو پورا ہونے نہیں دیا۔" معاویہ نے ناراضی سے کہا۔

ارد شیرازی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اب یہ مت کہنا کہ وسامہ نے اسی غم میں خودکشی کرلی۔" ان کا انداز نداق اڑانے والا تھا۔
"اس کے عمل کو جسٹی فائی کرنے کی یہ بڑی بودی لوجک ہوگی۔" وہ ذرا غیر سنجیدگی سے بولے تھے۔
"آپ صحیح سمجھے۔ میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔" وہ بے حد سنجیدگی سے بولا۔
"اوہ کم آن معاویہ! تمہیں مان لینا چاہیے کہ وسامہ اتنا ہی بزدل تھا کہ اس نے ایک آسیب کے ڈر سے خودکشی کرلی۔"
"بار بار ایک ہی بات مت دہرائیں۔ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اس نے خودکشی نہیں کی۔ اسے قتل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے انکوائری ہونے دی ہوتی تو اب تک ہمیں قاتل کا سراغ بھی مل چکا ہوتا۔"
"چلو ٹھیک ہے۔ ہم وسامہ کی موت کو خودکشی نہیں مانتے۔ ایک اتفاق ہو سکتا ہے کہ وہ الماری میں جاکر بیٹھ گیا۔ لیکن اگر شک کی بنیاد پر ہی کسی کو نامزد کرنا ہے تو میں آئے کت پر شک کا اظہار کرتا ہوں۔" انہوں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔
"آخری وقت میں جو انسان وسامہ کے سب سے قریب رہا وہ آئے کت ہی ہے۔ اس لیے پہلا شک اسی پر جاتا ہے۔"
"وسامہ کی موت کا بہت افسوس ہے مجھے۔ میری کاروباری مصروفیات سے تو تم واقف ہو۔ فوری طور پر تعزیت کے لیے آنا ممکن نہیں تھا میرے لیے۔" وہ طالب ماموں سے بولے۔
"آپ نے جو کرنا تھا کردیا۔ اب جائیں یہاں سے۔ میرا بھائی ایک پریشانی لے کر دنیا سے چلا گیا۔ میں آپ کو ہرگز معاف نہیں کروں گا۔"
"اپنے بابا سے اس طرح بات مت کرو معاویہ!" طالب ماموں نے جھڑک کر کہا تھا لیکن اردشیر ازی کے ماتھے پر ان گنت بل پڑ گئے تھے۔ انہیں سبکی کا احساس ہو رہا تھا۔
"ابھی تم جذباتی ہو رہے ہو۔ جب اس جذباتیت کا بھوت اتر جائے تو مجھ سے بات کرنا۔"
"میں کبھی آپ سے بات نہیں کروں گا۔ ساری زندگی نہیں کروں گا۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔" اس نے چلا کر کہا۔
اردشیر ازی نے خفت سے سب کو دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ چند لمحے بعد ان کی گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تھی۔ معاویہ بڑے دن کے بعد ایک بار پھر رو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اردشیر ازی چلے گئے۔ معاویہ نے ان سے لاتعلقی اختیار کرلی۔ وہ اس بارے میں بات کرتا تھا نہ کسی کو کرنے دیتا تھا۔
"تم کم سے کم اپنی پڑھائی تو مکمل کرلو۔"
ایک روز طالب ماموں نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ معاویہ کے اپنے گھر میں رہنے سے بیزار نہیں تھے۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ وہ جب تک چاہتا وہاں رہ سکتا تھا لیکن وہ اپنی زندگی خراب کر رہا تھا۔ وسامہ کی موت کا صدمہ دل سے لگا کر اس نے اپنی ذاتی زندگی کو بالکل ہی فراموش کردیا تھا۔ وہ نہ اپنی پڑھائی کی فکر کر رہا تھا نہ کاروبار کی۔
باپ سے بھی وہ لاتعلقی اختیار کرچکا تھا۔ ممکن تھا وہ کسی دن اسے اپنی جائیداد سے عاق کرنے کا قانونی نوٹس ہی دے دیتے۔

وہ اپنے ساتھ کیا کر رہا تھا، اس بارے میں واضح طور پر کچھ بھی کہنا ممکن نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بس وقت گزار رہا ہے۔ بے مصرف، بے مطلب۔ نہ مستقبل کا کوئی لائحہ عمل ترتیب دیا تھا نہ مستقبل کا کوئی خواب اس کی آنکھوں میں باقی رہا تھا۔

صرف ایک چیز تھی جس کی اسے فکر تھی اور وہ چیز آئے کت تھی یا اس کا آنے والا بچہ۔

گو کہ اس نے اس بات کا اظہار کبھی زبان سے نہیں کیا تھا لیکن کچھ باتیں اور چیزیں صرف زبان سے کہنے سے نظر نہیں آتیں نہ محسوس کی جاسکتی ہیں۔

آئے کت اور معاویہ کی بڑھتی ہوئی دوستی پر سب سے پہلے صاعقہ ممانی چونکیں جب معاویہ نے ان سے آئے کت کا چیک اپ کروانے کی بات کی۔ وہ اس کے ماہانہ چیک اپ اور دوائیوں کے لیے فکر مند ہو رہا تھا اور چاہتا تھا کہ صاعقہ ممانی شہر کی بہترین گائنا کالوجسٹ کے پاس آئے کت کو لے کر جائیں۔

"میں خود بھی کسی اچھی ڈاکٹر کی تلاش میں ہوں۔۔۔ میں جلد ہی آئے کت کو چیک اپ کے لیے لے جاؤں گی۔" انہوں نے اپنے دل میں اٹھتے وسوسوں سے نظر چراتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے ممانی! وسامہ ہوتا تو یقیناً "یہ کام بہت پہلے کر چکا ہوتا۔" وہ انہیں ان کی کوتاہی نہیں جتا رہا تھا بس ایک خیال کا اظہار کر رہا تھا۔ دراصل وہ خود اس بات پر شرمندہ تھا کہ آئے کت کو ابھی تک ایک اچھا میڈیکل چیک اپ بھی فراہم نہیں کیا جاسکا۔

"معاویہ۔۔۔!" وہ جانے لگا تو ممانی نے بے ساختہ اسے پکارا۔

"جی!"

"تمہیں یاد ہے نا۔۔۔ آئے کت۔۔۔ وسامہ کی بیوہ ہے؟" کسی انجان خدشے سے ان کا لہجہ لرز رہا تھا۔

معاویہ چونک گیا۔ گڑبڑا گیا۔ شہہ رگ کے قریب سے ایک سنسنی کی لہر اٹھی اور خون کے ساتھ سارے جسم میں پھیل گئی۔ پھر اس نے آہستگی سے کہا۔

"وسامہ نے مجھ سے آئے کت کا خیال رکھنے کا وعدہ لیا تھا۔۔۔ مجھے صرف اتنا ہی یاد ہے۔۔۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا ممانی!" اس نے نظریں چرا کر کہا تھا اور تیزی سے کچن سے نکل گیا تھا گو یک تک وہ اپنے جواب سے مطمئن تھا۔
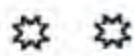
☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرزانہ کھرل

اسے سامنے پاکر ہارمونیم بجاتی میری انگلیاں تھم سی گئیں۔ میں اسے کہاں دیکھ رہی تھی میری نظریں تو اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے چلتی اس محبت پہ مرکوز تھیں جو پچھلے ایک سال سے اس کی ذات کا

احاطہ کیے ہوئے تھی۔ میرے سٹنگ روم میں ایک انوکھی سی خوشبو پھیلنے لگی۔

"ارے۔۔۔ یاس اپیا رک کیوں گئیں۔۔۔ بجائیں نا۔"

اصرار کرتے لہجے میں وہ مدھم سا مسکرائی اور اس کے نرم ہونٹوں پہ ہلکی سی چھب دکھلاتی مسکراہٹ نے میرا سارا چین و قرار غارت کردیا۔ میں یہ یکسر فراموش کر بیٹھی کہ کل دوپہر کو خانم نے اسے راہ راست پہ لانے کے لیے کیا کیا پٹیاں پڑھائی تھیں۔ میری مرجھائی۔۔۔ کملائی نگاہیں تو اس کے چہرے پہ اتری قوسِ قزح کے رنگ چننے میں لگی ہوئی تھیں۔ ایک رت بعد۔۔۔ ہری اودی۔۔۔ نیلی۔۔۔ پیلی ہو رہی تھیں۔۔۔ وہ ابھی نہا کر آئی تھی اور فلور کشن کو ایک ہاتھ سے پرے کھسکا کر میرے قریب ہی دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے گیلے بالوں کی تراشیدہ نوکوں سے پانی کی بوندیں۔۔۔ ٹپک کر بادامی کارپٹ پہ جو چھوٹا سا دائرہ بناتیں۔۔۔ اس دائرے میں لفظ محبت خودرو گھاس کی طرح اگ آتا جو اس غیر نمایاں ہالے کو روشن کرنے لگتا۔ میری آنکھوں کی پتلیاں ساکت ہو کر رہ گئیں۔

"اپیا۔۔۔ کچھ دیر قبل جو آپ گنگنا رہی تھیں، وہی سنائیے نا۔"

اس نے میری بے حرکت انگلیوں پہ اپنا محبت بھرا لمس رکھ کر انہیں اپنی خواہش منوانے پہ اکسایا۔۔۔ اور محبت جانتی ہے کہ اصرار کس سرگوشی کے بل پہ من چاہی مراد پالیتا ہے سو میری جامد پلکوں نے جنبش کی اور میری خنک انگلیاں متحرک ہوئیں۔ میرے سرد لبوں نے الفاظ کو طرز میں ڈھالا۔

پھولوں کی طرح ان ہونٹوں پہ اک شوخ تبسم بکھرے گا
ہم ذکر کریں گے غیروں کا اور اپنی کہانی کہہ دیں گے
شاید میں نے گنگناتے ہوئے پلکیں موندی تھیں۔

"یاس اپیا۔۔۔ آپ نے اسے کیوں چھوڑا؟" ثانی کا پُرحرارت ہاتھ میرے خنک ہاتھ پہ کسی بوجھ کی طرح گرا۔ پتا نہیں تکلیف اس کے سوال پہ ہوئی تھی۔ یا اس کے پھول جیسے ہاتھ کے وزن سے۔ کہ اپنی کھلتی ہوئی پلکوں کی کراہ۔ میں نے پورے ہوش و حواس سے سنی۔

"اسے میں نے نہیں۔۔۔ محبت نے چھوڑا تھا۔" کتنے ہی لمحوں کی خاموشی کے بعد میرے لبوں نے جیسے خود کلامی کی۔۔۔ اور میرے لہجے کی سچائی نے دہائیاں دیتے ہوئے مجھے چبھتی آنکھوں سے دیکھا۔

"کیا محبت بھی کسی کو چھوڑ سکتی ہے؟" ثانی کے بے قرار لہجے میں طوفان میں ہچکولے کھاتا سوال ابھرا۔۔۔ اور اس کی بے اعتبار سی نگاہیں میرے چہرے سے لپٹیں۔

"ہاں۔۔۔" میں نے ایک لفظی جواب پورے سکون سے دیا تو میرے اندر چھپی اس کی مٹیالی سی محبت نے جھرجھری سی لی۔۔۔ جیسے زمین جھرجھری لیتی ہے۔ ایسے ہی کسی سنگ دل اور بے درد زلزلے نے میرے پورے وجود کو پاش۔۔۔ پاش کیا۔۔۔ "میں اسے دوسری عورت کے ساتھ شیئر کر بھی لیتی مگر۔۔۔" میں نے ایک چکنا چور سی آہ بھری۔۔۔ "یہ کم بخت محبت نہیں مانتی ثانیہ۔۔۔" میں نے اپنے سامنے بیٹھی اس کامنی سی لڑکی کا سپید پڑتا چہرہ نرمی سے چھوا۔۔۔ اور اس پوری کی پوری کو نظروں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑ کے چلے جانے میں اور اٹھ کر چلے جانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ جاں سے گزر جانے کا ہوتا ہے اور دوسرا۔۔۔ جاں کنی کا عالم۔۔۔ روح کو بار بار جسم سے کھینچنے کی تکلیف کا صرف اندازہ نہیں ہوتا، تجربہ ہوتا ہے۔۔۔ اور اس کا شب کے اگلے پہر ہی میرے پہلو سے اٹھ کے جانا۔۔۔ محبت کا دم گھٹنے لگا تھا ثانی!" میرے لہجے میں نمی اور آواز پہ تھکن غالب آئی۔۔۔ میں نے ثانیہ کا متوحش چہرہ لحظہ بھر کو دیکھا۔

"میں نے اس کی اور اپنی زندگی میں فہمائش لا کر زندگی خوب صورت اور مکمل کردی تھی۔۔۔ پھر اسے پتا نہیں کیوں بیٹے کی خواہش ستانے لگی۔ ہمیں جن سے محبت ہوتی ہے اس کی دین پہ ہم راضی بہ رضا۔۔۔ پھر

اس کی محبت کا دعوا تو جھوٹا نکلا۔ فہمائش کے بعد چند پیچیدگیوں کی وجہ سے میں ماں نہیں بن سکتی تھی۔ اور اسے ہر حال میں بیٹا چاہیے تھا۔"

اس کے مقابل محبت اوڑھ کے بیٹھی گلابی سی لڑکی کی صبیح پیشانی پہ پسینے کے ننھے' منے قطرے نمودار ہونے لگے تو میں مبہم سا مسکرائی۔

"اس کی زندگی میں نئی آنے والی عورت کو عبید پورے کا پورا چاہیے تھا۔"

اس بار میں استہزائیہ سا ہنسی اور یہ استہزا۔ میرا خود کے لیے تھا۔ ثانی نے حواس باختہ سا ہو کر اپنی پیشانی کو رگڑ ڈالا۔

"وہ کہتا تھا یاسمین تمہارے ہاتھوں سے بنی چائے میں پتی کی خوشبو۔ اور دودھ کا ذائقہ نہیں ہوتا۔ چائے کا یہ کپ صرف محبت کی خوشبو سے لبالب بھرا ہوتا ہے اور اس سے اڑتی گرم بھاپ کے مرغولوں میں محبت محو رقص ہوتی ہے۔ وہ اپنی خوابیدہ آنکھیں سیکڑ کر اڑتی بھاپ کا رقص جنونیوں کی طرح تکتا تھا۔"

شاید میں ماضی میں ڈوب کر مسکرائی تھی یا ایک کھنکتی سی ہنسی نے میرے لبوں کو آوارہ جھونکے کی طرح چھوا تھا۔ ثانی نے الجھ کر میرا چہرہ دیکھا۔ وہ مجھے سمجھ نہیں پارہی تھی۔

"زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا تھا۔ مگر پھر وہ صرف چائے کو چائے سمجھ کر پینے لگا۔ نہ وہ کسی خوشبو کا ذکر کرتا' نہ کپ سے اڑتی بھاپ کے مرغولوں کو دیوانہ وار تکتا۔"

میں سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔ مجھے لگا تھا میری سانسوں میں انگارے جلنے بجھنے لگے تھے۔ ثانیہ کی بھیگی پلکوں پہ بے قراری کچھ اور گیلی ہوئی۔ ماحول کا بوجھل پن ہم دونوں کو کھلنے لگا۔

"وہ اپنوں کا ذکر کر کے غیروں کی کہانیاں سنانے لگا تھا۔ تو میں فہمائش کی انگلی تھام کر شادی کے چار سال بعد اس گھر میں واپس آگئی۔"

محبت کی ڈوریوں سے بندھی اس نازک سی لڑکی کی گیلی بے قراری پانی کے قطروں میں ڈھل کر رخساروں پہ بہنے لگی۔ جسے آنسو کہتے ہیں اور جنہیں بے وفائی چھو لے تو پانی بن جاتے ہیں۔ میری آنکھوں کے کناروں پہ بس پانی جمع ہوا تھا۔ اس نے تڑپ کر اپنی پوروں سے میری آنکھوں کو پونچھا۔

"ثانیہ۔ میری جان۔ تمہیں کیا مجبوری ہے۔ تمہارے پاس احسن فصیح سے کہیں بڑھ کر آپشنز ہیں۔ ماں کا دل مت دکھاؤ۔ پلیز۔"

میں التجائیہ سی ہو کے دھیمے لہجے میں گڑگڑائی۔ میری بات کا مطلب سمجھ کر محبت کی رنگ برنگی ڈوریوں کو اس نے ایک مرتبہ پھر نئے سرے سے گنا۔ سنبھالا اور دل کے ساتھ کس کے باندھ دیا۔

اس کی محبت میری داستان سن کر بھی سٹپٹائی۔ نہ گھبرائی۔ بلکہ پورے قد کے ساتھ مقابل آکر جیسے سراپا سوال بن بیٹھی۔

"برداشت۔ صبر۔ اور ظرف۔ آپ نے حالات کی پٹاری سے انہیں کیوں نہ نکالا۔ اپیا!"

اس کی آواز پست نہیں' بلکہ دنیا کے سب ہی عقل مندوں کو مات دیتی ہوئی تھی اور اس کی کالی لانبی پلکوں کے سائبان مجھ پر تنتے ہوئے تھے۔ میں نے خواب کے سے عالم میں اسے غور سے دیکھا۔ جیسے ترحم آمیز نگاہوں سے کسی دیوانے کو دیکھتے ہیں۔

"عورت' مرد کے تمام رشتوں سے سمجھوتا کر لیتی ہے۔ بہن' بھائی' دوست۔ احباب۔ مگر جہاں بات سوتن اور اس کے بچوں کی آتی ہے۔ وہاں صبر۔ برداشت۔ اور ظرف وقت کے ساتھ کمزور پڑ جاتے ہیں اور پھر کسی نہ کسی مقام پر ختم ہو جاتے ہیں۔ پلیز اپنا فیصلہ بدل ڈالو ثانیہ۔ جسے تم چاہنے کا دعوا کرتی ہو اس کی بیوی اور بارہ سالہ بچی کو اس کے ساتھ کیسے شیئر کرو گی۔" میں ملتجی سی ہوئی۔

"اسے اپنی پہلی بیوی سے محبت نہیں تھی' یہ شادی زبردستی کی تھی۔" وہ میری بات کاٹ کر دلیری سے گویا ہوئی۔ "وہ مجھ سے شدید محبت کرتا ہے۔"

اس کا اتراہٹ ہے۔ گردن پر غرور لیے۔ بلندی کی انتہا پہ جاکر امیدوں کے خوشنما۔۔۔ بے شمار پرندے پکڑ لایا۔

"وہ محبت کرچکا ہوگا۔" میں سرعت سے بولی۔

"اپنی پہلی شادی سے بھی بہت پہلے۔۔۔" میں شدید تپ کر۔۔۔ عاجز آکر وہی آواز سے چیخی تھی۔

ثانی نے تڑپ کر مجھے دیکھا جیسے میرے نوکیلے لہجے سے "محبت کرچکا ہوگا۔" یہ الفاظ چھین کر انہیں فنا کرنا چاہا۔۔۔ اس کی پرشکوہ آنکھیں متحیر سی ہوئیں۔

"یہ سچ ہے۔۔۔" میں اپنی بات پہ قائم رہی۔ میری آنکھوں کے آگے احسن فصیح کا چہرہ لہرایا۔

"وہ ایک چین اسموکر تھا۔ اس کی سگریٹوں کے دھوئیں میں میں نے اس شخص کی بے قراریوں کو اڑتے دیکھا ہے۔"

ثانی کے چہرے پہ میری بات سے ناگواری کی لکیریں ابھریں۔

"اسے اپنی بیوی سے محبت نہ سہی، مگر پندرہ برس اس نے اسی عورت کی سنگت اور قربت میں گزارے ہیں۔ تمہاری چاہت کو یہ سب کیونکر گوارا ہے ثانی؟؟"

ایسا کہتے ہوئے میں نے خود کو بے بسی کی انتہا پہ کھڑے دیکھا۔ میرے اس وار پہ اس نے جز بز ہو کر بے چینی سے پہلو بدلا۔ جس سے مجھے میری ڈھارس بندھی۔۔۔

"حسن کو بیٹا چاہیے نا۔۔۔ تو وہ کسی بھی اور عورت سے شادی کرکے اپنی یہ خواہش پوری کرسکتا ہے۔" اس بار میں دوٹوک ہو کر قطعیت سے بولی۔۔۔ اس کے چہرے پہ ایک رنگ سا آکے گزر گیا۔

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔" ثانی کی آواز کسی گہرے۔۔۔ اجڑے۔۔۔ کالے کھنڈر سے ڈھیروں سرخ گلاب ڈھونڈ کر لاتی ہوئی تھی۔

"وہ صرف اپنی خواہش سے محبت کرتا ہے۔" پتا نہیں میں اتنی بے رحم کیوں ہو رہی تھی۔ میں اس کے ہاتھوں سے اجڑے۔۔۔ کالے کھنڈر کے گلاب پتی پتی کرکے بکھیرنا چاہتی تھی۔۔۔ سو میں زہر خند سی ہو کر گویا ہوئی۔

"ہر انسان عبید نہیں ہوتا۔" اس کی زبان پھسلی۔

"اف۔۔۔" میرے اندر جون کا سورج پوری تمازت سے گھسا۔۔۔ سرکشی سے۔۔۔ چنگھاڑتا ہوا۔۔۔ دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا۔۔۔ میں خانم کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی تھی کہ میں نے تمہارا کیس پوری جان لگا کر ایمان داری سے لڑا رہے۔۔۔ آگے تمہاری قسمت۔۔۔ کچھ دیر بعد دنیا جہان کی شرمندگی اس کے چہرے پہ سمٹ آئی۔۔۔ اس نے میرے مسکراتے لبوں کو ہونقوں کی طرح دیکھا۔۔۔ اور نادم سی ہو کر لب چبانے لگی۔

"اگر وہ عبید جیسا نہیں تو اس کی بیوی یاسمین بھی نہیں۔۔۔ کیونکہ محبوب کے سکھ پہ صرف محبت قربان ہوتی ہے صرف محبت کو پہلو سے اٹھ کر چلے جانے کی ادا نہیں بھاتی، بیوی کو محض شوہر کا گھر مطلوب و مقصود ہوتا ہے چالیس سالہ احسن فصیح کی پہلی بیوی محبت کو بچانے کی غرض سے بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اس وجہ سے گوشہ نشینی اختیار نہیں کرے گی کہ پورا احسن تمہارا ہوسکے۔۔۔ تمہیں ہر دن۔۔۔ ہر پل انہیں نگاہوں کے سامنے برداشت کرنا ہوگا۔۔۔ ثانیہ معید۔"

اپنے تیز ہوتے تنفس کے ساتھ میں نے حقیقت کا بچا کھچا زہر بھی اس پہ اچھالا۔۔۔ وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ مجھے شکوہ آمیز نظروں سے دیکھتی رہی۔۔۔ مگر امیدوں کے خوشنما سے رنگلے پرندے اس کے ہاتھوں سے نہیں اڑے تھے۔ اس نے اڑنے نہیں دیے تھے۔ اچانک اس نے میرے کڑوے ہونٹوں پہ اپنا گلابی ہاتھ دھرا۔۔۔ چند ثانیے قبل میرے ہونٹوں نے زہر جو اگلا تھا۔ اسے وہ باتیں زہریلی ہی لگی تھیں۔ گہرا سبز زہر۔ جسے اس کی گلابی ہتھیلیوں نے خود میں جذب کرلیا۔۔۔ اس نے ملائمت سے میرا ہاتھ تھاما۔ وہ اپنے لمس سے میری ہر رگ جاں میں محبت اتارنا چاہتی تھی۔

"یاس ایپا!" میں اپنے نام کی خوب صورتی سے متعارف ہوئی۔ میں جو پہلے فقط نام کے معنی سے متعارف تھی۔ "محبت میں ذرا سا بھی بہت ہوتا ہے۔" اس کے گداز ہونٹوں نے رنگ اڑائے۔۔۔

خوشبو بکھیری۔۔۔ اجڑے کالے کھنڈر سے گلابوں کے جھنڈ اگنے لگے۔ گویا وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹی تھی۔ میں نے ایک گہرا۔۔۔ ٹھنڈا سانس بھرا۔۔۔ صاف۔۔۔ ستھرا۔۔۔ سادہ کسی بیوہ کی چادر جیسا۔

"جب خواب آسمان سے گر کے ٹوٹتے ہیں تو ان کا مقدر پانی اور سبزہ نہیں۔ بلکہ تڑتڑاتی چٹختی ہوئی زمین ہوتی ہے۔ لیکن میری دعا ہے کہ تمہارے خوابوں کو پانی اور سبزہ ملے۔"

میری دعا دل کی گہرائیوں سے نکلی۔۔۔ میرا اس سے ذاتی عناد نہیں تھا' سو میرے لہجے میں شکستگی بھی نہیں تھی۔ تب ہی ڈور بیل بجی۔

"یقیناً" فہمائش ہوگی۔" میں اٹھنے لگی۔

"رہنے دیں آپا۔" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ "میں دیکھتی ہوں۔" وہ جیسے اٹھنے کا بہانا ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ لہرا کے اٹھی اور داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔

"اکثر یوں بھی ہو جاتا ہے ثانیہ معیذ۔۔۔ کہ محبت میں بہت زیادہ بھی ذرا سا لگنے لگتا ہے۔"

یہ میرا آخری وار تھا جو میں نے اس کی پشت ہوتے ہی کیا۔ وہ ایک دم رکی تھی۔ پھر مڑے بغیر دروازہ عبور کر گئی۔ باہر وقت زندگی کے پیچیدہ زنگ آلود دروازے کھولے اس کا منتظر کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

میری بات سن کر خانم نے مجھے یوں اجنبیوں کی طرح دیکھا۔۔۔ جیسے ہمارے درمیان بیس سالہ ہمسائیگی کبھی تھی ہی نہیں۔۔۔ فقط اس لمحے میں اس سے متعارف ہو رہی تھی۔

"میں یاسمین عبید ہوں۔"

"اس کی خواہش سنگ پروان چڑھی اور اس سے بچھڑ کے بوڑھی ہو گئی۔ اب میں تمہاری طرح صرف ایک ماں ہوں۔ واہموں اور اندیشوں میں گھری ماں۔۔۔ مرد بہت سمجھ دار ہوتا ہے۔۔۔ اگلی پچھلی محبتوں کو مختلف جیبوں میں بھر کے رکھنے کا ہنر نا نہیں کیسے سیکھ جاتا ہے' مگر عورت۔۔۔ عورت کی قمیص میں کوئی جیب بھلا کہاں ہوتی ہے۔ اس لیے تو وہ سارے رشتوں میں الجھ کر ہی زندگی تمام کر دیتی ہے۔"

خانم نے تعارفی مراحل طے کرنے کے بعد یہ پہلی بات پتا نہیں مجھ سے کی تھی یا خود سے۔۔۔

"میری کنواری بچی کے لیے وہ شادی شدہ مرد ہی رہ گیا تھا۔" اس کے لہجے میں الاؤ بھڑکا۔۔۔ اور وہ خالی آنکھوں کے ساتھ رونے لگی۔

"تم دیکھنا یاسمین! میری بیٹی ایک غلط فیصلے پر اڑ کر زندگی بھر کے پچھتاوے خرید رہی ہے۔" وہ اس وقت شدید جذباتیت کا شکار ہو رہی تھی۔

"بس کرو خانم! جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔" میں نے اندرونی توڑ پھوڑ چھپاتے ہوئے اپنے اعصاب پر سکون رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ مگر اس کے بجھے ہوئے ہارے ہوئے چہرے پہ بے سکونی کی بدترین کیفیت تھی۔

"ہاں سچ کہہ رہی ہو۔" وہ نڈھال سی ہو کر بولی۔

اس پل اس کے وجود پہ پھیلی اذیت ایک اندھے کو بھی نظر آسکتی تھی۔ سوائے اس خوش گمان محبت کے جو اندر کھڑکی سے لگی ثانیہ کی آنکھوں میں پنہاں تھی۔

☼ ☼ ☼

ثانیہ کی شادی کے کچھ ماہ بعد ہی میں اسکاٹ لینڈ اپنے چھوٹے بھائی کے یہاں شفٹ ہو گئی تھی۔ وہاں بھی عبید فہمائش سے ملنے آتا رہتا تھا۔ خانم سے بات ہوتی تو ثانی کی بھی خیر خیریت معلوم ہو جاتی' جس سے مجھے اندازہ ہوتا کہ وہ اتنی خوش اور مطمئن نہیں ہے' اپنے وطن کی یاد نے بے قراری حد سے سوا کی تو بارہ سال بعد وقت مجھے دوبارہ اس آنگن میں لے آیا جس کی دیواریں خانم کے گھر سے جڑی تھیں۔ میری آمد کی خبر سن کر وہ مجھ سے ملنے چلی آئی۔ آج اس کے وجود سے سالوں پہلے والی تازگی مفقود تھی۔ میری یاد میں فروری کی ایک دوپہر دھپ سے میرے سامنے آکر بیٹھ گئی۔۔۔ جس دن ثانی نے محبت کی جنگ بنا کسی ہتھیار

کے لڑ کے جیت لی تھی۔

"تمہارے دونوں بیٹے کیسے ہیں۔۔۔ اور احسن فصیح کیسا ہے؟" میں نے بظاہر ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔ اسے ٹٹولنا یا کریدنا ہرگز بھی میرا مقصد نہیں تھا۔

"اسے کیا ہونا ہے۔۔۔ بھلا چنگا خوش باش ہے۔" وہ آج بھی اسی جگہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ "آج کل اپنی بیوی کے ساتھ مل کر بیٹی کی شادی کی شاپنگ میں مصروف ہے۔" اس نے لحہ بھر کو رک کر تھکا تھکا سا سانس لیا۔۔۔ میں حق' دق اسے تکنے لگی۔

"ایک دو سال بعد نواسوں کی صورت اس کی زندگی میں نئے رشتے آجائیں گے ——— آج اس کی سانسوں میں جلتے بجھتے انگاروں جیسی تپش تھی۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کی نگاہیں زمین پہ کسی نادیدہ شے کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ محبت جو اس کے وجود کا احاطہ کیے رہتی تھی' اس کے اندر جیسے سکڑ سمٹ سی گئی تھی۔ میری مرجھائی کملائی آنکھوں نے ثانی کی خوش رنگ محبت کو اس کے پاس ذرہ وجود سے کافی کھوجا' مگر میری نظریں بالآخر ہرا ہونے میں ناکام ٹھہریں۔

"اس کی بے قراریاں مجھے پاکر بھی سگریٹ کے دھوئیں میں کیوں اڑتی ہیں اپیا!" اس کا غم آلود لہجہ میرے اندر شگاف ڈالنے لگا۔

"اپیا ایک بات بتاؤں۔" وہ روہانسی سی ہنسی ہنس کر بولی۔ "محبوب کا پہلو سے اٹھ کر چلے جانا محبت کو یہ ادا آج بھی نہیں بھاتی۔"

اس کے لہجے کے کرب پہ میری دھڑکنیں متوحش سی ہوئیں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا' کمال کی بات تھی آج اس کا ہاتھ خنک اور میرا پر حرارت تھا۔

"محبت کو بچانا بڑی بات ہوتی ہے اپیا۔۔۔ بٹا ہوا مرد کانچ جیسی عورت کو پتھر میں ڈھال دیتا ہے۔ اس پتھر سے سر ٹکرا ٹکرا کے محبت کے خوشنما پرندے وہاں سے ہجرت کر جاتے ہیں۔" اس کا لہجہ کرلایا تھا۔ میرے دل پہ منوں بوجھ گرا۔

"محبت کا موسم ڈھونڈ اور اس میں آس امید کے

گھر اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر تعمیر کرو' مجھے یقین ہے احسن فصیح اپنی تھکن اتارنے اور سستانے کے لیے اسی گھر میں آیا کرے گا۔"

میں نے خوش گواری سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ سہلایا۔

"پھر سے اٹھ کر جانے کے لیے۔۔۔" وہ جیسے استہزائیہ سی ہو کر خود پہ ہنسی اور اپنی گیلی آنکھوں کو بے اختیاری سے مسلا۔

"اس کا دھیان تو باہر سے آتی آوازوں پہ لگا رہتا ہے' پھر اس کا داماد' پھر نئے رشتے' جو ہم دونوں کے نہیں صرف اس کے ہیں۔"

وہ میرا ہاتھ چھڑا کر حواس باختہ سی ہو کر اچانک کھڑی ہو گئی' پھر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔ مڑ کے مجھے دیکھا۔

"ثانیہ معید جان چکی ہے کہ اکثر یوں بھی ہو جاتا ہے محبت میں بہت زیادہ بھی ذرا سا لگتا ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ میرے بوجھل دل نے اسے شاد آباد رہنے کی دعا دی کہ وہ ذرا سا بہت زیادہ محسوس کر سکے۔

☆

دل کسی کی چاہ میں

نعیمہ ناز سلطان

سب کے جانے کا وقت' چند منٹوں کے فرق سے تقریباً" یہی تھا' ان کے ہاتھ گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کے ساتھ ساتھ حرکت کررہے تھے۔ جلدی جلدی پراٹھا بیل کر انہوں نے توے پہ ڈالا۔

"امی! جلدی کریں لیٹ ہو رہا ہوں۔" فیض احمد عرف فیضی کلائی پر گھڑی باندھتا ہوا آیا اور ان کے سر پہ کھڑا ہو گیا۔

"سالن گرم ہے تو دے دیں۔" وہ ماں سے بھی زیادہ جلدی دکھا رہا تھا۔

"اف فیضی! باہر چل کر بیٹھو' اتنی گرمی میں میرے سر پہ کیوں کھڑے ہو گئے۔ لا رہی ہوں ناشتہ۔" پسینے

پسینے چہرے کو چھوٹے سے تولیہ سے صاف کرتے ہوئے وہ جھنجلائیں۔

"بہو! تم نے ہی سر پہ بٹھایا ہوا ہے لاڈلے نواب کو' اب کہیں اور اٹھنے بیٹھنے کو جگہ ہی نہیں ملتی۔" دادا جان نے ہمیشہ کی طرح طنز کا پتھر پھینکا' مگر یہ پتھر بہو بیگم کے لیے نہیں بلکہ پوتے کے لیے تھا۔ جو ٹھک کرکے ٹھیک نشانے پر لگا۔

"جن کے نام پر آپ نے میرا نام رکھا ہے نا وہ بھی نواب تھے۔" فیضی باہر آگیا' صبح صبح دادا جان سے دو دو ہاتھ کرنے' جن کی صبح ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے اس وقت' جو چائے کی پیالی پی تھی اس کا ذائقہ بھی زبان سے ختم ہو چکا تھا' تب ہی تو نوک جھونک کے چسکے لینے کھڑے ہو گئے۔

"وہ نواب نہیں تھے' صاحب حیثیت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔" دادا نے تصحیح کی۔

"ایک ہی بات ہے' نواب بھی تو صاحب حیثیت ہوتے ہیں۔" پوتا جم کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مگر ہر صاحب حیثیت نواب نہیں ہوتا۔" دادا جان نے نکتہ نکالا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" حیرت انگیز طور پر فیضی نے بہت جلد ہتھیار ڈال دیے اور میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتے ہوئے اپنا تکیہ کلام بہ آواز بلند دہرایا۔

"امی! بھوک کے مارے دم نکلا جارہا ہے۔"

"پھر وہی فضول تکرار' دس بار منع کیا ہے دم نکلنے اور جان نکلنے کی باتیں زبان سے نہ نکالا کرو' کوئی کوئی وقت قبولیت کا ہوتا ہے۔ اچھی باتیں زبان سے نکالنی چاہئیں۔"

امی نے ٹرے لا کر اس کے آگے رکھی خستہ گرم تر پراٹھا اور رات کی بچی بھنی کلیجی کی پلیٹ' اسی سالن کی وجہ سے تو لاڈلے نے پراٹھا پکوایا تھا۔

"امی! ناشتہ تیار ہے؟" پریسا عرف پریا تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر آگئی تھی۔

"دس پندرہ منٹ پہلے اٹھ کر کم از کم اپنا ناشتہ ہی خود بنا لیا کرو' سب کے سب مل کر ماں کو ہلکان کیے دیتے ہیں' وہ بھی نوکری پر جاتی ہے۔ اس غریب کا بھی

"کچھ ہاتھ بٹا دیا کرو۔"

دادا اب کچھ عرصے سے ایسی ہی باتیں کرنے لگے تھے۔ پہلے جو طنز' طعنے اور تنقید بیٹے پہ ہوتی تھی وہ اب بیٹے کی اولاد پر ہونے لگی تھی اولاد ہی ایسی تھی کم بخت سارے کے سارے باپ پہ چلے گئے تھے' بے حس' خود غرض' نکمے نکٹھو' آخری دو اعزازات پر پریسا شدید اختلاف کرتی۔

"میں نکمی نہیں ہوں' جاب کرتی ہوں۔"

"ماں کے ہاتھ پہ کتنے پیسے رکھتی ہو؟" دادا دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیتے۔

"ارے واہ' اتنی محنت سے پیسے کمائے جاتے ہیں' آپ تو ایسے بول رہے ہیں جیسے میں درختوں سے نوٹ توڑ کر لاتی ہوں اور لا کر امی کے ہاتھ پہ رکھ دوں۔ امی کی طرح گورنمنٹ اسکول کی جاب نہیں ہے کہ جا کر آرام سے بیٹھے رہے' پڑھایا پڑھایا نہ پڑھایا' پرائیویٹ اسکول وہ بھی اتنا نامی گرامی' کھال کھینچ لیتے ہیں۔ محنت کروا کروا کر خون خشک کر دیتے ہیں پھر جا کر سیلری کا منہ دیکھنے کو ملتا ہے۔"

پریا چہک کر جواب دیتی بولتی اور بولتی ہی چلی جاتی' اپنی محنت' مزید محنت' مشقت' مصیبت' ساری کہانیاں اسی وقت بیان کی جاتیں۔

"ماں کا بھی کوئی حق ہے یا نہیں؟" دادا کا فقط ایک سوال۔

"میں ان کے لیے پیسے دیتی ہوں' وہ سب گھر میں لگا دیتی ہیں۔ یہ خرچا وہ خرچا' یہ چیز' وہ چیز' گھر کے خرچے ہی ختم نہیں ہوتے۔"

پریا کی گوری رنگت بول بول کر گلاب سی ہو جاتی' پتلے پتلے نازک سے ہونٹ بھینچ کر وہ اپنی صفائیاں پیش کرتی۔ مگر خیر یہ تماشے اور مناظر تو آئے دن کا معمول تھے۔ اس وقت تو ان کا اعتراض پریا کو برا ہی لگ رہا تھا' فوراً" منہ بن گیا۔

"جلدی ہی اٹھتی ہوں' اب میں اپنی تیاریاں کروں یا کچن میں گھس جاؤں سب نہایا دھو' ایک منٹ میں برابر ہو جائے۔"

نک سک سے تیار پریا علی الصبح نہائی دھوئی' استری شدہ لان کا پوسٹر سوٹ مہنگا والا' بالوں کو ڈرائی لگا کر خشک کرتی' تراشیدہ بالوں کے نت نئے اسٹائل بناتی' ہلکا پھلکا سا میک اپ' نازک سی جیولری' فینسی جوتا' یا چپل' پرفیوم سے خود کو اور اردگرد کی فضا کو مہکائے' وہ بھلا کچن میں گھستی کام کرتی اچھی لگتی؟ اسے یہ سب سوٹ نہیں کرتا تھا۔

"کیا لوگی؟" امی نے تحمل سے اپنی پہلوٹھی کی اولاد کو دیکھا۔

وہ ہمیشہ سے ہی ان کی جان تھی سب سے پیاری تھی انہیں اس کی ہر خطا' ہر غلطی' ہر خود غرضی' ہر بے حسی وہ شاید اس کی پیدائش سے پہلے ہی معاف کر چکی تھیں۔ دادا برملا کہتے تھے۔

"مامتا بڑی بری شے ہے۔ بہو بیگم! مگر اسے بری اولاد پہ ضائع نہ کرو۔" مگر کون ماں ہوتی ہے۔ جو اولاد میں اچھائی برائی' خوبی خامی کا موازنہ کر کر کے محبت کرتی ہے؟ ماں کی محبت تو بارش کی طرح برستی رہتی ہے' کھیت کھلیان' باغ باغیچوں جیسی اولاد پر بھی اور بنجر زمین اور سخت چٹانوں جیسی اولاد پر بھی۔

اس کی محبت اس نفع نقصان سے بے نیاز ہوتی ہے کہ کون سی زمین فائدہ مند ہے اور کون سی زمین بے کار' گورنمنٹ اسکول میں پرائمری کی استانی عافیہ سکندر کچھ ایسی ہی ماں تھیں' ویسی ہی جیسی کہ عموماً" مائیں ہوتی ہیں۔ اولاد کی تمام تر خامیوں اور برائیوں کو ایک طرف کر کے' صرف اور صرف ان سے محبت کرنے اور ان کا خیال رکھنے میں مگن۔

اور صرف ماں ہی کیوں' وہ تو بیوی بھی ایسی ہی تھیں' وفادار' وفاشعار' جاں نثار۔ کچھ عورتوں کا خمیر اللہ تعالیٰ نے ایسی مٹی سے اٹھایا ہے کہ محبت نام پر خود کو مٹا کر مٹی کر لیتی ہیں۔۔۔ وہ بھی ان ہی میں سے ایک تھیں تب ہی تو ان کی بڑی آپا رافعہ مہر ٹیچر آف گورنمنٹ سیکنڈری اسکول اعظم آباد انہیں کبھی کبھی لتاڑتیں تو

بھی کہتیں۔ "اس فضول انسان اور اس کی فوٹو اسٹیٹ اولاد کے پیچھے تم نے خود کو خوار کر ڈالا' تباہ کر ڈالی اپنی محبت بھی اور جوانی بھی' اپنی صلاحیت اور توانائی بھی۔"

"وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں آپا! شادی کو چھبیس سال ہو گئے۔ ہر سال انہیں شادی کی سالگرہ بھی یاد رہتی ہے اور میرے لیے پھول اور گجرے لانا بھی۔" عافیہ سکندر کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھتے' عمر اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کے دریا میں روانی اور طغیانی ہی آئی' کمی کبھی نہیں آئی۔

"پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان' کیسی محبت کہاں کی محبت' سب بے وقوف بنانے کے طریقے ہیں۔ سال میں ایک بار تمہاری ہی کمائی سے تمہیں ہار پھول پہنا کے تین الفاظ محبت کے بول دیے' ہو گئی رسم محبت پوری' باقی پورا سال گھر بیٹھے' بیوی کی کمائی کھاتے رہو اور بزنس کے بوگس منصوبے بناتے رہو۔"

بڑی آپا چراغ پا ہو کر جو سنانا شروع کرتیں تو عافیہ کی ملتجیانہ خاموش نظریں بھی انہیں چپ کرانے میں ناکام ہو جاتیں۔ مگر بہر حال یہ تو ان کی آپا کی باتیں تھیں' جو ان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ایک تو یہ محبت بھی کچھ عجیب ہی شے ہے' کہیں انسان اس کی وجہ سے کسی کو کڑوی کسیلی سنا دیتا ہے اور کہیں اس محبت کے نام پر ہی انسان کسی کی کڑوی کسیلی سن لیتا ہے۔

بات ہو رہی تھی صبح کے ناشتے کی تو امی جان نے پریا کے لیے دودھ کا گلاس اس کی فرمائش کے مطابق لا دیا۔

دو تین کو کیز اس نے حلق سے نیچے اتارے اور دودھ کا گلاس چڑھا گئی ابھی سنعیہ اور سونیا باقی تھیں۔ دونوں جڑواں تھیں مگر حیرت انگیز طور پر شکل عادات اور خصائل میں ایک دوسرے سے بے حد مختلف۔

سنعیہ اپنے والد محترم کی طرح تھی۔ ان ہی کی طرح صاف رنگت اور دل آویز ناک نقشہ اور ان ہی کی طرح بے حس' خود غرض اور کاہل' تھوڑی تھوڑی یہ

تینوں خصوصیات باقی بہن بھائیوں میں بھی تھیں مگر سونیا سب سے تھوڑی سی الگ تھی۔

ماں کی طرح سانولی رنگت پہ بڑی بڑی سحر انگیز آنکھوں اور ان ہی کی طرح گھنے سلکی بالوں کی مالک سونیا' اس کا دل اپنی ماں کی طرح تھا۔ نرمی اور محبت سے گندھا ہوا' خلوص اور سادگی سے بھرا ہوا۔

تینوں بہن بھائی اسے بے وقوف سمجھتے بھی تھے اور کہتے بھی تھے۔ برملا کہتے تھے' ڈنکے کی چوٹ پر کہتے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ سننے والے کو کیسی چوٹ پہنچ رہی ہے اور سونیا حتی الامکان ماں کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی تھی اور چھوٹے موٹے کئی کام کر لیتی تھی۔ ناشتہ بنانے میں بھی ان کی مدد کر دیتی تھی مگر وہ بے چاری آج کل اپنے امتحانات کی تیاری میں جتی ہوئی تھی۔

ایف ایس سی کے پیپرز ہو رہے تھے۔ اسے اے پلس کے ساتھ یہ امتحان پاس کرنا تھا اور پھر انٹری ٹیسٹ کی تیاری اور پھر میڈیکل میں ایڈمیشن' ڈاکٹر بننا اس کا شوق یا خواب نہیں بلکہ جنون تھا' اس جنون کو پورا کرنے کے لیے وہ جنونیوں کی طرح ہی محنت کر رہی تھی۔

آج اس کا پیپر تھا' صبح فجر کی نماز پڑھ کر اپنا نصاب دہرانے بیٹھ گئی تھی' اب امی ہی زبردستی تھوڑا بہت ناشتہ کروا دیں تو کروا دیں ورنہ وہ اس ٹینشن بھرے زمانے کے دوران کھانے پینے سے بالکل بے نیاز سی ہو جاتی تھی۔ کچھ اترتا ہی نہیں تھا۔ حلق سے نیچے۔ بہن بھائی مذاق اڑاتے تو وہ ہنس کر ایک طرف ہو جاتی۔

نظرانداز کرنے کی پالیسی بہت سے معاملات میں کار آمد ثابت ہوتی ہے۔ اب وہ اپنے معمول کے مطابق صبح سے ہی پیپر کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔ سنعیہ بھی اسی کی کلاس فیلو تھی مگر وہ اتنے تردد کی قائل نہیں تھی، مناسب محنت کے بعد مناسب نمبر آجائیں، بس اسے یہی مناسب لگتا تھا۔

امی کی پے درپے آوازوں پر سونیا کتاب ہاتھ میں لیے ہی ناشتے کی میز پر پہنچ گئی۔

"بیٹا! پہلے ناشتہ کرلو۔"

"امی! آپ کو معلوم تو ہے مجھ سے کچھ بھی نہیں کھایا جائے گا۔" وہ بے بسی سے ماں کو دیکھ کر بولی۔

"اف، پیپر کی ٹینشن۔"

"تھوڑا سا کھالو، خالی پیٹ بھی گھر سے نکلنا ٹھیک نہیں ہے۔" امی نے رسان سے کہتے ہوئے کچن کی راہ لی۔

سونیا کرسی پہ بیٹھ گئی اور کتاب کھول کر نظریں دوڑانے لگی۔ بریانی فیضی کے ساتھ نکل گئی تھی۔ فیضی اسے، اس کے اسکول چھوڑتا ہوا، یونی ورسٹی چلا جاتا تھا۔

سنعیہ اور سونیا نے بھی ناشتے سے فراغت حاصل کرلی تھی۔ اب کالج کی تیاری میں مصروف تھیں، امی نے اپنے لیے چائے مگ میں نکالی اور ٹیبل پر آ بیٹھیں۔ سلائس کا کونا کترتے ہوئے وہ جانے کس سوچ میں گم تھیں کہ شوہر نامدار کے آنے کی بھی خبر ہی نہ ہوئی۔

"کیا بات ہے، آج آپ کے غریب مسکین خاوند کو ناشتہ ملے گا یا ایک گھنٹے بعد برنچ کرنا پڑے گا۔"

"ہائیں!" وہ اک دم ہڑبڑا گئیں۔ "آپ کب اٹھے؟"

"اٹھ بھی گیا، نہا دھو کر یہاں آبھی گیا، آپ کو خبر ہی نہیں ہوئی۔" تازہ تازہ غسل کی بشاشت اور ازلی لاپروائی اور بے نیازی کی گواہ، وجیہ چہرے کی چمک لیے وہ بڑی شان سے مسکرا رہے تھے۔ سفید کرتا شلوار میں ملبوس، بالوں کو سلیقے سے جمائے ہوئے، ایک بھینی بھینی مہک میں بسے عافیہ سکندر کے شوہر سکندر بخت، ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ ناشتے کی میز پر۔

ایک نظر انہوں نے اپنے نک سک سے تیار، خوشبو میں بکھیرتے پیارے شوہر پر ڈالی اور دوسری نظر خود پر، اپنے سراپے پر، صبح ہی صبح اٹھ کر سیدھی کچن میں گھس گئی تھیں۔ رات بھر کے پہنے مسلے ہوئے، سلوٹ زدہ کپڑے، بالوں کو سمیٹ سمٹا کر کیچر لگا لیا تھا۔ منہ دھونے کا رسمی سا تکلف ہی کیا تھا۔

اس وقت وہ عموماً" اسی حلیے میں ہوتی تھیں اور بڑی آسودہ رہتی تھیں۔ سکندر بخت صاحب تو بڑے آرام سے اس وقت سو کر اٹھتے تھے جب وہ دوپہر کی ہنڈیا روٹی کرکے اسکول جانے کی تیاری میں مصروف ہوتی تھیں۔ شوہر صاحب بیدار ہو کر نہاتے دھوتے، تیار ہوتے اور بیگم کو ہرگز ہرگز بھی آوازیں نہ لگاتے، نہ زحمت دیتے۔ پکا ہوا کھانا اپنے لیے خود نکال لیتے اور جب تک وہ کھانا کھاتے، اس دوران میں عافیہ سکندر چائے چڑھا دیتیں اور اپنی تیاری کرتے کرتے، چلتے پھرتے چائے کا کپ انہیں پکڑا دیتیں، کچھ سودا سلف یا کچھ اور سامان وغیرہ لانا ہو تو اس کی لسٹ اور پیسے بھی اسی وقت ہی دیتیں۔ کبھی کبھار ہی یہ کرشمہ ہوتا تھا کہ وہ جلدی بیدار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ جاتے آج اسی ان ہونی کا دن تھا۔

"کیا بات ہے، آج بھی آپ خیالوں میں گم ہیں۔ وہ جو خیالوں میں بستا ہے، مجسم آپ کے سامنے موجود ہے۔"

"ناشتہ لاؤں آپ کے لیے؟" وہ ہڑبڑا کر سنبھلتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"ناشتے کا ہی ٹائم ہے غالباً"!" سکندر بخت نے ایک گہری سانس لی۔ وہ اٹھیں اور کچن میں جانے لگیں۔

"ارے اپنا ناشتہ تو پورا کرلیتیں یا میرے ساتھ کرنے کا ارادہ ہے؟" میاں صاحب نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"آرہی ہوں ابھی۔"

"بہو نے اس گھر میں سب کی عادتیں بگاڑی ہوئی ہیں۔ یہ بے غیرت تو پہلے ہی سے بگڑا ہوا تھا، بیوی کے لاڈ پیار نے اور چار چاند لگا دیے۔"

اندر کمرے میں ابا میاں ہمیشہ کی طرح کلس رہے تھے۔ بیٹے سے کچھ کہنا تو بس ایسا ہی تھا جیسے چکنے گھڑے پہ پانی کی بوندیں، پھسل پھسل کر گرتی رہتیں۔ ابا میاں جب بھی انہیں سنجیدگی سے سمجھانے کی کوشش کرتے، لگ کر اور ٹک کر کام کرنے کے بارے میں، گھر، بیوی بچوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں، سکندر بخت اپنی شیریں بیانی کے کمالات دکھانا شروع کر دیتے۔

"آپ کیا سمجھتے ہیں ابا جی! مجھے احساس نہیں ہے اپنی بیوی کی محنت کا؟ اپنے بچوں کا، آپ کا، گھر کا، مجھے ہر شے کا ادراک ہے۔ میں سب کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بس کچھ وقت چاہیے اور کچھ سرمایہ۔ میرا بزنس پلان ان شاء اللہ کامیاب ہو گا اور پھر ہم سب کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

وہ سنہرے خواب خود بھی دیکھتے رہے اور دکھاتے بھی رہے مگر انہیں جو وقت چاہیے تھا، وہ ایک عمر گزرنے پر بھی نہیں ملا اور جو سرمایہ درکار تھا وہ بھی اکٹھا نہ ہو سکا۔ کہانی اور زندگی کچھ یوں رہی کہ عافیہ سکندر محنت کر کے گھر گرہستی چلاتی رہیں، سکندر بخت ہوائی قلعے بنا بنا کر اس میں خواب خرگوش کے مزے لیتے رہے اور ابا ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہے۔

بہو پر ترس آتا تھا۔ رحم آتا تھا اور اپنی اکلوتی اولاد پر شدید غصہ۔ کبھی پیار سے، کبھی غصے سے، بیٹے کو بہت سمجھایا۔ ذمے داری اور فرض شناسی کے اسباق پڑھائے، مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ دراصل انسان کسی سوتے ہوئے کو جگا سکتا ہے مگر جو شخص پہلے ہی سے بیدار ہو مگر جان بوجھ کر مدہوش پڑا ہو، اسے جگانے سے کیا حاصل۔ بچے ہوئے اور چھوٹے سے بڑے بھی ہو گئے مگر سکندر بخت کی روش وہی رہی، انداز زندگی اور حالات زندگی ان کے وہی رہے جو تھے۔

وہ بیک وقت خوش نصیب بھی تھے اور بد نصیب بھی 'بد نصیب یوں کہ ہاتھ میں بہترین ہنر رکھنے والے اعلیٰ پائے کے کاریگر تھے۔ معمولی کپڑا بھی ان کے ہاتھوں میں آتا تو ان کی مہارت اسے شاہکار بنا دیتی 'گھر بیٹھے انہیں منہ مانگے معاوضے کی آفر آتی مگروہ اپنی لاابالی طبیعت اور غیر مستقل مزاجی کے سبب اپنے اس ہنر سے نہ خود کوئی فائدہ اٹھا سکے نہ اپنی فیملی کے لیے کچھ کر سکے اور خوش نصیب یوں کہ ایک عورت کی چاہت اور محبت نے ان کی خامیوں اور برائیوں کو پس منظر میں دھکیل دیا تھا۔ منظر پر تو بس وہی وہ چھائے ہوئے تھے۔

عافیہ سکندر نے ناشتہ لا کر میز پر رکھا اور چپ چاپ اپنی چائے پینے لگیں۔

سکندر بخت نے لقمہ توڑنے سے قبل انہیں غور سے دیکھا 'پھر لقمہ توڑ کر منہ میں رکھا اور اپنی بیوی کو بدستور دیکھتے رہے۔ جن کی پیشانی پر بڑی سوچ کی لکیریں ان کی پریشانی اور فکر مندی کی غماز تھیں۔

"کیا ہوا عافو' پریشان ہو؟" ان کا لہجہ اور الفاظ بیگم کے لیے ہمیشہ ہی شہد آگیں رہے تھے۔

"پریشانیاں تو زندگی کا حصہ ہیں۔"

"کوئی زبردستی ہے کیا؟ نہ بناؤ انہیں اپنی زندگی کا حصہ 'نکال باہر کرو ایک لات مار کر۔"

وہ بے ساختہ ہی بولے تھے اور ایسی باتیں وہی کہہ سکتے تھے۔ انہوں نے تو اب تک کی زندگی میں اسی پر عمل کیا تھا۔ کسی پریشانی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا اور یہ کام اعلیٰ درجے کے خود غرض ہی کر سکتے ہیں جو صرف اپنا بھلا سوچتے اور اپنا ہی بھلا کرتے ہیں۔

عافیہ ایک نظر اپنے محبوب شوہر کو دیکھ کر رہ گئیں۔ زندگی میں چند بار نہیں بلکہ کئی بار اور کبھی بار بار ایسے مقامات آتے ہیں جہاں صرف محبت اور خالی خولی پیار سے پیٹ نہیں بھرتا زندگی کے تلخ حقائق اور اٹل مطالبے محبت کی شیرینی ساری کی ساری چوس لیتے ہیں 'خالی پھوک رہ جاتا ہے جو کسی کام کا نہیں ہوتا۔

ان کو زندگی میں زیادہ نہیں مگر چند بار ضرور محسوس ہوا کہ زندگی کے کشکول میں محبت کے کھنکھناتے سکے 'دلفریب تو بہت لگتے ہیں۔ ان کی خوش نمائی بے مثل ہوتی ہے 'مگر ان کا مول؟ مول کوئی نہیں 'بے مول ہیں۔ زندگی کے کشکول کا تقاضا کچھ اور ہے۔ اسے عمل اور محنت کے پائیدار اور کھرے سکے درکار ہیں۔ جو زندگی کے بہت سے مسائل حل کرنے کی بے پناہ طاقت و قوت رکھتے ہیں۔

اس وقت بھی وہ فکر مند تھیں کہ پریا کے سسرال والے اب شادی پر زور دے رہے تھے اور وہ پریشان تھیں کہ اتنی بڑی ذمہ داری اکیلے کیسے سہار سکیں گی۔ کمائی کا بیشتر حصہ تو گھر اور گھر والوں پر خرچ ہو جاتا تھا 'بچت اتنی نہیں تھی کہ وہ اس دھوم دھام سے بیٹی کا بیاہ کر سکتیں 'جیسا کہ ان کا ارمان تھا۔ اور ارمان تو ان سے زیادہ ان کی بیٹی کے تھے۔ اس کی شادی کے منصوبے اس کے خوابوں کی طرح طویل اور سنہری تھے۔

ماں ہونے کے ناتے وہ ان خوابوں اور خواہشوں کی تکمیل کو اپنا فرض سمجھتی تھیں اور باپ؟ باپ کا فرض کیا ہے؟ کیا ہونا چاہیے؟ بیٹی کی وجہ سے آج وہ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوئی تھیں۔

"عاکف کے گھر والے شادی کا کہہ رہے ہیں۔" انہوں نے دھیرے سے شوہر کو آگاہ کیا۔

"انہوں نے دو سال کا ٹائم دیا تھا۔"

"ہاں 'منگنی کے وقت تو یہی بات ہوئی تھی مگر اسے بھی چھ ماہ گزر چکے ہیں۔ وہ ایک سال کے اندر اندر شادی کا کہہ رہی ہیں 'عاکف سے چھوٹا والا عاطف اسٹڈیز کے لیے باہر چلا جائے گا۔ اتنی جلدی اس کا آنا مشکل ہے۔ وہ لوگ چاہ رہے ہیں کہ عاطف اپنے بھائی کی شادی اٹینڈ کر کے باہر جائے۔" عافیہ بیگم نے پوری داستان سنادی۔

"پھر؟" سکندر صاحب نے گیند بڑی معصومیت کے ساتھ واپس ان ہی کے کورٹ میں ڈال دی۔

"لاکھوں کا خرچا ہے 'کیسے ہو گا سب کچھ؟" وہ جیسے خواب کے عالم میں بول رہی تھیں اور ساتھ ساتھ شاید ایک خواب بھی دیکھ رہی تھیں کہ سکندر بخت

انہیں تسلی دیں۔

"عافو! تم فکر مت کرو میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ ہم دونوں مل کر اپنی بچی کو بہت اچھے طریقے سے وداع کریں گے۔" ان کے خیالات مختلف سمتوں میں بھٹک رہے تھے اور سکندر بخت خاموشی سے ناشتہ ختم کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

"تم فکر مت کرو عافو!" بالآخر نرم لہجے میں سکندر بخت نے بات شروع کی۔ "اباجی کا پلاٹ ہے نا گلستان جوہر والا' ان سے کہو' وہ بیچ دیں۔ پریا کی شادی ان شاء اللہ بہت دھوم دھام سے ہو جائے گی۔" اتنے آرام سے مشورہ دیا گیا کہ وہ حق دق اپنے شوہر کو دیکھتی رہ گئیں۔

"مگر ابا اپنا پلاٹ کیوں بیچیں گے ہمارے کہنے سے؟" بڑی دیر بعد عافیہ کچھ کہنے کے قابل ہوئی تھیں۔

"ابا کی پوتی ہے۔ سب سے بڑی اور لاڈلی پوتی' اس کی خوشی کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتے۔" واہ کیا شان دار جواب ملا تھا عافیہ سکندر کو اپنے سوال کا۔

"ہماری بیٹی ہماری ذمہ داری ہے سکندر! ہمیں ہی اٹھانی ہے۔" یاسیت سے کہتے ہوئے وہ ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن میں رکھنے چل دیں۔

ماسی آگئی تھی۔ وہ گھر کی صفائی ستھرائی اور برتن وغیرہ دھونے کا کام کرتی تھی۔ ہفتے میں دو بار مشین لگاتی تھی۔ عافیہ بیگم ہنڈیا پکا کر رکھ دیتی تھیں جو دونوں وقت کے لیے کافی ہوتی' آٹا بھی گوندھ دیتی تھیں۔ وہ سیکنڈ شفٹ میں پڑھاتی تھیں۔ ان کے اسکول جانے کے بعد بچے کالج' یونیورسٹی سے آجاتے' تو ماسی پھلکے ڈال دیتی تھی۔ وہ کبھی چھٹی پر ہوتی تو یہ کام سونیا کرتی شام میں' رات میں کچھ اور کھانے کا موڈ ہوتا تو بچے کبھی خود کچھ شغل کر لیتے یا کبھی بازار کا رخ کرتے۔ وہ شام کو تھکی ہاری آتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

تنے ہوئے شرارے پر چھپائی مکمل ہوئی تو اس نے چھاپے سمیت سارا ساز و سامان ٹھکانے پر رکھا اور اڈے پہ بیٹھ گئی۔ کروشیے کی نوک والی اڈے کی سوئی بڑی مہارت سے ریشم اور کلابتو کے پھولوں کی دھنک سرخ شرارے پر بکھیر رہی تھی۔

"آپی! چھاپ لیا شرارہ؟" لڈو نے اندر جھانکا۔

"بنانا بھی شروع کر دیا۔ تم لوگ کب آؤ گے؟" سوئی کو گول گول گھما کر نیچے سے ٹانکے نکالتے ہوئے صفا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا۔

"ہم لوگ بس ابھی آرہے ہیں آپی' آدھے گھنٹے کی ریسلنگ اور رہ گئی ہے۔" "یہ جوڑا اگر لیٹ گیا نا تو ابو اچھی طرح خبر لیں گے تم سب کی' میں تو کہہ دوں گی' میں نے اپنا کام مکمل کر دیا ہے۔" صفا نے دھمکانے کی کوشش کی۔

"لیٹ نہیں ہو گا ہم لیٹ نائٹ شفٹ لگا لیں گے۔"

"ابو پوچھیں گے نہیں کہ یہ لیٹ نائٹ شفٹ کیوں لگ رہی ہے؟"

"ان کے سونے کے بعد لگائیں گے نا!" وہ چودہ پندرہ سال کا بڑا پیارا اور بلی با بچہ تھا۔ فرماں بردار' تمیزدار' بس ذرا اپنے سے تھوڑی سی بڑی بہنوں کا شوق اسے بھی لگ گیا تھا۔ ریسلنگ کے ساتھ ساتھ ڈراموں کا شوقین ہو گیا تھا۔ دو تین ڈرامے تھے جنہیں بڑی پابندی اور انہماک کے ساتھ یہ تینوں دیکھا کرتے تھے۔

دو تین گھنٹے ٹی وی کے سامنے گزارتے تو اس کام کا بہت حرج ہوتا جو ان گھنٹوں میں انہیں کرنا ہوتا تھا لہٰذا اپنا شوق پورا کر کے' رات میں ابو کے سونے کے بعد شفٹ لگاتے اور ادھورا کام جلدی جلدی مکمل کرتے۔

یہ لوگ اڈے کی کڑھائی کا کام کرتے تھے۔ اس کام کے اور دو سرے نام بھی ہیں۔ آری کا کام' زردوزی کا کام۔ یہ دو بہنیں اور تین بھائی اپنے گھر پر یہی کام کرتے تھے' مال کا آرڈر لانا' بنانے کے لیے ساز و سامان لانا' تیار مال کو بیچنا' یہ سب ذمہ داری باپ نے لی ہوئی تھی۔ ان بچوں کا کام صرف یہ تھا کہ جس میٹریل پر جس طرح کی کڑھائی مطلوب ہوتی' وہی کام کر کے

ملبوسات تیار کرتے ' زیادہ تر شرارے ' لہنگے میکسیاں' فراکیں اور کبھی کبھار ساڑھیوں کے آرڈر آتے تھے۔

یہ ان سب کے لیے ایک فل ٹائم جاب تھی۔ صبح ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر حد سے حد نو بجے تک یہ سب اڈے پہ بیٹھ جاتے اور شام چھ بجے اٹھتے تھے۔ بیچ میں کھانے اور نماز کا ایک گھنٹے کا وقفہ تھا۔

ان کے ابو صاحب "امیر عثمان کی لیاقت مارکیٹ میں فینسی کپڑوں کی دکان تھی۔ چھوٹی سی دکان تھی اور مال بھی بہت بھرا ہوا نہیں تھا مگر جو کچھ بھی مال وہ بنواتے تھے ' ٹھیک ٹھاک بک جاتا تھا اور عزت سے گزارا ہو رہا تھا۔ اسی آمدنی سے گھر بھی بنا لیا تھا۔ ایک بیٹی کی شادی بھی کر دی تھی۔ بنیادی طور پر وہ محنتی اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والے شخص تھے مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں غصیلا پن بھی تھا۔ بلکہ کسی حد تک سخت مزاج۔ زندگی' افراد اور معاشرے کے بارے میں ان کے اپنے مخصوص نظریات تھے ' جن پر وہ سختی سے کاربند تھے۔

انہیں لوگوں سے حتیٰ کہ رشتے داروں سے بھی بہت زیادہ میل جول پسند نہیں تھا۔ ایک حد میں رہ کر وہ سب سے ملتے تھے "وہ" سے مراد امیر عثمان نہیں بلکہ ان کی فیملی ہے جو ان کے بنائے ہوئے ضابطوں' قاعدوں اور قوانین پر پوری طرح عمل پیرا تھی۔ بیٹی ہو یا بیٹا میٹرک کے بعد کالج کی اجازت کسی کو نہیں ملی۔ جسے آگے پڑھنا ہو وہ پرائیویٹ پڑھ لے گھر پر ٹیوٹر کے بندوبست کی سہولت موجود تھی۔

وہ خود اڈے کے کام کے بہت اچھے کاریگر تھے۔ اپنے تمام بچوں کو چھوٹی عمر سے ہی یہ ہنر سکھانا شروع کر دیا تھا۔ بچے بڑے ہوتے گئے اور خود بھی کاریگر بنتے گئے۔ گھر کے تمام کام لگے بندھے انداز میں ہوتے تھے۔

ان کے رعب اور مہیا کی گئی تمام تر سہولیات نے بیوی' بچوں کو ایک سانچے میں ڈھال دیا تھا' ان کی مرضی کے سانچے میں' بچے خاص طور پر لڑکے 'ان کے بنائے ہوئے دائرے سے معمولی سا باہر نکل کر تھوڑی بہت اپنی مرضی کی انجوائے منٹ کر لیتے مگر دائرے سے باہر زیادہ آگے تک جانے کی ہمت نہیں تھی ان میں۔ تھوڑی بہت دل پشوری کر کے ہی خوش ہو لیتے۔

ولید عرف گڈو' نعمان عرف نومی اور زوہیب تینوں بھائی بڑے انہماک سے ایل ای ڈی کے آگے جمے ہوئے تھے ' ابو کے آنے کا ٹائم ابھی نہیں ہوا تھا۔ آ بھی جاتے تو وہ نیچے ہی ہوتے تھے۔ ایک آدھ چکر لگا لیتے تھے کام کا جائزہ لینے کے لیے کہ کہاں تک پہنچا۔ اوپر کے پورے پورشن میں دو کمرے لڑکوں کے تھے ' باقی ایک ہال نما کمرے میں یہ لوگ اپنا کام کرتے تھے۔

"پتا نہیں گڈو نے دوپٹے میں لئی ٹھیک سے لگائی کہ نہیں 'کہیں ریسلنگ کے چکر میں الٹی سیدھی' تھوپ دی ہو۔" صفا کو معاً "یاد آیا تو فکر لاحق ہو گئی۔

"دیکھ ہی لوں۔" کچھ دیر ادھیڑ بن میں رہنے کے بعد بالآخر وہ کھڑی ہو گئی۔

اس ہال نما کمرے کے آگے ' گلی کی طرف ایک چوڑی اور لمبی بالکنی تھی جو تین طرف سے لوہے کی گرل سے پیک تھی' چوتھی طرف کمرے کی دیوار اور کھڑکی تھی۔ تیار شدہ کپڑوں اور دوپٹوں کو لئی لگا کر سوکھنے کے لیے یہیں رکھتے تھے۔ یہاں اڈا پورا آ جاتا تھا اور ہوا بھی اچھی آتی تھی۔

دوپٹے کا معائنہ کر کے وہ مطمئن ہو گئی۔ لئی تو ٹھیک لگائی تھی گڈو نے 'اس نے بالکنی میں آتی فرحت بخش ہوا اپنے چہرے پہ محسوس کی 'بالکنی کی دیوار اس کی ناک تک آتی تھی پھر گرل شروع ہو جاتی تھی وہ پانچ فٹ دو انچ کی دبلی پتلی سی لڑکی تھی۔ ابو نے دیوار اپنے قد کے حساب سے بنوائی تھی' وہ لمبے تھے۔ گھر میں اور کوئی ان کی طرح لمبا نہیں تھا' ہاں فیض تھا جو ان کی ہی طرح لمبا تھا۔

صفا اندر آ کر دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہو گئی مگر دل و دماغ کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ فیضی کا خیال آتے ہی اس کی باتیں اور حرکتیں یاد آنے لگیں ' جنہیں وہ اس کے منہ پر تو اوٹ پٹانگ اور فضول کہتی تھی مگر پیٹھ پیچھے 'اس کی وہی باتیں اور حرکتیں سوچتی تو

اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگتی اور کبھی کبھی اس کی باتیں ایسی ہوتی تھیں جو دل کو چھونے کے بجائے ٹھک سے دل پہ جا کر لگ جاتیں۔ ابھی تو آیا تھا وہ پچھلے ہفتے' ابو کے سامنے تو بڑا مودب بنا رہتا تھا۔ شائستگی اور تہذیب کے سارے ریکارڈ توڑ دیتا تھا۔ اور ان کے پیچھے اپنے ہی بولنے کے پچھلے ریکارڈ توڑتا رہتا تھا۔ ہر بار صفا کو کوئی نہ کوئی نام یا خطاب دے جاتا تھا اس بار اسے بار بار پنجرے کا قیدی کہہ کر چھیڑتا رہا تھا۔

"تمہارا دل نہیں گھبراتا اس قید میں؟ کبھی پنجرے سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں سانس لینے' آزاد فضاؤں میں اڑنے کا دل نہیں چاہتا تمہارا؟"

اف اس کے نان اسٹاپ سوالات۔ صفا کی کالی گھور سیاہ آنکھوں میں برہمی ہلکورے لینے لگتی۔

"تمہیں یہ وہم کب سے ہو گیا کہ ہم پنجرے کے قیدی ہیں؟ ہمارے ابو ہمیں سب جگہ گھماتے ہیں' شاپنگ پر بھی لے جاتے ہیں۔"

"اچھا! سال چھ مہینے میں ایک آدھ بار کبھی گھومنے چلی گئیں یا شاپنگ کرلی تو بڑا تیر مار لیا۔ اسکول کے بعد کالج کا منہ نہیں دیکھا' یونی ورسٹی کے بارے میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتیں۔ اکیلے کہیں آنے جانے کی' سہیلیاں بنانے کی' موبائل رکھنے کی تمہیں اجازت نہیں۔ چلو بتاؤ' تمہیں ہمارے گھر یعنی اپنی سگی خالہ کے گھر آئے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔"

"عید پر تو آئے تھے۔" صفا بے ساختہ بولی۔

"اور اب دوسری عید آنے والی ہے' اگلے ماہ سے رمضان کا مہینہ شروع ہو رہا ہے۔" فیضی نے اسے لاجواب کیا تھا۔

"اپنے ہی کام اتنے ہیں' فرصت ہی نہیں ملتی۔" صفا نے بے نیازی دکھائی مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک ہی تھا۔

"کیا نہیں ملتی؟ فرصت یا اجازت؟"

"تم ہمارے ابو کے پیچھے کیوں پڑے رہتے ہو؟" صفا نے گھورا۔

"کیوں کہ انہوں نے تم سب کو پنجرے کا قیدی بنایا ہوا ہے۔"

"امی کے سامنے کرو ایسی باتیں' بتائیں گی تمہیں۔"

"توبہ کرو۔" اس نے کانوں کو چھوا۔

"ایک میری امی' ایک تمہاری امی' ایسی شوہر پرست خواتین' اپنی اس جوانی میں کہیں اور نہیں دیکھیں۔" وہ ہنستا۔

"شرم نہیں آتی امیوں کا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"مذاق نہیں اڑا رہا یار! قسم سے کبھی کبھی میں بڑا ایکسائیٹڈ ہوتا ہوں۔ سوچتا ہوں کاش مجھے بھی ایسی ہی بیوی ملے' میری امی کا عکس لیے کوئی لڑکی یا خالہ کا رنگ لیے کوئی لڑکی۔ ویسے کہنے والے کہتے ہیں کہ تم بالکل خالہ جیسی ہو۔" فیضی نے چند لمحوں بعد اچانک کہا اور صفا یک ٹک اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

"آپا!" روا نے اندر آتے ہوئے اسے پکارا۔

"ہاں!" وہ اپنے خیالوں سے چونک پڑی۔

"جیا آپا کا فون آیا تھا' وہ رات میں آئیں گی۔ انہوں نے کہا ہے کہ وہی بڑے بنا بھیجے گا۔" جیا کو ہی کیا گھر بھر کو صفا کے ہاتھ کے دہی بڑے بہت پسند تھے۔ یہ اور بات تھی کہ اسے دہی بڑوں کے علاوہ اور کچھ پکانا کچھ اتنا اچھا نہیں آتا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے' میں اپنا کام جلدی نپٹا کر آتی ہوں۔"

صفا نے سر ہلایا اور ہاتھ تیزی سے چلانے لگی' ہاتھ کے ساتھ ساتھ خیالات کی رو بھی تیزی سے چل رہی تھی۔ فیضی کی باتیں یاد کرتے کرتے دماغ میں اور ہی لہر چل پڑی۔

"کیا ہم واقعی پنجرے کے قیدی ہیں؟" اسے زندگی میں بہت سی چیزوں کا خیال آتا تھا کہ اگر وہ ہوتیں تو اچھا ہوتا۔ ذاتی موبائل رکھنے کی آزادی' انٹرنیٹ تک رسائی' اس کے لیے فینٹسیز کے ساتھ ساتھ شجر ممنوعہ تھیں۔ کالج' یونیورسٹی جیسے خواب کبھی کبھی اسے آزردہ کر دیتے تھے۔

وہ پرائیوٹ بی اے فائنل کا امتحان دے رہی تھی۔ پچھلے سال اس کی پرسنٹیج بہت اچھی آئی تھی، اتنی اچھی کہ اس کی ٹیوٹر مسز ابراہیم شیخ نے اس سے کہا کہ جتنی محنت اس میں کی ہے، اس سے تھوڑی زیادہ اور کرلینا، پھر فائنل میں تمہاری بورڈ کی پوزیشن کوئی نہیں روک سکتا۔

"کیوں اتنے اونچے اونچے خواب دکھا رہی ہیں۔"

وہ ہنس پڑی تھی۔

رشتے داروں کے ہاں، محلے والوں کے ہاں، بہت زیادہ آنا جانا نہیں تھا، جب وہ چھوٹی تھی تو اس کا بہت دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اور بچوں کی طرح اپنی نانی کے گھر رہنے جائے۔ رکنے جائے، بڑی ہوئی تو اس محرومی پر بھی صبر کرلیا یا پھر سمجھوتہ کرلیا۔ گھر میں کزنز لڑکے ہوں یا لڑکیاں کم ہی آتے تھے، بس ایک فیضی تھا جو پچھلے ایک سال سے گڈو، نومی اور زوہیب کو پڑھانے لگا تھا تو اس کی آمد معمول بن گئی تھی، مگر صفا سے اس کا ٹاکرا یا مناظرہ معمول نہیں تھا۔ ہفتے دو ہفتے میں کبھی وہ چائے کا کپ لے کر خالہ سے اجازت لے کر چھت پر جاتا تو بیچ میں ٹھہر کر دس پندرہ منٹ صفا سے چھیڑ چھاڑ کرکے منہ کا ذائقہ بدل لیتا۔ دراصل یونی میں اس کے حلقہ احباب میں جو لڑکیاں تھیں وہ تقریباً سب کی سب ہی بڑی شارپ، صاف گو اور ذہانت و فطانت سے مالا مال تھیں، وہ نہ خود کو لڑکیاں سمجھتیں اور نہ اسے لڑکا۔

کبھی وہ اپنے لڑکا ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی کو لائن دینے کی کوشش کرتا یا کوئی ذو معنی فقرہ کہتا تو پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتیں۔

"اے مسٹر! یہاں تعلیم حاصل کرنے آئے ہو۔ وہی کرو، ہیرو بننے کا شوق ہے تو ناپا میں ایڈمیشن لے لو۔"

بے حد ڈیشنگ، ہینڈسم اور اسمارٹ سا فیض احمد عرف فیضی اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔

اور پھر ایک بار تو حد ہی ہوگئی۔ علیزے خان ان کے گروپ کی اتنی خوب صورت، طرح دار علیزے بے اختیار اپنے دل سے مجبور ہو کر اسے کئی بار "تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔" کہہ بیٹھا۔

خوب صورت، طرح دار علیزے خان نے ایک روز پورے گروپ کے سامنے بیٹھ کر اس سے پوچھ لیا۔

"میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہوں نا، پھر اب بتاؤ، اپنے والدین کو کب بھیجو گے میرے گھر رشتہ لینے اور ہم شادی کب کریں گے؟"

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ غصے اور اہانت سے فیض کا منہ سرخ ہوگیا۔

"لعنت ہو تم پہ۔" کہہ کر وہاں سے واک آؤٹ کر گیا تو ایسا پس منظر اور حلقہ احباب رکھنے والے فیضی کو خالہ کی نسبتاً "سیدھی سادی" بھولی بھالی دنیا بھر کی مکاریوں اور چلتر پن سے دور صفا اچھی لگنے لگی تھی۔

اگر یہ بات وہ صفا کو بتاتا تو وہ علیزے کی طرح کبھی بھی اس کا مذاق نہیں اڑائے گی اسے یکا یقین تھا اور وہ کوئی بہت زیادہ نظر باز یا فلرٹی قسم کا لڑکا نہیں تھا۔ فائنل ہوتے ہی جاب کرنی تھی اور پھر رشتہ اور شادی، اس نے سارا منصوبہ دل ہی دل میں بنایا ہوا تھا۔

✲ ✲ ✲

عافیہ سکندر کو اہتمام سے آئینہ دیکھے ہوئے ہفتوں گزر جاتے تھے، بس روزانہ اسکول جاتے وقت جلدی جلدی چہرے اور گردن پر کریم تھوپی، لپ اسٹک رگڑی اور یہ جا وہ جا، مگر سکندر آج بھی ان کی آنکھوں کی، زلفوں کی، لب و رخسار کی تعریفیں کرتے تھے۔

"کیا واقعی میں آج بھی حسین ہوں یا سکندر کی نظروں کا حسن ہے، جو مجھے حسین بنائے ہوئے ہے۔"

آج وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لے رہی تھیں۔ ان کی کولیگ مسز جمال کا کہنا تھا کہ "مرد ذات بڑی بدذات ہوتی ہے۔" ان کے شوہر نے انہیں اپنی محبت کے منتر سے یوں مسحور کر رکھا تھا کہ انہیں دو سال بعد اپنے میاں کی دوسری خفیہ شادی کا پتا چلا تھا۔

اور مس فریدہ یہی بات عورتوں کے متعلق کہتی

تھیں کہ برسوں پہلے ان کی خوب صورت سہیلی نے ان کے منگیتر کو اپنے دام الفت میں پھنسا کر شادی رچالی تھی اور مس فریدہ آج بھی کنواری تھیں۔ اب تو عمر کی سہ پہر ڈھلنے لگی تھی۔ سب کے اپنے اپنے تجربات ہوتے ہیں جن کی کسوٹی پر وہ کسی کے بھی متعلق رائے قائم کرتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اسے نظریہ بنا لیتے ہیں اور پھر عقیدہ۔

عافیہ سکندر محبت کے سفر میں چلتے چلتے اب تھکنے لگی تھیں۔ کبھی کبھی قدم لڑکھڑا بھی جاتے تھے۔ اس سفر میں سکندر سمیت سب کا بوجھ ان ہی کے کندھوں پر تھا تو کیسے نہ تھکتیں۔

کیا واقعی مرد ذات بڑی بدذات ہوتی ہے۔ محبت کی بین ہی بجاتا رہتا ہے اور عورت زندگی کی پٹاری میں جھوم جھوم کر قید ہوتی رہتی ہے۔ اب چاہے دم گھٹے یا دم نکلے' اسی دائرے میں گھومتے رہو۔

پریا کی شادی کے لیے وہ جتنا پریشان تھیں' سکندر اس کا عشر عشیر بھی نہیں تھے۔ ان کی وہی باتیں' وہی منصوبے' ڈیزائنر سوٹ اپنا بوتیک' شاندار کاروبار' اس سے بھی شاندار منافع مگر ہوائی قلعے بنانا بہت آسان اور عملی طور پر کوئی قلعہ تعمیر کرنا؟ محنت لگتی ہے اور بہت' بہت زیادہ محنت لگتی ہے اور ایک یہی کام تھا جو ان کے بس میں نہیں تھا اور جس کے بس میں یہ کام نہ ہو وہ زندگی میں کبھی کچھ نہیں کر سکتا۔

سکندر بخت' خوش بخت تھے کہ بیوی کے دل پہ راج کر کے اور سر پہ چڑھ کے اتنی مسافت طے کر لی ورنہ ایسے لوگوں کی جگہ عموماً" ٹھوکروں میں ہی ہوتی ہے۔

عافیہ سکندر سوچ سوچ کر اور پریشان ہو ہو کر تھک گئیں تو سسر سے بات کی۔ سکندر کا مشورہ بھی انہیں بتا دیا سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئے اور زبان روکتے روکتے بھی بیٹے کی شان میں دو چار القابات نکل ہی پڑے۔

"نالائق' نانجار' بے غیرت' الو کا پٹھا۔" گولی کی سی رفتار سے الفاظ ان کے منہ سے نکلے اور گولی بن کر ہی عافیہ کے دل میں پیوست ہو گئے۔

ایک تو محبت کرنے والوں کے ساتھ یہ مصیبت بھی خوب ہے کہ محبوب کی خامیوں پہ خود بے شک کڑھتے رہیں مگر کوئی دوسرا ان زخموں کو کرید دے تو دل دکھنے لگتا ہے۔

بیچنے کو تو میں یہ پلاٹ بیچ دوں' پریا کی شادی ہو جائے گی دھوم دھام سے پھر؟ آگے جو دو اور ہیں ان کی شادیوں پہ کون سے پلاٹ بیچنے کا مشورہ دے گا یہ....."
بہو کی شکل دیکھ کر انہیں ترس آیا تو نرم لہجے میں بولے۔

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ پلاٹ بیچیں میں تو بس اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آئی ہوں آپ کے پاس' ورنہ مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ پریا کی شادی آپ کی نہیں ہماری ذمہ داری ہے۔"

"جتنا احساس' ہر بات کا تم رکھتی ہو اس سے آدھا بھی تمہارا شوہر کر لے نا تو گھر کے بہت سے مسئلے حل ہو جائیں۔ ناممکن بات کرنے سے بہتر ہے' ممکنات پر بات کریں۔"

عافیہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیں۔ ان کے پاس کیا حل تھا۔

"کچھ رقم بینک میں جمع ہے۔ لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ ہوں گے' وہ دے دوں گا۔"

"وہ آپ نے جس مقصد کے لیے جمع کیے ہیں اللہ اسے پورا کرے' آپ کچھ دینے یا کرنے کے لیے پریشان مت ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں آپ سے سب مسئلے ڈسکس کرتی ہوں۔ اسی لیے یہ بات بھی کر لی۔ سکندر اور بچوں کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔ ان لوگوں سے کچھ کہنا بے کار ہے۔" عافیہ ان کی پیش کش سن کر شرمندہ سی ہو گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اپنی پنشن کے پیسوں سے عمرے کے لیے رقم جمع کر رہے تھے۔

"پھر کیا کرو گی؟"

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ کوئی نہ کوئی سبب تو بنا ہی دے گا۔" وہ بوجھل دل کے ساتھ وہاں سے اٹھ گئیں۔

اور اللہ واقعی مسبب الاسباب ہے۔ بڑی آپا کی کمیٹی کھلی تھی۔ دو ماہ پہلے ہی شروع ہوئی تھی، تیسری ان کی کھل گئی۔ دس ہزار پہ چار لاکھ کی، وہ کمیٹی انہوں نے عافیہ کو دے دی۔

"یہ لو بھئی، اللہ نے انتظام کر دیا تمہارے مسئلے کا، اب آگے کی کمیٹی تم بھرتی رہنا، جو تین میں نے بھری ہیں ان کا حساب کر دینا، جب تمہیں آسانی ہو۔"

"آپا!" شدت جذبات سے ان کا گلا رندھ گیا، بڑی بہن تھیں، ماں کی جگہ، کبھی کبھی بالکل ہی ماں بن جاتی تھیں۔

"چلو بس، زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔" انہوں نے عافیہ کا ہاتھ تھپتھپایا۔

"ہاں کہتے تو یہی ہیں کہ اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں مگر شوہر کا، باپ کا رشتہ بھی تو اپنا ہوتا ہے پھر سکندر بخت کیوں اپنا نہیں بنا، نہ بیوی کے لیے۔ نہ بیٹی کے لیے شاید کچھ اپنے ایسے ہی ہوتے ہیں پرائے جیسے۔"

"زیور تو ہے نا تمہارے پاس۔"

"ہاں، اس کو دے کر نئے ڈیزائن کا سیٹ لے لوں گی، کڑے پچھلے سال پریا کی پسند کے بنوائے تھے، وہ رکھے ہیں۔"

مسئلہ حل ہو گیا تھا مگر آگے ایک اور مسئلہ تھا، پہلے ہی اچھی خاصی رقم کمیٹیوں میں بھر رہی تھیں، اب اکٹھی دس ہزار کی رقم نکالنا بہت زیادہ مشکل تھا۔ مگر پھر انہیں فیضی کا خیال آیا۔ اس کا فائنل ایئر تھا۔ شام میں وہ ایک کوچنگ سینٹر میں پڑھا رہا تھا۔

"فیضی سے کہوں گی کہ آدھی کمیٹی وہ بھر دے، آدھی میں بھر دیا کروں گی۔" وہ سوچ کر مطمئن ہو گئیں۔

مگر فیضی تو پھر صرف فیض احمد تھوڑی تھا۔ فیض احمد سکندر بخت بھی تو تھا۔ جو جینز ورثے میں ملے تھے اس میں ایک خود غرضی کا بھی تھا۔ اپنے باپ کی طرح اسے بھی نئے نئے نکات خوب سوجھتے تھے۔

"مجھے ملتے ہی کتنے ہیں جو اس میں سے کمیٹی بھی بھر دوں۔ میرے اپنے خرچے کیا کم ہیں اور یہ بات آپ پریا سے کیوں نہیں کہتیں۔ جو کماتی ہے اڑا دیتی ہے۔ شادی اس کی ہے، خرچے اس کے ہیں، کمیٹی تو وہ خود بھی بھر سکتی ہے۔ بلکہ اسے ہی بھرنی چاہیے۔ اچھا خاصا کماتی ہے اسی لیے تو شادی کے بعد بھی اپنی جاب چھوڑنے پر راضی نہیں۔ پہلے ہی سسرال والوں سے بات کر لی کہ بعد میں بھی جاب کرتی رہے گی۔"

تقریر جھاڑتا ہوا وہ ہو بہو سکندر بخت لگ رہا تھا۔ عافیہ بے بسی سے اسے دیکھتی اور سنتی رہ گئیں۔

"شادی کے بعد وہ اپنی سسرال میں ہو گی، اچھا لگے گا کہ اپنی کمائی سے یہاں کمیٹی بھرے؟"

"تو کیا ہوا؟ اس کی شادی پہ یہ کمیٹی خرچ ہو گی۔ آدھی بھر دے گی تو کیا قیامت آجائے گی اور ویسے بھی اس کے سسرال میں ہے ہی کون، کچھ کہنے بولنے والا، ساس خود لیکچرار ہیں۔ سسر بھی جاب کرتے ہیں۔ نندیں شادی شدہ اور وہ ہمارے پیارے بہنوئی اللہ میاں کی گائے، سب لوگ اتنے سوئٹ ہیں۔ آپ کو کس کا ڈر ہے؟"

"بے شک سب لوگ بہت سوئٹ ہیں مگر پھر بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"آپ کو اس لیے اچھا نہیں لگتا کہ آپ میں مروت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔"

"یہ مروت نہیں ہے، ماں کی محبت ہے۔"

"ہو سکتا ہے مگر آپ حد سے زیادہ بامروت ہیں۔ جن لوگوں کی آپ ماں نہیں ہیں۔ آپ ان سے بھی بہت زیادہ مروت دکھاتی ہیں۔"

فیضی سچ کہہ رہا تھا، وہ خاموش ہو گئیں۔ گھر میں سب کو معلوم تھا کہ امی کس ٹینشن میں ہیں اور کن مسئلوں سے دوچار ہیں مگر احساس کسی کو نہیں تھا سوائے دادا جان اور ان کی پوتی کے۔ سونیا ایف ایس سی میں تو بڑا اچھا رزلٹ لائی تھی مگر میڈیکل کے انٹری ٹیسٹ میں ناکام ہو گئی تھی۔ سو اب بی ایس سی کر رہی تھی، شام میں۔ اس نے حال ہی میں اکیڈمی جوائن کی تھی۔ فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی تینوں مضامین میں

اچھی تھی۔ سو یہ مضامین پڑھانے کا معقول معاوضہ مل رہا تھا۔

مہینہ ختم ہوا سیلری ملی تو پانچ ہزار ماں کے ہاتھ پہ رکھ دیے۔ وہ اتنی حیران ہوئیں کہ آنکھیں بھر آئیں۔ دراصل اتنے سالوں میں اپنے کندھوں پہ بوجھ اٹھانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ بیٹی نے معمولی طور پر اپنا کاندھا پیش کیا تو ان کے کاندھے سبک ہو گئے اور دل بھر آیا۔ سارے ہی سکے کھوٹے نہیں تھے۔ یہ تو بڑا نایاب بڑا قیمتی سکہ تھا۔

☆ ☆ ☆

پریا کی شادی سے دو ہفتے پہلے سکندر کی کزن ٹورنٹو سے آگئی تھیں اپنے ایک عدد بیٹے کے ہمراہ' میکے کے نام پر ایک سگا بھائی تھا جو خود آسٹریلیا میں تھا' ایک بہن اسلام آباد میں وہاں ایک ہفتہ رہ کر کراچی آئیں۔ بڑی اسمارٹ سی چاق و چوبند اور محنتی' وہاں ایک جم میں ملازمت کرتی تھیں۔

پانچ سال ہو گئے تھے شوہر کے انتقال کو اور دو سال پہلے ان کا بیٹا انجینئر بنا تھا۔ یہاں آنے کا ان کا مقصد وہی تھا جو عموماً "پردیس رہنی والی بہت سی فیملیز کا ہوتا ہے کہ اپنی جوانی ساری وہیں گزاریں گے' بچوں کو چھوٹے سے بڑا کرلیں گے اور جب شادی کا وقت آئے تو بر ڈھونڈنے کے لیے دیس کی طرف بھاگے بھاگے آتے ہیں۔ لڑکی کی تلاش ان کا نہیں ان کے بیٹے کا مسئلہ تھا۔ لڑکیوں کے ساتھ پڑھتا تھا لڑکیوں کے ساتھ جاب کرتا تھا۔ اسے کوئی لڑکی سمجھ میں نہیں آتی تھی' نہ دیسی' نہ بدیسی پھر بھی وہ لے آئی تھیں ادھر کیا پتا کوئی پسند آ ہی جائے' اتنی پسند کہ اس سے شادی کا فیصلہ کر ہی لے۔

عافیہ نے چھٹیاں لی ہوئی تھیں۔ کتنے کام نمٹ گئے تھے۔ کتنے رہ گئے تھے وہ تن دہی سے لگی ہوئی تھیں انہیں اردگرد کا دھیان ہی نہیں تھا کہ وہ ٹورنٹو سے آنے والا شکیب عرف شوبی' سونیا سے کتنے سوالات کرتا ہے۔ اس کی دوستی دادا سے بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ان کی محفل میں سکندر بخت بھی شامل تھے۔ وہ اپنے شان دار پلانز' اونچے اونچے منصوبے اسے بتاتے اور وہ زیر لب مسکراتا رہتا۔ اس کی "مام" اسے آنکھوں آنکھوں میں گھورتیں' خاموش "تنبیہہ" کرتیں اور دادا قہقہہ لگاتے ہوئے اسے تھپکی دیتے۔

"یار! تو پلا بڑھا ہے کینیڈا میں مگر تیری بعض عادتیں پکی پاکستانیوں والی ہیں۔"

"بعض نہیں' تقریباً" ساری' بائے برتھ اور بائے جینز تو میں پاکستانی ہی ہوں۔" وہ مزے سے جواب دیتا۔

"آپ کو معلوم ہے مس سونیا! زندگی گزارنے کے لیے سب سے اہم چیز کیا ہے؟"

"آکسیجن! اس کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔" وہ سائنس کی طالبہ تھی اور ذہنی طور پر بھی سائنسی اور منطقی رجحان رکھتی تھی' جذباتیت سے دور۔

"اس سے بھی زیادہ ضروری ایک اور شے ہے۔" شوبی کی سرمئی آنکھوں میں شرارت کی چمک آجاتی۔

"ہوا' غذا' سانس' پانی۔" وہ ایک ہی سانس میں کئی جوابات دے ڈالتی "کوئی تو صحیح ہو گا۔"

"اونہوں!" وہ نفی میں سر ہلاتا۔ "سوال پہ غور کرو۔" زندگی گزارنے کے لیے۔۔۔؟" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا۔

"دولت؟ قسمت؟ عزت؟ محبت؟" وہ دوسرے زاویے سے سوچنے کی کوشش کرتی۔

"تمہارا آئی کیو بہت پور ٹائپ ہے۔" وہ افسوس سے سر ہلاتا ہوا سونیا کو زہر لگتا۔ کس نے کہا تھا اس شخص کو کہ سونیا کا امتحان لے کر اس کی ذہانت چیک کرے اور ریمارکس دے۔

"اب ہے کیا اس سوال کا جواب؟" وہ جھنجلا جاتی صبر کا بھی امتحان لیتا ہے یہ آدمی اچھے بھلے لڑکے کو وہ کبھی شخص تو کبھی آدمی کے خطاب سے نوازتی مگر دل ہی دل میں۔

"زندگی گزارنے کے لیے سب سے ضروری شے خود زندگی ہے میڈم! زندگی ہو گی تو ہم اسے گزاریں

گے نا۔"

احمقانہ سوال اور اس سے بھی زیادہ احمقانہ جواب وہ بھنا جاتی' بیٹے سے اچھی ماں تھی علی الصبح اٹھ کر خود بھی ایکسرسائز کرتی تھیں اور جو بھی بیدار ملتا اسے بھی کرواتیں۔

دادا کو تو انہوں نے آسان آسان سی ایک دو ایکسرسائز کی اچھی پریکٹس کروادی تھی۔ سونیا کو بھی شوق ہو رہا تھا خود کو فٹ رکھنے کا' شادی تک تھوڑی سی تو سلم ہو ہی جاؤں۔ اس کا بدن تھوڑا گداز تھا' جسے وہ موٹاپا کہتی اور موٹاپا ہی سمجھتی تھی۔

آم دیکھ دیکھ کر کب سے دل للچا رہا تھا۔ کھانے کے بعد سب آم کھاتے تھے۔ وہ بھی کھاتی تھی مگر مزا نہیں آتا تھا۔ آم بھی کوئی چمچے اور کانٹے سے کھانے کی چیز ہے؟ تمیز تہذیب کا مظاہرہ تو ہو جاتا ہے مگر آم کھانے کا سارا لطف جاتا رہتا ہے۔

سہ پہر کے وقت تقریباً" سب ہی قیلولہ کرتے تھے سو اس نے فریج سے آم نکالے اور چھیل کاٹ کر ٹرے سمیت لاؤنج میں بیٹھ گئی۔

"اف کتنا مزا آتا ہے ایسے آم کھانے میں۔" گٹھلی ہاتھ میں لیے وہ مزے سے چوس رہی تھی۔

"اچھا تو آم ایسے بھی کھائے جاتے ہیں؟" پتا نہیں وہ غیر ملکی جاسوس کب سے اس کی جاسوسی کر رہا تھا۔ سونیا کے ہاتھ سے گٹھلی چھوٹتے چھوٹتے بچی۔

"آم ایسے بھی نہیں' بلکہ ایسے ہی کھائے جاتے ہیں۔" شرمندہ ہونے کے بجائے اس نے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

"اس میں کیا خاص بات ہے؟" وہ آگے بڑھا۔

"ایسے کھانے سے آم زیادہ میٹھا اور زیادہ مزے دار لگتا ہے۔"

"کھا کے دیکھوں؟" شوبی نے ایک گٹھلی اٹھائی۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"کپڑے خراب ہو جائیں گے آپ کے؟"

"آپ کے تو نہیں ہوئے۔"

"مجھے تو پریکٹس ہے' میں بچپن سے اس طرح آم کھا رہی ہوں۔" سونیا نے تیزی سے جواب دیا۔

"مجھے آپ سے زیادہ پریکٹس ہے۔ میں بھی اپنے بچپن سے اسی طرح آم کھا رہا ہوں' ان فیکٹ پورے سب کونٹیننٹ کی عوام آم اسی طرح کھاتی ہے۔ چاہے وہ کہیں بھی رہتے بستے ہوں ویسے میں اور دادا تو روزانہ رات بارہ بجے کے بعد اسی طرح آم کھا رہے ہیں۔ آپ کو صبح کچن میں آم کے چھلکے اور گٹھلیاں نہیں ملتے تھے؟ یا شاید آپ نے کبھی نوٹس ہی نہیں کیا' آئی کیو کے ساتھ ساتھ آپ کی آبزرویشن بھی خاصی کمزور ہے۔"

وہ مزے سے گٹھلی چوستا جا رہا تھا اور بولتا جا رہا تھا۔ سونیا آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی اور سن بھی رہی تھی۔ یکایک غصے کی ایک شدید لہر نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگا دی۔ یہ شخص خود کو بھلے سے افلاطون سمجھے' الیگزینڈر دی گریٹ سمجھے' اسٹیفن ہاکنگ یا بل گیٹس سمجھے مگر مجھے بے وقوف سمجھنے اور بنانے کی جرأت کیسے ہوئی اسے؟ وہ غصے میں تن کر کھڑی ہو گئی۔

"بیٹھ جائیے' غصہ صحت کے لیے مفید نہیں ہوتا۔" شوبی نے ہاتھ ہلا کر جیسے مکھی اڑائی تھی اور ہاں واقعی اس نے وہ موئی سی مکھی ہی اڑائی تھی جو آم کی خوشبو پر فوراً" آجاتی ہے۔

"آپ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؟" غم و غصے کے مارے اس کی آواز پھٹ سی گئی۔

روزانہ کھانے اور ناشتے کی میز پر یہ شخص اتنی تمیز کا مظاہرہ کرتا تھا کہ اس کی وجہ سے اس نے چائے میں بسکٹ یا پاپے اور کیک رسک بھگو بھگو کر کھانے چھوڑ دیے تھے مبادا وہ انہیں غیر مہذب' تمیز سے عاری نہ سمجھے وہ اتنی نفاست اور رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ کر رہی تھی تاکہ گاؤدی اور پینڈو نہ سمجھی جائے اور یہ شخص؟ اس نے دانت کچکچا کر اسے گھورنے کی کوشش کی مگر گھور نہیں سکی اس کی سرمئی آنکھوں نے سونیا کی سیاہ آنکھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"ویسے تم چاہو تو اپنے فیورٹ بسکٹ' کیک' رسک اور

کو کیز وغیرہ چائے کے ساتھ جیسے چاہو کھا سکتی ہو۔ کوئی بھی تمہیں ال مینو ڈیا ان کلچرڈ نہیں سمجھے گا میں نے تو خود اپنے کئی کینیڈین فرینڈز کو اسی طرح چائے بسکٹ کھانے سکھائے ہیں میں ٹی پارٹیز کرتا تھا نا تو اس میں چائے بسکٹ کھانے کا یہی اسٹائل رکھتے تھے۔ ہم کلچر از کلچر اس میں شرمانے کی بات کیا ہے؟"

بلا کا اطمینان اور سکون تھا اس کے لہجے میں جیسے خوشگوار موسم پر تبادلہ خیال کر رہا ہو اس سے۔

"آپ کو میرے بارے میں اتنی انفارمیشن کس نے دی ہے۔ دادا نے؟"

"دادا کیوں دیں گے انفارمیشن؟ آپ نے خود بتایا ہے اپنے بارے میں یہ سب۔"

"میں نے؟" سونیا نے بے یقینی سے اسے دیکھا "آپ کو بتایا ہے یہ سب؟"

"جی ہاں آپ نے بتایا ہے یہ سب صرف مجھے نہیں بلکہ ساری دنیا کو' آپ کے فیس بک اکاؤنٹ پر یہ ساری معلومات موجود ہیں اور کلچر کے نام سے آپ کی ساری پکس موجود ہیں آم کھاتے ہوئے' چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے اور ہاں برآمدے والی تصویر تو بیسٹ ہے۔ جس میں آپ پلنگ پر بیٹھی خود کو پنکھا جھل رہی ہیں اور آپ کے سامنے ساگ' مکئی کی روٹی اور لسی رکھی ہے۔"

اف خدایا' ذرا سی تفریح اتنا شرمندہ کروائے گی کسی کے آگے اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

"وہ سب میری دوستوں کے لیے تھا۔" سونیا کا غصہ غائب اور شرمندگی شروع۔

"آپ کی دوستوں کے علاوہ بہت لوگ ہیں جو فیس بک سے لنکڈ ہیں۔ ویسے ہمارا کلچر صرف ان ہی چیزوں تک محدود نہیں ہے اس کلچر کی اور بھی خصوصیات ہیں جو آپ میں موجود ہیں۔" وہ بولتا ہوا اٹھا اور فٹافٹ ہاتھ منہ دھو کر واپس بھی آگیا۔

"اور کون سی خصوصیات ہیں مجھ میں؟ کتنا شرمندہ کروائے گا یہ عامر لیاقت مجھے بولنا شروع ہو جائے تو چپ ہی نہیں ہوتا۔" سونیا دہی ہی دہی سوچے جا رہی تھی۔

"اب کیا اس حلیے میں بھی اپنی سیلفی لے کر لگائیں گی فیس بک پہ اپنی دوستوں کے لیے؟" وہ ابھی تک سنے ہوئے ہاتھوں اور منہ کے ساتھ شوخی سے تکرار کیے جا رہی تھی۔

"اُفوہ!" وہ کراہی۔ اپنا آپ بھی بھول گئی تھی کہ کس حلیے میں ہے فوراً" واش بیسن کی طرف دوڑ لگا دی۔ اور وہاں سے سیدھی اپنے اور سنعیہ کے مشترکہ کمرے کی طرف' ویسے وہ بزدل تو نہیں تھی کہ یوں راہ فرار اختیار کرتی۔ وہ تو چیلنج قبول کرکے ڈٹ کر مقابلہ کرنے والوں میں سے تھی' مگر یہ شخص مقابلے سے زیادہ تنگ کر رہا تھا۔ اس سے گریز ہی بھلا۔

وہ لیپ ٹاپ کے سامنے اپنا فیس بک اکاؤنٹ کھولے بیٹھی تھی اور اپنی پکس ہٹا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آنکھوں میں بیک وقت حیرانی بھی تھی خوشی بھی اور سراسیمگی بھی۔

"ابو! کیا کہہ رہے ہیں؟" مٹھیاں بھینچ کر صفا نے اپنے ہاتھوں کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"وہ ابھی مارکیٹ میں ہیں تھوڑی دیر میں آرہے ہیں۔ انہوں نے کہا ہے تم بات کرلو وہ لوگ جو پوچھیں' ٹھیک سے جواب دے دینا۔"

"اچھا!" صفا کو یقین نہیں آرہا تھا۔ دراصل اسے کسی بات پر بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا بی اے کا رزلٹ آیا تھا۔ بورڈ میں اس کی تیسری پوزیشن آئی تھی۔ ملک کے سب سے مشہور و معروف اور کثیر الاشاعت اخبار کی نمائندہ' ایک خاتون صحافی اس کا انٹرویو لینے آئی تھیں' ویسے اسے کئی اخبارات اور میگزین کی طرف سے مبارک باد اور انٹرویو کی خواہش کے فون موصول ہوئے تھے۔ ابو کی اجازت سے اس نے سب سے ہی بات کی تھی۔

دھڑکتے دل کے ساتھ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی نہا دھو کر لان کا یہ نیا جوڑا پہنا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

تھا۔ دوپٹہ سلیقے سے سر پر لیے وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ ایک خاتون صحافی اور ایک فوٹو گرافر۔

صحافی کا نام فریحہ الیاس تھا۔ وہ پہلے تو روایتی سوالات پوچھتی رہیں۔ پھر مستقبل کے بارے میں صفا کے عزائم اور ارادے جاننا چاہے تو وہ خاموش ہو گئی۔

"آگے کیا ارادے ہیں؟" اس کے ارادے تو ابو کی مرضی اور حکم کے تابع تھے۔

"ابھی تک تو پرائیویٹ پڑھا ہے مگر اتنے اچھے رزلٹ کے بعد یونیورسٹی میں ایڈمیشن؟" فریحہ الیاس ایک کے بعد ایک سوال کر رہی تھیں۔

"دراصل ابو نے اب تک پرائیوٹ پڑھنے کی اجازت دی ہے ہو سکتا ہے وہ آگے کے لیے بھی یہی پسند کریں۔" صفا نے یونی ورسٹی میں پڑھنے کا خواب ایک طرف رکھتے ہوئے سنبھل سنبھل کر جواب دیا۔

"آپ کی اپنی مرضی کیا ہے؟ ہر شخص کی کوئی نہ کوئی خواہش ہوتی ہے' آرزو ہوتی ہے۔ اس حوالے سے آپ کیا خواب دیکھتی ہیں؟ کیا سوچتی ہیں؟"

"میں اپنے ابو کی مرضی کے خلاف نہیں جاؤں گی' میرے خواب کچھ بھی ہوں' ان کی مرضی اور حکم کے تابع ہیں۔" صفا نے خوب سوچ کر مختصر لفظوں میں جواب دینے کی کوشش کی مگر وہ خاتون بال کی کھال نکالنے پر مصر تھیں۔

"آپ کو نہیں لگتا کہ فرسودہ خیالات اور رسم و رواج کے خلاف بغاوت ہونی چاہیے؟"

"میں اپنے معاملے میں ایسا نہیں سمجھتی' میری تعلیم نے مجھے والدین کی اطاعت سکھائی ہے' ان سے بغاوت نہیں۔ اللہ کے بعد میں اپنے ابو کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے پڑھنے کا موقع بھی فراہم کیا اور اس کے لیے وسائل بھی مہیا کیے' اگر وہ مجھے اس حد تک سپورٹ نہیں کرتے تو شاید ہی میں یہ کامیابی حاصل کر سکتی۔ مجھے احساس ہے کہ کالج یا یونیورسٹی نہ جانا میرے لیے ایک بڑی محرومی ہے مگر میں یہ سوچتی ہوں کہ کیا ہوا جو گلاس آدھا خالی ہے' گلاس آدھا بھرا ہوا بھی تو ہے۔"

بولتے بولتے صفا کا حلق خشک ہو گیا۔ اس نے بوتل سے گلاس میں پانی انڈیلا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

انٹرویو ہوا۔ اور چھپا اس کے ہنر مند ہاتھوں کی تعریف بھی ہوئی اور زرخیز دماغ کو بھی سراہا گیا۔

☆ ☆ ☆

حاجی صاحب دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم معلوم ہوتے تھے۔

"چائے منگواؤں؟" امیر عثمان نے ان کے چہرے پہ ادھیڑ بن کے تاثرات غور سے دیکھے۔ ان کی تاکید تھی کہ چائے ان سے پوچھ کر منگوائی جائے۔ وہ اپنے موڈ کے حساب سے چائے پیتے تھے۔

"چائے بھی اور مٹھائی بھی' یار ہماری بھتیجی نے تو کمال کر دیا اور تو نے مٹھائی بھی نہیں کھلائی؟" پورے بازار میں سلام دعا سب سے تھی مگر حاجی صاحب سے ایک خاص قلبی تعلق تھا ان کا' دونوں ہی ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے تھے اور لحاظ بھی۔

"انٹرویو کل آیا ہے اخبار میں' اور آپ آج آئے ہیں' کھلاتا ہوں ابھی مٹھائی۔" امیر عثمان مسکرائے۔ بظاہر تو وہ سنجیدہ اور متین ہی نظر آتے تھے مگر بیٹی کی اتنی بڑی کامیابی پر دل ہی دل میں وہ بے حد خوش ہوئے تھے۔

انسانی دماغ دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے' کبھی انسان اسے اتنا تنگ کر لیتا ہے کہ سانس لینے کو بھی جگہ نہ بچے' کبھی اتنا وسیع کہ ایک دنیا اس میں سما جائے تو امیر عثمان نے بھی اپنے اردگرد کے ماحول سے اپنے لیے کچھ نظریات اور اصول قائم کر لیے تھے جن کے تحت اتنی زندگی گزاری تھی۔ انہوں نے اولاد کو اپنے کنٹرول میں رکھا تھا۔ اتنی آزادی نہیں دی تھی کہ وہ آپے سے اور جامے سے باہر ہو جائیں' وہ خوش نصیب تھے کہ اولاد کے ساتھ صرف رعب کا رشتہ نہیں تھا بلکہ محبت کا بھی تھا' مگر اب وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ دماغ کے تاریک دریچوں میں چھپے

روشنی کے روزن کھل رہے تھے۔

کبھی‘ بہت پہلے باتوں باتوں میں حاجی صاحب کی کہی گئی بات یاد کیا آئی‘ ذہن کی دیواروں سے یوں چپک گئی کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

"ارے صاحب‘ ہمارا تو ماننا ہے کہ لڑکی رکے تو آپ سے‘ نہ رکے تو باپ سے‘ عزت کی پاس داری اور شرم و حیا کے بیج تو اولاد کے دل کے اندر بوئے جاتے ہیں‘ یہ پودا۔ باہر کی پابندیوں میں پروان نہیں چڑھتا۔"

"اور جس پرندے کے پروں میں آسمان کی وسعتوں میں پرواز کی بے پناہ صلاحیت ہو‘ اسے محدود فضا تک مخصوص کر کے رکھنا زیادتی نہیں تو اور کیا ہے۔"

امیر عثمان نے خوب سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ جس نے سنا‘ دنگ رہ گیا۔ سب سے پہلے تو بیوی بچے ہی دنگ رہ گئے۔

"صفا کو یونیورسٹی بھیج رہے ہیں پڑھنے کے لیے۔"

حیران پریشان بیوی نے تصدیق چاہی تھی۔

"ہاں!" ان کے مختصر جواب سے بیوی کی تسلی تو نہیں ہوئی‘ ہاں مگر خوشی ضرور ہوئی۔

"یا اللہ معجزے یوں بھی ہوتے ہیں؟" صفا حیرتوں کے جہان میں تھی۔

ایڈمیشن کے سارے مراحل طے ہو گئے‘ اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا وہ تو جیسے خواب کے عالم میں تھی۔

جس صبح اسے یونیورسٹی جانا تھا۔ رات میں امیر عثمان نے اسے اپنے پاس بٹھا کر دو چار باتیں کی تھیں‘ ان میں سے خاص طور پر کہی گئی ایک بات صفا کے دل پر نقش ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کیا تھی کوئی جادو نگری سی تھی۔ اپنی محدود دنیا سے نکل کر اس نے اس جادو نگری میں قدم رکھا تو کھل جا سم سم والا معاملہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کچھ دن بعد جب ذرا اوسان بحال ہوئے تو وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گئی۔ ناک کی سیدھ میں چلتے چلتے فیض اس سے ٹکرایا۔

"ویلکم ٹو یونی!" اس نے ذرا دلچسپی سے اپنی اس کزن کو دیکھا جو پہلے کے مقابلے میں خاصی پر اعتماد نظر آ رہی تھی۔

"ایک مہینے کے بعد خیال آیا ہے ویلکم کا؟" پتا نہیں کیوں ایک شکوہ سا صفا کے منہ سے پھسل پڑا۔

"ارے‘ لوگ شکوے شکایات پر اتر آئے‘ یعنی کہ ہمیں اپنا سمجھنے لگے؟" بلو جینز کے ساتھ شوخ رنگ کی ٹی شرٹ میں وہ زیادہ ہی شوخ ہو رہا تھا۔

"جن کے نام پر تمہارا نام رکھا گیا ہے ان کا کچھ تو لحاظ کر لو‘ وہ تو بہت کم گو تھے اور تم بالکل الٹ۔" صفا کو اس کی یہ بے باکی کچھ بھائی نہیں۔ ابھی اگر کوئی اس کی کلاس فیلو ساتھ ہوتی تو فیض کے یہ ڈائیلاگ سن کر کیا سوچتی۔

"میں تو زیادہ تر چپ ہی رہتا ہوں۔ یہ اور بات کہ لوگوں کو میری خاموشی بھی گفتگو لگتی ہے۔"

"یہاں آ کر تو تمہاری زبان میں اور بھی دھار لگ گئی ہے۔"

"فکر نہ کرو‘ چند دنوں کی بات ہے پھر تمہاری زبان مجھ سے زیادہ تیز دھار ہو جائے گی۔"

صفا ایک گہری سانس لے کر آگے بڑھ گئی۔ اس چرب زبان اور بلا کے باتونی سے باتوں میں جیتنا محال تھا۔

"اور ویسے بھی تمہیں کسی بھی معاملے میں جیت ہار سے کیا‘ چپ چاپ اپنی پڑھائی میں دل لگاؤ۔" دماغ نے چپکے سے مشورہ دیا۔

☼ ☼ ☼

پریا کی شادی سر پر تھی‘ عافیہ سکندر گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ نوکری‘ گھر‘ بازاروں کے چکر سب سے بڑھ کر اخراجات کی فکر اور بندوبست۔ اس دن بھی بازار سے واپسی پر رات ہی ہو گئی تھی‘ واپس آئیں تو بستر پر ڈھے سی گئیں۔

"ایسا لگ رہا ہے' ہاتھ پیروں میں دم ہی نہیں رہا' اتنی ہمت بھی نہیں ہو رہی کہ فریج سے سکنجبین نکال کر پی لوں' سونیا بے چاری بنا کر رکھ گئی تھی' مجھے میسج کر دیا تھا۔" وہ نقاہت سے بولتی ہوئی اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

سمیرا نے انہیں اشارے سے روکا اور خود اٹھ کر گئیں' واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ٹرے تھی' جس میں سکنجبین کا جگ اور دو گلاس تھے۔ انہوں نے ایک گلاس بھر کر عافیہ کی طرف بڑھایا اور دوسرا اپنے لیے بھرا پھر اطمینان سے عافیہ کے پاس بیٹھ گئیں۔

"میں تمہیں دیکھ کر حیران ہوں عافیہ! میں تقریباً اٹھارہ سال بعد پاکستان آئی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ہماری پاکستانی عورت شاید کچھ بدل گئی ہو مگر تمہیں دیکھ کر تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی تبدیلی تو دور کی بات الٹا میں 1950ء کی عورت سے مل رہی ہوں' تم پڑھی لکھی خود مختار ہو' پھر کیوں خود کو چکی کے دو پاٹوں میں یوں پیس رہی ہو' محنت کر کے کماتی ہو اور پھر اسے نکمی اولاد اور نکمے شوہر پر لٹا رہی ہو۔ تم نے اپنے شوہر پر گھر اور بچوں کی ذمہ داریاں کیوں نہیں ڈالیں' بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ انہیں اپنی ذمہ داریاں خود اٹھانے دو۔ کیوں سب کے لیے ہلکان ہوتی رہتی ہو' تمہیں ضرور برا لگے گا مگر یہ محبت نہیں حماقت ہے۔" سمیرا صاف گوئی سے بولتے ہوئے اب اپنا مشروب ختم کر رہی تھیں۔

عافیہ کے چہرے پہ تاریکی چھا گئی۔ اپنا آپ بڑا ہی بے وقعت اور بے مول لگ رہا تھا۔ آنے والی مہمان نے سات دنوں میں ہی بائیس سال کی کہانی جان لی تھی اور اس پر تبصرہ بھی کر ڈالا۔

"اتنے سے دنوں میں اتنا کچھ معلوم ہو گیا تمہیں؟" عافیہ نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

"تمہارا وہ نالائق شوہر جسے پچھلے ایک ہفتے سے میں گھر میں دیکھ اور سن رہی ہوں' اسی سے پتا چلا ہے یہ سب گو کہ اس نے اس انداز سے تو یہ سب نہیں بتایا مگر اصل کہانی سمجھنے کے لیے کسی راکٹ سائنس کی ضرورت نہیں تھی مجھے۔ حیرت ہے تم نے اس شخص کے ساتھ اتنے سال کیسے گزار دیے۔ میری جیسی کوئی ہوتی تو کب کی لات مار کر باہر نکال چکی ہوتی۔" سمیرا نے تکلیف دہ حد تک صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"لات مار کر باہر نکلنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تمہاری تو لو میرج تھی' اگر تمہارا شوہر ایسا نکلتا تو کیا تم اسے لات مار کر باہر کر دیتیں؟" عافیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ تھوڑی بہت صاف گوئی تو ان کا بھی حق تھی۔

سمیرا نے چند لمحے ان کی طرف دیکھا اور گلاس ٹرے میں رکھ کر گویا ہوئیں۔ "ہماری لو میرج تھی۔ اپنی اپنی جگہ ہم نے ایک دوسرے کے لیے بہت فائٹ کی تھی۔ چوبیس سال پہلے جب ہم کینیڈا گئے تو بہت خوش تھے۔ پانچ سال تک ہیپی میریڈ لائف گزاری تھی ہم نے' ہم دونوں میاں بیوی اور ہمارا بیٹا' پرفیکٹ لائف تھی۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ بدلنا شروع ہو گیا۔ عزیز کو نوکریاں چھوڑ چھوڑ کر گھر بیٹھنے کا چسکا پڑ گیا تھا۔ ایک دو سال تو یونہی گزر گئے۔ میں بھی جاب کرتی تھی سو اخراجات پورے کرتی رہی۔

پھر کچھ اور وقت گزرا اور مجھ پہ انکشاف ہوا کہ آئے دن جاب چھوڑ کر کئی کئی ہفتوں کے لیے گھر پڑ جانا' عزیز کی مجبوری نہیں بلکہ عادت بن گئی ہے۔ بحث' تکرار پھر لڑائی جھگڑے' شادی کی دسویں سالگرہ سے دو ہفتے پہلے ہماری ڈائیورس ہو گئی۔ اس نے کسی انڈین سے شادی کر لی تھی۔ پانچ سال پہلے اس کی ڈیتھ ہو گئی۔" سمیرا چپ ہو گئیں۔ کمرے میں ایک تکلیف دہ خاموشی کی دبیز دھند سی پھیل گئی۔

سمیرا نے ایک گہری سانس لی اور پھر سے بولنے لگیں۔

"ایک عورت کے لیے اس طرح کا فیصلہ کرنا آسان نہیں ہوتا۔ عورت تنکا تنکا جوڑ کے گھر بناتی ہے۔ اسے توڑنے کے فیصلے میں خود بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے اور پھر ہماری مذہبی اور معاشرتی روایات میں

بھی اسے ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے مگر میرے پاس اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ مجھ میں اتنا اسٹیمنا نہیں تھا کہ میں اپنے نکمے شوہر کو بھی پالوں اور اس کے بچوں کو بھی، میں نے سوچا کہ ساتھ رہ کر رونے سے بہتر ہے کہ الگ رہ کر رولوں۔"

سمیرا کی آواز بھیگنے لگی تھی۔ عافیہ کی آنکھیں بھی گیلی ہونے لگیں۔ بظاہر خوش باش ہنستی بولتی سمیرا نے اپنے اندر کتنا بڑا طوفان سمویا ہوا تھا۔

"تمہیں دیکھ دیکھ کر مجھے تم پر بہت ترس آرہا ہے عافیہ، تمہاری بے بسی پر، بے چارگی پر، تمہاری کبھی نہ ختم ہونے والی تھکن پر۔"

عافیہ کی آنکھیں بھیگنے لگیں، دل میں اندر ہی اندر بہت برائی اور شدید خواہش تھی کہ اس طرح کی بات سکندر کہتا، وہ محبت کا اظہار بہت کرتا تھا، ہمیشہ کرتا تھا مگر اس نے کبھی اس طرح کی بات نہیں کی کہ اس کی قربانیوں کو سراہا ہو یا اس کی کبھی دل جوئی کی ہو۔ وہ تو جیسے عافیہ کی محنت اور جدوجہد کو اس کا فرض اور اپنا حق سمجھتا تھا۔

"کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے جیسے بعض دفعہ ہم عورتوں کی محبتیں ہمارا جرم بن جاتی ہیں۔"

سمیرا کے لہجے میں صدیوں کی اداسی تھی اور عافیہ کے لبوں پہ صدیوں کی چپ۔ بلب کی تیز روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ عافیہ نے سیور بند کر کے نائٹ بلب جلا دیا۔

"کیا کر رہی ہو یار، میگزین پڑھ رہا ہوں، نظر نہیں آرہا تھا کیا؟" سکندر، بیگم کی اس حرکت پر بھنا گئے۔

"ایک گھنٹہ ہو گیا۔ آپ سے بات کرنے کے لیے بیٹھی ہوں، آپ کو اس میگزین سے ہی فرصت نہیں مل رہی، اسے ذرا ایک طرف رکھ دیں۔" عافیہ کو زندگی میں پہلی بار سکندر پہ اب ذرا ذرا غصہ آنے لگا تھا۔ بیٹی کی شادی سر پر تھی اور باپ کی لاپروائی اور بے نیازی عروج پر تھی۔

"کیا ضروری بات کرنی ہے؟" میگزین ایک طرف کر کے وہ سیدھے ہو گئے۔

"مختیار بھائی کے پاس جو کمیٹی ڈالی تھی میں نے، آپ کو کہا تھا شادی پر دے دیں گے تو ان سے بات کریں، اس میں کچھ اور رقم ملا کر فرنیچر کا بندوبست ہو جائے گا۔"

"فرنیچر کے لیے رقم نہیں ہے کیا؟" سکندر نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کیا۔

"ہوتی تو آپ سے کمیٹی کا کیوں پوچھتی؟"

"میں تو سمجھا تم نے سارا انتظام کر لیا ہے۔" سکندر یوں جواب طلبی کر رہے تھے جیسے انہوں نے شادی کے اخراجات کے لیے بھاری رقم بیوی کو دی ہو۔

"میں اکیلی کیا کیا کروں۔ شادی کے انتظامات کرنا کیا آسان ہیں، مہنگائی ہے کہ آسمان کو چھوڑ کر اس سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ یہاں خرچے ہی پورے ہونے میں نہیں آرہے۔ ایک کے بعد ایک نیا خرچا نکلا چلا جا رہا ہے۔" عافیہ جھنجلائی ہوئی تھیں۔

سکندر چپ چاپ بیوی کی شکل دیکھتے رہے۔

عافیہ کو اس خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ اضطراب کے عالم میں پہلو بدل کر انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سکندر اچانک بول اٹھے۔

"وہ دراصل بات یہ ہے کہ مختیار نے کمیٹی بنائی ضرور تھی مگر لوگ پیسے بھرنے میں ہر مہینے تنگ کر رہے تھے۔ اس نے توڑ دی تھی کمیٹی۔" سکندر نے بم ضرور پھوڑا تھا مگر بے حد ہموار اور پرسکون لہجے میں۔

"کب توڑی تھی کمیٹی؟ آپ نے بتایا کیوں نہیں مجھے؟ میں تو ہر مہینے رقم دے رہی تھی آپ کو۔" عافیہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھیں، جو ان کا شوہر تھا، لاپروائی اور بے نیازی کی انتہا وہ اکثر کرتا رہتا تھا مگر آج تو بے حسی کی انتہا کر دی تھی۔

"میں نے سوچا تمہیں کیا فرق پڑتا ہے، اتنی معمولی سی رقم سے۔ ہر مہینے جو پیسے تم دیتی تھیں، وہ میں کون سا اپنی عیاشی میں اڑاتا تھا۔ تمہارے گھر اور بچوں پر ہی خرچ کر دیتا تھا۔"

"ڈھائی سال سے ہر مہینے دو ہزار روپے بھر رہی تھی،

کمیٹی کے آسرے میں کہ وقت اور ضرورت پر ہمارا کام ہو جائے گا۔ یہی رقم اپنے پاس جمع کرتی تو ساٹھ ہزار ویسے ہی جمع ہو جاتے۔ کچھ تو آسرا ہو جاتا۔ اب کیا کروں میں کہاں سے انتظام کروں" آپ نے تو مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا سکندر!" الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر عافیہ کے منہ سے نکل رہے تھے۔

"تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے میں نے خدانخواستہ پتا نہیں کیا کر دیا ہے تمہارے ساتھ۔" شوہر نامدار کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔

"ہماری بیٹی کی شادی ہے سکندر' تین چار دن بعد فرنیچر سمیت سارا جہیز اس کی سسرال پہنچانا ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ ایک لاکھ کی کمیٹی ملے گی اس میں اور رقم ملا کر فرنیچر کا انتظام ہو جائے گا۔ اب مجھے بتائیں میں کیا کروں؟ آپ کو احساس نہیں ہے کہ میں کس پچویشن میں ہوں پہلے ہی بتا دیتے تو۔۔۔"

صدمے اور غم و غصے کی شدت سے عافیہ کی آواز بند ہو گئی۔ خود پہ قابو پانے کی کوشش کی مگر ناکام' آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گود میں دھرے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"میں نے آپ سے تین چار بار پوچھا کہ کمیٹی وقت پر مل جائے گی' آپ نے ہمیشہ جھوٹی تسلی دی۔ مجھے صحیح بات بتا دیتے۔ کیوں آسرے میں رکھا؟" عافیہ سکندر کو ڈھنگ سے غصہ کرنا بھی نہ آیا۔ ابھی بھی ان کی باتوں میں شکوے کا رنگ نمایاں تھا۔

"تم نے کبھی اباجی کے سامنے پوچھا' کبھی بچوں کے سامنے۔ ان لوگوں کے سامنے میں کیا کہتا۔ سوچا تھا کہ کسی دن آرام سے تسلی سے اکیلے میں بیٹھ کر تمہیں پچویشن سمجھا دوں گا۔"

"کسی دن؟ کون سے دن؟ شادی کے بعد بتاتے مجھے؟ اف خدایا' میں کیا کروں' کہاں جاؤں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بیٹھی تھیں۔

"اچھا اب اتنی پریشان مت ہو' اللہ پہ بھروسا رکھو' کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" سکندر نے ان کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پینترا بدلا۔

"اللہ پہ تو میں ہمیشہ ہی بھروسا کرتی ہوں سکندر' مگر کاش میں نے آپ پر بھروسا نہ کیا ہوتا۔" شوہر کے دونوں ہاتھ اپنے کاندھوں پر سے ہٹاتے ہوئے وہ پھر بلک بلک کر رو دیں۔

اباجی کو بتائے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اور پھر وہ آخر کب تک اپنے شوہر کی کمزوریوں' غلطیوں اور خامیوں پر پردے ڈالتی رہتیں اور کیوں؟ اباجی کو اعتماد میں لینا ہی پڑا اور وہ تو ایسے جلال میں آئے کہ بس۔۔۔

"یہ تو ہے ہی کمینہ' بدذات کہیں کا' تم نے اس پر بھروسا کیا کیوں؟ اور تم نے کہا نہیں کہ کہیں سے بھی رقم کا بندوبست کر کے دے۔ بے شرم کہیں کا' بیٹی کی شادی پر تو ایرے غیرے بھی مدد کو آجاتے ہیں۔ اس بے غیرت کو اپنے ہی گھر میں نقب لگاتے شرم نہ آئی۔" مارے غصے کے اباجی کا برا حال تھا۔

"اباجی! آپ پلیز اتنا غصہ نہ کریں' بی پی ہائی ہو جائے گا آپ کا؟" عافیہ گھبرا گئیں۔ وہ ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے۔

"ہونے دو بلڈ پریشر کو ہائی قائی' اچھا ہے دنیا سے رخصت ہو جاؤں ایسی ناہنجار اولاد کا منہ دیکھنے سے بہتر ہے کہ میں قبر کا منہ دیکھ لوں۔" وہ ہانپنے لگے۔

"بتاؤ ذرا' ایسا بے حس' بے ضمیر باپ میں نے کہیں نہیں دیکھا؟"

"اباجی پلیز کول ڈاؤن' میں گلٹی فیل کر رہی ہوں کہ آپ کو کیوں بتایا۔" عافیہ نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

"بیٹی! یہ چھوٹی اور معمولی بات نہیں ہے۔ بڑا تکلیف دہ معاملہ ہے میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ اسے اپنے گھر اور زندگی دونوں سے عاق کر دوں۔"

"اب کیا ہو گا؟" کچھ دیر بعد جب وہ بیٹے کو اچھی طرح برا بھلا کہہ چکے تو انہیں خیال آیا۔

"اللہ مالک ہے۔" ایک پھیکی سی تسلی ان کے لبوں پہ آئی۔

☆ ☆ ☆

سگی بہن کا گھر تھا مگر انہیں یہاں آئے ہوئے اور

بہن سے ملے ہوئے عرصہ گزر جاتا تھا۔ ان کی مجبوری تھی‘ ملازمت اور گھر‘ دونوں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں تھا۔ بہن کی اپنی مجبوریاں تھیں۔ گھر گرہستی کی ذمہ داریاں تو الگ تھیں۔ شوہر کہیں آنا جانا پسند نہیں فرماتے تھے‘ چاہے وہ میکے یا سگے بہن بھائیوں کے گھر ہی کیوں نہ ہوں۔ لہٰذا سگی بہنوں کی ملاقات بھی مہینوں میں ہی ہوا کرتی تھی‘ ہاں فون کے ذریعے رابطہ ضرور رکھتی تھیں۔

بڑی بہن کی بات سن کر‘ وہ چند لمحے گہری سوچ میں پڑ گئیں۔ بڑی بہن تھیں‘ وضع دار اور خود دار۔ آج تک کبھی ایک روپے کا ادھار بھی نہیں مانگا تھا مگر اب وہ جانتی تھیں کہ بیٹی کی شادی کا موقع ہے‘ رقم کی ضرورت کوئی عجب بات نہ تھی۔

"باجی! آپ تو جانتی ہیں کہ میرے پاس اتنی بڑی رقم نہیں ہوتی مگر میں ان سے بات کرتی ہوں‘ وہ ضرور انتظام کردیں گے۔" عالیہ نے انہیں تسلی کے پھول تھمائے۔ مگر عافیہ بے حد مضطرب اور پریشان تھیں۔

"تمہیں یقین ہے کہ امیر عثمان یہ کام کردیں گے؟"

"ہاں ہاں‘ بالکل۔ آپ پریشان مت ہوں۔ ان شاء اللہ آپ کا کام ہوجائے گا۔"

امیر عثمان رات میں کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرکے واپس آئے تو تھوڑی دیر خبریں دیکھیں پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

"آپ سے ایک بات کرنی تھی۔" بیوی نے ذرا ہمت سے کام لے کر انہیں مخاطب کیا۔

"خیریت؟" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"خیریت ہی ہے‘ وہ عافیہ باجی آئی تھیں آج۔ شادی کا کارڈ دے گئی ہیں۔" بیوی نے بات کا آغاز کیا۔

"اچھا‘ روک لیتیں۔ کھانا وانا کھلا کر بھیجتیں رات کا‘ میں بھی آجاتا تب تک‘ ملاقات ہوجاتی۔" امیر عثمان ایک مخصوص سخت مزاج کے مالک ضرور تھے مگر گھر آئے مہمان کی تعظیم و تکریم میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔ پھر ان کی یہ بے ضرر سی سالی صاحبہ تو ایک عرصے بعد گھر آئی تھیں۔

"میں نے روکا تھا مگر رکی نہیں اور بھی جگہوں پر جانا تھا کارڈ دینے اس لیے۔" وہ ایک لمحے کو جھجکیں۔

"ہوں!" انہوں نے بیوی کا چہرہ دیکھا۔ "اور کوئی خاص بات؟"

"کچھ رقم ادھار چاہیے تھی انہیں‘ چھ ماہ کے بعد واپس کردیں گی۔"

"کتنی رقم؟"

"پچاس۔"

"ٹھیک ہے‘ میں بندوبست کردوں گا۔ کل دکان تھوڑی جلدی بند کرکے آجاؤں گا‘ پھر چلیں گے ان کے گھر‘ جو تمہیں دینا ہے شادی پہ‘ وہ بھی کل ہی دے آنا‘ اپنی مرضی اور پسند سے کچھ خرید لیں گی۔" اس سے پہلے کہ بیوی حیران ہوتیں انہوں نے وہاں جانے کی وضاحت کردی۔ پچھلے ہفتے ہی انہوں نے پریا کے لیے دس ہزار روپے بیوی کو دیے تھے۔

"بچوں سے پوچھ لینا‘ جو چلے وہ تیار ہوجائے۔" ان کی سخاوت اور فیاضی آج اپنے عروج پر تھی۔

☆ ☆ ☆

"ڈیئر سونیا‘ آج سورج کہاں سے نکلا تھا۔" فیضی کچن میں کھڑی سونیا سے پوچھ رہا تھا۔ مگر مقصود اسے سنانا تھا جو مہمان بن کر آئی تھی اور اس وقت سونیا کے ساتھ کھڑی تھی۔

"مشرق سے ہی نکلا ہوگا۔ دوسری سمت سے نکلتا تو قیامت کے آثار ہوتے۔" سونیا اس کی چھیڑ چھاڑ بخوبی سمجھتی تھی‘ مسکراہٹ دبا کر جواب دینے لگی۔

"آثار تو قیامت کے ہی ہیں۔ ایسے بھولے بھٹکے لوگ آئے ہیں۔ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا۔ ایسا لگ رہا ہے خواب دیکھ رہا ہوں۔ سونیا یار‘ ذرا چٹکی تو کاٹنا مجھے؟"

"یہ بیلن کافی رہے گا یقین دلانے کے لیے۔" صفا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"ارے‘ یہ تو واقعی آپ ہیں۔ رہنے دیں۔ مجھے یقین آگیا۔" فیضی نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

امی اندر مہمانوں کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ شعیب اپنی ممی کے ساتھ شاپنگ پر نکلا ہوا تھا۔ سونیا کچن میں مہمانوں کی خاطر تواضع کا بندوبست کر رہی تھی کہ کیفی نے آکر چٹکلے چھوڑنے شروع کر دیے۔

وہ گیا تو صفا نے سکون کی سانس لی اور سونیا سے باتیں کرنے لگی۔ دونوں کا موضوع بس اپنی پڑھائی' کالج اور یونیورسٹی کی باتیں۔ عافیہ بیگم کی آنکھوں میں تشکر اور طمانیت کے آنسو تھے۔ ان کا مسئلہ حل ہو گیا تھا جس نے ان کی راتوں کی نیندیں اڑا دی تھیں۔

شادی تو سکون اور خیریت کے ساتھ ہو گئی مگر ان کے سسر نے حتمی فیصلہ کر لیا تھا اپنے بیٹے کا دماغ ٹھکانے لگانے کا۔ شادی کے بعد کا ایک ہفتہ انہوں نے بڑی مشکل سے گزارا پھر بیٹے کو بٹھا کر بات کی تو حسب توقع وہ ہکا بکا رہ گئے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ابا جی؟" سکندر کا چہرہ دیکھنے لائق تھا۔

"وہی کہہ رہا ہوں جو تم نے سنا ہے۔ تمہاری بیوی کی صحت اب اس قابل نہیں ہے کہ وہ دہری ذمہ داریاں اٹھائے یا تو وہ نوکری کر سکتی ہے یا گھرداری میں نے کہا ہے کہ نوکری چھوڑ کر گھر سنبھالے۔ زندگی گزر گئی غریب کی' اب تو تھوڑا بہت سکون اور آرام دے دو بے چاری کو۔ میں خود کو نالائق اور خود غرض باپ سمجھتا ہوں کہ تمہارے سدھرنے کا انتظار کرتا رہا مگر بس' اب انتہا ہو گئی ہے' اگر تمہیں اس گھر میں رہنا ہے تو ذمہ داری اٹھاؤ اس گھر کی اور گھر والوں کی' ورنہ جہاں دل چاہے جاؤ' میں مزید تمہیں اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا۔" غصے کے مارے ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور آواز کانپ رہی تھی۔

"آپ بے کار میں غصہ کر رہے ہیں ابا جی' جتنا ہو سکتا ہے اتنا تو میں کام کرتا ہی ہوں' بالکل ہی فارغ تو نہیں رہتا ہر وقت' اب میری مرضی کا آرڈر آجائے' آپ دیکھیں دن رات ایک کر دوں گا۔" باپ کے جلال سے خائف ہو کر وہ اپنی چرب زبانی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

"اگلے ہفتے ابرار دکان خالی کر رہا ہے اپنی۔ اس کا ویزا آگیا ہے دبئی کا۔ میں نے بات کر لی ہے اس سے' تم اپنا کام شروع کر دینا اگلے مہینے سے' اچھی خاصی بڑی دکان ہے۔ صاف ستھری ہے۔ چار' چھ مشینیں آرام سے آجائیں گی' مرضی ہے تمہاری اکیلے کام کرو یا اور کاریگر رکھ لو۔"

"اس علاقے میں دکان کیا چلے گی۔ میری بھی کوئی کلاس ہے۔ بڑے بڑے بوتیکس کے کپڑے سیے ہیں میں نے' یہاں چھ سو اور آٹھ سو کی سلائی پر کام کروں؟ ذرا سی سپورٹ مل جائے تو طارق روڈ پر اپنا بوتیک کھول لوں۔"

"یہاں کام کرو چھ سو' آٹھ سو کی سلائی کر کے پیسے جمع کر لو پھر کھول لینا بوتیک' جہاں دل چاہے۔ نہ تمہارے باپ کے پاس اتنا پیسہ ہے نہ تمہاری بیوی کے پاس' جو تمہیں سیٹھ صاحب بنا کر کہیں بٹھا دیں' جو کرنا ہے' خود کرو۔ برسوں جمع ہے ایڈوانس کے دس ہزار ابرار کو دے دینا۔ بے چارہ بھلا مانس ہے۔ مروت سے کام لے رہا ہے ورنہ لوگ پچیس ہزار ایڈوانس دے کر بھی دکان لینے کو تیار ہیں۔" ابا بات ختم کر کے اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼

امتحانات قریب تھے۔ کوچنگ میں ایکسٹرا کلاسز ہو رہی تھیں۔ آج کل روزانہ ہی وہ تھکن سے چور گھر آ رہی تھی۔ آج بھی آتے ہی بیگ رکھ کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ فریش ہو کر آئی تو چائے تیار ملی۔

"اللہ اللہ' اچھی چائے بھی کیسی نعمت ہے۔" پہلا گھونٹ بھرتے ہی اس کی تھکن جیسے زائل ہونے لگی تھی۔ کپ رکھنے کچن میں گئی تو امی گوشت کے پیکٹ نکال کر بھگو رہی تھیں۔

"کیا پکا رہی ہیں؟" کپ کھنگالتے ہوئے سونیا نے سوال کیا۔

"مٹن بریانی پکاؤں گی۔ پریا کا فون آیا تھا۔ آج دونوں یہیں ڈنر کریں گے۔"

"میں پکا لیتی ہوں آج بریانی۔" سونیا نے پیشکش کی۔

"رہنے دو، تم تھکی ہوئی آئی ہو۔ رات میں اپنی تیاری بھی کرو گی۔"

"آپ بھی تو تھکی ہوئی ہوتی تھیں بچوں کے ساتھ اتنے سارے کام مینیج کرتی تھیں۔"

"تم شادی شدہ ہو نہ بال بچوں والی، ابھی اپنے گھر میں ہو۔ لائف انجوائے کرو۔ بے کار کی مشقت میں کیوں خود کو تھکاتی ہو۔" امی نے رسان سے لے جواب دیا۔

"شادی کیا ذمہ داریوں کے انبار کا دوسرا نام ہے؟" عافیہ سکندر بیٹی کے اس سوال پر ساکت رہ گئیں، مگر خود کو سنبھالتے ہوئے جبراً" مسکرائیں۔

"ہاں کسی حد تک، مگر ہر کسی کے لیے نہیں، سب کے حالات اور تجربات الگ الگ ہوتے ہیں۔" وہ بولتے ہوئے باہر لاؤنج میں آگئیں۔

گھر میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ منعیہ سو رہی تھی۔ فیضی اپنی اکیڈمی گیا ہوا تھا اور ابا اپنے بیٹے کے ساتھ دکان پر تھے۔

"مگر ہمارے معاشرے میں تو سب کے حالات و تجربات تقریباً" ایک جیسے ہی ہوتے ہیں یا تو برے یا بہت برے کوئی کوئی ہو گا جو اپنے حالات سے خوش ہو گا۔" سونیا پیاز کاٹتے ہوئے یاسیت سے بولی۔

"اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا، مسئلے مسائل تو دنیا بھر میں سب کے ساتھ ہیں۔ تم اتنا نیگیٹو کیوں سوچ رہی ہو۔"

"پتا نہیں، مجھے لگ رہا ہے آج کل میں کچھ زیادہ ہی سوچنے لگی ہوں۔" سونیا کا لہجہ الجھا ہوا تھا۔

"وہ بھی نیگیٹو۔" امی مسکرائیں۔

"شاید۔"

"بس سوچتی ہی رہو گی یا کوئی فیصلہ بھی کرو گی؟" امی کو اس سے پوچھنے کا موقع مل گیا۔

"کہتے ہیں کہ بیٹیاں عموماً" اپنی ماں کی طرح ہوتی ہیں اور بیٹے باپ کی طرح۔"

"کوئی لازمی کلیہ بھی نہیں۔" امی نے سبھاؤ سے بولتے ہوئے اسے مثال دی۔ "تمہارے ابو اور دادا ایک دوسرے سے کتنے مختلف ہیں۔"

"فیض بھائی تو بالکل ابو پر ہی گئے ہیں۔" سونیا نے ایک گہری سانس لی اور پیاز کی پلیٹ لے کر اٹھ گئی۔

"مگر شعیب بالکل اپنے باپ کی طرح نہیں ہے، سمیرا نے مجھے بتایا تھا۔ ایک ماں سے زیادہ اس کی اولاد کو کوئی نہیں جانتا۔" امی تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے کچن میں آئی تھیں۔

"میں یقین کرنا چاہتی ہوں مگر پتا نہیں کیوں کر نہیں پاتی۔"

"آجائے گا یقین، سچائی خود کو منوالیتی ہے۔" امی کا لہجہ تسلی آمیز تھا۔

"تہ والی بریانی پکاؤں یا یخنی پلاؤ؟" سونیا نے موضوع بدلا۔

"پریا کو تو تہ والی بریانی پسند ہے، عاشر میاں بھی وہی شوق سے کھاتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، یہی پکا لیتی ہوں میٹھے میں شاہی ٹکڑے بنا لوں؟"

"ہاں بنا لو، میں بھی ہیلپ کرواں گی۔" امی نے آمادگی ظاہر کی۔

"نہیں، آپ رہنے دیں منعیہ ابھی آجائے گی اٹھ کر۔ اسے لگا لوں گی اپنے ساتھ، آپ اپنے کمرے میں جائیں، آرام کریں۔" سونیا نے انہیں کچن سے نکالا۔

☼ ☼ ☼

کینٹین کے مخصوص شور شرابے اور بھانت بھانت کی آوازوں سے بے نیاز وہ چکن رول سے نبرد آزما تھی۔ ان کے گروپ کی عظمیٰ نے اپنی منگنی کی خوشی میں ٹریٹ دی تھی۔ ساری اشیائے خورد و نوش ٹیبل پر آگئیں تو بحث چھڑ گئی۔ آدھے لوگ کینٹین سے باہر جا کر کھانے کے حق میں تھے اور آدھے یہیں بیٹھ کر کھانے پر اصرار کر رہے تھے۔ بے چاری میزبان جس نے ٹریٹ دی تھی، تلافی کرنے کی کوشش کر رہی تھی

مگر اس کی سن کون رہا تھا۔

صفا بھوک سے بے تاب ہو رہی تھی۔ صبح برائے نام ہی ناشتہ کیا تھا۔ پوائنٹ نکل جانے کے ڈر سے آدھا ادھورا ناشتہ کر کے اسٹاپ کی طرف بھاگی تھی۔ اس نے اپنے پیٹ میں دوڑتے چوہوں کی صدا پہ ترس کھایا اور ایک چکن ویجی ٹیبل رول اٹھا لیا۔

"جب تم لوگ ڈیسائیڈ کر لو کہ کہاں بیٹھ کر کھانا ہے تو مجھے بتا دینا۔" صفا نے یہ کہہ کر رول کے ساتھ انصاف کرنا شروع کر دیا تھا۔ ابھی پورا بھی نہ کھایا تھا کہ اس شور شرابے میں اپنے کان کے پاس اسے مانوس آواز سنائی دی' جو اس کا نام پکار رہی تھی۔

صفا نے حیران ہو کر سر اٹھایا اور دائیں طرف گھمایا۔ وہاں فیضی کھڑا تھا۔

"پانچ منٹ کے لیے باہر چلو گی' ایک ضروری کام ہے۔"

"خیریت؟" وہ رول کھانا بھول کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں ہاں خیریت ہی ہے۔ اب ایسے آنکھیں تو مت پھاڑو۔ ضروری کام ہے تم سے۔" وہ دانت پیس کر آہستہ سے بولا۔ سب کی نظریں اسی پر تھیں۔

"اچھا۔" وہ متذبذب سی کھڑی ہو گئی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔" وہ سب سے معذرت کرتی ہوئی باہر نکلنے لگی۔

"کینٹین سے ہی باہر جانا ہے نا؟"

"ظاہر ہے' اب میرے کہنے پہ' میرے ساتھ تم یونی سے باہر تو جانے سے رہیں' اتنی نیک پروین تو ہو نہیں۔" وہ چلتے چلتے ایک جگہ رکا اور وہیں بیٹھ گیا۔ صفا نے بھی اس کی تقلید کی۔

"نیک پروین ہوں جب ہی تو۔" اس نے سنجیدگی سے بولتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی۔

"اچھا نیک پروین صاحبہ' پہلے یہ بتاؤ تمہارے فون کو کیا ہوا' کب سے ٹرائی کر رہا ہوں' بند مل رہا ہے۔"

"ہاں' فون شاید خراب ہو رہا ہے۔ آئے دن بند ہو جاتا ہے خود بخود۔" صفا نے بیگ میں ہاتھ ڈال کر اسے ٹٹولا اور موبائل باہر نکال لیا۔

"ہاں دیکھو ذرا' بند پڑا ہوا ہے۔" وہ اتنی معصومیت سے بولی تھی کہ فیضی اسے دیکھ کر دیکھتا رہ گیا۔

"ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے' اتنی معصومیت کہ بندہ ٹھیک سے غصہ بھی نہیں کر سکتا۔" وہ بڑبڑایا۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔

"پریا کی شادی پہ تم بہت پیاری لگ رہی تھیں۔" وہ اچانک ہی بولا۔

صفا ایک لمحے کو جھجکی پھر اس نے سنجیدگی سے اپنی نگاہیں اس پر جمائیں۔

"یہ بات آپ نے مجھے شادی کے دن بھی بتائی تھی' اب بھی کیا یہی کہنے کے لیے بلایا تھا؟"

"نہیں یار! مجھے کہنا کیا تھا اور کہہ کیا گیا' سوری میں یہ بتا رہا تھا کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ناردرن ایریاز کے ٹرپ پر جا رہا ہوں۔"

"اچھا' گڈ نیوز۔ کب واپس آئیں گے؟" صفا مسکرائی۔

"تقریباً" تین ہفتے کا ٹور ہے۔"

"او کے انجوائے یور لائف!"

"ہاں جی' فی الحال تو دوستوں کے ساتھ ہی لائف انجوائے کرنی پڑ رہی ہے۔" فیضی نے جیسے منہ بسورا تھا۔

"یہ دن بھی یاد آئیں گے کبھی۔"

"یس' یو آر رائٹ۔" اس نے فوراً" ہی صفا سے اتفاق کیا۔ "یہ بتاؤ' تمہارے لیے کیا لاؤں؟"

"میرے لیے!" وہ حیران ہوئی پھر اک دم کھلکھلا اٹھی۔

"ہنسنا ضروری تھا۔" فیضی نے سنجیدگی سے دیکھا۔

"میں کوئی چھوٹی سی بچی ہوں؟"

"جی نہیں' اب تو آپ خاصی بڑی ہو چکی ہیں۔ اسی لیے پوچھ رہا ہوں جلدی سے بتاؤ۔"

"ایک منٹ سوچنے تو دیں۔" صفا نے آنکھیں بند کیں اور چند لمحوں بعد کھول کر بولی۔ "لکھیے میری

فرمائشی لسٹ۔"

"بولو!" فیضی نے اپنا موبائل آن کیا۔

"تھوڑی سی اسنوفالنگ، کچھ سہانا موسم، چند خوب صورت مناظر جھیلوں، دریاؤں اور چشموں کا پانی، رنگ برنگے پھول، ہری بھری گھاس۔ کافی ہیں یا اور بتاؤں۔" وہ شرارت سے بولی تو فیضی کا حیرت سے کھلا منہ بند ہوگیا۔

"میں سیریس ہوں، تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔" فیضی کی آنکھوں میں خفگی در آئی۔ "پتا ہے پچھلے ایک سال سے پیسے جمع کر رہا ہوں اس ٹرپ کے لیے، ٹھیک ٹھاک اماؤنٹ جمع ہوگیا ہے۔ تفریح بھی ہو جائے گی اور شاپنگ بھی۔ آئی تھنک کہ ان جگہوں پر ہینڈی کرافٹس اچھی ملتی ہیں۔ ان ہی میں سے کوئی چیز لے آؤں؟"

"ایسی چیزوں کی قیمتیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔" صفا کو ایک دم ہی کسی الجھن نے گھیرا تھا مگر وہ اس نکتے پر خود کو مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔

"ڈونٹ وری۔ پیسے کس لیے جمع کیے ہیں ظاہر ہے خرچ کرنے کے لیے۔ اور ویسے بھی پیسے تم سے اور تمہاری خوشی سے بڑھ کر تھوڑی ہیں۔" اس نے حسب عادت ڈائیلاگ جھاڑا۔

"اس سے پہلے کہ میری سہیلیاں اعلان گمشدگی کا اشتہار چھپوادیں، مجھے چلنا چاہیے۔" صفا اک دم ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بتایا ہی نہیں تم نے، کیا لاؤں تمہارے لیے؟" فیضی بھی مایوس سا اٹھ کھڑا ہوگیا۔

"آپ خیریت سے واپس آجائیں، کافی ہے۔" صفا کینٹین کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"تمہارے لیے؟"

"سب کے لیے۔" وہ آگے بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

دادا جان کی منتظر نگاہیں وال کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔

"کب آئے گا یہ نالائق؟" انہوں نے بے چینی سے منیعہ کی طرف دیکھا۔

"بس آنے ہی والے ہیں۔" منیعہ شرارت سے مسکرائی۔ اتنے میں فیضی کی موٹر سائیکل کی آواز آئی۔

"لیجیے آگئے۔"

"کون آگئے؟" فیضی نے ہیلمٹ اتار کر رکھا۔

"تم اور کون، کب سے انتظار کر رہا ہوں تمہارا۔" دادا نے جواب دیا۔

"خیریت!" وہ بالوں میں ہاتھ چلاتا ہوا صوفے پہ بیٹھ گیا۔ "منیعہ یار! ایک گلاس پانی تو لاؤ۔"

"جی دادا حضور! فرمایئے۔" پانی پی کر وہ دادا جان کی طرف متوجہ ہوا۔

"فرمانا یہ ہے کہ بجلی کا بل بہت زیادہ آرہا ہے۔ تمہاری ماں افورڈ نہیں کر سکتی لہٰذا اس ماہ سے بل کی آدھی رقم تم دیا کرو گے۔" دادا جان نے بغیر کسی تمہید کے میزائل داغ دیا۔

"میں؟" اس نے حیرانی سے انگوٹھے سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ہاں آپ، آپ کو زیادہ گرمی ستاتی ہے اس لیے اے سی آپ کے کمرے میں لگا ہے، کمپیوٹر بھی سب سے زیادہ تم ہی استعمال کرتے ہو اور یہ وجوہات نہ بھی ہوں تب بھی اب تم اس قابل تو ہو کہ گھر کی کوئی ذمہ داری پوری نہ سہی، آدھی پونی اٹھا سکو۔"

"دادا۔ میں اپنے سمسٹر کی فیس خود بھر رہا ہوں۔" فیضی نے جتایا۔

"تین سال تک تمہارے ہر سمسٹر کی فیس تمہاری ماں نے بھری ہے۔ بس یہ آخری سال کے دو سمسٹر کی فیس تم بھر رہے ہو۔ اسی لیے میں نے آدھا بل تمہارے ذمے لگایا ہے ورنہ پورا لگاتا۔"

"کیا ہوگیا ہے دادا! امی پہلے بھی تو مینیج کرتی تھیں کرنے دیں انہیں۔ میں کوئی اتنا تھوڑی کماتا ہوں، کیسے کروں گا؟"

"ماشاء اللہ جوان جہان ہو، تھوڑی اور زیادہ محنت کرلو گے تو گھس نہیں جاؤ گے۔" دادا نے ڈپٹ کر کہا۔

"اور رہی بات تمہاری ماں کی تو ساری عمر گزر گئی اس نے تم ہی لوگوں کے لیے اپنی ہڈیاں گھس لیں۔ اب اسے اپنے لیے بھی کچھ کرنے دو۔ وہ حج کرنا چاہتی ہے' پیسے جمع کرے گی' بغیر محرم کے جا نہیں سکتی تمہارے باپ کے ساتھ ہی جائے گی۔ کئی لاکھ روپے جمع کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ پھر لڑکیوں کا شادی بیاہ بھی ہے' اب اپنا یہ لاابالی پن چھوڑو اور انسان بنو اپنے باپ کی طرح۔" وہ غصے سے بول کر اپنی لاٹھی ٹھک ٹھک کرتے ہوئے وہاں سے چل دیے۔

"کیا ہو گیا ہے دادا کو' آج کل بڑی فارم میں ہیں۔" فیضی نے بے بسی سے بہن کو دیکھا۔

"دادا جان نے آج کل ضرب عضب شروع کی ہوئی ہے گھر میں' سدھر جائیں ورنہ خیریت نہیں ہے آپ کی بھی۔" سنعیہ سنجیدہ تھی۔

"سارے احکامات میرے ہی لیے ہیں یا اوروں کے لیے بھی کچھ ہے۔" فیضی حد سے زیادہ چڑچڑا ہو رہا تھا۔

"جی ہاں میرے لیے بھی کچھ کام نکالے گئے ہیں گھر کے' جو مجھے لازمی کرنے ہیں۔" سنعیہ کا منہ لٹک گیا۔

"اچھا بھلا گھر چل رہا تھا' پتا نہیں کس نے مشورہ دیا ہے یہ انقلاب لانے کا۔" وہ بڑبڑایا۔

سامنے سے دادا چلے آرہے تھے۔ اپنی ٹوپی سر پر جمائے وہ نماز پڑھنے جارہے تھے۔ اس کی بڑبڑاہٹ سن کر ٹھہر گئے۔

"میاں صاحبزادے! انقلاب تو جب آئے گا جب تم دونوں باپ بیٹے پوری طرح سے اپنی ذمہ داریاں اٹھاؤ گے اور جہاں تک پہلے گھر چلنے کی بات ہے تو یہ میری کوتاہی ہے کہ میں سب کچھ دیکھتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا' مگر یہ میری غلط فہمی تھی' عملی طور پر ڈنڈا اٹھائے بغیر کوئی بگاڑ کبھی درست نہیں ہوتا' سنعیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے بھی اپنے گھر میں ضرب عضب کا آغاز کر دیا ہے۔ اتنے عرصے کا بگاڑ اک دم صحیح نہیں ہو گا مگر آہستہ آہستہ کر کے' کبھی نہ کبھی تو ٹھیک ہو ہی جائے گا چلو ٹوپی لے کر آؤ اندر سے' نماز پڑھنے چلو میرے ساتھ۔ جمعے کے جمعے مسجد میں شکل دکھاتے ہیں اپنی' اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے مرنے کے بعد۔" انہوں نے ڈپٹ کر فیضی سے کہا۔

"دادا تو بالکل ہی جنرل صاحب بن گئے ہیں۔" وہ تن فن کرتا اندر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

الجھن تھی کہ بڑھتی چلی جارہی تھی' بلکہ یہ الجھن بھی کہاں تھی کشیدگی تھی۔ سرد مہری تھی۔ سکندر کو زندگی میں پہلی بار اپنی بیوی جسے وہ اپنی محبت کہا کرتے تھے' سے بہت زیادہ شکایتیں ہو گئی تھیں۔ ان کے خیال میں عافیہ نے ابا جی سے ان کی شکایتیں کی تھیں۔ عافیہ اپنی صفائیاں دے دے کر تھک گئی تھیں پھر بے زار ہونے لگیں' آپا ٹھیک کہتی تھیں۔ سکندر کی محبت بڑی آرام طلب ہے۔ اب جو ذرا مشقت آن پڑی تو مزاج برہم ہو گیا۔

ابا سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا تو وہ مسکرا دیے۔

"زندگی میں پہلی بار پابندی اور تسلسل کے ساتھ کام کر رہا ہے' چڑچڑا تو ہو گا ہی۔ تم زیادہ پریشان مت ہو۔ آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے بہو بیگم کو تسلی دی۔

"بہت بدگمان ہوتے جارہے ہیں آپ کے بیٹے۔"

"ہونے دو' کہاں جائے گا بدگمان ہو کر؟ کچھ عرصے کی بات ہے' اپنے کام کے ساتھ سیٹ ہو جائے گا تو تمہارے ساتھ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بھی ذرا رسی کھینچ کے رکھا کرو' بہت سر پہ چڑھا لیا۔ اپنے آپ کو بھی کچھ ریلیف دو۔ ہم پر سارے حقوق صرف دوسروں کے ہی نہیں ہوتے۔ ہم پر ہمارے اپنے آپ کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں' ان کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔" ابا سنجیدہ ہو کر سمجھا بیٹھے اور وہ کوئی بچی تو نہیں تھیں۔ ساری باتیں معلوم تھیں' سمجھتی تھیں مگر۔۔۔

"چلو' اب زندگی کا رنگ یہ ہے تو یہی سہی' بگڑے

مزاج درست ہو بھی سکتے ہیں۔ شکوے 'ناراضیاں اور غلط فہمیاں دور ہو بھی سکتی ہیں اور یہ سب اب ہو ہی جائے'بس تھوڑا انتظار۔

☆ ☆ ☆
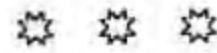
تیزی سے نوٹس بناتے اس کے ہاتھ اب دکھنے لگے تھے۔ قلم کی روانی مدہم ہونے لگی۔ اس نے قلم ایک طرف رکھا اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ دو دن پہلے کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔

"کیسا رہا سیر سپاٹا؟" تقریباً "ایک ماہ بعد فیضی اس کے سامنے تھا۔ بلو جینز اور گرے شرٹ میں اس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ نئے ہیئر اسٹائل میں وہ بہت فریش لگ رہا تھا جواباً" مسکرا دیا۔

"نیا ہیئر اسٹائل سوٹ کر رہا ہے آپ پر۔"

"ہے نا' میرے تمام دوست بھی یہی کہہ رہے تھے۔" وہ پرجوش ہوا۔

"اور؟ کیسے لگے پاکستان کے نظارے؟"

"یار' مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا ہمارا ملک کتنا خوب صورت ہے اور ناردرن ایریاز 'اف کیا بتاؤں' حالانکہ پکچرز میں کئی بار دیکھا ہے مگر خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا بہت ڈفرنٹ اور خوب صورت ایکسپیرینس تھا۔" فیضی شروع ہو گیا۔

"آپ ایک کام کیوں نہیں کرتے 'اپنا سفرنامہ لکھ لیں تاکہ اور لوگ بھی مستفیض ہو سکیں ہم اکیلے مجھ بے چاری کو کیوں سنا رہے ہیں۔"

"جب سے یہاں آئی ہو' کافی پر لگ گئے ہیں تمہیں؟" فیضی نے شرمندہ ہوئے بغیر اسے گھورا۔

"پرواز کے لیے پر تو ضروری ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"ویسے تم نے کچھ منگوایا تو نہیں تھا مگر پھر بھی تمہارے لیے ایک چیز لے آیا ہوں۔" وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالنے لگا۔

اس کی ہتھیلی پر رکھی کھلی ڈبیا میں سے جھانکتی ایک بے حد خوب صورت انگوٹھی کو دیکھ کر وہ ساکت رہ گئی۔

"کیسی ہے؟" فیضی سوالیہ اور فخریہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"خوب صورت ہے۔" صفا نے خود کو سنبھالا۔

"ابھی نہیں دے رہا۔" اس نے ڈبیا بند کر کے واپس جیب میں ڈالی۔

"صرف دکھانے لایا تھا امی اور گھر والوں کے ہاتھ بھجواؤں گا پھر پہننا اور پہنے ہی رہنا۔" اس نے ذرا جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں 'میں یہ نہیں پہنوں گی۔" صفا نے نفی میں سرہلایا۔

"مذاق۔۔۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی 'سیریس ہوں۔" صفا نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ "بلکہ آپ کو نہیں کرنا چاہیے تھا ایسا مذاق 'آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا؟" صفا کی پیشانی پر شکنیں ابھرنے لگیں۔

"کیوں 'کیا تم مجھے لائک نہیں کرتیں؟" فیضی کا چہرہ کچھ غصے اور کچھ شرمندگی سے سرخ ہونے لگا۔

"ہم دونوں ایجوکیٹڈ ہیں 'کزنز ہیں۔ آپس میں انڈر اسٹینڈنگ بھی ہے ہماری پھر میں تمہیں بہت بہت لائک کرتا ہوں۔ پرفیکٹ میچ ہو گا ہمارا۔" وہ کسی سیلز مین کی طرح دلائل دے رہا تھا۔

"آپ میرے حوالے سے ایسا کوئی فیصلہ مت کریں اور نہ ہی بڑوں تک اس بات کو پہنچائیے گا۔" صفا نے سختی سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

"صفا! بیٹھو 'مجھے وجہ بتا کر جاؤ۔ تم کیوں انکار کر رہی ہو۔ کیا تم کسی اور میں انٹرسٹڈ ہو؟"

"میں صرف اور صرف اپنی اسٹڈیز میں انٹرسٹڈ ہوں اور کسی چیز میں نہیں۔ رہی بات وجہ کی تو۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔

"آئی ایم سوری ٹو سے 'آپ کو میری بات بری لگے گی۔"

"کہہ دو 'برا لگے بھی تو کیا ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں مجھ میں کیا برائی ہے۔ جو میں آپ جیسی لڑکی کے قابل

بھی نہیں۔" فیضی کا لہجہ طنز اور تلخی سے بھرپور تھا۔

صفا اس کے طنزیہ لفظوں اور تلخ لہجے کو نظر انداز کر کے سکون سے گویا ہوئی۔ "ریا باجی کی شادی پہ خالہ جان کتنے کرائسس میں تھیں۔ انہیں اچانک اماؤنٹ کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ آپ کے پاس آپ کی سیونگ تھی، پھر بھی آپ نے اپنی امی کی ہیلپ نہیں کی کیوں؟"

"کیوں کرتا؟" فیضی کا لہجہ اور جارحانہ ہو گیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں نے اتنی محنت کر کے اور اپنی کئی خواہشات اور ضروریات ایک طرف کر کے یہ پیسے جمع کیے تھے اپنے ٹرپ کے لیے، میں اپنی سیلفش بہن کے لیے کیوں دے دیتا اور وہ بھی تو کماتی تھی۔ کچھ اماؤنٹ وہ بھی جمع کر سکتی تھی اپنی شادی کے لیے کیوں نہیں کیا؟"

"میں تو آپ کی امی کی بات کر رہی ہوں، آپ کو ان کا خیال نہیں آیا؟"

"آئی لو مائی مدر ویری مچ، لیکن ان کے لیے میں اپنی محنت کی کمائی کسی پر بھی نہیں لٹا سکتا۔" اٹل انداز میں بولتا ہوا وہ بالکل سکندر لگ رہا تھا۔ صفا کو جھرجھری آ گئی۔

"اسے خود غرضی کہتے ہیں۔" صفا نے جتایا۔

"یہ تمہارا خیال ہے، میں متفق نہیں۔" فیضی نے تیزی سے جواب دیا۔

"لیکن میں ان رویوں کی عادی نہیں، نہ ہی ایسے ماحول میں خوش رہ سکتی ہوں۔"

"تمہیں میرے ساتھ رہنا ہے۔ میں تمہیں بہت چاہتا ہوں۔"

"چاہت کا دعوا تو شاید آپ کو اپنی ماں سے بھی ہو لیکن ان کی پریشانی کو اطمینان سے دیکھتے رہے۔ انہوں نے اپنی عزت نفس کو داؤ پر لگا کر قرض مانگا۔ لیکن آپ بہن بھائیوں کے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ ایسی چاہت کا کیا فائدہ.... خود غرضی عادت نہیں فطرت ہوتی ہے اور فطرت کبھی بدل نہیں سکتی۔ خدا حافظ۔"

اس نے کتابیں سمیٹیں اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆ ☆ ☆

اور میں نے اپنے آپ کو خوب ٹٹولا، لیکن میری کوئی خاص فیلنگز نہیں مگر وقت کے ساتھ ساتھ بہت کچھ بدل بھی جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے زندگی کے معاملات میں قسمت کا فیکٹر بہت اہم ہوتا ہے، کون جانے میرے نصیب میں آگے کون لکھا ہے۔ لہٰذا اس معاملے کو آگے کے لیے ہی چھوڑنا مناسب ہے۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں ہاں کروں گی یا ناں۔"

آنکھیں بند کیے وہ سوچتی رہی، پھر سر جھٹک کر سارے خیالات ایک طرف کیے اور اپنا قلم لے کر دوبارہ شروع ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"بڑی ظالم لڑکی ہو تم۔" پہلا مسیج آیا۔

"کیسے بھئی؟" وہ چکرا گئی۔

"اتنے انتظار کے بعد ہاں کی ہے۔ تم نے شکر ہے میں نے تمہیں پرانے زمانے کے کاؤنٹ کی طرح گھٹنوں کے بل بیٹھ کر پرپوز نہیں کیا، ورنہ تمہاری ہاں کے انتظار میں میرا تو حشر برا ہو جاتا۔"

"زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہے، سوچ سمجھ کر ہی کرنا چاہیے، ایسے کیسے بس کہہ دیتی۔"

"میں نے سوچا تھا تم فٹافٹ ہاں کرو گی۔"

"بڑے خوش فہم ہیں آپ۔"

"میں اوپٹی مسٹک ہوں۔"

"اچھا!"

"بس، ایک لفظ! یار کچھ تو بولو، ہم ان فیوچر ایک دوسرے سے انگیج ہو رہے ہیں، تم تو کچھ بول ہی نہیں رہیں۔"

"کیا بولوں؟"

"کچھ نہیں بولنے کو؟ آئی لو یو ہی بول دو۔"

"یہ کوئی بولنے کی بات ہے۔"

"پھر؟"

"یہ محسوس کرنے کی بات ہے۔"

"ہوں، اس کا مطلب، بالکل ہی سمنس لیس

"گڈ فیلنگز۔"

"اور...؟"

"ویری گڈ فیلنگز۔"

"اور...؟"

ویری ویری ویری گڈ فیلنگز۔

"ہاہاہا... تمہارا یہ نانی اسٹائل 'ویری ویری گڈ ہے تو پھر سنڈے کو آرہی ہو۔"

"کہاں؟"

"ایئرپورٹ 'مجھے اور مام کو ریسیو کرنے۔"

"اس سنڈے کو؟ پرسوں؟"

"ہاں 'سوچا تھا تمہیں سرپرائز دوں گا لیکن چھوڑو ' ایسی کی تیسی سرپرائز کی 'تم آؤ گی نا ایئرپورٹ!؟"

"دیکھوں گی۔"

"ہاں ہاں 'بالکل دیکھنا اب تمہیں چوری چھپے دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب کے سامنے بھی دیکھ سکتی ہو۔ ویسے میں پہلے سے بھی زیادہ ہینڈسم ہو گیا ہوں۔"

"ایک منٹ 'میں نے چوری چھپے کب دیکھا آپ کو؟"

"جب ہم آپ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ دیکھتی تھیں مجھے چوری چوری 'چپکے چپکے۔"

"اب اگر میں آپ کو شٹ اپ کہوں تو مائنڈ مت کیجیے گا۔"

"لڑنے کے موڈ میں ہو۔"

"آپ کی باتیں ہی ایسی ہیں۔"

"میں رومانس کرنے کی کوشش کرتا ہوں تو بدک جاتی ہو۔ چھیڑتا ہوں تو لڑنے لگ جاتی ہو 'کیا کروں پھر میں؟"

"اس وقت تو فون بند کریں۔ دادا جان بلا رہے ہیں مجھے۔"

"ایک تو یہ تمہارے دادا جان...۔"

"شٹ اپ!"

"اوہ 'میں مائنڈ کر گیا۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔ نہیں ہو تم 'تو پھر کیا فیل کرتی ہو تم میرے بارے میں؟ ناراض ہو گیا ہوں۔ پرسوں نہیں منایا تو..."

"تو...؟"

"تو کوئی بات نہیں سویٹ ہارٹ 'اب تم جیسی بھی ہو برداشت تو کرنا ہی پڑے گا۔ بائے بائے۔"

"بدتمیز!" سونیا نے اپنے موبائل کو گھورا اور پھر یکدم مسکرادی۔

"سمیرا آنٹی کو شادی کی جلدی تھی 'یہاں سے عندیہ ملتے ہی انہوں نے شادی اور آنے کا سگنل دے دیا۔ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہر ایک کی کہانی دوسرے سے الگ ہوتی ہے۔ اور سونیا کو یقین آ گیا تھا کہ شعیب اپنے والد سے بہت مختلف ہے۔ اور پھر اس کا ساتھ کچھ ایسا برا نہ تھا۔ کچھ کھٹی سی کچھ میٹھی سی زندگی اس کی منتظر تھی۔

عطیہ خالد

رات بے حد گرم تھی۔ گرم ہوا بگولوں کی صورت اڑتی تھی۔ عمر رفتہ کے بوجھ سے خمیدہ وجود سر پر لپیٹے صافے کو دوبارہ لپیٹے ہوئے باہر چلا آرہا تھا۔ کھوں... کھوں... کھانسی بڑھتی جارہی تھی۔ سانس درست کرکے باہر لگے بیسن سے لوٹا بھرا اور پاس پڑی چوکی پر بیٹھ کر حاضری کے لیے وضو کرنے لگے۔ ابھی رات باقی تھی' بگولے تھم گئے تھے اور آسمان تاروں کی جھلملاہٹ سے چمک رہا تھا۔ انہوں نے وہیں صحن کے ایک کنارے گھاس پر جاء نماز بچھائی اور حاضری لگانے لگے' محبوب کے در پر ماتھا رگڑنے لگے۔ آنسو تواتر سے آنکھوں سے گرتے اور سفید ملائم داڑھی سے ہوکر سینے پر بندھے ہاتھوں کو نم کرتے جاتے تھے' وہ عرضی پیش کرتے رہے اس کے حضور۔

جو جو بچہ یاد آتا گیا اس کی عرضی پیش کرتے گئے۔ پوتوں' نواسے' نواسی کا نام لے کر روتے رہے۔ سب نام حفظ تھے۔ باری باری ان کے لیے دعا کرتے رہے۔ نفل ختم کیے تو اذان کے انتظار میں بیٹھے اپنے محبوب سے باتیں کرتے رہے۔ پھر اذان کی آواز کے ساتھ مسجد کے لیے چل پڑے۔ دل بڑا بوجھل تھا آج۔ نماز کے بعد مسجد میں ہی کلام پاک پڑھتے رہے۔ بھرے پیٹ والوں کا علاقہ تھا۔ بڑے بڑے افسر' ڈاکٹر رہتے تھے۔ صبح ذرا دیر سے ہی ہوتی تھی یہاں' اس لیے واپسی پر بھی خاموشی ہی تھی۔ گھر پہنچے تو ابھی سب سو رہے تھے۔ نسرین کے کوارٹر کی طرف دیکھا' وہ بھی بند تھا۔

"چلی گئی عاقب کی ماں' مجھے چائے کون دے۔" سوچتے ہوئے لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد اندر سے آوازیں آنی شروع ہوگئیں۔ بہو کی' پھر بیٹے کی پھر بچوں کی۔ نسرین کی آواز سب سے اونچی تھی' بچوں کا ناشتا' صاحب کا ناشتا' صاحب کا لنچ۔ پھر گاڑی کی آواز آئی۔ عاقب بچوں کو اسکول چھوڑ کر دفتر جاتا تھا۔ انکم ٹیکس آفیسر تھا' نو سال میں اتنی ترقی کی تھی کہ بیسویں گریڈ تک جا پہنچا تھا۔ ایک کنال کی کوٹھی بنالی تھی' دو دو گاڑیاں' بیوی کی الگ' اپنی الگ۔ وہ سوچوں میں گم تھے کہ نسرین کی آواز آئی۔

"اباجی! بی بی پوچھتی ہیں ناشتا ادھر ہی بھیج دوں؟"

"آرہا ہوں میں باہر۔" کہتے ہوئے وہ باہر آگئے۔ کچن کے ساتھ چھوٹے ڈائننگ ٹیبل پر ان کا ناشتا رکھا تھا۔ مہنگے ہوئے توسٹ اور آملیٹ اور دودھ پتی' پھر بیوی یاد آگئی' ململ دار پراٹھا اور وہی کا ناشتا۔

"اباجی! ناشتا کرکے آپ یہیں بیٹھیں میں آپ کا کمرہ صاف کروادوں۔" بہو نے نسرین کو بھیجا' پھر چائے ختم کرکے خود بھی پیچھے چلی گئی۔ چادریں' تکیے' کور' پردے بدل ڈالے' دھلا تولیہ رکھا' پھر فنائل کا پوچا لگایا۔

"اباجی کتنا گرم ہورہا ہے آپ کا کمرہ۔ آپ عاقب کی بات مان کیوں نہیں لیتے۔ آخر وہ کس کے لیے کماتے ہیں۔ ایک اے سی آپ کے کمرے میں نہیں لگواسکتے آپ کے لیے؟"

"نہ لاج وہ مجھے ٹھنڈے کمرے کا' مجھے اپنی حیثیت کا اندازہ ہے۔ ماسٹر ہدایت اللہ کی گنجائش بس ایک پنکھے جتنی ہی ہے۔"

"لاؤ تم مجھے سودے کی لسٹ دو۔"

"دن چڑھے پر جانا اباجی' باہر بہت دھوپ ہے۔" سحر

پرچی تھماتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔۔۔ ہاں رکشے پر ہی جاؤں گا۔" وہ قدرتی تلخی سے بولے۔ ایک گھنٹے بعد سودا لا کر نسرین کو تھمایا۔ اس کے ہاتھ سے ٹھنڈے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے بولے۔ "ایک کپ چائے۔" وقت دیکھا اور پنکھے کے نیچے جاء نماز بچھائی' ظہر کے وقت مسجد جانے کے لیے نکلے تو نسرین باہر کپڑے پھیلاتی نظر آئی۔

"اباجی! سب چولہوں پر کچھ نہ کچھ پک رہا تھا۔ میں چائے نہیں بنا سکی۔" آج بہو کے مائیکے والے آنے والے تھے۔ روز ہی کوئی نہ کوئی آجاتا تھا' رشتہ دار' دوست' سہیلیاں۔۔۔

نماز کے بعد معمول کا ذکر بھی مشکل لگا' دل میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ واپسی پر گھر میں شور شرابا برپا تھا۔ پوتے اور مہمان بچے بھاگے پھر رہے تھے۔ کچن سے اندر ڈائننگ ہال تک لذیذ کھانوں کی ڈش پہنچاتی نسرین' بھوک کا احساس شدید ہو گیا۔ آخر نسرین کو آواز دی۔

"آئی اباجی!" نسرین نے آتے آتے بھی پندرہ بیس منٹ لگائے۔ قیمہ' شملہ مرچ اور تازہ پھلکا' ٹھنڈا پانی۔۔۔ "الحمدللہ" لیکن کھانا کھا کر بھی طبیعت نہ سنبھلی۔ عصر کی نماز پڑھ کر واپس نکلتے ہوئے دل میں شدید درد اٹھا۔ سرفراز صاحب کا پوتا چھوڑنے آیا تو بیٹے کی انا پر کاری ضرب پڑی۔۔۔ اس کے واپس جاتے ہی برس پڑا۔

"کیا ضرورت تھی مسجد جانے کی۔" بیٹا برستا ہی رہتا' لیکن گیٹ پر بیل ہوئی اور شاید سینے کو مسلتے دیکھ کر ترس آگیا تھا۔ سرفراز صاحب کا پوتا ڈاکٹر خاور کو لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب پڑوس کا خیال کرتے ہوئے اپنے ایوننگ کلینک سے اٹھ کر آگئے تھے۔ انہوں نے معائنہ کرتے ہی زبان کے نیچے گولی رکھی اور کہا کہ فوری اسپتال لے جائیں۔

آئی سی یو میں نیلے ڈھیلے ڈھالے لباس میں' مختلف نالیوں میں جکڑے ہوئے اباجی کو دیکھ کر عاقب کو احساس ہو رہا تھا کہ اسے اباجی سے کتنی محبت تھی۔ امینہ آپا کو سحر نے اطلاع کر دی تھی۔ وہ اور اس کے میاں بھی اسپتال پہنچ گئے تھے۔ عاصم الدین نے بتایا کہ ڈاکٹر نے کہا ہے۔

"حالت تشویش ناک ہے' کل ڈاکٹرز کا بورڈ فیصلہ کرے گا۔ لیکن آپ لوگ ذہنی طور پر تیار رہیں۔ بائی پاس کرنا ہی ہو گا۔"

وہ حیران' پریشان ہو گیا۔ شام تک تو اچھے بھلے تھے اباجی۔ اتنے میں میل نرس نے آواز دی۔ ساشہد ابیت اللہ کے ساتھ کون ہے۔ عاقب پہنچا تو اس نے اندر بلا لیا کہ آپ کے اباجی ہوش میں ہیں' وہ دوائی نہیں کھا رہے۔

"یہ کہاں لے آیا تو مجھے عاقب! یہ پرائیویٹ اسپتال ہے۔"

"اباجی آپ کو علاج کی ضرورت ہے۔" اس نے ابا

جی کا بوڑھا جھریوں والا ہاتھ نہ جانے کتنے عرصے بعد سہلایا۔

"ماسٹر ہدایت اللہ کی اتنی گنجائش نہیں بیٹا۔" وہ روندھی آواز میں بولے۔

"کوئی مہنگا نہیں ہے۔ ایسا گراپڑا غریب نہیں ہے آپ کا بیٹا۔"

"عاقب! بیٹا تو صرف میرے پیسے میرے علاج پر خرچ کرے گا۔"

"آپ اس وقت بھی میرا تیرا کریں گے ابا جی!" عاقب رو کر بولا۔ نرس نے اشارہ کیا کہ مریض کا بولنا اچھا نہیں۔

"تو قسم کھائے گا تو میں دوائی کھاؤں گا۔"

"اچھا! ٹھیک ہے' میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ اب دوائی کھائیں اور آرام کریں۔"

☆ ☆ ☆

عاقب آئی سی یو سے باہر آگیا۔ گاڑی کی چابی بہنوئی کو پکڑائی کہ آپ آپا' سرفراز صاحب اور سلیم (پوتا) کو چھوڑ کر ابا جی کی چیزیں لے کر اسپتال آجائیں اور سحر کو فون کر دیا کہ ابا جی کی رقم ان کے ہاتھ بھیج دے۔ وہ رقم تقریباً پونے تین لاکھ روپے تھی۔ آپریشن کے لیے تو کافی تھی۔ اس کے بعد اخراجات کے لیے ان کا ایک چھوٹا سا زرعی زمین کا ٹکڑا تھا وہ بیچا جا سکتا تھا۔ اس نے ثاقب بھائی کو فون کر کے ساری صورت حال بتادی اور کہا کہ وہ زمین بیچ کر صبح رقم لے آئیں۔ صبح ہی بائی پاس کا فیصلہ ہوگیا۔ عاقب اور امینہ ابا جی کی باتیں کرتے ہوئے انتظار گاہ میں بیٹھے تھے۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ آپریشن کامیاب ہوگیا۔ مگر مزید خون کی ضرورت ہے۔ ان کے پاس او پونیٹو کی صرف تین بوتلیں موجود ہیں۔ ابا جی کی رقم ختم ہو چکی تھی۔ صرف اکیس روپے اس کی جیب میں پڑے تھے۔ اس نے سوچا کہ میں اپنے پیسے سے خرید لیتا ہوں ثاقب بھائی آئیں گے تو اس میں سے لے لوں گا۔ بلڈ بینک کی طرف بھاگا۔ او پونیٹو ختم تھا۔ رفاہی بلڈ بینک والوں کو فون کیا تو وہاں بھی نہیں تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"عاقب! ہمارا گروپ بھی تو او پونیٹو ہے۔" امینہ آپا نے یاد دلایا۔ خون دیتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سیاہ داڑھی والے ابا جی تھے۔

"او پونیٹو ہے تم بہن بھائیوں کا خون۔ یہ گروپ ہے یونیورسل ڈونرز کا۔ سب کو خون دے سکتا ہے یہ گروپ۔ اس خون کو رزق حلال اور طیب سے پاک بنائے رکھنا' کبھی حرام کی پیوند کاری نہ کرنا' یہ زندگیاں بچانے والا خون ہے۔ اس کو زندگی چھیننے والا نہ بنانا۔ خالق نے ایسا خون دے کر تم پر احسان کیا ہے' اس کا احسان بھول نہ جانا۔"

جہاں کہیں بھی خون دینے کی ضرورت پڑتی۔ ابا جی ضرور پہنچتے۔ وہ بڑے ہو گئے تو ان کو بھی لے جاتے۔ ابا جی ان کو ماہوار خرچ دیتے اور جتنا خرچ دیتے اس کے مطابق کھاتے۔ تین سالن بنتے تو سب سے سادہ والا لیتے' کہتے۔

"میرا پیٹ اس سے زیادہ نہیں مانگتا۔" وہ سمجھتا ابا جی اس کے پیسے سے حسد کرتے ہیں بھلا ایسا ہو سکتا تھا ابا جی۔ وہ ابا جی کا سکھایا ہر سبق بھول گیا۔ حرام راستوں پر چل کر خون چوسنے والی جونک بن گیا تھا۔ بھلا اس کا پیسہ ان کے لیے کیسے قابل قبول ہوتا۔

ابھی دوسری بوتل پوری نہیں ہوئی تھی کہ کمپاؤڈر نے ڈرپ علیحدہ کر دی کہ اب مزید ضرورت نہیں رہی۔

"اچھا شکر ہے۔" وہ لیب سے باہر آیا تو امینہ آپا اس سے لپٹ گئیں۔

"ابا جی چلے گئے' عاقب وہ ہمیں چھوڑ گئے۔"

ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تین بوتل تک تو سب ٹھیک رہا' لیکن چوتھی بوتل لگاتے ہی شدید ری ایکشن ہوا اور لمحوں میں روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ چوتھی بوتل۔ وہ اس کا خون تھا۔ ایک خائن کا۔ ایک راشی کا۔ ان کا حلال خون حرام کا ایک قطرہ نہیں سہہ سکا اور زندگی کی دوڑ سے نکل گیا۔

☆

میں اس لمحے کو کبھی نہیں کھوج سکا جس لمحے میں مجھے مشعل سے محبت ہو گئی تھی۔ میں اس وجہ کو بھی نہیں جان سکا جس نے مجھے اس کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ کیا اسی لیے محبت کو اندھا، گونگا، بہرا کہا جاتا ہے کیونکہ وہ لمحہ نہ دکھائی دیتا ہے نہ سنائی اور نہ ہی اس لمحے کی سزا کے قیدی بنتے ہوئے ہم کچھ بول پاتے ہیں۔

مشعل سے میری پہلی ملاقات یونی ورسٹی کے پہلے دن ہوئی تھی۔ میں نے اس سے اپنی کلاس کے بارے میں پوچھا اور اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کر دیا کہ وہاں ہے۔ جس طرح اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر بے اعتنائی سے ٹھک ٹھک کرتی چلی گئی تو مجھے یہ منظر یاد رہ گیا۔ اتنا یاد رہ گیا کہ میں اسے یونی ورسٹی میں ڈھونڈنے لگا کہ وہ دوبارہ کہاں مل سکتی ہے۔

اور یہی میری پہلی غلطی تھی۔ اسے ڈھونڈنا۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے تکلیف و کرب کے امکانات کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ میں ایک ایسی ہستی کو تلاش کر رہا ہوں جو میرے دل کی بستی کو برباد کر کے چھوڑ دے گی۔ جو میری محبت کی تذلیل کچھ ایسے انداز میں کرے گی کہ دوبارہ اس محبت کی عزت بحال نہیں ہو سکے گی۔

عزت، جو مجھ جیسے عام اور معمولی انسان کو تو مل جاتی ہے۔۔۔ لیکن محبت نہیں ملتی۔

میں ہمیشہ سے ایک برائٹ اسٹوڈنٹ رہا تھا، پھر بھی میں ایک بی لو ایوریج ہزبینڈ ہی رہا۔ میں نے بہت سی کتابیں پڑھی تھیں، پھر بھی بات کرنے کے لیے میرے پاس کوئی موضوع نہیں تھا۔ میں دیکھنے میں اچھا

تھا۔ بلکہ گاؤں میں تو خوب صورت مشہور تھا، پھر بھی میں ماڈرن۔۔۔ اسٹینڈرڈ کے مطابق چارمنگ نہیں تھا۔ ہینڈسم تھا، لیکن "ہاٹ" نہیں۔ مجھے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، بات چیت کے سب آداب معلوم تھے، پھر بھی میں پینڈو تھا۔

میں عادل۔۔۔ ایک دیہاتی، عام اور معمولی انسان۔۔۔

اپنے شہر کے دوستوں سے کتنی ہی بار میں نے یہ سنا تھا کہ پینڈو کتنا بھی پڑھ لکھ جائے وہ رہتا پینڈو ہی ہے۔

اس بات پر میں نے کبھی ان سے کوئی تکرار نہیں کی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ شہر والوں کے نظریات بدلنا مشکل ہوتا ہے۔ شہر کے لوگ ذرا ضدی ہوتے ہیں۔ ان کے رویوں میں اتنی لچک نہیں ہوتی جتنی ایک دیہاتی کے رویے میں ہوتی ہے۔

میٹرک میں جب میں نے بورڈ میں دوسری پوزیشن لی تو میرے اسکول کے ایک ٹیچر نے کہا کہ۔۔۔ "پینڈو جب پڑھنے پر آتا ہے تو سب کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ دیکھنا، یہ عادل کتنا آگے جائے گا، لیکن رہے گا پینڈو ہی۔۔۔"

یہ بات مجھے ہمیشہ یاد رہی کہ میں کتنا ہی آگے چلا جاؤں، رہوں گا پینڈو ہی۔

ابا جی میری پیٹھ تھپک کر بار بار کہا کرتے تھے۔ "پڑھ لکھ، تے بابو بن جا۔"

بابو یعنی شہری۔۔۔ یہ وہ واحد بات تھی جو مجھے کم سے کم ابا جی کے منہ سے پسند نہیں تھی۔ ہم سب اپنی شناخت بدلنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں رہتے ہیں۔ ابا جی ایک سادہ انسان تھے۔ شاید انہوں نے اپنی زندگی میں پینڈو ہونے کے طعنے اتنے زیادہ سنے تھے کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پینڈو رہوں۔ یا شاید اس کی وجہ وہ لڑکی رہی تھی جس سے انہیں محبت ہو گئی تھی اور وہ لڑکی شہر کی تھی۔

شاید بچپن میں یا پھر لڑکپن میں، لیکن مجھے یہ بات معلوم ہو گئی کہ ابا جی کو اپنے کسی دور کے رشتے دار کی بیٹی سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ لڑکی کالج جاتی تھی، جبکہ ابا جی میٹرک بھی پاس نہیں تھے۔ جب دادا جی شہر لڑکی والوں کے گھر رشتہ لے کر گئے تو انہوں نے شاید ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ ہماری بیٹی کالج جاتی ہے اور آپ کا بیٹا دس جماعتیں بھی نہیں پڑھا ہوا ہے۔ کم سے کم لڑکا میٹرک پاس تو ہو۔ پھر ہم سوچیں گے۔

اگر ابا جی کو اپنی محبت دس جماعتیں پاس کرنے سے مل سکتی تھی تو وہ یہ دس جماعتیں بار بار پاس کرنے کے لیے تیار تھے۔ ابا جی نے دو سال لگا کر میٹرک جیسے تیسے کر کے پاس کیا۔ کالج میں داخلہ لینے ہی لگے تھے کہ لڑکی کے نکاح کی اطلاع آ گئی۔ دس جماعتیں پاس کر کے بھی وہ فیل ہو گئے۔ سنا ہے کہ ابا جی تین ہفتے تک لاپتا رہے تھے پھر کسی دربار سے ملے تھے۔ فقیر بن کے بیٹھے تھے دربار پر۔۔۔

دل سے وہ ابھی بھی وہی فقیر تھے، لیکن مجھے فقیر دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ میرے لیے خوف زدہ تھے۔ اتنے کہ ساری زندگی ابا جی نے جتنا پیسہ جمع کیا، مجھے شہری بنانے میں لگا دیا۔ میرے کپڑوں، میرے جوتوں، میری کتابوں، میرے کھلونوں پر۔ وہ تو میرے لیے شہر جا کر رہنے کے لیے بھی تیار تھے، لیکن دادی نے اپنی محبت سے باندھ لیا۔ دادی ایک ٹانگ سے معذور تھیں۔ جب ابا جی تین ہفتوں کے لیے لاپتا ہو گئے تھے تو دادی پاگلوں کی طرح ابا جی کو ڈھونڈتی پھرتی تھیں کہ ٹرالر کے نیچے آ گئیں۔ جان بھی بڑی مشکل سے بچی تھی ان کی۔ ابا جی کی اس ایک محبت نے بڑا نقصان کیا، سب کا۔ دادی جی کا، اماں کا، خود ابا جی کا اور سب سے زیادہ میرا۔۔۔

میں کبھی ابا جی کے اس پاگل پن کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ اس وقت تک جب تک میں نے خود مشعل سے شادی نہیں کر لی۔

میں ایک پینڈو آدمی جس کے باپ نے ساری زندگی اسے شہری بنانے میں لگا دی تھی پینڈو ہی رہا۔ میری آسٹریلین یونی ورسٹی کی ڈگری اور میری فیصل آباد کی جاگیر بھی مجھے برانڈڈ ہینڈسم نہیں بنا سکی۔ میری

فقیرانہ محبت بھی اس در تک نہیں پہنچ سکی جہاں ۔۔۔ اسے بادشاہی کا رتبہ مل جاتا۔ یہ جذبہ فقیر کا وہ کشکول ہی رہا جو صداؤں پر بھی "خیرات" سے خالی ہی رہتا ہے۔

☼ ☼ ☼
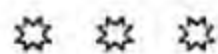
"تم پاکستان کے کس شہر سے ہو مشعل؟"

جب میں نے اسے ڈھونڈ لیا اور یہ تک معلوم کر لیا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ کس کلاس کی اسٹوڈنٹ ہے تو ایک دن میں لائبریری میں جا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہیلو ہائے کے بعد پوچھا۔

"میں پاکستانی نہیں ہوں ۔پاکستانی نژاد ہوں۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔ شاید اسے اپنے پاکستانی نژاد ہونے پر شرمندگی تھی۔

"اوہ۔۔۔ کیا تمہارے فادر بھی۔۔۔؟"

"میرے گرینڈ پاپا پاکستانی تھے۔ میرے فادر آسٹریلین ہیں۔۔۔ تم کون ہو۔۔۔ تمہیں کس نے اجازت دی ہے ایسے مجھ سے آ کر باتیں کرنے کی؟"

میں شرمندہ ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ میں اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں نے اس کا نام معلوم کر لیا تھا۔ نہ وہ مجھے جانتی تھی، نہ اس نے پہلی ملاقات کے اس منظر کو ذہن میں رکھا ہوا تھا جو میرے دل پر نقش تھا۔

"میں۔۔۔ میں عادل ہوں۔۔۔ یونی ورسٹی کے پہلے دن وہ۔۔۔ وہ میں نے تم سے ایپی۔۔۔"

"میں کسی عادل کو نہیں جانتی اور غیر ضروری لوگوں سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی۔"

اس نے برا مان لینے کی حد تک اپنے لہجے کو برا بنا کر کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ چند جملوں پر مشتمل یہ مکالمہ مجھے ہمیشہ یاد رہا۔ اتنا یاد کہ پھر دوبارہ میں نے کبھی مشعل سے بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔

وہ خوب صورت تھی اور پھر آسٹریلین تھی۔ وہ ایسا لہجہ اپنا سکتی تھی۔ جتنا اس کا مزاج ہائی فائی تھا اتنا ہی اس کا انداز۔ اپنی کار سے لے کر کار کی کی چین تک۔ وہ برانڈڈ گرل تھی۔ ہاں پھر وہ کیوں مجھ جیسے غیر ضروری لوگوں سے بات کرتی۔ اس کے پاس سارے حقوق تھے کہ وہ مجھے نظر انداز کر دیتی۔

لیکن میں اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ اسے یونی ورسٹی میں آتے اور جاتے دیکھتا رہتا۔ اکثر اسے لائبریری میں کتاب کی اوٹ سے دیکھا کرتا تھا۔ وہ گہری سرخ لپ اسٹک لگاتی تھی۔ ایک صرف وہی تھی جو ایسے سرخ رنگ کو سنبھال سکتی تھی۔ اس کے بال ہمہ وقت بکھرے رہتے تھے۔ اس کی آنکھیں ارد گرد سے لاپروا رہتی تھیں۔ اس کے ابرو کی اٹھان۔۔۔ دور بہت دور۔۔۔ بھاگ جانے کا الارم دیتی تھی۔ اس کے

چہرے کی تہ میں چھپی سختی مجھے ہولا دیتی تھی۔ اگر وہ کسی ریک سے کتاب نکال رہی ہوتی اور میں بھی اسی ریک کے قریب کہیں موجود ہوتا تو اس کی سرد مہری کی سرد لہر مجھے اکھاڑ کر رکھ دیتی تھی۔ پھر بھی دو سال تک میں مشعل کو دیکھتا اور اس کا مشاہدہ کرتا رہا۔

کیا میں اسے پسند کرتا تھا...؟ مجھے نہیں معلوم تھا۔

کیا مجھے اس سے محبت ہو چکی تھی...؟ مجھے نہیں معلوم تھا... پھر معلوم ہو گیا۔

اب اپنے باپ کی طرح میں بھی اس کے لیے کسی دربار کا مجاور بننے کے لیے تیار تھا۔ میرا دل وہ کشکول بن گیا جو "مشعل مشعل" نام کی صدائیں لگانے لگا۔ خیرات میں ہی سہی... کھوٹے سکوں کی صورت ہی سہی... مجھے اس کی محبت درکار تھی۔

لیکن یہ بہت بعد میں ہوا... جب میری اس سے شادی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

ڈگری لینے کے بعد میں گاؤں واپس جانا چاہتا تھا۔ میری چھوٹی بہن سارہ گاؤں میں ایک اسکول کھولنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی میں بھی واپس آ کر اس کے ساتھ کام کروں، لیکن ابا جی مجھے واپس بلانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ ہر بار مجھے سختی سے منع کر دیتے۔ کبھی کبھی ان کا انداز مجھے رویا رویا ہوا سا لگتا جیسے کہتے ہوں۔ "پتر عادل! اس چھوٹی دنیا میں واپس نہ آنا' لوگ چھوٹا سمجھ کر تمہیں کبھی بڑا نہیں بننے دیں گے۔"

"پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن گیا ہوں ابا جی۔ اب اپنے لوگوں کے لیے کام کرنا ہے مجھے۔"

"وہاں بھی پاکستانی ہیں تم ان کے لیے کام کرو۔"

"یہاں کے پاکستانی بہت خوش حال ہیں ابا جی۔ حکومت ان کے لیے سب کام کر رہی ہے۔ میں یہاں ڈگری لینے آیا تھا ہمیشہ رہنے نہیں۔"

"رہ لو پتر وہاں! ہمیشہ کے لیے ہی رہ لو۔ کون بلا رہا ہے تمہیں یہاں۔ شہری ہو شہروں میں رہو۔ بڑے شہروں میں کیا کرو گے گاؤں آ کر۔ لوگ تمہیں بابو کہتے ہیں۔ کیوں چاہتے ہو کہ اب وہ تمہیں پینڈو کہیں۔"

"لوگ ایسا کچھ نہیں کہتے ابا جی۔"

"کہتے ہیں... تم نہیں جانتے... تمہیں کچھ نہیں معلوم۔"

"میں آپ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں ابا جی۔"

"ہم تمہارے ساتھ ہی ہیں پتر... الگ کب ہیں تم سے...؟"

"ایک ہی بیٹا ہوں آپ کا ابا جی۔ مجھے بھی آپ خود سے ایسے دور رکھ رہے ہیں۔"

"ایک ہی بیٹے ہو' اسی لیے کہتا ہوں بابو بن کے رہو... اپنے باپ جیسا نہ بن جانا۔ دیہات کتنے بھی بڑے ہو جائیں پتر' شہروں سے بڑے نہیں ہوتے۔ دیہاتی کتنا بھی پڑھ لکھ جائے' نسلوں تک پینڈو گنا جاتا ہے۔"

"میں بھی دیہاتی ہوں ابا جی... مان لیں۔"

"تو صرف دیہات میں پیدا ہوا ہے' بس... دیہاتی نہیں ہے تو۔"

پتا نہیں ابا جی نے خود کو کن کن فلسفوں سے بہلایا ہوا تھا۔ وہ خود کو کیا کیا تسلیاں دیتے رہتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ابا جی کبھی نہیں مانیں گے۔ وہ اپنا ماضی میرے حال سے سنوارنا چاہتے تھے۔ پھانس جو ان کے دل میں ابھی تک چبھی ہوئی ہے' اسے وہ میرے کانٹے سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اتنا پڑھ لکھ کر بھی میں اپنے باپ کو یہ نہیں سمجھا سکا کہ نہ وہ پینڈو ہیں اور نہ ہی میں... پینڈو تو وہ انسان ہے' جو انسانوں میں فرق رکھتا ہے۔

کیا انسان کی ساری فصاحت اور علم' اس کا لب و لہجہ اور طرز زندگی ہی ہے۔ نفیس انسان کے لیے جو پیمانے مرتب ہیں' ان میں کھیتوں میں کام کرنے والوں' زمین پر بیٹھ کر رزق کھانے والوں اور مٹی گارے کی لپائی کرنے والوں کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے؟

کوشش کے باوجود میں پاکستان نہیں جاسکا۔ ابا جی بھی چاہتے تھے کہ یا میں یہاں کوئی بزنس کرلوں یا کوئی اچھی سی جاب۔ اچھی سی جاب تو مجھے فوراً" مل گئی تھی۔ اگر میں اپنا بزنس سیٹ کرنا چاہتا تو وہ بھی کرسکتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں بزنس کا ارادہ کروں گا اور ابا جی سب کچھ بیچ کر میرے ہاتھ میں پیسے پکڑادیں گے اور میں یہی نہیں چاہتا تھا کہ اپنی تین بہنوں کا حصہ بھی خود لے لوں۔ اب اگر مجھے بزنس کرنا بھی تھا تو خود اپنے بل بوتے پر کرنا تھا۔

میری جاب اچھی تھی۔ میرے ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ پاکستانی نژاد تھے۔ شروع میں وہ مجھے اتنے سخت گیر اور غیر معمولی لاتعلق لگے کہ انہیں دیکھ کر مشعل کی یاد آجاتی۔ ان کی سرد مہری بھی مجھے اکھاڑ کر رکھ دیتی تھی۔ ان کی پروفیشنل مسکراہٹ زخم خوردہ لگتی۔ اطوار میں تلخی اور ناپسندیدگی کی پرچھائیں بھی نظر آتی تھی۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جب ان کی سخت گیری کی پرتیں اترنے لگیں تو میں نے انہیں ایک ہمدرد انسان پایا۔ شاید وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ہم سب انسانوں سے خائف تھے۔ وہ ہماری خرابیوں سے اتنے بے زار ہوچکے تھے کہ کسی بھی نئے انسان کو کسی خوبی کے لیے آزمانا نہیں چاہتے تھے۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے قریب آنے لگے یا یوں کہنا چاہیے کہ وہ مجھے اپنے قریب کرنے لگے۔ ہلکی پھلکی بات چیت گھنٹوں کی گپ شپ پر محیط ہوگئی۔ پہلے کافی ساتھ پینے لگے، پھر لنچ بھی کرنے لگے۔ دوبار مل کر ہم کرکٹ میچ بھی دیکھ آئے تھے۔ ایک رات جب وہ اچانک میرے فلیٹ میں آگئے تو ہم نے مل کر تھوڑی سی کوکنگ بھی کی۔ ساتھ ڈنر کیا۔ پھر اکثر وہ میرے فلیٹ میں آنے لگے۔

"یہاں آکر تو بڑے بڑے لوگ بدل جاتے ہیں عادل! تم ویسے کے ویسے ہی ہو۔" میرے فلیٹ کو اپنا فلیٹ سمجھ کر کاؤچ پر نیم دراز ہوتے ہوئے وہ پوچھ رہے تھے یا مجھے بتارہے تھے۔ ان کے انداز سے میں سمجھ نہیں سکا۔

میں ہنس دیا۔ "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے مجھے بہت پہلے سے جانتے ہیں۔"

"میری عمر میں ماضی تک جانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تجربہ سب بتادیتا ہے۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی میں یہ جان گیا تھا کہ تمہارا تعلق کسی چھوٹے شہر یا گاؤں سے ہے۔"

"پینڈو دور سے ہی پہچان لیا جاتا ہے نا؟" میں نے قہقہہ لگایا۔

وہ ہنس دیے۔ "پینڈو نہیں سادہ آدمی... بڑے شہروں کے لوگ بڑے لاؤڈ ہوتے ہیں۔ سوپ بھی پیتے ہیں تو پورے اہتمام کے ساتھ..."

"لاؤڈ تو چھوٹے شہروں کے لوگ بھی ہوتے ہیں سر... ہم بھی ساگ کو اہتمام کے ساتھ کھاتے ہیں۔ دیسی گھی مکئی کی روٹی اور لسی کے ساتھ..."

"ہوتے ہیں لیکن کم..."

"لاؤڈ ہونا بری بات ہے؟"

"بری نہیں، لیکن عجیب ضرور ہے... بلکہ سب کچھ ہی عجیب ہوگیا ہے... کچھ نارمل رہا ہی نہیں..."

"میں بھی عجیب لگتا ہوں آپ کو... ابنارمل؟"

"ہاہاہا... نہیں یار! تمہیں نہیں کہہ رہا۔"

"آپ ہنستے ہوئے اچھے لگتے ہیں... ہنسا کریں... پورے دل سے... ساری خوش امیدی لے کر..."

وہ میری طرف دیکھنے لگے۔ "تم ایک معصوم دل انسان ہو عادل..."

میں اس بات پر اتنا حیران ہوا کہ انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں سر؟"

"میں نے کہا نا میری عمر میں یہ باتیں خودبخود معلوم ہوجاتی ہیں۔ معصوم دل لوگ مجھے اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ میں تم سے مل کر' باتیں کرکے بہت خوش ہوتا ہوں۔ مجھے ایک لمبے عرصے بعد ایک ایسا انسان ملا ہے۔ جس کی آنکھوں میں کوئی ہیر پھیر نہیں ہے۔"

"ہیر پھیر تو آپ کی آنکھوں میں بھی نہیں ہے

سرا!"

"شاید اسی لیے میری آنکھوں نے تمہیں پہچان لیا۔"

☆ ☆ ☆

ایک دن مسٹر جلال نے مجھے اپنی شادی کی سالگرہ کی پارٹی میں آنے کے لیے کہا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں وہاں ہرگز ہرگز جانا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے اندر اتنی قابلیت رکھنے کے باوجود میں ایسے لوگوں سے ملنے سے گھبراتا تھا جن کا تعلق کبھی کسی دیہات سے نہیں رہا۔ جو خوب صورتی اور امارات کا ٹریڈ مارک بنے گھومتے ہیں۔ جن کے تنے ہوئے چہرے اور خوش آمدید کہنے سے عاری آنکھیں ان کے کپڑوں کی طرح چمکتی دمکتی تو ہیں' لیکن نقلی اور کھوئی ہوتی ہیں۔ جو خوش اخلاقی سے بولتے ہیں اور تہذیب سے مسکراتے ہیں' لیکن پھر بھی نہ خوش کرتے ہیں نہ مسکرانے پر مجبور۔۔۔ میں ایسے لوگوں میں جاکر بے چین رہتا تھا۔ اپنی ٹائی کی ناٹ کو ایسے ڈھیلا کرتا رہتا تھا جیسے اپنے دم کو گھٹنے سے بچا رہا ہوں۔ لیکن مجھے مسٹر جلال کے گھر ہر صورت جانا تھا۔ انہوں نے مجھے اتنے اصرار سے آنے کے لیے کہا تھا کہ جیسے میں ان کا کوئی قریبی رشتہ دار ہوں جس کے بغیر ان کی پارٹی ادھوری رہ جائے گی۔

میرے آفس کے چند کولیگ بھی پارٹی میں موجود تھے۔ جس وقت میں اپنے ایک کولیگ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا' اس وقت لاؤنج کی گلاس وال سے میں نے لان میں سوئمنگ پول کے کنارے کھڑی مشعل کو دیکھا۔ میں اسے یونی ورسٹی کے بعد اب دیکھ رہا تھا۔ پورے ایک سال تین ماہ بعد۔ مجھے اڑتی اڑتی خبریں ملی تھیں کہ وہ امریکہ چلی گئی ہے۔ وہاں اسے جاب ملی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ وہ یہیں ملبورن میں ایک بڑے فیشن میگزین میں جاب کرنے لگی ہے۔

وہ اپنے ان ہی دوستوں کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی جن کے ساتھ وہ یونی ورسٹی میں ہوتی تھی۔ اس کے پانچ دوستوں کے گروپ میں سے نہ کوئی کم ہوا تھا' نہ زیادہ۔ وہ واقعی نئی دوستیاں کرتی تھی نہ غیر ضروری لوگوں سے بات۔۔۔

کھڑکی کے اس طرف کھڑا میں مشعل کو دیکھتا رہا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے پارٹی گاؤن میں تھی اور ہمیشہ کی طرح اس کے ہونٹوں پر سرخ لپ اسٹک تھی۔ اس کی گھنی بھنوئیں کسی مغرور اطالوی حسینہ کی یاد دلاتی تھیں۔ وہ دل کو اجاڑ دینے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

اس کے قہقہے مجھے اس طرف دکھائی دے رہے تھے۔ میں یہ حقیقت تسلیم کرنے کے لیے بالکل تیار تھا کہ وہاں کھڑے میں اسے جاہلوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میں نے اسے اتنے عرصے سے نہیں دیکھا تھا تو مجھے کسی پل قرار نہیں تھا۔ اب وہ نظر آگئی تو بھی مجھے قرار نہیں آرہا تھا۔

کچھ ہی دیر میں مسٹر جلال میرے پاس آگئے۔ وہ کچھ وی آئی پیز کو اٹینڈ کر رہے تھے۔ وہ مجھے اور میرے چند دوسرے کولیگز کو باقی لوگوں سے متعارف کروانے لگے۔ پھر مسٹر جلال صرف مجھے اپنے ساتھ لے کر لان کی طرف آئے۔

"میری تین بیٹیاں ہیں عادل۔۔۔" آج پہلی بار وہ کھل کر باقاعدہ اپنی فیملی کے بارے میں بتا رہے تھے۔

"ایک بیٹی کی تین سال پہلے ڈیتھ ہوچکی ہے۔"

"اوہ! بہت افسوس ہوا۔"

"اس نے خودکشی کرلی تھی۔ اسے شادی کرنے کی بھی جلدی تھی اور مرنے کی بھی۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ ان کی مسکراہٹ اتنی تلخ کیوں رہتی ہے۔ میں نے جان لیا۔

"آؤ۔ میں تمہیں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے ملواتا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ میرا بچا کھچا اطمینان اب اس بیٹی سے جڑا ہے۔"

"میں سمجھ نہیں پایا کہ اپنی ایک بیٹی کا دکھ بتانے کے بعد وہ مجھے اس سے ملوانے کیوں لے گئے تھے۔

اس سے۔۔۔ مشعل سے۔۔۔

جس وقت مشعل میری طرف اپنا ہاتھ بڑھا رہی

تھی اس وقت وہ مجھے پہچاننے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کر رہی تھی۔ ظاہر ہے میں اسے کیسے یاد رہ سکتا تھا۔ میرا دل بجھ سا گیا کہ اس نے مجھے فراموش ہی کر دیا۔

"میں آپ کا یونی ورسٹی فیلو بھی ہوں۔" میں نے خود ہی یاد دلانا چاہا جس پر اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

اپنے بابا سے معذرت کر کے وہ واپس اپنے دوستوں کے پاس چلی گئی۔ پورے تین ہفتوں تک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آسکی کہ مسٹر جلال نے صرف مجھے ہی کیوں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی مشعل سے متعارف کروایا۔ لیکن پھر میری سمجھ میں آگیا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں اس سے شادی کر لوں۔

☆ ☆ ☆

ان کی دو بیٹیوں اور ان کی اکلوتی بہن کی ازدواجی زندگیاں ناکام رہی تھیں۔ بڑی بیٹی نے ایک پاکستانی بزنس مین سے شادی کی تھی۔ تین سال کی محبت کے بعد ہونے والی شادی ڈیڑھ سال میں ہی اتنی بری طرح سے ناکام ہو گئی کہ وہ واپس آسٹریلیا آگئی۔ دوسری شادی اس نے اپنے کولیگ مصری نژاد سے کی۔ چار سال بعد اس شادی کا انجام بھی طلاق ہوا۔ بہن شادی کے نو سال تک بے اولاد رہیں تو شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ پھر جب وہ دو بچوں کا باپ بن گیا تو مسٹر جلال کی بہن کو طلاق دے دی۔ اس صدمے نے انہیں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہنے دیا۔

جس وقت مسٹر جلال نے مشعل سے شادی سے متعلق اشارہ دیا اس وقت میں جیسے بھونچکا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ مجھے مشعل سے شادی کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے۔ یعنی وہ لڑکی جسے میں نے یونی ورسٹی میں کتنی ہی بار صرف اس لیے دیکھا تھا کہ کسی کتاب کو پڑھنے سے زیادہ اسے دیکھنا ضروری ہو گیا' وہ لڑکی میری بیوی بھی بن سکتی ہے۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد مسٹر جلال نے مجھے مشعل کے آفس کا ایڈریس دیا اور کہا کہ میں اسے پک کر لوں۔ مشعل کی کار گیراج میں ہے۔ پہلے میں کار میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتا رہا۔ پھر کار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر میں اس کے انتظار میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

وہ آفس سے نکلی اور اپنی ٹریڈ مارک نظر سے مجھے سرسری سا دیکھا۔ اور "ہیلو" کہہ کر کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ سارے راستے وہ خاموش رہی۔ جس وقت میری کار مسٹر جلال کے گھر کے باہر رکی اور وہ دروازہ کھول کر باہر جانے لگی تو اس نے بس اتنا کہا۔

"پاپا چاہتے ہیں میں تم سے شادی کر لوں۔"

جس شادی کی بات دراصل مجھے کرنی تھی اور میں کر نہیں پایا تھا اس کی بات اب وہ کر رہی تھی۔

"مجھے تم سے شادی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ تم پاپا کو خود منع کر دینا۔"

جب بات اس نے شروع کی تھی تو ختم بھی اسے ہی کرنی تھی۔

اور میں نے واقعی مسٹر جلال کو منع کر دیا۔ میں جانتا تھا یہ ممکن نہیں ہے۔ مشعل کو پسند کیا جا سکتا ہے۔ اس سے محبت بھی کی جا سکتی ہے' لیکن اس سے شادی کا خواب دیکھا جا سکتا ہے' نہ خیال سوچا جا سکتا ہے۔ وہ ناممکنات میں سے تھی۔ اسے ممکن کرنا ممکن نہیں تھا۔ میں یہ بات سمجھ چکا تھا۔

"مجھے لگتا ہے میرے اور مشعل کے درمیان کچھ بھی کامن نہیں ہے۔" میں نے مسٹر جلال کو انکار کی وجہ بتائی۔

"ہاں ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو' لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شادی ایک جیسی سوچ یا ایک جیسی چیزوں کو پسند کرنے کا نام تو نہیں ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ لوگ جو ایک جیسی دلچسپیاں رکھتے ہوں' وہ ایک کامیاب زندگی بھی گزار سکتے ہوں۔"

"لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ دو الگ الگ طرح کے لوگ ایک کامیاب زندگی گزار سکتے ہوں۔"

"میری بڑی بیٹی کومل نے اس شخص سے شادی کی تھی' جس کے ساتھ اس کی کمال کی انڈر اسٹینڈنگ

تھی۔ لیکن پھر کیا ہوا؟ فروا نے جس سے شادی کی تھی اسے وہ اسکول کے وقت سے جانتی تھی۔ آٹھ سال سے۔ اور کیا ہوا؟ شہریار نے چیٹنگ کی۔ فروا نے اس لیے خودکشی نہیں کی تھی کہ شہریار نے چیٹنگ کی ہے۔ اس نے تو اس لیے جان لے لی کہ وہ شہریار کو آٹھ سالوں میں بھی پہچان کیوں نہیں سکی تھی۔ اس احساس نے اس کی جان لے لی کہ وہ دھوکا کھا چکی ہے اور میری بہن۔ وہ تو اپنے شوہر سے محبت بھی کرتی تھی اور اس کے ہر حکم پر سر بھی جھکاتی تھی، لیکن پھر بھی کیا ہوا؟"

"یہ سب تو میرے اور مشعل کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے سر۔"

"ہو سکتا ہے۔ ہو تو کچھ بھی سکتا ہے، لیکن تم اتنے اچھے انسان ہو عادل! کہ تم کچھ بھی برا نہیں ہونے دو گے۔"

"اتنا ہی اچھا انسان ہوتا تو مشعل کو بھی اچھا لگتا سر۔"

"ہماری بدقسمتی اس وقت عروج پر ہوتی ہے جب ہم اچھے انسانوں کی قدر نہیں کرتے۔ میں مشعل کو بدقسمتوں میں نہیں دیکھ سکتا۔"

انہوں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ میرا دل بھیگ سا گیا۔ ایک انسان اپنی دو بیٹیوں اور ایک بہن کی بربادی پر اتنا دکھی تھا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب کوئی چوتھا انسان آئے اور اس کی لاڈلی بیٹی کی زندگی برباد کر دے۔ پرانے دکھ، حال کو بوجھل بھی کر دیتے ہیں اور خوف زدہ بھی۔ مسٹر جلال بھی خوف زدہ تھے۔

میں خود بھی مشعل سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا، کیونکہ میں اس سے محبت کرتا تھا۔ میں اس محبت کو اس کے ساتھ نبھا سکتا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ مجھے اس کے علاوہ کوئی اور پسند آجاتا۔ یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ اب میں اسے بھول جاتا۔ مجھے ساری زندگی پچھتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ مشعل سے شادی کی بات شروع ہو چکی تھی۔ میں نے ہمت سے کام نہیں لیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس لیے اس بار میں پھر سے اس کے آفس کے باہر اپنی کار میں موجود تھا۔ پارکنگ میں وہ اپنی کار کی طرف بڑھی تو میں فوراً اس کے پاس آیا۔

"مجھے تم سے بات کرنی ہے مشعل۔"

کار کا دروازہ کھولتے اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس کی آنکھیں اتنی تیکھی ہو گئیں کہ ان میں دیکھنا ممکن ہو گیا۔ "کیا بات کرنی ہے؟"

میں نے جرات سے کام لیا۔ بہت جرات سے کام لیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور کہہ دیا۔

"شادی کی۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں پسند کرتا ہوں۔ بلکہ بہت پسند کرتا ہوں۔" چاہ کر بھی میں محبت کا لفظ استعمال نہیں کر سکا۔

اس کی تیکھی آنکھوں میں تمسخر سمٹ آیا۔ اس کے ہونٹ ناپسندیدگی سے قہقہہ لگا دینے کے قریب ہو گئے۔

"میں تمہیں اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔ اس دن تمہارے ساتھ کار میں صرف پاپا کی وجہ سے بیٹھی تھی۔ تمہیں کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے۔"

"تمہارے انکار کی وجہ کیا ہے؟" سارے تمسخر اور ناپسندیدگی کو نظر انداز کر کے میں نے پوچھا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "میں تم سے صرف اس لیے شادی کر لوں کہ تم پاپا کو بہت پسند ہو۔"

"اور میں تمہیں اتنا ناپسند کیوں ہوں؟"

"بہتر ہو گا کہ تم پاپا کی باتوں میں نہ آؤ۔ وہ میری دو بہنوں کے انجام سے خوف زدہ ہو چکے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں بھی نفسیاتی مریضہ بن جاؤں گی یا خودکشی کر لوں گی۔"

"تمہیں مجھ میں کیا ناپسند ہے مشعل؟" میں نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے اپنا سوال دہرایا۔

"تم میں پسند ہی کیا کیا جا سکتا ہے مسٹر عادل۔ یہی کیا کم ہے کہ تم ایک عام اور معمولی انسان ہو۔"

میں زندگی میں کبھی اتنا شرمندہ نہیں ہوا جتنا اس وقت ہوا، جب مشعل نے یہ کہا۔ مجھے اس وقت

معلوم ہوا کہ "عام" ہونا کس قدر ذلت آمیز بات ہے اور "خاص" ہونا کس قدر ضروری ہے۔ کم سے کم محبت کے لیے۔ کم سے کم مشعل کے لیے۔

☼ ☼ ☼

اس بار شاید مشعل نے ہی اپنے پاپا سے صاف صاف بات کرلی تھی' کیونکہ انہوں نے آفس میں مجھ سے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ضرورت سے زیادہ خاموش ہوگئے تھے۔ جس دن میں نے انہیں یہ بتایا کہ میں پاکستان جارہا ہوں۔ ایک سایہ سا ان کے چہرے پر لہرایا اور پھر اس سے اگلے دن ہمیں ان کے ہارٹ اٹیک کی خبر ملی۔

وہ آئی سی یو میں تھے۔ مسز جلال سے میں کافی دیر تک ان کی حالت کے بارے میں بات کرتا رہا۔ جس وقت میں اسپتال سے نکل کر اپنی کار کی طرف جارہا تھا اس وقت مشعل میرے پیچھے تیز تیز چلتی ہوئی آئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ کوئی میرے پیچھے آرہا ہے۔ مجھے تب اندازہ ہوا جب میں نے اپنے پیچھے مسٹر عادل کی پکار سنی۔

"تم پاکستان جارہے ہو؟"

مجھے حیرت تھی کہ اسے کیسے معلوم ہوا۔ "جی... ایک ہفتے بعد کی فلائٹ ہے میری..."

"تم پاپا کے ٹھیک ہونے سے پہلے کیسے جاسکتے ہو؟"

میں حیرت سے اس کا منہ دیکھنے لگا۔ "میں ابھی نہیں' ایک ہفتے بعد جارہا ہوں۔ ایک ہفتے تک وہ ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائیں گے۔"

"تم گھر نہ جاؤ۔ یہیں رہو۔ انہیں ہوش آئے گا تو ان کے سامنے رہنا' پھر ان سے ہماری شادی کی بات کرلینا۔"

وہ تو کہہ کر چلی گئی۔ میں کار کے پاس حیرت زدہ کھڑا رہا۔

☼ ☼ ☼
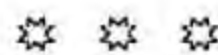
والدین اولاد کے لیے پہاڑ اپنے کندھوں پر اٹھا سکتے ہیں' لیکن وہ اولاد کے دکھ کے ایک کنکر کے بوجھ کو اپنے دل پر نہیں اٹھا سکتے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ مسٹر جلال مشعل کے لیے اتنے فکر مند تھے کہ انہیں لگا کہ اگر میں پاکستان چلا گیا تو انہیں اس پوری دنیا میں مشعل کے لیے کوئی اور لڑکا نہیں ملے گا۔ جن کی بیٹی کو مجھ میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی تھی' اس کے باپ کو میری ہر خوبی غیر معمولی کیوں لگتی تھی۔ ایک کے لیے عام تھا تو دوسرے کے لیے خاص کیوں تھا۔

مجھے یہ تسلیم کرنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ میرے من کی مراد ایک ہارٹ اٹیک سے پوری ہوسکتی تھی' مجھے معلوم نہیں تھا۔ مشعل میرے اور اپنے لیے "ہم" کا لفظ استعمال کرسکتی تھی' میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ میری اور مشعل کی منگنی ہوگئی۔ ابا جی' مشعل کا رشتہ لینے چھوٹی بہن سارہ کے ساتھ آئے تھے۔ ایک مہینہ رہے اور پھر چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

منگنی برائے نام ہوئی تھی۔ ابا جی نے ڈھیر سارے پیسے مشعل کو دیے۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور منگنی ہوگئی۔ مشعل دس منٹ ہمارے ساتھ بیٹھی رہی۔ پھر میں نے اسے کار میں بیٹھ کر جاتے دیکھا۔ عارضی طور پر لیا گیا دوپٹا اس نے اتار دیا تھا۔ گھر کے دروازوں کو تیزی سے پھلانگتی' وہ گھر سے کہیں دور بھاگتی ہوئی سی لگتی تھی۔

میں جانتا تھا کہ وہاں منگنیاں کیسے ہوتی ہیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ کم سے کم اس کے کسی دوست کی منگنی کیسی ہوئی ہوگی۔ اس کی ویسی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں ویسی منگنی ارینج نہیں کرسکتا تھا' بلکہ اس لیے کہ وہ میرے ساتھ ویسی منگنی ارینج کروانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اسی صورت میں منگنی کی پارٹی رکھتی جس صورت میں اس کا منگیتر اس کا من پسند ہوتا۔ جبکہ میں ایک عام انسان تھا۔ ایک دیہاتی۔ مجھ جیسے پینڈو کے ساتھ پارٹیز نہیں کی جاتیں۔ جشن نہیں منائے جاتے۔ کیونکہ وہ اس کے مستحق نہیں ہوتے۔

لیکن اس وقت تو میرے دل میں یہی دھن سمائی تھی کہ میں اسے اپنی محبت سے بدل دوں گا۔ مجھے اسے حاصل کرنے کی چاہ تھی بس۔ اسے اپنی بیوی بنا لینے کی۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ خالی زمین ہے' جس پر میری محبت کی فصل لہلہانے لگے گی۔ ایک دن۔۔۔ ایک دن ضرور۔۔۔

"میں تمہیں ڈنر پر لے جانا چاہتا ہوں مشعل۔۔۔"

جواب میں کچھ دیر کی خاموشی ملی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ جیسے وہ کوئی کڑوی گولی نگل رہی ہے۔

"رات کو مجھے گھر سے پک کر لینا۔"

اس نے آخر کار کہہ ہی دیا۔ لنچ سے اس رات کے ڈنر کے انتظار میں' میں نے کتنی ہی راتوں کی مسافت طے کی۔ کتنی ہی بار میں اپنی وارڈروب تک چل کر گیا اور اس میں رکھے اپنے کپڑے چیک کیے۔ مجھے پانچ سال ہو گئے تھے آسٹریلیا میں رہتے ہوئے۔ میری ڈریسنگ بہت آؤٹ کلاس نہیں تھی تو ایسی لو کلاس بھی نہیں تھی۔ میرے پاس اچھے' مہنگے' خاص' عام سب کپڑے موجود تھے۔ کچھ ڈیزائنر ڈریسز اور جوتے بھی موجود تھے۔ لیکن پھر بھی مجھے لگا کہ ویک اینڈز پر جمپ سوٹ پہن کر سائیکلنگ کرنے والی لڑکی کو ڈنر پر لے جاتے ہوئے مجھے اپنی تیاری پر کچھ تو غور کرنا چاہیے' بلکہ کچھ خاص تیاری کرنی چاہیے۔

پہلی بار جب مشعل نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تھا تو یہ خیال میرے ذہن میں راسخ ہو چکا تھا کہ وہ مجھے میرے پس منظر کی وجہ سے ناپسند کرتی ہے۔ وہ مجھ جیسے پڑھے لکھے انسان کو ایک ہائی فائی پینڈو سے زیادہ نہیں سمجھتی۔

اسی لیے اب میں۔۔۔ ایک ہائی فائی پینڈو۔ ایک ہائی فائی منگیتر بننے کی تیاریاں کرنے لگا تھا۔ ویب سائٹس کو سرچ کر رہا تھا۔ ڈنر کے لیے آن لائن ڈریسز دیکھ رہا تھا۔ کچھ کولیگز اور دوستوں سے مشورے کر رہا تھا۔ کچھ موویز اور ویڈیوز دیکھ رہا تھا۔

جس وقت میں مشعل کے لیے کار کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوا اس وقت میں نے مشعل کو حیرت سے اپنے سراپے کو دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ متاثر نہیں ہوئی تھی۔ وہ اگنور بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ بری طرح سے تلخ نظر آنے لگی تھی کہ میں کتنا اوور ڈریس ہو کر آیا ہوں۔ جبکہ وہ خود ایسے لباس میں تھی جس میں وہ آرام سے اپنے گھر کے لاؤنج میں بیٹھ کر ٹی وی دیکھ سکتی تھی۔ پاپ کارن کھا سکتی تھی۔ کولڈ کافی پیتے اسے اپنے کپڑوں پر گرا بھی سکتی تھی۔ وہ جو گھر میں بھی ایسے رہتی تھی جیسے کسی پارٹی میں جا رہی ہو' وہ آج اپنے منگیتر کے ساتھ پہلی بار جاتے ہوئے ایسے مردہ رنگ اور بجھے ہوئے لباس میں تھی جیسے کسی دوست کی عیادت کے لیے اسپتال جا رہی ہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس جیسی فیشن ایبل لڑکی کے وارڈروب میں ایسا مرجھایا ہوا ڈریس بھی ہو سکتا ہے۔

میں نے اس کے لیے ڈنر ٹیبل بک کروائی تھی۔ مشعل میرے ساتھ نہیں چل رہی تھی۔ وہ مجھ سے آگے چل رہی تھی۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے' تب بھی وہ خاموش رہی۔ تب بھی جب میں نے اپنی جیب سے ایک انگوٹھی نکال کر مشعل کے عین سامنے رکھی۔ مشعل نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنی انگلی میں پہن لیا۔

"تھینکس۔۔۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہنے کی غلطی نہیں کی۔

انگوٹھی کو دیتے ہوئے میں نے جو کچھ کہنے کے لیے سوچا تھا وہ ان کہا ہی رہ گیا اور ہم دونوں ڈنر کر کے گھر آ گئے۔ اس رات میں دیر تک اپنے فلیٹ میں ٹہلتا رہا۔ میں مشعل کے ساتھ ڈنر کر کے آیا تھا' پھر بھی میرے ہاتھ میں خوشی کا کوئی سرا نہیں آیا تھا۔ میں اس کے عین سامنے بیٹھا رہا تھا' پھر بھی میں مشعل کو حق سے یا محبت سے نہیں دیکھ پایا تھا۔ مشعل کے اسٹینڈرڈ کے عین مطابق میں نے ٹیبل بک کروائی تھی' پھر بھی میں کہیں اسٹینڈرڈ سے نیچے ہی رہا تھا۔

ہال کے وسط میں بجنے والا پیانو بھی بے کار رہا۔

میرے دل میں جلتی محبت کی "مشعل" گرم ہو کر بھی ٹھنڈی ہی رہی۔

اور ایسے ڈنر اور فرسٹ ڈیٹ ٹائپ تمام ہوئی اور وہ رات بھی جس رات میں نے پھر سے مشعل کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔

☼ ☼ ☼

اس رات میں نے فیصلہ کرنا چاہا کہ مجھے یہ منگنی توڑ دینی چاہیے۔ شاید مشعل کبھی خوش نہ رہ سکے۔ شاید مشعل کبھی مجھے پسند نہ کرسکے۔ شاید میں کبھی مشعل کے دل میں جگہ نہ بنا سکوں۔ میں نے ساری رات یہ فیصلہ کرنے میں لگادی۔

اگلی صبح آنکھ کھلتے ہی اس خیال نے کہ مجھے مشعل کو چھوڑ دینا ہے' کچھ ایسے میرا گھیراؤ کیا جیسے تیز آندھی لہلہاتی فصلوں کا کرتی ہے۔ میرے دل کی دھرتی پہ سبزہ ناپید ہوگیا اور کلرزدگی کا جال پھوٹ نکلا۔ مجھے ایسے لگا میرے جسم سے کچھ جدا ہو رہا ہے۔ میرا وجود بے جان ہو رہا ہے۔ کوئی میرے دل کو پھٹا پرانا کپڑا سمجھ کر ادھیڑ رہا ہے۔

پھر اس رات کی صبح میں نے دو تکلیفوں کا موازنہ کیا۔۔۔ مشعل کے ساتھ رہنے کا۔۔۔ مشعل کے بغیر رہنے کا۔۔۔

مشعل کے بغیر رہنے والی تکلیف ہار گئی اور میں نے مشعل کے ساتھ رہنے والی تکلیف کا انتخاب کرلیا۔

☼ ☼ ☼

"تم میرے فیانسی ہو' میرے گارڈ نہیں۔ کیوں مجھے روز پک کرنے آجاتے ہو؟"

"مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے الجھن ہوتی ہے۔" وہ کوفت سے بولی۔

اور کچھ راتوں سے پہلے' کچھ صبحوں کے بعد' جو میں نے فیصلہ کیا تھا کہ مشعل کے ساتھ رہنے والی تکلیف بہتر ہے۔ اس فیصلے نے جیسے مجھ پر قہقہہ لگایا۔ میرا چہرہ شرمندگی کے احساس کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

"تم میرے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔"

کاش وہ اعصاب کی جگہ دل کہہ دیتی۔ یا کاش ایسا دل کو مسل دینے والا جملہ اس کے اندر۔۔۔ ہی دم توڑ دیتا۔

"میں جانتا ہوں تم مجھے پسند نہیں کرتیں۔ تم نے انکل جلال کی خاطر مجھ سے منگنی کی ہے۔"

"تم طنز کر رہے ہو؟"

"حقیقت بتا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں انکل سے بات کرسکتا ہوں۔"

"کیا بات۔۔۔؟"

"یہی کہ ہمیں اس منگنی کو ختم کردینا چاہیے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"تمہیں میری بھی کوئی ضرورت نہیں ہے مشعل۔۔۔ تمہیں مجھے برداشت کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایک ایسی ناپسندیدہ ہستی ہوں' جس کے لیے چاہ کر بھی تم اپنی ناگواری نہیں چھپا سکتیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کار میں بیٹھ گئی۔ اگلی بار اس نے پھر نہیں کہا کہ میں اسے پک کرنے نہ آیا کروں۔ البتہ یہ ہوا کہ اب وہ دروازہ کھولتی' بیٹھتی اور فوراً" اپنا اسمارٹ فون آن کرلیتی اور اس کے ساتھ مصروف ہوجاتی۔ ہر بار ایسا ہی ہوا۔ ہمیشہ ایسا ہی رہا۔ پھر بھی میں اسے پک کرتا رہا۔ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتا رہا۔ اس کی بے اعتنائی کو دیکھتا رہا۔

میں عادل۔۔۔ مجھے افسوس بھی ہوتا رہا' لیکن میں کیا کرتا۔۔۔ میں دکھ کرتا یا محبت۔۔۔

☼ ☼ ☼

انکل جلال اکثر مجھے گھر ڈنر پر بلا لیتے تھے۔ مشعل کی سب سے بڑی بہن کومل کو انکل نے امریکہ سے اپنے پاس مستقل بلالیا تھا۔ وہ اب ان ہی کے ساتھ ان کے گھر میں رہتی تھیں۔ وہ بھی مشعل کی طرح ہائی فائی لیڈی تھیں' لیکن ان میں بے اعتنائی کی مقدار مشعل

کی نسبت کم تھی۔ وہ ہائے ہیلو سے آگے چند جملوں پر مشتمل بات چیت کر لیتی تھیں۔ مسز جلال بھی کم و بیش مشعل اور کومل جیسی ہی تھیں۔ لیکن شاید شوہر کی محبت میں وہ مجھ سے اس طرح بات کرتیں جیسے اگر میں ان کا داماد نہ ہوتا تو ان کا بڈی ہوتا کہ جب میں انہیں انکل جلال کے بغیر ملتا وہ مجھے "شٹ اپ" کہہ کر "گیٹ لاسٹ" ہونے کے لیے کہہ دیں گی۔

کسی ایگری منٹ کی طرح کی ہی سہی، لیکن میری انٹری جلال فیملی میں ہو چکی تھی۔ مجھے کافی بھی آفر کی جاتی تھی اور ساتھ بٹھا کر مووی بھی دیکھ لی جاتی تھی۔

ڈنر ٹیبل پر مشعل کا رویہ کچھ کچھ بدل جاتا تھا۔ اس کے لیے وہ کس مشکل سے گزرتی تھی، میں جانتا تھا۔ وہ میرے ساتھ والی چیئر پر بیٹھ جاتی تھی۔ مجھے کھانا سرو کرتی۔ مجھ سے ہلکی پھلکی باتیں کر لیتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب انکل جلال کے لیے کیا جاتا ہے۔ صرف انکل جلال کو دکھانے کے لیے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ دکھاوا ہی سہی مشعل میرے لیے مسکراتی تو ہے۔ اوپری دل سے ہی سہی وہ میرا حال چال تو پوچھتی ہے اور سب سے بڑی بات وہ میرے ساتھ آکر بیٹھتی ہے، میرے برابر۔

لیکن اس رات جب انکل جلال نے ہم دونوں کی طرف دیکھ کر یہ کہا کہ انہوں نے ہماری شادی کا دن طے کر لیا ہے تو مشعل مسکرا سکی، نہ ہی وہ اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں سے کھانا اٹھا کر منہ تک لے جا سکی۔ وہ کھانے سے کھیلتی رہی۔

میں نے مشعل کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ اگر میں اس کی طرف دیکھ لیتا تو شاید میں اتنا دل گرفتہ ہو جاتا کہ مشعل کو چھوڑ کر پاکستان لوٹ جاتا۔ پھر پاکستان میں گاؤں کی زمین پر مجاور بن کر بیٹھ جاتا۔ میرا دل اس خیال سے ہی بلکنے لگا۔ میں نے خود کو انتہائی اذیت میں گھرے ہوئے پایا۔

"تمہاری فیملی کب تک آجائے گی عادل؟" انکل پوچھ رہے تھے۔

"دو ہفتے بعد۔"

"مشعل! تمہیں یہ ڈیٹ سوٹ کرتی ہے۔ کوئی پرابلم تو نہیں؟"

"نہیں۔۔۔ کوئی پرابلم نہیں۔"

اس نے کہا اور اٹھ کر چلی گئی۔ انکل اور میں دیر تک شادی کے انتظامات کو ڈسکس کرتے رہے۔

اگلے دن مجھے آفس میں مشعل کی کال آئی۔

"میں گھر لینا چاہتی ہوں۔"

یہ پہلی فرمائش تھی جو شادی کے سلسلے میں مشعل نے کی تھی۔ گھر کے لیے میں بھی سوچ رہا تھا، لیکن چاہ کر بھی مشعل سے ڈسکس نہیں کر سکا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ انکل نے مشعل سے کہا تھا کہ وہ اپنی پسند سے عادل کے فلیٹ کا انٹیریئر کروائے اور شاید مشعل میرے فلیٹ میں آنا پسند نہیں کرتی تھی، اس لیے اس نے مجھ سے کہا کہ میں گھر کا انتظام کروں۔

وہ اسی ایریا میں رہنا چاہتی تھی جہاں انکل رہتے تھے اور اس نے ایک گھر بھی وہیں دیکھ لیا تھا۔ یہ کبھی میرا مسئلہ نہیں رہا تھا، لیکن میں اتنا بھی امیر نہیں تھا کہ اس ایریا میں اتنا بڑا گھر "فوراً" خرید لیتا۔ میرے اکاؤنٹ کی اتنی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن مشعل سے یہ سب کیسے کہا جاتا۔ اس نے پہلی بار تو فون کر کے مجھ سے کہا تھا کہ وہ گھر لینا چاہتی ہے۔ مجھے وہ گھر ہر صورت لینا تھا۔ میں نے ابا جی کو پاکستان فون کیا اور اپنا مسئلہ بتا دیا۔ ابا جی نے رات سے دن پتا نہیں کیسے کیا اور کتنی ہی زمین بیچ کر پیسے میرے اکاؤنٹ میں ڈلوا دیے۔ میں نے گھر خرید لیا اور بس مشعل سے اتنا کہہ دیا کہ ابھی میں اس پورے گھر کا انٹیریئر نہیں کروا سکتا۔ وہ صرف بیڈ روم اور لاؤنج کا کروا لے۔

"میں خود کروا لوں گی انٹیریئر، تم فکر نہ کرو۔"

وہ استہزائیہ سی ہنس دی۔ میری چیز اس کی تھی اور اس کی میری لیکن جب میری محبت ہی اس کی نہیں تھی تو پھر اس کا کچھ بھی میرا نہیں تھا۔ وہ اتنے بڑے فیشن میگزین میں جاب کرتی تھی۔ وہ ایسا ایک گھر بھی خرید سکتی تھی اور اس کا انٹیریئر بھی کروا سکتی تھی۔ میں جانتا تھا، لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی، مرد عورت کے

خریدے ہوئے گھر میں تب ہی رہ سکتا ہے جب عورت اپنے دل کا گھر اس مرد کی ملکیت میں دے چکی ہو۔

"یہ گھر اور تم میری ذمہ داری ہو۔۔۔ مجھے کچھ وقت دو میں سب کر دوں گا۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور سارے گھر کو آراستہ کروا دیا۔ وہ گھر جو میں نے خرید ااور جسے مشعل نے سجایا' ایک ایسا گھر تھا جو مجھے مشعل کی طرح ہی بے انتہا' روٹھا اور اکھڑا اکھڑا سا لگتا۔ اس گھر کے باہر میرے نام کی تختی تھی' پھر بھی مجھے لگتا تھا وہاں میرے علاوہ سب رہ سکتے ہیں۔ وہاں کی ہر چیز خوب صورت تھی' سوائے وہاں میری موجودگی کے۔ وہ مشعل کا گھر تو لگتا تھا' لیکن ایک دیہاتی کا نہیں۔ پھر بھی وہ دیہاتی وہاں رہ رہا تھا۔ کاش میں تھوڑی سی ہمت سے کام لے سکتا اور مشعل کو چھوڑ کر پاکستان آسکتا۔

ان دنوں بھی میں ہر رات یہ فیصلہ کرتا کہ مجھے پاکستان چلے جانا چاہیے اور ہر رات کی ہر صبح میں خوف سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا۔ میں اپنے بیڈ سائڈ پر رکھی مشعل کی تصویر کو ہاتھ میں لیتا اور اسے اپنے سینے میں چھپا لیتا۔

"چھوڑ دینا آسان نہیں ہوتا' جیسے پالینا مشکل ہوتا ہے۔"

یک طرفہ ہی سہی محبت تو محبت ہی ہوتی ہے نا۔ دو طرفہ ہونے میں کتنا ہی وقت کیوں نہ لگے' یک طرفہ محبت اپنی آس نہیں چھوڑتی۔

☼ ☼ ☼
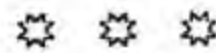
شادی ویسے ہی ہوئی تھی جیسی مسٹر جلال کی لاڈلی اور آخری بیٹی کی ہونی چاہیے تھی۔ مشعل ویسی ہی دلہن بنی تھی جیسی اس جیسی لڑکی بن سکتی تھی۔ میں بھی ویسا ہی دولہا تھا' جیسا کہ مجھے ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی اس شادی میں شادی والی کوئی بات نہیں تھی۔

اگر یہ شادی ہی تھی تو۔۔۔ پھر بھی یہ شادی نہیں تھی۔

شادی سے پہلے شاپنگ کے لیے میں نے کافی بار مشعل سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ چلے اور اپنی پسند سے جو لینا چاہے وہ خرید لے۔ لیکن مشعل نے مجھے ایسا کوئی موقع دیا نہ وقت۔ مجھے خود ہی اس کے لیے شاپنگ کرنی پڑی۔ میں اس کے پسندیدہ ڈیزائنرز کے پاس گیا تھا اور اس کے لیے کچھ ڈریسز اور جیولری ڈیزائن کروائی۔

وہ لباس میں نے اسے کبھی پہنے ہوئے نہیں دیکھا' جیولری اس نے چند بار پہن کر وارڈ روب میں مقفل کردی تھی یا کہیں پھینک دی ہوگی۔ ہماری گرہستی آباد ہو گئی۔ گھر میں ایک ایسا سناٹا رہنے لگا تھا جیسا سناٹا میرے فلیٹ میں بھی کبھی نہیں رہا تھا جہاں میں اکیلا رہتا تھا۔ لیکن اب دو افراد کی موجودگی میں وہ ہمیشہ رہتا۔

اتنا عرصہ آسٹریلیا میں اکیلے رہنے کا ایک فائدہ مجھے ضرور ہوا تھا کہ میں ایک اچھا کک بن گیا تھا۔ مجھے کوکنگ کا شوق بھی تھا۔ شروع میں جب میں نے اپنے لیے دیسی کھانے بنائے تو حیرت انگیز طور پر مشعل نے انہیں بہت رغبت سے کھایا۔ یہ کھانے اس کے اپنے گھر میں بھی بنتے تھے۔ لیکن شاید اسے میرے ہاتھ کا ذائقہ پسند آگیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

"کیا تم آج چکن فجیتا بنا سکتے ہو؟"

چکن فجیتا مشعل ایک مخصوص ریسٹورنٹ سے ہی کھاتی تھی۔ اب اگر اس نے مجھے بنانے کے لیے کہا تھا تو اس کا مطلب تھا کہ اب وہ اسے گھر میں کھانا چاہتی تھی یعنی جب اس کا دل چاہے تب۔ میں یہ ڈش آرام سے بنا لیتا تھا۔ پھر بھی میں نے آن لائن کوئی پچاس ویڈیوز دیکھیں تاکہ اگر کہیں کوئی کمی یا زیادتی ہے تو میں وہ بھی دور کرلوں۔ میں مشعل کے سامنے بے حد لذیذ فجیتا رکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے مشعل کے گھر آنے سے پہلے میں کوئی چھ بار الگ الگ فجیتا بنا کر ٹیسٹ کر چکا تھا۔

"آہ یہ خوشبو۔۔۔ کیا میری ناک مجھے ٹھیک بتا رہی ہے؟ کیا تم نے فجیتا بنایا ہے؟" وہ کچن کی سمت گئی۔

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L ۔ 5 / 79 ڈاکخانہ L.5 / 78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

وہ شاید جانتی نہیں تھی کہ میں آج آفس ہی نہیں گیا تھا — بہترین ذائقے کا فجیتا اسٹو پر رہنے دیا تھا۔ اس نے برتن کا ڈھکن اٹھایا۔ چمچ سے چکھا ' پھر جلدی سے پلیٹ میں ڈال کر کھانے لگی۔ نہ اس نے کپڑے بدلے اور نہ ہی میز پر بیٹھنے کا تردد کیا۔ جب اس نے ساری پلیٹ صاف کر دی تو میں نے پوچھا۔

"ٹھیک بنا تھا...؟"

وہ ہنسی۔ شاید پہلی بار میری کسی بات پر۔ "ٹھیک ... اٹس آؤٹ آف دی ورلڈ... کیا یہ مجھے ہفتے میں ایک بار مل سکتا ہے۔"

"یہ تمہیں ہفتے کے ساتوں دن مل سکتا ہے۔"

"شکریہ... تم کمال کے کک ہو۔"

ماحول اتنا دوستانہ ہو گیا کہ میں کچن میں گیا اور باقی کے چھ فجیتا بھی اٹھا لایا۔ "یہ بھی ٹرائی کرو۔ شاید تمہیں یہ بھی پسند آئیں۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر میز کو۔ "تم نے اتنا سارا بنا لیا؟"

"ہاں! الگ الگ چھ بار... جو سب سے بیسٹ تھا وہ تمہیں دیا ہے۔"

مسکراہٹ اس کے چہرے سے غائب ہو گئی۔ شاید اس نے برا مانا۔ لیکن میرے لیے یہی کافی تھا کہ مجھ جیسے معمولی آدمی کے ہاتھ کے پکے کھانے اسے غیر معمولی لگے تھے۔ اس رات میں اطمینان سے سویا۔ مجھے امید نظر آ رہی تھی کہ وہ ایک دن مجھے بھی چکن فجیتا کی طرح پسند کرنے لگے گی۔ لیکن اس رات کی صبح بہت عجیب تھی۔ اس صبح نے میرے دل کو نئے سرے سے نئی مایوسی سے توڑا۔

☼ ☼ ☼

آفس میں مجھے مشعل کی ایک دوست کا فون آیا۔

"تم مشعل کے ساتھ کیمپنگ کے لیے کیوں نہیں جا رہے۔ مشعل ٹھیک کہتی ہے 'تم بہت بورنگ ہو۔" حال احوال کے بعد لیزا نے پہلا سوال کچھ ایسے پوچھا کہ میں سمجھ گیا کہ مجھے کیا جواب دینا ہے۔

"میں پھر کبھی چلا جاؤں گا۔ آج کل میں مصروف ہوں۔"

لیزا نے مجھے ایک لمبا لیکچر دیا اور فون ٹھک سے بند کر دیا۔ ٹھک سے ہی میرے دل کا اطمینان رخصت ہوا۔ گھر آیا تو مشعل پیکنگ کر رہی تھی۔

"میں کیمپنگ کے لیے جا رہی ہوں۔" اس نے تیسرے اور آخری بیگ کی زپ کو بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے... انجوائے کرنا۔" میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

کچھ سامان جو ابھی بھی بیڈ پر بکھرا تھا وہ اس کا جائزہ لیتی رہی۔ اس نے مجھ سے مزید بات کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

"کب واپس آؤ گی۔" وہ اگلی صبح جب جا رہی تھی تب میں نے پوچھا۔

"شاید دو ہفتوں تک... ہمارا پلان تھوڑا لمبا ہے۔ زیادہ دن بھی لگ سکتے ہیں۔"

"میں تمہیں مس کروں گا۔ کم سے کم مجھے ایک میسج کر دیا کرنا۔"

اس کے دوست باہر گاڑی میں بیٹھے ہارن پر ہارن بجا رہے تھے۔ میں اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے 'اس کا بیگ اٹھا کر باہر لا رہا تھا کہ میرے آگے چلتے چلتے وہ تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹک سی گئی۔ لیکن اس نے پلٹ کر پیچھے مڑ کر مجھے نہیں دیکھا۔ وہ پلٹ کر کبھی مجھے نہیں دیکھے گی۔ میں جان گیا تھا۔ نہ ہی وہ پلٹ کر کبھی میرے پاس آئے گی۔ وہ میرے دل کے جتنی قریب تھی 'میں اس کے دل سے اتنا ہی دور تھا۔

گھر میں کھانے کے نام پر میں نے برگر اور پزا کھانا شروع کر دیا۔ کافی پر کافی پینے لگا۔ اس کی موجودگی میں بھی گھر میں سناٹا ہی رہتا تھا۔ لیکن اب تو یہ سناٹا میرے اندر رہنے لگا تھا۔ تو میرا یہ فیصلہ ٹھیک تھا کہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا 'ہاں یہ فیصلہ ٹھیک تھا۔

وہ مجھے باقاعدگی سے ایک میسج کرتی رہی۔ ایک

میسج جس کا مجھے چوبیس گھنٹے شدت سے انتظار رہتا تھا۔ جس کے لیے مجھے باربار فون کو دیکھنا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ سے میں آفس میں کوئی کام ٹھیک سے نہیں کرپا رہا تھا۔

"ہیلو۔ آج ہم فشنگ کے لیے جارہے ہیں۔"

"ہائے۔ آج سن ڈے ہے۔ موسم اچھا ہے یہاں۔"

"لیزا کے پاؤں میں چوٹ آئی ہے۔ ہمارا آدھا دن ڈاکٹر کے پاس گزرا۔"

روز آنے والا ایسا ایک آدھ میسج میرے لیے اتنے ہی ضروری تھا جتنا ضروری "مشعل" کی واپسی کا انتظار کرنا۔ میں اسے فون کرتا بھی تو فون دو منٹ کے اندر اندر بند ہوجاتا۔ میرے پاس کہنے 'پوچھنے' سننے کے لیے بہت وقت تھا بلکہ سارا ہی وقت تھا۔ لیکن مشعل کے پاس نہیں تھا۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ میری بورنگ فون کالز اس کا ٹرپ خراب کردیں۔ اور یہ بھی کہ جب اس کے فون پر "عاول کالنگ" آئے تو اس کا سارا موڈ خراب ہوجائے۔ وہ کوفت سے ادھر ادھر دیکھے اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے میری فون کال ریسیو کرنی پڑے۔

جیسے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ میرے ساتھ رہ رہی تھی۔

گھر واپسی پر وہ مجھے زندگی سے اتنی بھرپور لگی کہ مجھے دکھ ہوا کہ میں نے اس سے شادی کرکے اسے مرجھا دیا ہے۔ مجھے اس کی ہر خوشی کے غم میں بدل جانے میں صرف اپنا ہی قصور نظر آیا۔ اگر مجھے اس سے محبت نہ ہوچکی ہوتی تو میں کتنی آسانی سے اسے چھوڑ کر جاچکا ہوتا۔ اتنی آسانی سے جتنی آسانی سے وہ مجھے چھوڑ جاتی ہے۔ ہر روز۔۔۔ ہر پل۔۔۔ ہر بار۔۔۔

☼ ☼ ☼

مشعل کے آفس میں ہونے والے فنکشن اور دوستوں کی طرف سے دی جانے والی پارٹیز میں 'ہم دونوں کو بلایا جاتا تھا۔ لیکن وہاں مشعل اکیلی جاتی تھی۔ مجھے یہ پوچھنے کی اور مشعل کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے کر کیوں نہیں جاتی۔

اب مجھے معلوم ہونے لگا تھا کہ میرے کند ذہن باپ نے میٹرک کیسے پاس کرلیا تھا۔ دو سال وہ رات دن کتابوں سے کیسے چپکا رہا تھا۔ مجھے لگتا ہے' میں دسویں جماعت کبھی پاس نہیں کرسکوں گا۔ میں خود کو آئینے میں دیکھتا اور مجھے اپنی پوری شخصیت پر فیل فیل فیل لکھا ہوا نظر آتا' مجھے اس کا یقین تھا کہ ابا جی تو دربار سے واپس گھر آگئے تھے لیکن میں کبھی واپس نہیں آسکوں گا۔ جو جوگ ابا جی نے ادھورا چھوڑ دیا تھا اسے میں پورا کروں گا۔

اس لیے میں نے ہر صورت مشعل کا دل جیتنے کا فیصلہ کرلیا — میرا بھی دل چاہتا تھا کہ جب وہ تیار ہو تو میرے بازو اس کی کمر میں حمائل ہوں۔ میرے پاس یہ حق ہو کہ میں جھک کر اس کے کان میں سرگوشی کرسکوں۔ میں اس کے بالوں کی لٹ کو چھو سکوں۔ محبت کا اظہار کہیں تو' کسی گوشے میں تو میں ممکن کرسکوں۔

وقت بدل جاتا ہے' لیکن محبت کے امتحان وہی رہتے ہیں۔ میں نے دادی کو کسی سے کہتے سنا تھا کہ ابا جی کو ان دنوں تین تین استاد پڑھانے آتے تھے۔ چونکہ ابو جی کند ذہن تھے اس لیے ایک بات انہیں پچاس بار سمجھانی پڑتی تھی۔ پھر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بار بار لکھنے کی مشق کرنے سے شاید یاد ہوجائے۔ انہوں نے لکھ لکھ کر کاغذوں کا انبار لگا دیا تھا۔ وہ راتوں کو نیند میں اپنا سبق دہراتے تھے۔ دن کو جاگتے میں اپنا سبق دہراتے تھے۔ محبت۔۔۔ محبت۔۔۔ محبت۔

وہ حقیقت جسے میں نے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا۔ مجھے پھر سے اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑا کہ میں ایک دیہاتی ہوں۔ مجھ میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں۔ مجھے اپنے دیہاتی پن سے نفرت ہونے لگی۔ اس دیہاتی پن کو میں اپنی ذات اور شخصیت پر سے کھرچ کھرچ کر اتار

دینا چاہتا تھا۔ اپنے معمولی پن کو غیر معمولی پن میں بدلنا چاہتا تھا۔
ایک رٹا مجھے بھی لگاتا تھا۔ جسے اسکول میں کبھی اپنے سبق کے رٹے نہیں لگانے پڑے۔ جس نے میتھ میں ہمیشہ ننانوے فیصد نمبر حاصل کیے۔ جو میٹرک سے ہی فر فر انگلش بولنے لگا تھا۔ جسے ملبورن یونیورسٹی میں آرام سے داخلہ مل گیا۔ جسے جاب کے لیے دھکے نہیں کھانے پڑے۔ وہ عادل اپنی بیوی کو خوش دیکھنے کے لیے بتیس سال کی عمر میں چھ ماہ کا گرومنگ کورس کرنے جانے والا تھا۔
"آپ کو گرومنگ کی ضرورت کیوں محسوس آئی... اپنے پروفیشن کے لیے...؟"
"نہیں... اٹس فار پرسنل ریزن..." ایڈمیشن سے پہلے مجھ سے چھوٹا سا انٹرویو لیا گیا۔
"اور وہ پرسنل ریزن کیا ہے... خود اپنے لیے یا فیملی دوستوں یا گرل فرینڈ کے لیے...؟"
"وائف کے لیے۔" یہ جواب دینے میں مجھے کچھ وقت لگا۔
"کیا وہ چاہتی ہیں کہ آپ ایسا کریں... انہیں آپ کی پرسنالٹی میں کس طرح کی تبدیلیاں چاہئیں۔"
"میرا تعلق دیہات سے ہے۔ میں اپنا دیہاتی پن ختم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں اس ہائی فائی سوسائٹی کا حصہ نہیں بن پا رہا۔ میں خود کو بہت کمتر محسوس کرتا ہوں۔ میری وائف ایک بہت بڑے فیشن میگزین میں کام کرتی ہے۔ وہ مجھ جیسے دبے دبے لوگوں کو پسند نہیں کرتی۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ پارٹیز میں جا سکوں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ فخر سے لے جا سکے۔ شاید وہ میری وجہ سے شرمندہ ہے۔"
"کیا آپ کو بھی خود پر شرمندگی ہے...؟"
مجھے کتنی ہی دیر تک جواب کے لیے سوچنا پڑا۔ "شاید ہاں..."
"آپ پڑھے لکھے ہیں... اچھی لک، اچھی جاب ہے آپ کے پاس... پھر بھی؟"
"ہاں... پھر بھی..."
میرا انٹرویو لینے والا تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ "احساس کمتری تو شخصیت کی موت ہے۔"
"اسی موت سے تو زندگی چاہتا ہوں..."
"آپ اپنی وائف کو کیوں نہیں بتانا چاہتے کہ آپ گرومنگ کے لیے آئے ہیں...؟"
میں کافی دیر تک خاموش رہا اور پھر میں نے سچ بولنے کا ارادہ کر لیا۔
"اسے میری ذات میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ شاید میری گرومنگ ہو جائے تو اسے کچھ..."
یہ بات کہتے ہوئے میں نے محسوس کیا جیسے میں انٹرویو لینے والے سے التجا کر رہا ہوں یا بری طرح سے التجا کرنے ہی والا ہوں کہ خدا کے لیے مجھے بدل دو۔ اتنا بدل دو کہ مشعل کا دل بھی بدل جائے۔
اس وقت میں نے اس احساس کو پالیا جب ابا جی اپنے استادوں کی باقاعدہ منت کیا کرتے ہوں گے کہ "مجھے دس جماعتیں پاس کروا دیں استاد جی۔ اللہ کا واسطہ ہے... مجھے ایسے پڑھا دیں کہ میں پاس ہو جاؤں مجھے فیل نہیں ہونا... مجھے پاس کروا دیں... اللہ کا واسطہ ہے جی..."
گرومنگ کورس کے اس بیچ میں وہ واحد انسان تھا جو اپنی بیوی کو متاثر کرنے کے لیے وہ کورس کر رہا تھا۔ مجھ پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ یہ توجہ اس انٹرویو کا نتیجہ تھی جو میرا پہلے دن ہوا تھا۔
سیکھنے سے بہت کچھ آجاتا ہے اور لگن سے کچھ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میری شخصیت میں لحہ بہ لحہ تبدیلی آرہی تھی۔ میری ڈریسنگ میں، میری بول چال اور بات چیت میں۔ اگر کہیں میرے ظاہر میں گنوار پن تھا بھی تو وہ بھی میل کی طرح اترنے لگا تھا۔
کورس کے پانچویں مہینے میں میں نے کم و بیش ان ہی ماڈلز کی طرح کی شخصیت اپنا لی تھی جو مشعل کے میگزین کے کور پر آتے تھے۔ کورس کے شروع میں میری ویڈیو بنائی گئی تھی۔ پھر ہر ہفتے وہ ویڈیو بنتی تھی۔ چھٹے مہینے کے پہلے ہفتے ساری ویڈیوز ایک ساتھ مجھے

دکھائی گئیں اور میں نے خود کو اجڈ گنوار سے "ماڈرن بن گئے" بنتے دیکھا۔ مجھ میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئی تھیں۔ میں نے دیہاتی 'سیدھے سادے سے 'غیر اہم عادل' کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا تھا بلکہ دھکے دے کر اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ اب یہ نیا عادل تھا' مشعل کا شوہر۔ گرومڈ۔ پالش۔ ہینڈسم۔ چارمنگ۔ آؤٹ کلاس۔

☼ ☼ ☼

"اگلے ہفتے تمہارے آفس میں سالانہ پارٹی ہے نا۔؟"
مشعل نے مجھے دیکھا اور صرف سر ہلایا۔
"میں بھی چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔"
مشعل نے کوئی جواب نہیں دیا اور انکار بھی نہیں کیا۔
میں اس کے ساتھ پارٹی میں گیا۔ میں نے اس کے گرد اپنا بازو حمائل کیا۔ اس کے ساتھ چلتے لوگوں سے ملنے میں بالکل نہیں جھجکا۔ میں نے اپنے اندر کی مایوسی اور اپنی شخصیت کی کم مائیگی کو اپنے اندر سے نکال کر پھینک دیا تھا۔ میں خوش تھا۔ بہت خوش تھا۔ اور خوش ہی رہتا اگر ہال میں کپل ڈانس کا آغاز نہ ہو چکا ہوتا۔
مشعل اپنی کسی کولیگ کے ساتھ کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ میں دور میز پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب ڈانس کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ مشعل کی طرف اس کے مرد کولیگ بڑھے اور ڈانس کے لیے کہا لیکن مشعل نے انکار کر دیا۔ اس کی کولیگ نے میری طرف اشارہ کیا۔ پھر ہال میں ہونے والے ڈانس کی طرف۔ مشعل ہنس کر رہ گئی۔ میں مشعل کی اس ہنسی کے معنی جانتا تھا۔ وہ مجھ پر ہنسی تھی۔
میں چھ ماہ کا گرومنگ کورس مکمل کرنے کے بعد وہاں گیا تھا اور وہاں جا کر یہ احساس ہوا تھا کہ میں کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب میری اور مشعل کی شادی ہوئی تھی تب بھی ایسا ہی ڈانس ہوا تھا۔ مشعل نے اپنے پاپا اور اپنے بھانجے کے ساتھ کیا تھا۔ دکھاوے کے لیے ہم دونوں نے رقص کی کوشش کی تھی لیکن وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں روک دی گئی تھی۔ میں اس کے برائیڈل گاؤن میں بری طرح سے الجھ رہا تھا اور کچھ ایسا مضحکہ خیز لگ رہا تھا کہ شرمندگی سے مشعل کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ انکل جلال ہنستے ہوئے میرے پاس آئے اور میرا کندھا تھپک کر کہنے لگے۔
"تمہارے بس کی بات نہیں لگتی۔ میری بیٹی کو گرا نہ دینا۔"
میں نے زندگی میں کبھی اکیلے ڈانس نہیں کیا تھا کجا یہ کپل ڈانس۔ بظاہر ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو اپنے پارٹنر کا ہاتھ پکڑنا ہے اور تھوڑا بہت موو کرنا ہے لیکن آپ کا پارٹنر مشعل ہو تو پھر اتنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ مشعل کے سامنے جو آج بھی سرخ لپ اسٹک کو پورے اہتمام سے سنبھال کر رکھتی ہے اور اپنے سفید گاؤن میں جس کی پشت ناپسندیدگی کی حد تک عریاں ہے میں وہ کسی بھی صورت کہیں سے بھی پاکستانی نژاد نہیں لگتی کے ساتھ کپل ڈانس کیسے آسان ہو سکتا ہے۔
آسان تو یہ بھی نہیں تھا کہ اسے کسی اور کے ساتھ ڈانس کرتے دیکھا جائے۔ لیکن شاید میرے لیے کچھ آسانیاں زندہ تھیں اور میری غیرت کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہاں اس نے کسی اور کا ہاتھ تھام کر رقص نہیں کیا تھا۔
گھر واپسی پر میں اس کا ہاتھ بھی نہیں پکڑ سکا۔ وہ اتنی تیزی سے جا کر گاڑی میں بیٹھی اور گاڑی میں بیٹھ کر اس نے کچھ ایسے انداز میں سیٹ کی پشت پر سر ٹکا کر خود کو تھکا سا لیا کہ میرے لیے خاموش رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔

جس وقت وہ بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی اور میں کاؤچ پر بیٹھا تھا۔ اس وقت اس نے ہائی ہیل کے ساتھ ٹھک ٹھک چلتے ہوئے رک کر مجھے دیکھا' جیسے کہنا چاہتی ہو' دیکھا! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا تم میں ایسا ہے ہی کیا جو تم سے شادی کی جائے۔"

اسے مجھ سے شادی نہیں کرنی تھی۔ اور مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔
اسے مجھ سے محبت نہیں تھی۔ مجھے بھی اس سے محبت کرنا چھوڑ دینی چاہیے تھی۔
اس کی صورت ضروری تھی اور میری ناممکن۔

☼ ☼ ☼

انکل جلال بہت خوش رہنے لگے تھے۔ وہ پھولے نہیں سماتے تھے کہ ان کی بیٹی اپنے گھر میں کس قدر خوش ہے۔ وہ علاج کے لیے کسی نفسیاتی ڈاکٹر کے پاس جارہی ہے نہ اسے سلیپنگ پلز کھا کر اپنی زندگی کو ختم کرنے کی جلدی ہے۔ وہ اکثر ہمارے گھر اچانک آجاتے اور مجھے کچن میں کوکنگ کرتے اور مشعل کو میز لگاتے دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ یا کبھی میں ٹی وی دیکھ رہا ہوتا اور مشعل لاؤنج میں رکھی اپنے رننگ مشین پر دوڑ رہی ہوتی۔ وہ اس طرح کے مناظر دیکھ کر پھولے نہیں سماتے تھے۔

اپنے پاپا کو ایسے خوش دیکھ کر مشعل بھی پھولی نہیں سماتی تھی۔ جب جب وہ گھر آتے، مشعل کا رویہ ایک دم سے بدل جاتا۔ وہ معمول سے کچھ زیادہ مجھ سے مخاطب ہونے لگتی۔ بلکہ وہ بار بار مجھ سے مخاطب ہوتی۔

"دیکھیں پاپا! آج عادل نے کیا بنایا ہے۔ یہ ہر بار مجھے حیران کردیتا ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا بہترین کک ثابت ہو سکتا ہے۔ کمال کی کوکنگ کرتا ہے یہ۔" پاپا ہنس دیتے۔ "اچھا شوہر ثابت ہو گیا ہے تو کک کیوں نہیں۔"

"کیسے اچھا شوہر ہوا یہ۔ میں اسے شاپنگ پر نہیں لے جا سکتی۔ یہ بور ہوتا ہے۔"

"ہاہاہا۔ ہر مرد بور ہوتا ہے مائی ڈیر صرف یہ ہی نہیں۔"

مشعل کو واقعی اپنے پاپا سے بہت پیار تھا کیونکہ ان کے آنے پر وہ اتنی مکمل اداکاری کرتی تھی کہ مجھے شک ہونے لگتا تھا کہ وہ اداکاری نہیں کررہی بلکہ ہمارا تعلق ہے ہی ایسا۔ کاش وہ اداکاری نہ کیا کرتی۔ کاش اسے دکھاوے کی ضرورت نہ ہوتی اور کاش وہ اتنی فرماں بردار نہ ہوتی کہ اسے مجھے برداشت کرنا پڑتا۔ وہ ان سے محبت نہ کرتی کہ اسے میرے ساتھ بیوی بن کر رہنا پڑتا۔

ہم دونوں میں جیسے کوئی ان دیکھا معاہدہ طے تھا۔ وہ جانتی تھی کہ میں خود سے انکل سے کچھ نہیں کہوں گا اور یہ بھی کہ جس وقت وہ انکل کے سامنے اداکاری کرے گی میں بھی اس کا ساتھ دوں گا۔ مجھے تو اس کا ساتھ ہمیشہ دینا تھا۔ اس کی ناپسندگی کے بدلے میں بھی پسندیدگی ہی دینی تھی۔

اسے میرے ہاتھ کے پکے کھانے پسند ہیں، اسے اب میری ڈریسنگ پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور ایک دن ہو سکتا ہے ایسا بھی ہو کہ میری شخصیت پر اٹھنے والے سب اعتراضات ختم ہو جائیں۔ میں خود کو اتنا بدل دوں کہ مشعل کا دل بھی بدل جائے۔ پھر مجھے خود کو پورا بدل دینے میں وقت نہیں لگانا چاہیے۔

اس کی سالگرہ آنے والی ہے اور میں ایک بڑی پارٹی کا ارینج کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میں اس کے ساتھ رقص کروں۔ اس لیے مجھے دو نہیں چار قدم آگے بڑھنا چاہیے اور رقص سیکھ لینا چاہیے۔

جس وقت میں ڈانس اکیڈمی گیا اس وقت میں نروس بھی تھا اور شرمندہ شرمندہ سا بھی۔ میں نے زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے یہ سب کرنا ہوگا۔ نہ مجھے ان چیزوں کا شوق تھا نہ کبھی ضرورت رہی تھی۔ مجھے لگتا تھا کہ یہ سب صرف فلموں میں ہوتا ہے۔ جیسے چاند آسمان پر ہے اور وہ زمین پر نہیں آسکتا ایسے ہی فلموں کی چیزیں حقیقی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتیں۔

"تمہیں کپل ڈانس آتا ہے۔" مشعل کے ساتھ پہلی بار پارٹی پر جانے کے بعد میں نے اگلے دن اپنے کولیگ سے پوچھا۔

"وہ کسے نہیں آتا ہوگا۔ مجھے تو ٹینگو بھی آتا

ہے۔"

مجھے حیرت ہوئی۔ "کیا سب کو یہ ڈانس وانس کرنا آتا ہے۔"

اس نے کندھے اچکائے۔ "شاید۔ ویسے میری بیوی کمال کی ڈانسر ہے۔ کیا خوب رقص کرتی ہے۔"

"اور تم...."

"میں اس کے مقابلے میں پھوہڑ ہوں۔ لیکن میں مینیج کرلیتا ہوں۔"

"کیسے مینیج کرتے ہو....؟"

اس نے قہقہہ لگایا۔ "جیسے مجھ جیسے پھوہڑ شوہر کرلیتے ہیں۔ میں اسے مجبور کردیتا ہوں کہ وہ میری آنکھوں میں دیکھے نہ کہ میرے رقص کو۔ ہاہاہا۔"

مشعل کی آنکھوں میں دیکھنا ایسے ہی تھا جیسے کوئی جرم کرنا۔

"کیا تم مجھے کپل ڈانس سکھادو گے۔"

"بہتر ہے کہ تم کسی... انسٹرکٹر سے سیکھ لو بلکہ اگر تم چھوٹے موٹے ڈانسر بننا چاہتے ہو تو ڈانس اکیڈمی جوائن کرلو۔"

میں ہنس دیا۔ وہاں ابا جی زمینوں اور فصلوں میں الجھے ہیں۔ اماں جی سارہ کی شادی کے لیے جہیز بنا رہی ہیں۔ سارہ اپنا اسکول چلا رہی ہے اور یہاں میں رقص سیکھنے کا سوچ رہا ہوں۔ اس لیے کہ میں مشعل کو متاثر کرسکوں۔ یا اس لیے کہ ایک بار ہی سہی میں اس کے ساتھ ڈانس کرسکوں۔ یا صرف اور صرف اس لیے کہ اگر حاصل ہوسکے تو ایسے محبت کو حاصل کرسکوں۔"

جن دنوں میں گرومنگ کورس کررہا تھا میں نے اکثر نوٹ کیا تھا کہ وہ ترچھی نظروں سے مجھے دیکھ لیا کرتی ہے۔ شاید وہ دیکھ رہی تھی کہ میں بدل رہا ہوں۔ وہ نوٹ کررہی تھی کہ میرے وارڈ روب میں تبدیلی آرہی ہے۔ میرے بالوں کا ہنہو اسٹائل بدل گیا ہے۔

میں برانڈڈ شاپنگ کرنے لگا ہوں بلکہ فضول خرچ لڑکیوں کی طرح میرے پاس بھی اب جوتوں، کپڑوں، پرفیومز اور گھڑیوں کا ڈھیر لگنے لگا ہے۔

پہلے ایسا نہیں تھا۔ دیہات میں رہنے والے ایک دیہاتی کی طرح میرے لیے چند ڈریسز بھی کافی تھے۔ اپنے پورے یونیورسٹی پریڈ میں میں نے چند بار شاپنگ کی وہ بھی صرف موسم کی تبدیلی پر۔ میں نے کبھی دوسرے لوگوں کے کپڑوں پر غور نہیں کیا۔ مجھے لگتا تھا کہ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ہم نے کیا پہنا ہوا ہے اور اسے کتنی بار پہنا ہے۔ اگر ہمارا پہناوا صاف ستھرا ہے تو وہ بار بار پہنا جاسکتا تھی۔

اب یہ بات مجھے بے چین رکھتی ہے کہ میں بے کار چیزوں پر لاکھوں روپے لگا رہا ہوں۔ میرا گاؤں جہاں ہر گھر میں بجلی تو ہے لیکن ہر کمرے میں بلب اور پنکھا نہیں، جہاں پانی کے لیے ہاتھ والے نلکے ہیں، جہاں آج بھی بہت سے گھروں میں اتنی غربت ہے کہ لالٹین کی روشنی میں عورتوں کو رات رات بھر کڑھائی سلائی کرکے اپنا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ کتنے ہی بچوں کو میلوں دور چل کر کالج جانا پڑتا ہے۔ ایک ایسے پس منظر سے تعلق رکھنے کے بعد میرا آسٹریلیا جیسے ملک میں ہزاروں ڈالرز کپڑوں پر لگا دینا پاگل پن تھا۔ میں نے یہ پاگل پن صرف مشعل کے لیے کیا۔ اگر پیسے سے محبت خریدی جاسکتی ہے تو میں یہ محبت خرید رہا تھا۔ اگر محبت کسی بازار میں بکتی ہے تو میں اس بازار میں خود کو نیلام کرکے اسے پالینے کے لیے تیار تھا۔

☼ ☼ ☼

جو سوچنے میں مضحکہ خیز لگتا ہے وہ حقیقت میں اتنا ہی حقیقی لگتا ہے۔

میں حقیقت میں ڈانس اکیڈمی میں موجود تھا، کیونکہ چند ہفتے پہلے اپنے ماما پاپا کی شادی کی سالگرہ پر بھی مشعل نے اپنے بھانجے اور پاپا کے ساتھ ڈانس کیا تھا۔ ڈانس کرتے وہ بہت خوش تھی۔ ہنس رہی تھی، قہقہے لگا رہی تھی۔ شاید یہی زندگی کا غیر معمولی پن تھا، شاید رقص اسے خوش رکھتا تھا۔

انکل جلال نے میری طرف اشارہ کیا اور ڈانس کے

لیے کہا تو مشعل نے ہنس کر کہہ دیا۔

"آپ چاہتے ہیں میں — بھری محفل میں شرمندہ ہو جاؤں۔"

مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے اپنے لہجے کی تلخی چھپائی۔ مشعل نے گرے کلر کی ساڑھی باندھی تھی اور وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ گروپ فوٹو کے دوران جب میں اس کے ساتھ کھڑا ہوا تو بے اختیار اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کر دیا۔ اس نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا لیکن خاموش رہی۔

میرے ساتھ کھڑی بھی وہ کتنی دور تھی۔

کچھ رشتے تعلق میں بندھ کر بھی بے تعلق ہی رہتے ہیں۔ آج سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا کہ جتنا فاصلہ ایک میاں بیوی کے درمیان آسکتا ہے وہ دنیا کے کسی اور رشتے میں نہیں آسکتا۔ دنیا کا ہر رشتہ کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں دریا و سمندر کی طرح ایک مقام پر ایک ہو ہی جاتا ہے لیکن مجھ جیسے میاں بیوی کے تعلق میں قسمت سے ہی دریا سے سمندر ہونا لکھا ہوتا ہے۔

جس وقت انسٹرکٹر مجھے کپل ڈانس کے بنیادی اصول سکھا رہا تھا اس وقت میں نے اپنی شناخت خود سے چھپالی تھی۔ میں نے بھولنے کی کوشش کی کہ یہ صرف ایک بچکانہ مذاق ہے جو میں خود اپنے ساتھ کر رہا ہوں۔ ایک لڑکی جواب میری بیوی ہے کے لیے میں اپنے آفس سے یہاں ڈانس سیکھنے کے لیے آرہا ہوں۔ یہ معلوم کرنے کہ اپنے پارٹنر کی کمر میں ہاتھ کیسے رکھنا ہے۔ اپنے پیروں کو کیسے حرکت دینی ہے اور کیسے کپل کیمسٹری بنانی ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ خون کا اثر ہوتا ہے ٹھیک کہتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ماضی کا بھی اثر ہوتا ہے۔ جو تکلیفیں اور روگ پچھلوں نے بھگتے ہوں وہ اگلوں کو بھی بھگتنے ہوتے ہیں۔ کیا واقعی اتنی ہی شدت تھی میرے باپ کی محبت میں کہ وہ شدت اتنا لمبا سفر طے کرتی مجھ میں آگئی۔ کیا یہ جو محبت ہے یہ ایسی ہی آندھی ہے کہ سب کچھ گرد آلود کر دیتی ہے۔ آنکھیں دھندلی۔۔۔ سانسیں اکھاڑتی۔۔۔

☼ ☼ ☼

جس دن مشعل کی سالگرہ تھی اس دن انکل نے اسے اپنے ساتھ مصروف رکھا اور پھر رات بارہ بجے جب دونوں گھر آئے تو مشعل کے لیے سرپرائز تیار تھا۔ اس کی برتھ ڈے پارٹی۔۔۔

بارہ بج کر ایک منٹ پر اس کے سب دوستوں اور میں نے اسے ایک ساتھ وش کیا۔ مشعل نے کیک کاٹا۔ ہم نے کھانا کھایا اور میوزک لگا کر میں نے مشعل کا ہاتھ تھام لیا۔

میں نے اس کے ساتھ ڈانس کیا اور کامیابی سے کیا۔

وہ رات میری تھی۔ جو مشعل کے نام تھی۔

لیکن۔۔۔

☼ ☼ ☼

سب کے جانے کے بہت دیر بعد تک مشعل کاؤچ پر خاموش بیٹھی رہی۔ میں چیزیں سمیٹ رہا تھا۔ میز پر مشعل کے گفٹس کا ڈھیر رکھا تھا۔ میں نے اسے نیکلس گفٹ کیا تھا۔ مشعل نے فی الحال کوئی بھی گفٹ نہیں کھولا تھا۔

"کم سے کم میرا گفٹ تو دیکھ لو۔" میں اپنا گفٹ لے کر اس کے پاس آیا۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر گفٹ پکڑ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ "یہ سرپرائز برتھ ڈے پارٹی کس نے ارینج کی تھی؟"

"میں نے۔" میں نے خوش ہو کر بتایا۔

"دوبارہ نہ کرنا۔۔۔" اس نے اپنے لہجے کی سختی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"کیوں کیا ہوا۔۔۔ تمہیں اچھا نہیں لگا۔۔۔؟"

"میں نے بس اتنا کہا ہے کہ دوبارہ ایسی کوئی پارٹی ارینج نہ کرنا۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔"

اس نے دوبارہ اسی سخت انداز سے کہا تو میری ساری خوشی کافور ہو گئی جو اس کے ساتھ رقص کرنے اور پارٹی میں چاند تارا بنے رہنے سے حاصل ہوئی تھی۔

"تمہیں برا لگا کہ یہ سب میں نے کیا۔۔۔؟"

"مجھے مزید کوئی کمنٹ نہیں کرنا۔" وہ اٹھ کر جانے لگی۔

"مجھے کمنٹ سننا ہے۔" پہلی بار میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا اور اسے روک لیا۔ وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

"یہ کیا طریقہ ہے مجھ سے بات کرنے کا۔"

"کیا تم نے اپنا طریقہ دیکھا ہے مجھ سے بات کرنے کا۔"

"مجھے زہر لگتا ہے جب تم ہر وقت مجھے متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہو۔ تم کسی جوکر سے کم نہیں لگتے جو ہر بار نیا تماشا کرتا ہے۔ تنگ آ گئی ہوں میں تمہارے ان کھیلوں سے۔۔۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ میرے بارے میں اتنی سخت بات کہے گی۔ سات ماہ کی منگنی اور اٹھارہ مہینوں کی شادی شدہ زندگی کے بعد وہ مجھے جوکر کہے گی۔ پینڈو کے بعد میرے درجے میں فرق تو آیا۔ میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور کاؤچ پر گر سا گیا۔

"اگر مجھے اتنا ہی ناپسند کرتی ہو مشعل تو تم میرے ساتھ رہ کیوں رہی ہو؟"

بیڈ روم کی طرف تیزی سے جاتے ہوئے اس نے رک کر مجھے دیکھا لیکن جواب نہیں دیا اور جانے لگی۔

"مجھے جواب چاہیے مشعل۔۔۔" مجھے چلانا پڑا۔

"تم ایک نارمل انسان کی طرح میرے ساتھ رہو اور بس۔۔۔"

"تم کسے نارمل ہونا کہتی ہو؟" میں اٹھ کر اس کے پاس آیا۔ جا کر اس کے عین سامنے کھڑا ہو گیا۔

"گڈ مارننگ مشعل، آؤ ناشتہ کرو، گڈ بائے مشعل، گڈ ایوننگ مشعل، آفس میں دن کیسا رہا تمہارا، آ جاؤ مشعل زبردست مووی لگی ہے مل کر دیکھتے ہیں۔ چلو ٹھیک ہے سو جاؤ، مشعل ہم ڈنر کرنے باہر چلیں، ٹھیک ہے نیکسٹ سنڈے سہی۔ تم ریسٹ کرو۔ مشعل کہیں گھومنے چلیں، ٹھیک ہے پھر کبھی سہی۔۔۔" یہ ہے ہم دونوں کی نارمل لائف؟

"تو اور تمہیں کیا چاہیے؟ وہ چلائی۔" کیا چاہتے ہو تم مجھ سے۔"

"محبت چاہتا ہوں تم سے مشعل۔۔۔ تھوڑی سی۔۔۔ بہت تھوڑی سی ہی سہی۔۔۔ ساری زندگی تمہارے ساتھ چلنا چاہتا ہوں اتنی جلدی بے دم نہ کرو مجھے۔۔۔ سہارے کے لیے تھوڑی سی محبت دے دو۔"

اس کی سرخ لپ اسٹک اور گہری میک اپ زدہ آنکھوں کے تحتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"میں نے شادی پاپا کی وجہ سے کی تھی۔"

"میں نے محبت کی وجہ سے۔۔۔"

"وجہ تو میرے پاس بھی محبت ہی ہے۔ پاپا سے محبت۔"

"کس چیز کی کمی ہے مجھ میں مشعل بتاؤ مجھے۔ میں خود کو بدل لوں گا۔ جیسے کہو گی ویسا ہو جاؤں گا۔"

"کس چیز کی کمی ہے مجھ میں جو مجھے تم ملے ہو۔۔۔؟" مشعل کے لہجے میں نوکیلی چٹانیں سمٹ آئیں۔

اٹھارہ مہینوں بعد وہ وہی کہہ رہی تھی جو اس نے منگنی سے پہلے کہا تھا۔ اس کے رویے میں، انداز میں، الفاظ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مجھ میں جو کمیاں تھیں، وہ کمیاں ہی رہیں۔ زیادتی ہوئی تو صرف ایک محبت کی۔ لیکن صرف ایک محبت اکیلی پسند نہیں کی جا سکتی۔ تن تنہا محبت کے بس میں سب کچھ نہیں اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ نتھی ہے۔ اس کی آرائش کرنی پڑتی ہے۔ اس کی قیمت بڑھانی پڑتی ہے۔ تب ہی یہ کارگر ہوتی ہے۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مجھ میں کیا کمی ہے۔ میں اچھا قیمتا بنا تا نہیں ہوں مشعل۔۔۔ میں اچھا قیمتا پکانا سیکھ گیا ہوں۔ ایک شارٹ کوکنگ کورس کیا ہے

میں نے صرف تمہارے لیے، صرف تمہارے لیے۔ میں نے ہزاروں بار خود کو آئینے میں دیکھا ہے، خود پر بے جا تنقید کی۔ تمہارے لیے ہی میں نے خود کو بھی کبھی پسند نہیں کیا۔ نفرت ہے مجھے خود سے، جسے تم پسند نہیں کرسکتیں۔ میں نے کوشش کی کہ میں تمہارے لیول پر آسکوں گرومنگ کی اپنی، رقص بھی سیکھا۔

اس گھر کا جو انٹیریر تم نے کروایا تھا اس پیسے کی ادائیگی کے لیے۔ گاؤں میں موجود اپنی کچھ پیاری چیزیں بیچ دی تھیں۔ نہر کے کنارے کی وہ زمین جس کے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر میں پڑھا کرتا تھا۔ شہر کا وہ چھوٹا سا گھر جس میں میں اپنے دوستوں کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جب تم مجھے پیاری ہوگئیں تو میں نے اپنی زندگی میں موجود باقی پیاری چیزوں کی اہمیت کو غیر اہم کردیا۔ کچھ کو بیچ دیا کچھ کو نکال دیا۔ مجھے پسند تھا سادہ رہنا، پینڈو بن کر رہنا، کبھی کبھی سر میں تیل لگا کر گھومنا، لیکن اپنی بیوی کے لیے جو ایک بہت بڑے فیشن میگزین میں کام کرتی ہے، میں نے بالوں میں وہی سب لگایا جو اس کے میگزین کے میل ماڈلز لگاتے ہیں۔ وہی کپڑے پہنے جو اس کے ماڈلز پہنتے ہیں۔ ویسا ہی نظر آنا چاہا جیسے وہ دکھائی دیتے ہیں۔ میں نے اپنی پسند کے رنگوں کو تمہاری پسند کے رنگوں سے بدل دیا۔ میں نے تو خود کو ہی سر سے پاؤں تک بدل دیا۔ میں نے خود کو عاول رہنے ہی نہیں دیا۔

گاؤں میں میری بہن گاؤں کے بچوں کے لیے اسکول بنا چکی ہے۔ وہ وہاں انہیں مفت تعلیم دے رہی ہے۔ اپنے اسکول کے لیے وہ ایک ایک پیسہ بچاتی ہے اور میں؟ میں نے تمہارے لیے اپنی ذات پر ایک ایک روپیہ لگا دیا۔ میں نے خود کو بدل لیا کہ شاید تم بدل جاؤ۔ میرا باپ ایک امیر آدمی ہے لیکن آج بھی وہ اپنے سارے پیسے اپنی قمیص کے نیچے پہنے شلوکے میں رکھتا ہے۔ میری ماں نے کبھی اس پر اعتراض نہیں کیا، لیکن تمہارے لیے میں نے اپنے ہر ڈریس کے لیے مہنگے اور برانڈڈ والٹ خریدے، اگر محبت پیسے سے خریدی جاسکتی ہے تو میں نے اپنی ساری جمع پونجی اسے خریدنے میں لگادی۔ دولت کا کیا ہے۔ آجائے گی اگر چلی بھی گئی تو بھی کیا لیکن محبت کہاں سے آئے گی پہلی گئی تو لوٹے گی کیسے، ملے گی کیسے۔

میں نے اپنے انسٹرکٹر سے کہا کہ میں اپنی بیوی کے لیے رقص سیکھ رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ میری بیوی دنیا کی خوش قسمت عورتوں میں سے ایک ہے اور میری بیوی کہتی ہے کہ وہ بدقسمت ہے جو اسے میں ملا۔

بدقسمت تو میں ہوں مشعل کہ مجھے تم سے محبت ہوئی۔

گاؤں کا رہنے والا عام انسان، ایک دیہاتی تمہاری مسکراہٹ کے انتظار میں اپنی ساری مسکراہٹیں گنوا بیٹھا ہے۔

تم ٹھیک کہہ رہی ہو کہ تم میں کیا کمی ہے کہ میں تمہیں ملا، واقعی میں تمہاری قسمت خراب تھی جو تمہیں انکل کے پریشر کی وجہ سے مجھ سے شادی کرنی پڑی۔ تمہیں ایک ایسے انسان سے شادی کرنی چاہیے تھی جسے تم اپنے ساتھ ٹریولنگ کے لیے لے جاسکتیں۔ جس سے تم خود کہتیں کہ وہ تمہیں ڈنر پر لے جائے۔ جو تمہارے دوستوں کے گروپ کو محظوظ کرسکتا اور جس کے دیے گفٹ کو حاصل کرکے تم خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین عورت سمجھتیں۔

میری طرف سے تمہیں اجازت ہے کہ تم اپنے لیے یہ انسان ڈھونڈ لو۔ میں اپنے ملک واپس لوٹ جاؤں گا۔ اب مجھے معلوم ہوا ہے کہ میں کس قدر بے وقوف رہا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ دو افراد میاں بیوی بن کر ساتھ رہتے ہیں، ایک تعلق میں بندھتے ہیں تو وہ خود بھی ایک ہو ہی جاتے ہیں۔ لیکن "ایک" تو دو افراد ہوتے ہیں۔ مشعل اور عاول نہیں۔

"اباجی کہتے ہیں کہ کوئی چیز پالو تو محصول کی ادائیگی اس کی قدر سے کرو۔ تمہیں پالیا تھا تو محصول میں اپنی ساری چاہت دے رہا تھا۔ لیکن مجھ جیسے انسان کی چاہت کی اتنی ہی حیثیت ہوتی ہے جتنی متروک زنگ

آلودسکوں کی جو راکھ کی قیمت کی ادائیگی میں بھی نہیں دیے جاسکتے۔"

☼ ☼ ☼

اس نے ٹھیک کہا ہے کہ محبت جیسے بھی ہو' اسے حاصل کرلینا چاہیے۔ کچھ لے کر' کچھ دے کر' کچھ کھو کر' کچھ پاکر۔

میں نے پاپا کی محبت کے لیے بھاری قیمت دی ہے۔ خود کو دے کر' خود کو مار کر' شاید یہ میرا ہی قصور رہا ہے کہ میں نے پاپا سے اس قدر زیادہ محبت کی ہے۔ یہی قصور پاپا کا بھی ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں سے بے حد محبت کی ہے۔

پتا نہیں انہیں عادل میں ایسا کیا پسند آگیا تھا کہ انہیں لگتا تھا کہ ایک صرف عادل ہی میرا شوہر بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کوئی خوش نہیں رکھ سکے گا۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ انسان اچھائی اور برائی کا میزان ہے اور عادل کی اچھائیوں کا میزان جھکا ہوا ہے۔ کتنے ہی دن وہ مجھے عادل کے بارے میں گاہے بگاہے بتاتے رہے۔ پہلے ایک جونیر کی حیثیت سے پھر ایک دوست کی حیثیت سے۔ ان کا کہنا کہ وہ اسے ہر طرح سے پرکھ چکے ہیں اور اب یہ ممکن نہیں کہ ان کا تجربہ اور مشاہدہ انہیں دھوکا دے دے۔

پارٹی میں مجھے اس سے ملوانے کے بعد انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ وہ میرے لیے عادل کا انتخاب کرچکے ہیں۔ پھر وہ اس کے حق میں دلائل دینے لگے جنہیں میں تحمل سے سنتی رہی اور اسی تحمل سے انہیں انکار کرتی رہی۔ عادل میں ایسا کچھ نہیں تھا جس کی وجہ سے اس سے شادی کی جاتی۔ پھر بھی ہمارے درمیان ہر دوسرے دن عادل ڈسکس ہوتا۔ پاپا میرے کسی بھی انکار کو اہمیت ہی نہیں دے رہے تھے۔ مجبوراً" مجھے عادل سے کہہ کر انکار کروانا پڑا۔

"تمہیں عادل سے انکار نہیں کروانا چاہیے تھا۔" پاپا بہت ناراض تھے۔

"آپ نے مجھے کسی اور لائق چھوڑا ہی نہیں تھا۔"

"جس اسکیل پر تم عادل کو رکھ کر جانچ رہی ہو وہ مشینوں کے لیے تو کار آمد ہیں لیکن انسانوں کے لیے نہیں۔"

اس کے بعد وہ کتنے ہی دن مجھ سے خفا رہے۔ میں جانتی تھی وہ یہ سب میرے لیے کر رہے ہیں۔ میری محبت میں' میری بہنوں کے انجام اور پھوپھو کی حالت نے انہیں میرے لیے خوف زدہ کردیا تھا۔ وہ میرے لیے اتنے حساس ہوچکے تھی کہ اکثر وہ چھپ کر میری نگرانی کیا کرتے تھے کہ کہیں میں کسی غلط انسان کے قریب تو نہیں ہو رہی۔

ان کی اداسی اور حساسیت کی وجہ سے میں کبھی کھل کر کسی پر اعتماد نہیں کرسکی۔ دنیا کا ہر مرد ان کے نزدیک ایک برا مرد تھا۔ کیونکہ وہ ایک برا شوہر بننے والا تھا۔ انہیں بھولتے ہی نہیں تھے۔ جن دنوں کومل کا علاج ہو رہا تھا۔ اس کا پہلا شوہر اس پر تشدد کرتا رہا تھا۔ ان کی پڑھی لکھی خوب صورت بیٹیوں کو پڑھے لکھے خوب صورت شوہر تو ملے لیکن خوب سیرت انسان نہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب ان کے نظریات بدل گئے۔ وہ بہت زیادہ خاموش رہنے لگے۔ گھر میں ہونے والی آئے دن کی تقریبات ختم کردی گئیں۔ گھر میں ان کے دوستوں کی آمد بھی تقریباً" ختم ہوگئی تھی۔ ان کی خوش اخلاقی اور خوش اطواری جو ان کی شخصیت کا حصہ تھی' وہ سختی اور لاتعلقی میں ڈھل گئی۔ وہ اپنے آپ کو محدود کرتے چلے گئے۔

میں پاپا کی اس حالت کو سمجھتی تھی۔ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ بدل رہے ہیں لیکن میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ کبھی کبھی انہیں لگتا کہ یہ ان کی اپنی غلطی تھی جو انہوں نے اپنی بیٹیوں کی پسند کو اتنی اہمیت دی۔ انہوں نے کومل اور فروا کو ہر طرح کی آزادی تو دی لیکن انہیں انسانوں کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں دی۔ یا کم سے کم وہ خود محتاط ہوجاتے۔ انہیں آج بھی یہ لگتا ہے فروا نے خودکشی ان ہی کی وجہ سے کی۔

جس وقت میں نے فراز کے پرپوزل کے بارے میں پاپا کو بتایا اس وقت ان کے رد عمل نے مجھے حیران کر دیا۔ انہوں نے صاف صاف انکار کر دیا تھا۔

"میرا دل اس کی طرف مائل نہیں۔"

"یہ کیا لاجک ہوئی۔؟"

"میرا دل کمزور بہت کمزور ہو گیا ہے مشعل۔۔۔ تیز ہوا سے بھی لرزنے لگتا ہے۔ بس فراز مجھے پسند نہیں' تم اسے انکار کر دو۔"

"میں اسے ہاں کہہ چکی ہوں۔ میں اسے پسند کرتی ہوں پاپا۔"

ایک لڑکا کومل نے بھی پسند کیا تھا اور فروا نے بھی۔ ضروری نہیں کہ جو آج تمہیں پسند کرتا ہے' وہ ہمیشہ پسند کرے گا۔ کیا تم نے اپنی بہنوں کی زندگیوں سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔؟

"ان دونوں کی زندگیوں نے آپ کو بہت وہمی بنا دیا ہے۔"

"وہمی نہیں محتاط ہو گیا ہوں۔ دو بار اپنا دل چھلنی کروا چکا ہوں اب تو جان سے ہی جاؤں گا۔"

"آپ کو فراز کے لیے مثبت انداز میں سوچنا ہی ہو گا۔ اسے میرا آخری فیصلہ سمجھ لیں۔"

فراز میرا کلاس فیلو بھی تھا اور میرا بیسٹ فرینڈ بھی۔ میری اور فراز کی منگنی گیارہ ماہ رہی۔ اور پھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس دوران اس کی ایک ایکس گرل فرینڈ سامنے آگئی۔ فراز مجھے اس ایکس گرل فرینڈ کے بارے میں بتا چکا تھا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس ایکس کے ساتھ اس نے منگنی بھی کی تھی اور نوبت شادی تک بھی آچکی تھی۔

"ایکس گرل فرینڈ میں اور تقریباً" وائف ہو جانے میں فرق ہوتا ہے۔" میں نے فراز سے کہا۔

"ایکس ایکس ہی ہوتا ہے مشعل' وہ تقریباً" ہو یا مکمل۔۔۔"

ہم دونوں کے درمیان یہ بات کچھ اس انداز سے شروع ہوئی اور اتنی بڑھ گئی کہ فراز نے خود بریک اپ کر لیا۔ گیارہ ماہ رہنے والی منگنی اور تین سال چلنے والی دوستی صرف ایک بحث کی نذر ہو گئی۔ اسے اپنے ماضی کے بارے میں میرے سوالوں کا جواب دینا پسند نہیں آیا۔ وہ بار بار مجھے یہ جتاتا رہا کہ وہ مجھے اپنے ہر ایکشن کے لیے جواب دہ نہیں ہے۔ جب تک وہ میرا دوست تھا اسے میرا ہر ایکشن' ہر ری ایکشن پسند تھا' جیسے ہی ہمارا رشتہ بدلنے لگا وہ بھی بدل گیا۔ آخری بات جو اس نے کی تھی وہ یہ تھی۔۔۔

"شادی سے پہلے ہمارے درمیان بحث کا یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہو گا۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت دو۔"

اس نے وقت لیا اور پھر منگنی توڑ دی۔

پاپا نے کہا تھا "فراز اچھا ہے' پڑھا لکھا ہے' امیر ہے' لیکن وہ بھی ان نوے فیصد لوگوں میں سے ہے۔ جو شادی سے پہلے ہی اچھے ہوتے ہیں' پھر وہ شوہر تو رہتے ہیں لیکن اچھے نہیں۔ جھوٹے تو ہوتے ہیں لیکن سچے نہیں۔"

فراز سے متعلق خیالات میں بلاشبہ پاپا جیت گئے تھے۔ میں اس معاملے میں ہار گئی تھی۔ پھر بھی میں عادل کے ساتھ کسی بھی طرح کے تعلق کے لیے تیار نہیں تھی۔ میں نے زندگی میں بہت کم لوگوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ میرے قریب آئیں۔ خاص طور پر مردوں کو۔ میرے چند دوستوں اور فراز کے علاوہ میں نے کبھی کسی کو اپنے قریب آنے کی اجازت نہیں دی۔ شاید کہیں نہ کہیں میرے ذہن میں بھی وہی سب تھا جو پاپا کے ذہن میں تھا۔ میں بھی اجنبی اور نئے لوگوں سے ایسے ہی خائف رہتی تھی جیسے پاپا رہتے تھے۔

فروا کی خود کشی نے ہم سب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ مہینوں ہمارے گھر سے سوگ نہیں نکلا تھا۔ سالوں پاپا نے گہری نیند سو کر نہیں دیکھا تھا۔ اس سب کی وجہ فروا کا شوہر تھا۔ پاپا چاہتے تھے کہ میرا شوہر فروا کے شوہر جیسا نہ ہو۔ پاپا کا جو بھی کہنا تھا اس سب کے باوجود میں عادل کے لیے اپنے دل میں گنجائش پیدا نہیں کر سکی۔ وہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا' اس سے محبت دور کی بات تھی۔ شادی اس سے بھی زیادہ دور کی بات تھی۔ اس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

میں کوئی ایک بھی خوبی ایسی نہیں تھی جو مجھے اس کی طرف مائل کرتی۔ وہ پڑھا لکھا تھا تو دنیا میں لاکھوں کروڑوں لوگ پڑھے لکھے ہیں۔ اس کے پاس اچھی جاب یا اچھا مستقبل تھا تو دنیا میں کروڑوں لوگوں کے پاس عادل سے کہیں زیادہ کامیاب حال اور روشن مستقبل تھا۔ پھر عادل ہی کیوں۔۔۔

☆ ☆ ☆

اور عادل ہی کیوں کہ پاپا نے اس کے جانے کی اتنی ٹینشن لی کہ اپنی جان ہی لے لی۔ انہوں نے آفس سے مجھے پک کیا اور گھر لائے۔

"عادل پاکستان جارہا ہے۔"

"سو واٹ پاپا۔ میں یہ موضوع بند کرچکی ہوں مزید اس پر بات نہیں کروں گی۔"

"اس کی فیملی نے اسے شادی کے لیے بلایا ہوگا مشعل۔۔۔"

"یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔"

"مشعل! یہ غلطی نہ کرو۔ میں کہاں تمہارے لیے اس جیسا ایک اور ڈھونڈتا رہوں گا۔"

"مجھے اس جیسا چاہیے بھی نہیں، آپ سمجھ کیوں نہیں رہے۔"

"تم کیوں نہیں سمجھ رہیں، مجھ پر اعتماد نہیں ہے تمہیں۔"

"آپ پر اعتماد ہے لیکن آپ کی پسند میری پسند نہیں بن سکتی۔ میری شادی کا خیال ہی آپ اپنے دل سے نکال دیں ورنہ کم سے کم عادل سے شادی کا پاپا میرا انکار بھی ہاں میں نہیں بدلے گا۔ اس شخص کو دیکھتے ہی مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ کتنی دبی دبی شخصیت ہے اس کی۔ اس میں اتنی قابلیت تو ہوگی کہ وہ محنت کرکے دنیا کے کسی بھی مقام پر پہنچ جائے لیکن اس میں اتنی صلاحیت نہیں ہوسکتی کہ وہ میرا لائف پاٹنر بنے۔"

"لائف پارٹنر میں قابلیت یا صلاحیت نہیں دیکھتے مشعل۔۔۔ انسانیت دیکھتے ہیں۔"

"پھر آپ میرے لیے انسانیت کی خدمت کرنے والا کوئی انسان ڈھونڈ لیتے نا۔"

تلخی سے کہہ کر میں کمرے میں آگئی۔ اور پھر آدھی رات کو مجھے اور ماما کو پاپا کو ایمرجنسی میں لے جانا پڑا۔ فروا کے مرنے پر ان کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا تھا۔ عادل سے شادی پر انکار پر انہیں ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا۔ اتنا ہی خاص تھا وہ ان کے لیے۔۔۔ جو میرے لیے ایک معمولی سا انسان تھا وہ پاپا کے لیے اتنا غیر معمولی کیوں تھا۔ کیا صرف اس لیے کہ ایک شوہر ہونے کی حیثیت سے وہ مجھے کبھی تنگ کرنے کی جرات نہیں کرے گا۔ کیا پاپا نے عادل کا انتخاب اس کی بزدلی کی بنا پر کیا تھا۔

مجھے عادل سے منگنی کرنی پڑی۔ یہ تھی وہ قیمت جو اپنے باپ کی محبت کے لیے میں نے ادا کی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ میں اپنی اور اس کی شادی میں کیا ڈسکس کروں۔ ایسے لگتا تھا یہ ہماری نہیں دو الگ الگ لوگوں کی شادی ہے۔ ایک بار وہ مجھے ڈنر پر لے کر گیا تھا۔ اتنا اوور ڈریس ہوکر کہ اسے دیکھتے ہی میں کوفت کا شکار ہوگئی۔ مجھے اسے برداشت کرنا پڑتا تھا۔ مجھے اسے اگنور کرنا پڑتا تھا۔ اس کے ساتھ موجود ہونا میرے لیے کسی امتحان سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس نے جو انگوٹھی مجھے دی تھی۔ وہ عین میری پسند کے مطابق تھی۔ ویسی ہی جیسی میں اپنی منگنی پر لینا چاہتی تھی لیکن ایک صرف اس انگوٹھی کا اس کے ہاتھ سے دیا جانا تھا کہ وہ انگوٹھی مجھے بری لگنے لگی۔

میرے دوستوں کا کہنا تھا کہ وہ ایک سادہ لیکن سوبر انسان ہے۔ شاید ایسا ہی تھا پھر بھی وہ مجھے پسند نہیں تھا۔ وہ مجھے پسند نہیں آسکتا تھا۔ شاید میں اس سے نفرت کرتی تھی۔ اس لیے کہ اس نے پاپا کو بری طرح سے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سوچ غلط ہے لیکن مجھے ایسا ہی لگا۔ اس نے پاپا کو اپنی خوبیوں سے اتنا متاثر کرلیا کہ وہ اس کے سوا سب کو ناپسند کرنے لگے۔

میرے لیے شادی اتنی ضروری نہیں تھی یا پھر مجھے

شادی کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں زندگی میں کبھی بھی شادی کر سکتی تھی یا پھر کبھی نہ بھی کرتی تو بھی میری اپنی لائف پر اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔ شادی تو پھر ایک جوا ہے۔ جس میں جیت جتنی غیر یقینی ہے ہار اتنی ہی یقینی' پتا نہیں ڈیڈی کیوں چاہتے تھے کہ یہ جوا وہ ہر صورت جیتیں اور مجھے بھی جتوائیں' وہ بار بار مجھے ایک اچھے انسان کی' ایک اچھے شوہر کی خوبیوں کے بارے میں بتاتے تھے۔ یہ وہ موضوع تھا جو مجھے سخت ناپسند تھا اور پاپا کو اتنا ہی پسند تھا۔ شاید وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اس طرح بات کرنے سے میں اپنا ذہن بدل دوں گی۔

اور میں نے ذہن بدل دیا۔ ان کے بات کرنے سے تو نہیں لیکن ان کے ہارٹ اٹیک سے۔

☆ ☆ ☆

ایسی شادی جو عادل جیسے انسان کے ساتھ ہو رہی تھی اس میں میری دلچسپی کیا ہو سکتی تھی؟ میں نے جتنی بھی دلچسپی دکھائی وہ پاپا کے لیے دکھائی۔ شادی سے کچھ دن پہلے عادل کے گھر کی آرائش و سجاوٹ میں نے کروائی تھی' جو میں نے کروایا تھا اس کی پوری پے منٹ مجھے دے دی۔ اس نے چیک میرے آگے کیا۔

"تم نے ہمارا گھر بہت اچھا سجایا ہے مشعل۔ یہ خوب صورت ہے تمہاری طرح۔"

وہ مجھ سے ڈرتا تھا' میں جانتی تھی۔ اسی ڈر کی وجہ سے وہ میری تعریف نہیں کر سکتا تھا اور جب کرتا تھا تو صاف نظر آتا تھا کہ اس نے بہت جرات سے کام لیا ہے۔ مجھے نہ اس کا ڈر پسند تھا نہ جرات۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتی تو کبھی ایسی لڑکی سے شادی نہ کرتی جس سے بات کرنے سے پہلے دس بار سوچنا پڑے۔ وہ دس نہیں بیس بار سوچتا ہو گا کیونکہ وہ مجھے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مجھے کوئی بات بری لگے۔

"یا مجھے کوئی بات ہرٹ کرے۔" اس امکان کو میں نے بہت بعد میں سوچا۔ جب وہ چلا گیا۔

مجھے اکثر یہ لگتا تھا کہ وہ مجھے اپنے پیسوں سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے شادی کے لیے مجھے جو گفٹس دیے وہ مجھے متاثر کرنے کی ابتدائی کوششوں میں سے ایک تھی۔ کوئی ایسے کسی بھی انسان کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ جو ہر وقت دوسروں کو متاثر کرنے میں ہلکان رہتا ہے۔

میں اس سے بہت زیادہ چڑتی ہوں' میں جانتی ہوں۔ میں اسے ایک نارمل حد تک پسند نہیں کر سکتی۔ یہ بھی میں جانتی ہوں۔ پھر اس صورت میں ہمارا تعلق کسی ایگری منٹ سے زیادہ کیا حیثیت رکھ سکتا ہے۔ جیسے کہ اکثر ہمیں بہت ساری ایسی ماڈلز کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے جنہیں ہم ذاتی طور پر بالکل پسند نہیں کرتے لیکن چونکہ ہمیں ان کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے ہم ان سے ایگری منٹ کر لیتے ہیں اور انہیں برداشت بھی...

ایک بار پاپا گھر آئے جیسا کہ وہ جان بوجھ کر اچانک میرے گھر آتے رہتے تھے کہ دیکھیں ہم دونوں کسی بات پر جھگڑ تو نہیں رہے۔ یہ سب کچھ ٹھیک چل رہا ہے نا۔ میں جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے کاؤچ پر اونگھ رہی تھی میرے پاس بیٹھ گئے۔

"تھک گئی ہو مشعل؟"

"او پاپا آپ۔ کب آئے؟"

"میں تو تمہارے کچن سے بھی ہو آیا ہوں' بہت مزے کا کھانا بنایا ہے آج عادل نے۔"

"آپ نے کھا بھی لیا؟"

"ہاہاہا۔ تھوڑا سا۔ عادل کہاں ہے؟"

اور یہ سوال تھا جس کا جواب میں نہیں جانتی تھی۔ جب میں گھر آتی تھی تو مجھے بالکل پروا نہیں ہوتی تھی کہ وہ کہاں ہے کیا کر رہا ہے۔ اکثر وہ مجھ سے پہلے گھر میں موجود ہوتا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ نظر آجاتا تھا یا اگر میں عادل کی طرف سے بات کروں تو ایسے ہوتا تھا کہ وہ گھر پر میرا انتظار کر رہا ہوتا تھا۔ پاپا نے اس کے بارے میں پوچھا تو میری سمجھ میں نہیں آیا۔

"یہیں کہیں ہو گا۔"

"یہیں کہیں کہاں؟" پاپا ناراض سے ہو گئے۔

"لان میں ہو گا پاپا۔ ابھی دیکھتی ہوں۔"

"آدھ گھنٹہ پہلے میں نے تمہیں آفس سے آتے دیکھا ہے۔ تیس منٹ سے تمہیں معلوم نہیں کہ عادل کہاں ہے؟"

"وہ میں آتے ہی کاؤچ پر لیٹ گئی تھی۔ بس نیند آگئی۔"

پاپا اٹھے اور عادل کو آوازیں دینے لگے پھر وہ اسے فون کرنے لگے۔ "آفس میں ہے وہ' آج دیر سے آئے گا۔"

"پھر کھانا کس نے بنایا؟" میں حیران ہوئی۔

"وہ کہہ رہا ہے کہ وہ ایک گھنٹہ پہلے گھر آیا تھا۔ یعنی وہ آیا تھا' تمہارے لیے کھانا بنانے کہ تمہیں آتے ہی بھوک لگتی ہے اور تمہیں یہ تک معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔" پاپا خفا ہو کر گھر واپس جانے لگے۔

"میرے ساتھ کھانا کھائیں پاپا! ممی کو بھی یہیں بلا لیتے ہیں۔"

"تم اپنے شوہر کا کھانے پر انتظار کرو گی تو مجھے زیادہ اچھا لگے گا۔" کہہ کر وہ چلے گئے۔

پہلی بار مجھے عادل نے حیران کر دیا تھا۔ وہ گھر آیا اور میرے لیے کھانا بنا کر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ کوکنگ کرنا بالکل پسند نہیں۔ آفس سے آتے ہی مجھے بھوک بھی بہت لگتی ہے۔

عادل اچھا انسان ہے' خیال رکھتا ہے' بات مانتا ہے' لیکن پھر بھی وہ مجھے پسند نہیں' وہ حیران کرتا ہے لیکن متاثر نہیں' شاید وہ مجھے متاثر بھی کر دے۔ میں متاثر ہو بھی جاؤں لیکن پھر بھی۔۔۔

☼ ☼ ☼

وہ یہ سمجھتا تھا کہ اس کے حلیے میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں میں ان سے لاعلم ہوں۔ اس میں اتنی تیزی سے اور اتنی تبدیلیاں آرہی تھیں کہ کوئی بھی اسے دیکھ کر چونک جاتا۔ ایک دن میں نے اسے کار سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ میں اپنے آفس کی کھڑکی میں کھڑی بارش کا نظارہ کر رہی تھی جب وہ پارکنگ سے بارش میں بھیگتا ہوا آفس بلڈنگ کی طرف آیا۔ وہ پہلی بار تھا کہ میں نے اسے پہچاننے میں تھوڑا وقت لیا۔ اس کا ہیئر اسٹائل بدلا ہوا تھا۔ یقیناً" اس نے بالوں کو کلر بھی کروایا تھا اور انہیں باقاعدہ سیٹ کروایا تھا۔ اس کی شرٹ' شرٹ پر کوٹ' شوز اور ہاتھ میں پہنی ریسٹ واچ میں ایسی نمایاں تبدیلیاں تھیں کہ کھڑکی سے اسے دیکھتے ہوئے میں چند سیکنڈز کے لیے اسے پہچان ہی نہیں سکی۔

میرا شک یقین میں بدل گیا۔ وہ گرومنگ کلاسز لے رہا تھا۔ آج وہ فائنل میک اوور کروا کر آیا تھا۔ ایک عرصے سے وہ کچھ زیادہ ہی اپنی ڈائٹ کا خیال رکھنے لگا تھا۔ اپنے لیے اسپیشل فوڈ بناتا تھا۔ جم جا رہا تھا' ریگولر رننگ' جوگنگ کرتا تھا۔ اس کی باڈی ایک خاص شیپ میں بدلنے لگی تھی۔

آج جیسے وہ مجھے سرپرائز دینے آیا تھا۔ میں سرپرائزڈ ہو گئی تھی۔ بہت حیران تھی میں۔ اس نے خود کو بہت حد تک بدل لیا تھا۔

اس کی شخصیت کی سادگی اپ ڈیٹ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ پاپا کہتے ہیں وہ بہت ڈیسنٹ ہے تو آج وہ ڈیسنٹ پرسن کم فیشنگ پرسن لگ رہا تھا۔

وہ اندر میرے آفس میں آیا اور مجھ سے کہا کہ کیا میں اس کے ساتھ لنچ کے لیے چلوں گی۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔

"میرا خیال تھا آج موسم بہت اچھا ہے۔ ہمیں لنچ کہیں باہر کرنا چاہیے۔"

میرے انکار پر بھی وہ بضد تھا کہ ہمیں لنچ باہر کرلینا چاہیے۔

میں نے ایک فائل اٹھائی اور اسے پڑھنے لگی اور اس سے کہا کہ میں بہت مصروف ہوں۔ سر ہلا کر وہ چلا گیا۔ پہلے وہ مجھ سے فون پر پوچھا کرتا تھا کہ میں لنچ کے لیے اس کے ساتھ جا سکتی ہوں' آج وہ خود آیا تھا۔ میں اس کے ساتھ لنچ کے لیے ضرور چلی جاتی اگر اس کے لیے میری ناپسندیدگی میں کوئی کمی آچکی ہوتی۔ ویسے بھی آج وہ مجھے لنچ پر لے جانے نہیں خود کو دکھانے آیا

تھا۔ میں نے اسے سرسری نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ جو مایوسی اس کے چہرے پر نمایاں ہوئی وہ مجھے نظر آگئی تھی ہلیکن میں کیا کرتی۔۔۔ خود پر جبراً اس پر رحم۔۔۔

میں جانتی ہوں خود کو۔۔۔ میں جس چیز کو ایک بار ناپسند کر لیتی ہوں۔ پھر اسے کبھی پسند نہیں کرتی۔ جن کھانوں کو، جن کپڑوں کو، جن رنگوں، شہروں کو، لوگوں کو میں نے ایک بار ناپسند کیا، انہیں پھر کبھی پسند نہیں کیا۔ ناپسندیدہ چیزیں جیسے میری انا کے لیے چیلنج بن جاتی ہیں۔ میری انا اتنی بلند ہے کہ میں آسانی سے یہ چیلنج جیت جاتی ہوں۔ اس معاملے میں میں پتھر کی لکیر ہوں، بلکہ پتھر ہوں میں۔۔۔

مجھے نظر آرہا تھا کہ اس کی وارڈروب میں کیا تبدیلیاں آرہی ہیں۔ اس کے لیے کہاں کہاں سے پارسل آرہے ہیں۔ مجھے ہنسی آتی تھی کہ وہ کس لیے خود کو اتنا ہلکان کررہا ہے۔ کیا اسے لگتا ہے کہ اگر وہ کسی ماڈل مرد کی طرح کا چارمنگ ہو جائے گا تو مجھے اچھا لگے گا۔ وہ ہینڈسم ہو گا تو میں اس سے محبت کرنے لگوں گی۔ یا وہ میرا فخر بننا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ فخر سے چل سکوں۔ اگر وہ باعث فخر تھا تو پاپا کے لیے۔۔۔ متاثر کرتا تھا تو صرف انہیں۔۔۔

مجھے عادل ہمیشہ ایک بوجھ لگا۔ ایک ایسا سایہ جو میرے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ پاپا کہتے ہیں کہ اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اس نے آج تک مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں کہاں تھی اور اتنی دیر سے گھر کیوں آئی؟ کس کے ساتھ تھی، اسے فون کیوں نہیں کرسکی؟ اس کی کال کا جواب کیوں نہیں دے سکی؟

ڈیڈی کہتے ہیں کہ وہ بے ضرر انسان ہے۔ اگر کسی انسان کی ذات سے کسی دوسرے انسان کو کوئی تکلیف نہ پہنچے تو وہ انسان فرشتہ ہوتا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ وہ بے ضرر ہی ہے۔ میں نے شادی کے بعد بھی شادی سے پہلے والی لائف گزاری ہے۔ میں اپنے دوستوں کے ساتھ گھومتی پھرتی رہی ہوں۔ ان کے ساتھ پارٹی کی، ہلا گلا کیا، تھیٹر، سینما، کنسرٹ پر گئی، میچز دیکھے، وہ

سب کیا جو میرا دل چاہا۔ میں کسی کو جواب دہ نہیں تھی۔ عادل کو تو بالکل نہیں۔ وہ میرے گڈ ایوننگ گڈ نائٹ کہنے پر ہی خوش ہو جاتا تھا۔

جس دن میں اس سے کہہ دیتی کہ.... "کیا وہ میرے لیے ایک کپ کافی بنا دے گا۔" تو وہ دن اس کے لیے خاص ہو جاتا تھا۔

میں اسے مسکرا کر دیکھ لیتی تھی تو سارا دن مسکراہٹ اس کے چہرے سے الگ نہیں ہوتی تھی۔ اپنی کافی کے ساتھ اگر میں اس کی کافی بھی بنا دیتی تھی تو اسے لگتا تھا کہ جیسے میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں۔

مجھے اس سے محبت ضرور ہو جاتی 'اگر وہ مجھے پسند آ جاتا۔ اس میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ جسے ناپسند کیا جاتا تو ایسا بھی کچھ نہیں تھا کہ اسے اتنا پسند کر لیا جاتا کہ محبت ہی کر لی جاتی... وہ ایک شوہر تھا... صرف شوہر۔ اور بس...

☆ ☆ ☆

پاپا مطمئن تھے 'ممی خوش تھیں اور مجھے کیا چاہیے تھا؟ میں سکون سے اپنے میگزین کے لیے کام کرتی تھی۔ عادل کے ساتھ ہوئے شادی کے ایگری منٹ کو میں نبھا رہی تھی تو دوسری طرف اپنے کیریئر کے لیے میں جیسے جان کی بازی لگا رہی تھی۔ اب جب زندگی میں ایک ناپسندیدہ چیز موجود تھی تو مجھے زندگی میں ہر چیز اپنی پسندیدہ چاہیے تھی۔ گھر سے لے کر آفس تک۔ کام سے لے کر کامیابی تک۔

ایک دن میں اپنے میگزین کے ایک آرٹیکل کے لیے ملبورن کی ٹاپ ٹین ڈانس اکیڈمیز میں سے ایک میں گئی تھی۔ کافی دیر تک میں آفس میں بیٹھی مائیکل سے بات چیت کرتی رہی تھی۔ جس وقت میں واپس آ رہی تھی اس وقت میں نے سرسری سا شیشے کی اس دیوار کے پار دیکھا جہاں ایک بڑا ہال تھا اور بہت سے لڑکے لڑکیاں ڈانس پریکٹس کر رہے تھے۔ میری نظر پلٹ گئی۔ لیکن میں چلتے چلتے رک بھی گئی۔ چار قدم چل کر مجھے پھر سے اپنی نظروں کو شیشے کے اس طرف موڑنا پڑا جہاں۔ انسٹرکٹر ایک لڑکے کے ساتھ مصروف تھا۔ انسٹرکٹر کھڑا ہو کر اسے اسٹیپ کر کے دکھا رہا تھا' پھر اس نے سامنے والے کو کہا کہ وہ کر کے دکھائے۔

سامنے والا انسان عادل تھا۔

میں آج بھی ٹھیک سے یہ نہیں جان سکی کہ چلتے چلتے میں کیوں رک گئی تھی۔ کس چیز نے مجھے زیادہ حیران کیا تھا۔ عادل نے یا اس کی وہاں موجودگی نے۔

میں وہیں کھڑی رہی اور اس کی طرف ہی دیکھتی رہی۔ عادل نے۔ انسٹرکٹر کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ایک کمر میں حمائل کیا اور پھر اس نے موومنٹ دی۔ اس کی موومنٹس پالش تھیں۔ یقیناً وہ کافی وقت سے یہاں آ رہا تھا۔ خوف سے یا حیرانی سے میں کپکپا کر رہ گئی۔ پہلی بار میں نے اپنے دل کو ایک دم سے سکڑتے محسوس کیا۔ ایک سرگوشی بے اختیار میرے ہونٹوں سے نکلی۔

"عادل... تم یہ کیا کر رہے ہو۔"

پاپا کہتے ہیں کہ وہ آفس سے وقت پر نکل آتا ہے۔ پھر وہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ گھر جاتا ہے 'میرے لیے کھانا پکاتا ہے اور پھر یہاں آ جاتا ہے۔ میں تو تقریباً روز ہی آفس سے لیٹ ہو جاتی تھی۔ بلکہ مجھے تو رات بھی آفس میں گزار دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔

دو منٹ تک وہاں کھڑی میں اسے دیکھتی رہی۔ میں اپنی پلکیں نہیں جھپک سکی۔ ایک لحظے کے لیے میرا دل چاہا کہ میں ہال کے اندر جاؤں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آؤں... لیکن پھر... پھر یہ کہ مجھے اس چیز کی فکر نہیں کرنی چاہیے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں۔

اس رات جب وہ گھر آیا تو غیر معمولی طور پر خوش تھا۔ شاید اس کا ڈانس ٹھیک ہو گیا تھا۔ رات گئے تک میں اپنے آرٹیکل پر کام کرنے کی کوشش کرتی رہی' لیکن اس رات مجھ سے کام ہی نہیں ہو سکا۔ میں بار بار بیڈ روم کے آدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی

جہاں اندر وہ سو رہا تھا۔ عادل۔

☆ ☆ ☆

پتا نہیں کیوں، لیکن میں نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ لیا تھا۔ مجھے عادل کو یہ موقع دینا ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے رقص سے کسی کو بھی متاثر کر سکے یا کم سے کم اس کا مظاہرہ کر سکے۔ جب سے وہ ویل گرومڈ ہوا تھا تب سے پاپا اس کے اور زیادہ گرویدہ ہو گئے تھے۔ ان ایفیکٹ وہ تو ہر وقت اس کی ڈریسنگ اور پرسنالٹی کی تعریف کرتے رہتے تھے۔ وہ بار بار مجھے یہ جتاتے رہتے تھے کہ وہ کس قدر ہینڈسم ہو چکا ہے۔ ہمارے حلقہ احباب میں کوئی بھی اس کی پرسنالٹی جیسا نہیں ہے۔ اس کی شخصیت میری شخصیت سے کہیں زیادہ پرکشش ہو چکی ہے۔

شاید اس نے زندگی بھر کبھی خود پر اتنے پیسے انویسٹ نہیں کیے تھے جتنے وہ اب کر رہا تھا۔ انویسٹمنٹ جتنی بڑی ہوتی ہے فائدہ بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ میرے دوست بھی اس کی تعریف کرنے لگے تھے۔ اکثر لوگ تو اسے پہچاننے میں کافی وقت لیتے تھے۔ پاپا کی دیکھا دیکھی کومل بھی عادل سے متاثر نظر آنے لگی تھی۔ ایک دن وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"پاپا کا فیصلہ ٹھیک تھا.... عادل تو واقعی میں بہت اچھا انسان ہے.... تم سے محبت بھی کرتا ہے۔"

میں ہنس دی.... "تمہیں کیسے پتا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے؟"

کومل حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ "کیوں تمہیں نہیں پتا؟ جب سب کو نظر آ رہا ہے، تو تمہیں کیوں نہیں؟"

"نہیں.... مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔"

جبکہ مجھے سب نظر آ رہا تھا۔ وہ کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے، کتنا بدل رہا ہے، میرا کتنا خیال رکھتا ہے، سب۔ لیکن بات صرف اتنی سی تھی کہ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ ڈانس سیکھتے ہوئے اس نے مجھے چونکا دیا تھا۔ خوف زدہ بھی کر دیا تھا۔ اس رات میں

سو بھی نہیں سکی تھی، لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

میں نے اپنی آفیشل پارٹیز میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا، کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ وہاں میرے ساتھ جائے۔ لیکن پھر اس نے میرے لیے برتھ پارٹی ارینج کی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ میں اتنی مصروف ہو گئی کہ میں اپنی برتھ ڈے بھول گئی۔ میں یہ بھی بھول گئی تھی کہ ایسی کوئی پارٹی مجھے دی جا سکتی ہے۔ جہاں رات کو میرے سارے دوست گھر میں موجود ہوں گے گھر سجا ہو گا لان میں ایک عالی شان پارٹی کا انتظام ہو گا۔

پاپا خوش تھے۔ بہت خوش تھے اور عادل بھی۔ کومل اور ممی بھی.... پتا نہیں وہ سب کیوں اتنے خوش تھے۔ کیا ان سب نے اپنے غموں کا علاج میری خوشیوں میں تلاش کر لیا تھا۔ کیا انہیں یہ لگتا تھا کہ اب جبکہ میں اور عادل ایک پرفیکٹ کپل بن چکے ہیں تو ان کے سارے زخم بھر چکے ہیں۔ کیا عادل ان کے لیے مرہم تھا۔ اگر ایسا تھا تو وہ میرے لیے زہر کیوں تھا؟

جس وقت عادل نے اپنا ہاتھ میرے سامنے کیا کہ میں اس کے ساتھ ڈانس کروں، اس وقت میں اسے صاف انکار کر دینا چاہتی تھی اور میں کر ہی رہی تھی کہ کومل نے کہا۔

"اگر آج رقص نہیں ہو گا تو کب ہو گا.... فوراً شروع ہو جاؤ دونوں۔"

شاید کومل جانتی تھی کہ عادل رقص سیکھتا رہا ہے۔ شاید وہ عادل کی رازدار بن چکی تھی۔ میں نے اس رات محسوس کیا کہ میرا بھانجا، کومل کا اکلوتا بیٹا بھی عادل کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ عادل کے ساتھ سیلفیاں لے رہا تھا۔ اسے اپنے دوستوں سے ملوا رہا تھا۔ خضر عام نارمل بچوں کی طرح ایکٹ کر رہا تھا جو کہ وہ کم ہی کیا کرتا تھا۔ وہ تنہائی پسند تھا اور زیادہ تر اپنے کمرے میں گیمز کھیلنا پسند کرتا تھا۔

"خضر کے اتنے دوست کیسے بنے۔ اس نے کب اپنے کمرے سے نکلنا شروع کیا۔ وہ کس طرح عادل سے اتنا فری ہوا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے دوستوں سے ملوانے لگا۔"

اس رات کی جھولی میں اتنے سوال تھے اور میرے لیے حیرت کے اتنے سامان تھے کہ میں تلخ سے تلخ ہوتی گئی۔ تو عادل میری فیملی میں صرف داخل ہی نہیں ہوا تھا' بلکہ وہ ہماری فیملی کا حصہ بھی بن چکا تھا۔

"اس شخص نے ہر انسان کو متاثر کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔"

عادل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے عادل کے ساتھ ڈانس کرنا پڑا۔ میں جو ایک اتنے بڑے فیشن میگزین میں کام کرتی ہوں۔ جس کا ہر دن شوبز کے ہائی فائی لوگوں سے ملاقاتیں گزرتا' ان کی زندگیوں کے تجزیے کرتے اور ان کی پروفیشنل لائف کے بارے میں لکھتے گزرتا' مجھے یہ ماننے میں کوئی عار نہیں کہ اس رات عادل نے کسی فلمی ہیرو کی طرح رقص کیا... مجھے کسی ہیروئن کی طرح ٹریٹ کیا۔

اس رات اس کی پرفارمنس آؤٹ کلاس تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ یہ حقیقت کہ وہ میرے ساتھ ایسے رقص کر سکتا ہے اور کر رہا ہے' اسے کسی خواب میں لے جا رہی تھی... وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ ہاں! وہ مجھے پوری جرات اور دلیری سے دیکھ رہا تھا... اس نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی اور میری گردن پر جھک آیا۔

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی... میں نے اسے فوراً" پرے دھکیل دینا چاہا۔

"میں تھک گئی ہوں۔"

"ابھی تو ملی ہو... ابھی کیسے جانے دوں۔"

اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا... بازو میری کمر میں حمائل رہا اور گردن کا جھکاؤ بدستور پہلے جیسا۔

اگر اس رات کا اہتمام میرے لیے تھا تو وہ رات عادل کے نام تھی۔ سب خوش تھے۔ میرے لیے نہیں عادل کے لیے۔ وہ اسٹار تھا اس رات کا۔ میں نے پاپا کو آج سے زیادہ کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔

"حیران کر دیا نا انکل نے آپ کو۔" خضر نے میرے پاس آکر پوچھا۔ میں حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ سے اچھا ڈانس کرتے ہیں اب وہ۔ آپ تو خوب صورت ہیں' لیکن وہ تو کمال ہیں۔"

عادل' پاپا اور ممی سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا۔ مجھے صاف صاف ایسے لگا جیسے اس نے مجھے ہرا دیا۔

وہ جیت گیا۔

عادل جیسے انسان کو جیت جانے دینا... اس جیسے انسان سے ہار جانا... مجھے اپنی تذلیل لگا۔

اگلے دن وہ چلا گیا۔

"اچھا ہوتا تم بھی عادل کے ساتھ چلی جاتیں۔ کچھ دیر وہاں اپنے سسرال جا کر رہو۔ اب جب عادل بلائے تب چلی جانا۔ کام کو اتنا سر پر سوار نہیں کرتے۔"

پتا نہیں اس نے پاپا سے کیا کہا تھا' کیا نہیں۔ کیا سچ کیا' کیا جھوٹ کہ پاپا مجھ سے کوئی باز پرس نہیں کر رہے تھے۔ وہ بہت مطمئن تھے۔ میں بھی بہت مطمئن تھی۔

وہ میرے نام ایک خط ٹیبل پر چھوڑ گیا تھا کہ میں پاپا کی فکر نہ کروں' وہ انہیں سمجھا لے گا۔ میں اپنے فیصلے میں آزاد ہوں۔ میں نے چاہا کہ میں پاپا کے گھر چلی جاؤں تو انہوں نے مجھے منع کر دیا۔

"اپنے گھر میں رہو اور اپنے شوہر کا انتظار کرو۔ تمہیں بھی معلوم ہو کہ عادل کے بغیر گھر کیسا لگتا ہے۔"

عادل کے بغیر گھر ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا۔ نہ وہ میرے لیے پہلے گھر میں موجود تھا' نہ بعد میں ہوا۔ ان لوگوں کے جانے سے زندگی میں فرق پڑتا ہے۔ جن لوگوں کی موجودگی سے فرق پڑے۔ جسے زندگی میں شامل ہی نہیں کیا اسے نکال دینے پر افسوس کیا کرنا۔ ہاں! لیکن چند بار مجھے افسوس ہوا کہ میں نے ایک عام سے شخص کو اتنا ہلکان کر دیا کہ وہ خود کو سر سے پیر تک بدل دینے میں مصروف ہو گیا۔ کوکنگ سیکھتا رہا' گرومنگ کرتا' رقص میں غلطاں رہا۔ وہ خود کو خاص بنا لینے پر کمربستہ ہو گیا۔

مجھے افسوس تھا اور بس...

پاپا کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی عادل سے

روز بات ہوتی ہے۔ ایسے ہی روز بات کرتے عادل ایک دن انہیں ہمارے فیصلے کے بارے میں بتا دے گا۔ مجھے عادل پر بھروسا تھا کہ جیسے اس شخص نے باقی کے سب کام اتنی خوش اسلوبی سے کیسے تھے وہ یہ کام بھی بہت اچھے انداز سے کرلے گا۔

"تمہارا اس اکیلے گھر میں دل پریشان نہیں ہوتا مشعل۔۔۔؟" عادل کو گئے ہوئے آٹھ مہینے سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا تو ایک رات پاپا نے مجھ سے پوچھا۔

"سارا دن تو میں آفس میں ہوتی ہوں۔ رات کو سونا ہی تو ہوتا ہے۔"

"کیا زندگی یہی ہے؟ دن کو کام کرنا اور رات کو سو جانا؟ اپنے کیریئر کے لیے جنون رکھنا اور اپنی پرسنل لائف کو کوئی اہمیت نہ دینا۔"

میں خاموش رہی۔۔۔

"مجھے یہ خوف ہمیشہ رہا تھا کہ مجھے کبھی اپنی کسی بیٹی کے لیے ایک اچھا انسان نہیں مل سکے گا۔ مجھے یہ خواب لگتا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو گا کہ میری کسی بیٹی کا شوہر اتنا اچھا ہو گا کہ میں رات کو سکون سے سو جایا کروں گا۔ فروا کی موت کے بعد میں تمہاری موت کے فوبیا میں مبتلا ہو گیا تھا۔ جب کوئی انسان اولاد والا ہوتا ہے نا اس دن سے ہی وہ کئی طرح کے خوفوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ میں تو پھر بیٹیوں والا تھا۔ لیکن تم سے یہ باتیں کرنا یا تمہیں سمجھانا بے کار ہے کیونکہ تم ضدی اور خود پسند ہو۔"

"میں خود پسند نہیں ہوں پاپا۔۔۔" مجھے پاپا کے اتنے سفاکی سے کہنے پر دکھ ہوا۔

"تم خود کو کیا کیا سمجھتی ہو مشعل؟ ہو تو تم ایک انسان ہی نا۔ اگر تم خوب صورت ہو تو اس میں تمہارا کیا کمال ہے؟ اگر تم پڑھی لکھی ہو تو اس میں میرا کمال ہے۔ میں نے رات دن محنت کی، تمہیں زندگی کی ساری سہولتیں دیں۔ اگر میرا باپ پاکستان سے یہاں نہ آتا تو تمہاری پیدائش بھی کسی دیہات میں ہوتی۔ تم اس سے کہیں زیادہ عام اور معمولی ہوتیں، جتنا عادل تمہیں لگتا ہے۔ جب ایک انسان خود کو بہت اونچے مقام پر رکھ لیتا ہے نا تو سے باقی کے سب لوگ خود سے چھوٹے ہی نظر آتے ہیں۔ خود کو تم نے کس خوبی کی بنا پر اتنا اونچائی پر رکھ لیا ہے؟

تم عادل سے شادی سے انکار کرتی تھیں، تو مجھے یقین تھا کہ جب تم اس کے ساتھ رہو گی تو تم بھی اس کی گرویدہ ہو جاؤ گی۔ ہونہہ۔۔۔ لیکن گرویدہ تو وہ شخص ہو جو خود اپنے سحر سے نکل سکے۔ جسے اپنی ہی چاکری سے فرصت نہیں، وہ کسی کو کیا سراہے گا۔ مجھے افسوس ہے مشعل! کہ تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ تمہیں اپنے فلاں ڈریس کے ساتھ کون سے شوز اور کون سا کلچ لینا ہے، لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم کہ ایک اچھے انسان کے ساتھ کیسے رہنا ہے۔"

میں حیرت سے ڈیڈی کو دیکھ رہی تھی۔

"عادل مجھ سے تفصیل سے بات کر چکا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میں تمہیں تمہارے مرضی کی زندگی گزارنے دوں۔ تم پر اپنی محبت کا دباؤ نہ ڈالوں۔ وہ تمہیں چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔ تم کاغذات بنوالو، وہ سائن کر دے گا۔ یہ گھر وہ پہلے ہی تمہارے نام کر چکا ہے۔ تم کچھ اور لینا چاہو تو اس کا دعوا کر دینا۔ تم نے خود پر شادی کی اسٹمپ لگوالی ہے، اب چاہو تو ساری زندگی سنگل رہ سکتی ہو۔ عادل کے بارے میں جو میرے دعوے تھے، وہ سب سچ ثابت ہوئے۔ اس نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ مایوس تو مجھے میری اپنی ہی اولاد نے کیا۔ اب مجھے اس چیز کا خوف نہیں رہے گا کہ میری بیٹی کی زندگی میں کوئی برا شخص آجائے گا کیونکہ اب میں یہ جان گیا ہوں کہ اچھے شخص کو میری بیٹی خود اپنی زندگی سے بے دخل کرتی رہے گی۔ عادل کو بھی مکمل بے دخل کر دو۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کسی اپنے جیسی لڑکی سے شادی کرے اور اپنا گھر بسالے۔ میں اسے بہت پسند کرتا ہوں۔ اس نے تمہارے ساتھ ایک صبر آزما وقت گزارا ہے۔ میں اس کے صبر کی قدر کرتا ہوں۔"

"پاپا! آپ۔۔۔"

"تم اپنے ہر طرح کے فیصلے کے لیے آزاد ہو مشعل۔۔۔" میری بات سنے بغیر وہ اپنی کہہ کر چلے گئے۔

٭ ٭ ٭

جس رات پاپا میرے پاس آئے تھے اس رات کے دن میں آفس میں بھی ایک واقعہ ہوا تھا۔

"یہ آرٹیکل آپ نے لکھا ہے۔" تند و تیز انداز میں ایک عورت میرے آفس آئی۔

"جی میں نے ہی لکھا ہے۔"

"پہلے میں نے سوچا کہ مجھے تمہیں ای میل کرنی چاہیے' پھر سوچا کہ جو بات ملاقات میں ہے' وہ ای میل میں نہیں۔ ویسے بھی تم جیسے لوگوں کی طبیعت لائیو صاف کرنی چاہیے۔

جولائی کے ایڈیشن میں تم نے جو میگزین کے کور پر کول ہسبنڈ' ہاٹ گائے' پرفیکٹ ہسبنڈ کی تصویریں دیں' اور اندر آرٹیکل اور ہنٹ دیے ہیں' کیا سوچ کر دیے ہیں۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہی اکا بیسٹ ہو سکتا ہے' جس کی باڈی اچھی شیپ میں ہو؟ وہی شوہر پرفیکٹ ہو سکتا جو بیوی کی برتھ ڈے کو یاد رکھے' جو بیوی کو غیر معمولی گفٹ دے سکے۔ جو اسے ہفتے میں ایک بار ڈنر کے لیے لے کر جائے۔ جو دیکھنے میں ہینڈسم ہو۔ اس کے پاس ٹریولنگ کروانے کے لیے ڈھیر سارے پیسے ہوں۔ جو کسی فلمی ہیرو کی طرح ہمارے سب خواب سچ کر دکھائے؟ یہ ہے وہ اسکیل جو تم لوگ دوسروں کو جج کرنے کے لیے دیتے ہو؟ تم ہوتے کون ہو ہمیں یہ اسکیل دینے والے؟

بند کرو یہ واہیات چیزیں لکھنا۔ میرا ہزبینڈ یہ سب چیزیں پڑھتا ہے اور اسے لگتا ہے کہ وہ ایک پرفیکٹ ہزبینڈ نہیں ہے۔ میرے برتھ ڈے گفٹ کے لیے اس نے اپنی کچھ قیمتی اور پیاری چیزیں بیچ دیں۔ اسے لگنے لگا کہ شاید دنیا کی ہر عورت ایسے ہی خوش رہ سکتی ہے۔ ہر عورت کو یہی سب چاہیے۔ ہفتے کے چھ دن وہ پارٹ ٹائم کام کرنے لگا ہے' تاکہ ہفتے میں ایک بار مجھے کسی اچھی جگہ پر ڈنر کرا سکے۔ اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے وہ مجھے ٹریول کروانے کے لیے پیسے جمع کر رہا ہے۔ تم لوگ کیوں دوسرے لوگوں کی زندگیاں مشکل بنا رہے ہو۔ میرا شوہر تمہارے میگزین کے کور پر آنے والے پرفیکٹ گائے جیسا نہیں دکھتا' لیکن وہ میرے لیے پرفیکٹ ہے' کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ اس کی جیب میں پیسے ہیں یا نہیں' وہ مجھے ڈھیر ساری شاپنگ کروا سکتا ہے یا نہیں' مجھے اس کی پروا نہیں ہے' کیونکہ وہ میرے دکھ میں میرے ساتھ مل کر روتا ہے۔ میری خوشی میں میرے ساتھ خوش ہوتا ہے۔

تم یہ سب لکھ کر میرے شوہر کو اذیت دینا بند کرو۔ بند کرو یہ سب بکواس لکھنا۔ تم وہ وچ (چڑیل) ہو جو سادہ دل لوگوں کی زندگیوں کا خون چوستی ہے۔ تم جیسے گھٹیا لوگ اپنی زندگیوں کو مشینوں کی طرح چلاتے ہیں اور انہیں لگتا ہے کہ باقی کی دنیا بھی اسی فارمولے پر چلے۔"

کیا میں واقعی اپنی زندگی کو کسی مشین کی طرح چلا رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی پر ایک فارمولا لگایا تھا۔ جو اسکیل میں دوسروں کو دے رہی تھی اسی اسکیل پر میں نے عادل کو رکھا ہوا تھا۔

اس دن اور اس رات مجھے لگا کہ ہر شخص عادل کی زبان بول رہا ہے۔ ہر شخص عادل کے حق میں بول رہا ہے۔ ہر اشارہ اس کے حق میں جا رہا ہے۔ اس رات پہلی بار میں نے اپنے دل کو ڈوبتے ہوئے محسوس کیا۔ پہلی بار مجھے لگا کہ جس نظریے میں دنیا کو اور عادل کو دیکھتی رہی ہوں وہ نظر ہی غلط تھی۔

نہیں مجھے عادل سے محبت نہیں ہو گئی تھی۔ میں تو اس سے متاثر ہوئی تھی کہ کیسے ہر شخص اس کی وکالت کر رہا ہے۔ ہر شخص' ہر واقعہ' ہر اشارہ۔ وہ خود پاکستان میں تھا اور یہاں وہ اپنے وکیل چھوڑ گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

اگلے دن صبح ہی مجھے ہمارے فیملی وکیل کی کال آ گئی۔ ان کا کہنا تھا کہ پاپا نے انہیں مجھ سے بات کرنے کے لیے کہا۔ پاپا کا رویہ مجھے حیران کر رہا تھا۔ وہ عادل کو اس قدر پسند کرتے تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ عادل جلد مجھ جیسی اذیت سے آزاد ہو جائے۔ پاپا کا یہ رویہ مجھے

اپنے منہ پر کسی طمانچے سے کم نہیں لگا۔

☼ ☼ ☼ ☼

پاپا مجھ سے قطع تعلق کر چکے تھے۔ وہ نہ گھر آتے تھے' نہ میرے گھر جانے پر مجھ سے بات کرتے تھے۔ لیکن میں نے انہیں عادل سے فون پر لمبی لمبی باتیں کرتے دیکھا تھا۔ آخر اس شخص میں ایسا کیا تھا کہ جنہیں وہ ایک بار پیارا لگا تھا انہیں وہ بُرا نہیں لگ رہا تھا۔

اور پھر... ایک رات...

ان دونوں نے ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا تھا۔ ایک نے پسٹل مجھ پر تان لی تھی اور ایک نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے ریسٹ واچ اور باقی کی جیولری اتارنے کے لیے کہا۔ اس طرح کے اسٹریٹ کرائم سے میں واقف تھی۔ میں نے آج تک ہزاروں بار ان اسٹریٹ کرائم کے بارے میں پڑھا تھا' سنا تھا اور ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ یہ سب دوسروں کے ساتھ تو ہو سکتا ہے' لیکن میرے ساتھ نہیں۔ میرے پاس میری اپنی کار تھی اور میرا اچھے علاقوں میں آنا جانا تھا۔ میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کسی پوش علاقے میں بھی میرے ساتھ یہ ہو سکتا ہے۔ کار تک آتے کوئی مجھے بھی پیچھے سے دبوچ سکتا ہے۔ میرے گھٹنے پر میرے پیٹ میں اور میرے منہ پر تھپڑ مار سکتا ہے۔ کبھی کہیں میرے ساتھ بھی کچھ برا ہو سکتا ہے... کوئی مجھے بھی بے بس کر سکتا ہے۔

میری ساری قیمتی جیولری اور میرا بیگ ان کے پاس تھا' پھر بھی وہ مجھے گالیاں دے رہے تھے۔ ایک اپنا بدبودار' غلیظ منہ میرے منہ کے پاس لا کر چلا رہا تھا۔ میرے اعصاب اتنی بری طرح سے منتشر ہوئے کہ میں کتنی ہی دیر تک وہیں بت بنی کھڑی رہی۔ میں خوف زدہ نہیں ہوئی تھی' بلکہ میں بے عزت ہوئی تھی۔ میری گردن پر ایک لڑکے کے پنجوں کی سختی اور میرے ہاتھوں' کانوں' انگلیوں سے جیولری اتارنے کی درندگی نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔

میں نے پولیس کو کال نہیں کی تھی۔ میں گھر آگئی تھی۔ میں نے اپنا منہ بھی صاف نہیں کیا تھا۔ کپڑے بھی نہیں بدلے تھے۔ تذلیل کے اس احساس کو لیے میں رات بھر خاموش بیٹھی رہی... اس ایک تھپڑ کی گونج ساری رات سنتی رہی۔

ماہ رخ کی نمبر ون یونی ورسٹی سے ڈگری لینے والی لڑکی' ملک کے سب سے بڑے میگزین میں کام کرنے والی مشعل جلال' جو لوکل ٹرین میں سفر کرنے کو اپنی توہین سمجھتی تھی۔ جسے اپنی خوب صورتی' ریمپ پر چلنے والی ماڈلز سے کہیں زیادہ لگتی تھی۔ میں جو عادل جیسے انسان کو اپنے کندھے پر صرف اس لیے ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھی کہ میں سمجھتی تھی کہ میری خوب صورتی اتنی گری ہوئی نہیں کہ ایک دیہاتی اس پر اپنا حق جمائے۔ وہ مشعل آج گندے سندے نشہ کرنے والے لفنگے غنڈوں کے ہاتھوں ذلیل ہو چکی ہے... وہ میرا سامان نہیں لوٹ کر لے گئے تھے' بلکہ وہ میرا وقار لوٹ کر گئے تھے۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ

ذلت تو کہیں سے بھی، کبھی بھی مل سکتی ہے۔ یہ تو عزت ہے، جو ہر ایک سے، ہر جگہ سے نہیں ملتی ہے۔ اور محبت... اور عادل ... جس کا ہاتھ ہاتھ میں تو آتا لیکن گال تک نہیں...

☼ ☼ ☼

پاپا اور میں عادل کو اطلاع دیے بغیر پاکستان اس کے گاؤں گئے تھے۔ عادل گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ گاؤں میں کوئی ڈسپنسری بنوا رہا تھا' وہ وہیں تھا۔ گھر کا ایک ملازم مجھے وہاں تک لے گیا تھا۔ ڈسپنسری کی تعمیر سے کچھ فاصلے پر وہ ایک ٹیوب ویل کے پاس بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا۔

جس وقت میں اس کے پاس جا کر کھڑی ہوئی' اس نے سر اٹھا کر ایسے دیکھا کہ جیسے اسے گمان تھا کہ وہاں میں ہوں' لیکن اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا گمان سچ بھی ہو سکتا ہے۔ حیرت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی۔ اسی حیرت نے اسے خاموش کر دیا۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکا۔

میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی اور اسی کی طرح میں نے بھی اپنے پاؤں پانی میں ڈال لیے۔ وہ ابھی بھی خاموش تھا۔ وہ میری طرف دیکھنے سے بھی کترا رہا تھا' شاید اسے یہ لگ رہا تھا کہ میں کوئی خواب ہوں جو اس کے بات کرنے سے ٹوٹ جائے گا۔

اس وقت اس کے ساتھ اس گاؤں' اس جگہ بیٹھے مجھے شدت سے یہ احساس ہوا کہ اس پوری دنیا میں عادل ایک صرف میرے بغیر کتنا اکیلا اور تنہا تھا۔ اس کے سامنے لہلہاتے سارے کھیت در اصل کس قدر بنجر تھے۔ عادل کی آنکھوں کی ویرانی' اس کے وجود میں نمایاں کرب کے گہرے سائے اسے کس قدر بدصورت بنا چکے تھے۔ ایک صرف میرے لیے... ایک صرف میرے لیے... وہ شخص میرے لیے خود کو ویران کیے ہوئے تھا۔ ایسا پہلی بار ہوا کہ اسے ایسے دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے اس کی اذیت کو پورے دل سے محسوس کیا... میں نے جان لیا کہ وہ تو صرف مجھ سے محبت کرتا تھا... ایسی محبت' جس پر اس کا اپنا کوئی اختیار نہیں تھا۔

"میں تم سے محبت نہیں کرتی عادل... لیکن کیا تم اتنا وقت میرے ساتھ رہ سکتے ہو کہ مجھے تم سے محبت ہو جائے... زیادہ نہیں' بس اتنا ہی..."

اس نے کتنی ہی دیر تک بے یقینی سے مجھے دیکھا۔

"کیا تم نے محبت کا لفظ استعمال کیا مشعل؟"

"ہاں وہی "حرف محبت" جو تم سے سیکھا ہے۔"

"جو تمہیں سکھا دیا ہے' وہ میں خود بھول گیا ہوں مشعل۔" اس نے کہا اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ کے نیچے سے نکال لیا۔ میں نے اسے دیکھا۔ ہاں وہ ٹھیک کہہ رہا تھا' وہ بھول سکتا تھا۔ کائنات میں ایسا کیا ہے' جو ہمیشہ ایک ہی جگہ قائم رہتا ہے۔ وہ کیا ہے' جس میں تبدیلی وقوع پذیر نہیں۔ محبت اپنے وجود میں کتنی بھی کامل کیوں نہ ہو' کہیں نہ کہیں ڈگمگا ہی جاتی ہے۔ پھر محبت اپنے اندر غیرت بھی رکھتی ہے' جب اسے مسلسل ذلیل کیا جائے' تو یہ غیرت جاگ اٹھتی ہے۔

"میں نے آنے میں دیر کر دی نا عادل؟"

"واپس لوٹ جاؤ مشعل..." پہلی بار مجھے اس تکلیف کا احساس ہوا جس تکلیف سے ہر بار عادل گزرتا تھا' جب میں اس کی محبت کو اپنی جوتی کی نوک تلے مسل دیا کرتی تھی۔

"واپس لوٹ جاؤ۔" نے مجھے اس درد سے آشنا کیا جس درد کو عادل نے مسلسل جھیلا تھا۔ میں نے اسے تھکا دیا تھا۔ وہ یقین جو اسے اپنے جذبے پر تھا' وہ سرد ہو چکا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر پھر سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ یہ بھی تو میں نے عادل سے ہی سیکھا ہے کہ پتھر محبت سے کتنا ہی نا آشنا کیوں نہ ہو' آخر کار پگھل کر موم ہو ہی جاتا ہے۔

☼

رابعہ رحمان خان

آج وہ بہت زیادہ تھک گئی تھی' اس کے سر میں شدید درد تھا اور وہ سستی سی محسوس کر رہی تھی' اس نے آفس سے چھٹی لے کر گھر کی راہ لی۔ آج تو ویگن میں رش بھی نہیں تھا۔ پھر بھی بہت رینگ رینگ کر چل رہی تھی اور علینہ گرمی' تھکن اور سر درد سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا دل چاہا اس ڈرائیور کو اٹھا کر باہر پھینک دے اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی بھگا دے' مگر ہائے رے حسرت۔

اس کا ذہن ہی نہیں' دل بھی عجیب سا ہو رہا تھا' اسے رونا آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی تھی وہی باتیں جو دن رات اس کے دل و دماغ میں چلتی تھیں۔ بچوں کے نئے یونیفارمز' جوتے بھی لینے ہیں۔ حیا کا اسکول میں ایڈمیشن کروانا ہے۔ پھر آئزہ اور حسن کی ٹیوشن فیس' بجلی' گیس' ٹیلی فون اور پانی کے بلز کے ساتھ ساتھ فلیٹ کی قسط اف ف ف...." اس کے سر میں ٹیسیں سی اٹھنے لگیں۔ علی کی کم تنخواہ کا اسے پانچویں مہینے میں پچاسویں بار احساس ہوا تھا۔ وہ علی کا ہاتھ بٹانے ہی گھر سے نکلی تھی' لیکن حالات تھے کہ قابو سے باہر ہی ہوتے جا رہے تھے اور یہ تمام مسائل علینہ علی کے اپنے خریدے ہوئے تھے۔

ویگن ایک جھٹکے سے رکی' کچھ مسافر سوار ہوئے اور ویگن نے رینگنا شروع کیا۔ علینہ نے گھڑی دیکھی اور سوچنے لگی۔ ہاف لیو کا بھلا کیا فائدہ' گھر تو وہ اسی اپنے وقت پر پہنچے گی۔

"اے میں نے تو بہت سمجھایا کہ ساتھ رہو' ساتھ رہنے میں برکت ہے' اپنا گھر ہے' بلز وغیرہ میں سب ہی حصہ دیتے ہیں' تم پر زیادہ بوجھ نہیں ہے' لیکن نہ جی اسے تو اپنے گھر کا بھوت سوار تھا اب بھگتے۔" نئے

مسافروں میں ایک عورت جو تقریباً" پینتالیس 'پچاس کے پیٹے میں تھی۔ زور و شور سے بول رہی تھی۔ علینہ کو ناگواری کا احساس ہوا۔ یہ بات وہ گھر میں بھی تو ..... کرسکتی تھیں۔ دوسری عورت جوان ہی کی ہم عمر تھی اور بھی تیز آواز میں بولی۔

"ساتھ رہنے سے کم از کم یہ فکر تو نہیں ہوتی کہ بچے بھوکے رہیں گے۔ اگر ہر کوئی اپنی روٹی کا ایک ایک نوالہ دے 'تب بھی پیٹ بھر جائے۔"

"اف... کیا بھونڈی مثال دی ہے۔" علینہ پہلو بدل کر رہ گئی۔

"ہاں... ہاں.... اب دیکھو ساتھ رہو تو بچوں کو دادی 'نانی وغیرہ سنبھال لیتی ہیں اور سب سے اہم بات جس طرح آج کل کے بچے بگڑ رہے ہیں 'اس میں زیادہ ہاتھ اس اکیلے پن کا ہے۔ ماں 'باپ چوبیس گھنٹے ان کے سروں پر تو نہیں کھڑے رہ سکتے' نہ گھر میں دادی ' نانی ' پھوپھیاں اور تایا اور کزنز وغیرہ ہوں تو بھی نظر رکھنا آسان ہوتا ہے۔ جب بچے بڑے ہو جائیں 'اچھا برا سمجھنے لگیں 'تب بھلے الگ ہو جائیں۔" علینہ کھول کر رہ گئی۔

علی نے بھی تو یہی کہا تھا کہ بچے ذرا بڑے ہو جائیں ' تب تک ہم بھی سیونگ کرلیں گے۔ پھر الگ ہو جائیں گے۔ لیکن علینہ کو وہ سب یاد آ گیا جب وہ بھری دوپہر میں بیٹھی کے مزے لے رہی تھی۔ دیورانی ندا جو اچھی خاصی سلجھی ہوئی 'پڑھی لکھی لڑکی تھی اور گھر کے تمام بچوں کو بہت پیار سے پڑھاتی تھی 'اس کے بیٹے حسن کا کان پکڑ کر لائی۔ دروازہ بجایا اور اندر آ گئی۔

"بھابھی اس پر نظر رکھا کریں۔ یہ میرے کمرے کے ٹیرس پر چڑھ کر حیات انکل کے گھر میں لگے ہوئے درخت سے پھل توڑ رہا تھا۔ یہی تو عمر ہے اچھا برا سیکھنے کی۔"

"تم میرے بیٹے پر الزام لگا رہی ہو۔ صاف کہہ دو کہ ندا کیا کرے تمہارے گھر سے میں۔" علینہ نے وہ

دہائیاں دیں کہ الامان الحفیظ یہ چھوٹی سی بات اتنی بڑھی کہ علینہ کا برسوں پرانا "اپنے گھر" کا خواب پورا ہو گیا۔ ندا کے ساتھ ہی علینہ کو پھر سے حسن اور آئمہ کی ٹیوشن فیس یاد آ گئی۔

اسے یاد آ رہا تھا الگ گھر کی بات سن کر علی نے کہا تھا۔

"دیکھو علینہ! میری سیلری صرف پندرہ ہزار ہے اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ گھر میں خرچ کے لیے سب سے کم رقم میں دیتا ہوں۔ دیکھو اگر میں چھ ہزار دے بھی دیتا ہوں تو بھی میرے پاس نو ہزار بچتے ہیں جو ہمارے لیے بہت ہیں اور الگ ہونے کی صورت میں مجھے گھر کا کرایہ 'یوٹیلٹی بلز' بچوں کی اسکول فیس ' ٹیوشن فیس سب دیکھنا پڑے گا' میں کیسے کروں گا۔ وہ بھی ہنگامی صورت حال میں 'تم بس کچھ عرصہ صبر کرلو۔" مگر علینہ کی یہی رٹ کہ الگ ہونا ہے 'بس اس نے حل بھی نکال لیا کہ زیور بیچ کر اور تھوڑی بہت جو بچت ہے اس سے فلیٹ کی بکنگ کروا لیتے ہیں اور قسطیں وہ خود دے گی نوکری کر کے۔ آخر علی کو ماننے ہی بنی۔

اپنے اسٹاپ پر نظر پڑتے ہی علینہ کے چہرے پر چمک سی آ گئی۔ اس نے دیکھا وہ دونوں عورتیں 'بس میں نہیں تھیں۔ وہ شاید انہیں بس میں نہ دیکھ کر اچھا محسوس کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں 'وہ خود بھی اتری ڈرائیور کو ہزاروں دعائیں دے کر کہ شام سے پہلے منزل پر اتار گیا' ورنہ وہ سمجھ رہی تھی کہ رات تو ہو جائے گی 'ایک کونے پر آفس تھا شہر کے تو دوسرے کونے پر اس کا گھر۔ وہ گھر کی طرف چل دی' راستے میں بھی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ مشکل اور کڑا وقت بھی آخر گزر جائے گا۔ وہ اور اس کے بچے کم از کم اپنی مرضی کی زندگی تو گزار رہے ہیں۔

وہ بچوں کے لیے خوش تھی کہ یہاں اب ان پر روک ٹوک کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہی سوچتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی گھر میں آ گئی۔ ایک

اضافی چابی ہمیشہ وہ پڑوس میں دے جاتی تھی۔ حیا کو بھی پڑوس کی زاہدہ باجی سنبھال لیتی تھیں جو ریٹائرڈ ٹیچر تھیں۔ آئرہ اور حسن اسکول سے آکر گھر چلے جاتے۔ کھانا بنا ہوا ہوتا تھا' روٹیاں بھی وہ صبح ہی ہاٹ پاٹ میں رکھ دیتی تھی' لیکن بچے اکثر و بیشتر لنچ اسکول میں ہی کرلیا کرتے تھے۔

وہ پہلے زاہدہ باجی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد زاہدہ باجی نے دروازہ کھول کر بتایا۔ آئرہ اور حسن' حیا کو لے گئے کہ اسے بھی ساتھ کھلانا ہے۔ باجی نے اسے اندر آنے کی دعوت دی۔ لیکن اس نے مسکرا کر رد کردی اور اپنے گھر آگئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بچوں کے کمرے سے آوازیں آرہی تھیں۔

وہ آگے بڑھنے لگی کہ اس کی نظر ٹی وی لاؤنج میں تیز آواز میں چلتے ہوئے ٹی وی پر پڑی۔ وہاں نہایت واہیات گانا چل رہا تھا اور دائیں طرف رہنے والی دیا جو حیا کو ساتھ بٹھا کر آنکھیں اور منہ پوری طرح کھولے گانا دیکھنے میں مگن تھی' وہ حیرت سے گنگ کچھ کہہ بھی نہ سکی اور آگے بڑھی۔

آگے کا منظر اور آوازیں اس کے دماغ کو سنسنانے لگے۔ یہی لمحہ آگہی کا تھا۔ وہ بت بنی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی معصوم بیٹی آئرہ جو کلاس فورتھ کی اسٹوڈنٹ تھی کی گود میں حیا کی ڈول تھی جو علینہ نے پچھلے مہینے ہی لاکر دی تھی اور حسن کو فرسٹ ایڈ باکس دلایا تھا اور اب وہ ڈاکٹر بنا بیٹھا تھا۔

آئرہ کے ساتھ دیا کا بھائی احمد تھا اور حسن احمد سے کہہ رہا تھا۔

"مسٹر احمد! آپ کی مسز ماں بننے والی ہیں اور اتنی جلدی دوسرا بے بی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔" حسن یوں بولا تھا جیسے یہ روز کا معمول ہو اور اس کے ذہن میں اس کی ماں کا کہا جملہ ہتھوڑے برسا رہا تھا۔

"علینہ! تم خود تو یہ واہیات ڈرامے دیکھتی ہو جن میں یہی باتیں ہوتی ہیں اور ساتھ معصوموں کو بھی بٹھا لیتی ہو۔" اس وقت اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"امی! یہ تو بچے ہیں' انہیں کیا سمجھ۔" پھر اس آواز پر ساس کی آواز بھاری پڑ گئی' جو کہہ رہی تھیں۔

"جب بچوں کے ہاتھ میں ریموٹ دے دو تو پھر ان کے بگڑنے کے لیے تیار رہو۔" وہ دروازے میں ہی کھڑی تھی جب بچوں کی نظر اس پر پڑی' وہ اس کی طرف بھاگے آئے۔

"ماما آگئی ہیں۔ حیا دیکھو آج جلدی آگئیں۔" وہ چپ رہی احمد اور دیا جا چکے تھے۔ حیا' آئرہ اور حسن پریشانی کے عالم میں ماں کے پاس ہی بیٹھے تھے۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ ماں پریشان ہے' لیکن یہ نہیں کہ کیوں پریشان ہے' ان کی نظر میں یہ کوئی برا عمل نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ان کے گھر میں یہ آوازیں نہ گونجتیں۔

علینہ اٹھی اور علی کا نمبر ڈائل کیا۔

"علی! پلیز جتنی جلدی ہو سکے گھر آجائیں۔" اور کوئی بھی بات سنے بغیر فون بند کردیا اور گھنٹے میں وہ دونوں ساتھ تھے اور اس پر بات کررہے تھے۔ علی نرمی سے علینہ سے کہہ رہے تھے۔

"علینہ! اس گھر میں اب بھی ہماری اتنی ہی عزت ہے جتنی پہلے تھی۔ ہمیں اپنے بچوں کی اخلاقی تربیت بھی کرنی ہے' بچوں کو صرف اعلا کپڑے' اچھی خوراک اور مہنگے اسکولز میں داخلہ دلوا دینا ان کا حق نہیں ہے' بلکہ انہیں وقت دینا' پیار اور توجہ دینا' انہیں اپنے عمل سے بڑوں کی عزت سکھانا بھی ہمارا فرض اور ان کا حق ہے۔ یہ بات میں بہت عرصے سے تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں' لیکن خیر تم سمجھ گئیں' بہت ہے' کیونکہ تم جانتی ہو میں تم پر سختی نہیں کرسکتا۔" آخر میں علی کا انداز شرارتی ہو گیا تھا۔

"علی پلیز۔ مجھے معاف کردیں' مجھے نہیں رہنا الگ' مجھے اپنی خالہ کے پاس جانا ہے۔"

"اب آئی ہے نا خالہ کی یاد' چلو کیا یاد کرو گی' یہ خالہ کا بیٹا تمہیں تمہاری خالہ کے پاس لے جائے گا۔" علی گھر فون کرنے کے لیے اٹھا کہ امی کو خوش خبری سنا سکے کہ ان کی لاڈلی بھانجی پلس بہو راہ راست پر آگئی ہے۔ اور علینہ مسکراتی ہوئی بچوں کے کمرے کی طرف بڑھی۔ ان کا خوف اور پریشانی ختم کرنے کے لیے جو علینہ کی کیفیت کی وجہ سے بچوں کے چہروں پر چھا گئی تھی۔

☆☆

کنیز نبوی

ماروی جو محبت کا استعارہ ہے۔

ماروی جو ندائے محبت ہے۔

ماروی اپنے دوستوں شمع اور عبداللہ کے ساتھ گاؤں اپنی ماں سے ملنے آرہی ہے۔ اسے راستے میں اغوا کرلیا جاتا ہے۔

ماروی کو پڑھنے کا بہت شوق ہے' اس کا باپ پاندھی جو ایک چرواہا ہے اسے پڑھانا چاہتا ہے' اور اپنے دوست ساجن سندھی کو اس کو پڑھانے کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ ساجن سندھی کا بیٹا کھیت اور ماروی ساتھ پڑھتے ہیں۔ پاندھی اور ساجن ان دونوں کا رشتہ طے کردیتے ہیں۔ دونوں میں بہت محبت ہے۔

کھیت اسکول میں بچوں کو پڑھانے لگتا ہے اور ماروی آگے پڑھنے کے لیے جام شورو یونی ورسٹی میں داخلہ لے لیتی ہے' جہاں اس کی دوستی شمع سے ہوتی ہے جو کہ شہر کی رہنے والی ہے۔

یونیورسٹی میں ماروی کا سامنا اپنے گاؤں کے وڈیرے کے بیٹے عمر سومرو سے ہوتا ہے۔ ماروی اسے خاطر میں نہیں لاتی۔

عمر سومرو' شمع اور عبداللہ پر احسان کرکے ان کے ذریعے ماروی کو اغوا کروالیتا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

کچھ ہی دیر بعد ایک جیپ آکر ماروی ہاسٹل کے گیٹ پر رکی ' ساجن سندھی نے گیٹ پر پڑے اپنے کھیت کو اٹھایا ' جیپ میں لاکر بٹھایا اس کا حلیہ ' دھول سے اٹے ہوئے سوجے سوجے ننگے پاؤں ساجن سندھی آبدیدہ ہوگیا ' جام شورو شہر سے چپل خرید کر جیپ میں آبیٹھا۔

"کھیت ! چپل پہن لے۔" کھیت خالی خالی ' نظروں سے باپ کو دیکھتا پھر اپنے پیر کو دیکھتا۔ پاگل کردینے والی رات ' اسے سب کچھ نئے سرے سے یاد آیا ہے۔ اس نے چپل جام شورو پل سے گزرتی جیپ کی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر دریائے سندھ میں پھینک دی اور باپ کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"مرد بن مرد ' بلی بھاڑے "بزدل" نہ بن۔" ساجن نے اپنے آنسوؤں پر ضبط کا بند باندھ کر اس کی پیٹھ تھپکی۔

چوکیدار کی زبانی سنی ہوئی عبداللہ کی کتھا پر اسے رہ رہ کے غصہ آرہا تھا ' اس کے اندر وہ نوجوانی والا انقلابی جاگ گیا تھا۔

"ہم کسی حال میں انہیں نہیں چھوڑیں گے۔ دل بڑا کر میرا بیٹا ! تمہارا باپ ابھی مرا نہیں۔" وہ عزم سے بولا۔

☼ ☼ ☼
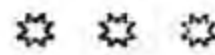
اس کی آنکھ کھلی تو پہلے پہل غنودگی اور نشے کی وجہ سے اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے ' وہ غائب دماغی سے ارد گرد دیکھنے لگی۔ اس کمرے کی خوب صورتی دل لبھانے والی تھی۔ اس نے ذہن پر زور دے کر یاد کیا اور اسے یاد آیا ' وہ ننگر پار کر اپنے گاؤں جارہی تھی اور بیچ میں کچھ آدمی گاڑی میں چڑھ آئے تھے۔ اس نے اپنی چنری کو پوری طاقت سے پکڑا تھا ' وہ چکراتے سر کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ اپنی چنری کو دیکھا ' جو اس کے سرہانے پڑی تھی۔ اس کے جسم پر وہی لباس۔ تھا اس کی ماں کے ہاتھ کا بنا ہوا گج جو بلیک

شرٹ لگا ہوا تھا اور سوسی کی شلوار جس کے پائنچوں پر اس کی ماں نے زری کی کڑھائی کی ہوئی تھی۔ اس نے بے چینی سے اپنے پائنچوں کو دیکھا۔ گج کو دیکھا ' چنری کو دیکھا ہے۔ بے تابی سے خود کو دیکھا اور جانچا۔

"تو ویسی ہی ہے جیسی تیری ماں نے تجھے جنا تھا۔" ماروی نے اس آواز پر سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے سامنے اس سے آٹھ دس سال بڑی عمر کی عورت کھڑی تھی۔ تھری چولی گھاگھرے میں ملبوس ' ناک کی پھننگ سے عین نیچے دونوں نتھنوں کے درمیان گول نتھ جھٹنا بولا پہننے والی ' تیکھے نقوش اور گندمی رنگ والی عورت۔

"تو عمر سائیں کی امانت ہے ' تمہیں ہوا بھی چھو نہیں سکتی۔" وہ بولی تو اس کا نتھ بار بار اس کے ہونٹوں سے ٹکراتا۔

"بھاڑ میں جائے تمہارا عمر سائیں۔" وہ تیزی سے شاہی بیڈ سے اتری۔ چکراتے سر کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازہ لاک تھا۔ ماروی نے پوری توانائی کے ساتھ ہینڈل گھمایا۔ ایک بار دو بار ' تین بار ——— مگر وہ قبر کا قفل کھل نہ سکا ' بار بار توانائی صرف کرنے پر ایک بار پھر اسے زور کا چکر آیا۔ وہ لڑکھڑائی اسے تھامنے کو تھری عورت آئی۔

"جہاں ہوا نہ چھو سکے وہاں قفل کیسے کھل سکتا ہے۔" چوڑے پہنی بانہوں نے اسے شانوں سے تھاما۔

"خدا کے لیے دروازہ کھول دو۔" وہ گڑگڑائی۔

"کوئی فائدہ نہیں۔ قفل ایک ہو تو کھلے۔ سارا محل "زنجیروں" میں جکڑا ہوا ہے۔" وہ تھری دیہاتی لہجے میں بولی۔

"میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں' پاؤں پڑتی ہوں۔" وہ گھگھیائی۔

"یہ ہاتھ عمر سائیں کے آگے جوڑنا۔ ہو سکتا ہے' اس کے ہاتھوں بچ جاؤ۔"

"توڑ نہ دوں اس کے ہاتھ۔" ماروی کو بے تحاشا غصہ آیا اس تھری عورت کے انداز پر۔

"یہ "فیصلہ" "وقت" کرے گا۔ کون کس کو توڑتا ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"تم میری ہی طرح کی عورت ہو۔"

"نہیں۔" اس تھری عورت نے ماروی کی بات بیچ میں کاٹی۔ "رانی اور رکھیل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم خوش قسمت ہو' رانی بن کر آئی ہو۔" وہ پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

"تمہیں خود پر رحم نہیں آتا۔"

"جسے اپنی ذات پر نہ آئے' اسے کسی پہ نہیں آتا۔ ہم بے اختیار ہیں اور رحم بااختیار ہی کر سکتے ہیں۔" وہ گہرائی سے بولی۔ "یہ عرضی تم عمر سائیں کے آگے رکھنا۔"

"ہرگز نہیں' رحم رحمان سے مانگوں گی' ظالم حکمران سے نہیں۔" ماروی اٹل عزم سے بولی۔

"یہ پی لو۔" اس نے خوب صورت ٹرے میں غیر ملکی جوس اس کے سامنے رکھے۔

"مجھے نہیں چاہئیں۔" وہ چاروں طرف دیکھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

"پی لوگی تو سر چکرانے سے جان چھوٹے گی۔"

"حرام کی کمائی کے حرام مشروبات مجھ پر حرام ہیں۔" وہ تھری عورت اس کے چڑنے پر زیر لب مسکرائی۔

اس کا مطلب تھا کہ عمر سومرو کو گالی دینے پر وہ خوش ہوئی تھی۔ ماروی کی ہمت بڑھی۔ وہ اٹھ کر کھڑکیاں جانچنے لگی۔ ان کی کنڈیاں بھی باہر سے بند تھیں' وہ ہال نما بیڈ روم جس میں اک کونے پر صوفہ سیٹ رکھے ہوئے تھے' دوسرے کونے میں بک شیلف میں کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ تیسرے کونے میں جھولا تھا۔ چوتھے کونے میں واش روم کا دروازہ تھا۔ عین وسط میں منعکس فانوس کے نیچے شاہی بیڈ پڑا تھا جس کی پائنتی کی جانب قد آدم ایل سی ڈی دیوار کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ اس کمرے کی تین دیواروں میں کھڑکیاں تھیں۔

اندر سے لاک باہر سے چٹخنیاں اور مضبوط گرل لگی ہوئی تھی' جس سے صرف انسانی ہاتھ ہی نکل سکتا تھا۔ پورا انسان نہیں' کھڑکی کے شیشے توڑ بھی دیے جاتے تب بھی مضبوط گرل کسی کو اندر آنے یا باہر جانے کا راستہ فراہم نہیں کر سکتی تھی' وہ تھک ہار کر ایک کونے میں قالین پر بیٹھ گئی۔

"تسلی ہو گئی۔" وہ تھری عورت مسکرائی۔ "یہاں سے باہر جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے باہر چوکیدار کھڑا ہے۔ کلاشنکوف لے کر' کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا یہاں' اس کمرے سے ہر وہ چیز اٹھائی گئی ہے' جس سے تمہیں یا عمر سائیں کو کوئی نقصان پہنچنے کا امکان ہو۔ دیکھو' تمہیں یہاں کوئی گلدان بھی نظر نہیں آئے گا۔" اس کی آنکھیں بات کرتے کرتے بند ہو رہی تھیں۔

"ساری رات تمہارے لیے جاگی ہوں۔ اب بے تحاشا نیند آرہی ہے۔" وہ وہیں قالین پر ڈھیر ہو گئی۔

"یہ بیڈ پھولوں سے سجایا گیا ہے' تمہارے لیے' جا اس پر سو جا۔ آرام کر لے' یہاں کیوں پڑی ہے۔" کہتے کہتے اسے نیند آگئی۔ وہ صدمے اور دکھ کی کیفیت میں گھر گئی تو ماروی بالآخر تم اغوا کرلی گئیں۔ پہلی بار آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ بیٹھے۔ اس محل نما کمرے میں خاموشی سے روتے' تب اس نے سوچا۔

کاش میں تھر کا کوئی تھوہر ہی ہوتی' کاش میں کوئی میٹھے پھل والی بیل ہوتی جس سے مارو اپنی بھوک مٹاتے۔ اس پاتال میں تو نہ گرتی' کوئی گھاس پھوس ہی ہوتی جس کو بھیڑ بکریاں چرتی رہتیں۔ کاش کوئی ککڑ

تھری درخت ۲۲ کا گوند ہی ہوتی جو کاغذ پر رکھ کر لوگ درد والی جگہ پر لگاتے درد رفع ہو جاتا)

اس کے آنسوؤں سے پورا چہرہ تر ہو گیا۔ اک ان تھکا کاش تھا جو اس کی سوچ کی زبان سے لپٹ گیا تھا۔

کاش میں ماروی نہ ہوتی۔ ماروی کے لیے طعنہ نہ بنتی' داغ نہ بنتی۔

"اے پروردگار میری لاج رکھنا۔" ماروی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں بہنے لگی۔ اس نے چنری مضبوطی سے سر کے گرد لپٹی اور سجدے میں گر گئی۔

"مولا مہربانی کر' تیری تدبیر ہر تدبیر سے بہتر ہے۔

تو اس ماروی "روح" کو اپنی حکمت "قرآن" سے اس ــــ "دنیا" کے فریب سے بچا۔ عمر "نفس" کی اندھی خواہشات اور پھوگ "ابلیس" کی چالوں سے محفوظ رکھ۔

اس بندی خانے میں سارے آسرے' ختم اک تیرا ہی آسرا ہے' تو ماروی کی لاج رکھ۔

وہ سجدے میں گڑگڑا رہی تھی' رو رہی تھی' اپنے خالق کے سامنے' جو دلوں کے بھید جانتا ہے' ذہن کی سوچوں سے آگاہ رہتا ہے۔

"اے مالک ماروی پر رحم کر۔"

☼ ☼ ☼

"ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔" ماروی بھی تو لوٹنا چاہتی تھی اپنی اصل کی طرف۔ "عالم ارواح" کی طرف' ماروی اس وحدانیت کی وادی کی تمنائی تھی جس کی جانب چل کر واحد تک پہنچنے کا آسرا تھا۔

"جو ہر وقت دل کو یاد ہے' اسے دل بھولتا نہیں' تب سے جب عہد الست کا انجام لیا۔ میں نے اقرار کیا تھا اسے ماننے کا۔

وہ رب کہ جس نے کسی کو جنا ہے' نہ کسی نے اس کو جنا ہے' نہ اس کے ماں باپ نہ اس کی اولاد۔ وہ اپنی ذات میں یکتا ہے۔

اسی رب کو یاد کرتے کرتے ماروی آج یا کل مر جائے گی' روح اس کی طرف پرواز کر جائے گی۔ یہ دنیا "اس" کی محبت کے سوا کچھ بھی تو نہیں۔ اس دنیا کی ساری دلفریبیاں اس کی محبت میں بہنے والے اک آنسو کے آگے ہیچ ہیں۔

اے ماروی اس کی یاد سے دل کا نگر سجا لے' اپنی آنکھوں میں اس کی یاد کی لالی لگا لے' اس دنیا میں مسافر بن کر رہ' کیوں کہ کوئی چیز اس کے مثل نہیں۔

ایک ہی دل "ایک" ہی کو دو
اپنی ترجیح اول اس ایک کو بنا دو
صرف اس ایک کو
اور لوٹ آؤ اپنی اصل کی طرف
ماروی اس دنیا کی محبت سے جان چھڑا

یہ پرفریب ہے
دیکھنے میں حسین
برتنے میں غمگین
دیکھنے میں میٹھی
چکھنے میں کڑوی۔ طلاق دے دے اس کو اور اپنی اصل کی طرف لوٹ' وعدہ وفا کر دے۔

☼ ☼ ☼

سرگوشیاں صفحہ اول کی سرخیاں بن کر تھر کے ریگستان پر رقم ہو گئیں۔ چہ مگوئیاں چاروں جانب اپنی چاپ چھوڑ گئیں۔ دس منہ دس باتیں' دن دیہاڑے دھوم دھام سے دھرنا مار کر ہر اک دل کو شک سے داغ دار کر گئیں۔

"ماروی بھاگ گئی۔ وڈیرے کے بیٹے کے ساتھ۔"

"کیوں نہ بھاگتی۔ کھیت کے پاس اسی کے لیے رکھا بنی کیا تھا۔"

"ارے مائی! وہ عقل مند تھی۔ اپنے لیے سکھ چن لیا' کیوں دکھوں میں جان جلاتی۔ غربت' بدحالی میں ہی مر جاتی' اچھا کیا اس نے۔"

"ہاں پڑھی لکھی تھی' اپنا راستہ خود بنا لیا۔ وہ اس

کے ساتھ ہی تو پڑھتا تھا۔"

بھیلوں کے ویڑھے سے اڑنے والی باتیں پورے گاؤں کے گرد گردش کرنے لگیں۔ چارپائی کے کونے سے لگی بھاگی کا بھاگ روٹھ گیا۔ ابھاگ لگ گیا۔

"میں کہتی تھی نا کہ کچھ ہو جائے گا' میری ماروی کے ساتھ۔" ماں تھی' دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا پر کوئی مانتا نہ تھا۔" وہ رو رو کر دہائی دیتی۔ "ارے میں تو اس کا نام ماروی رکھ کر پچھتائی۔"

"اری بھاگی! نہ رو' نہ رو' صبر کر۔" کھیت کی ماں نے شانے پر ہاتھ رکھ کر دلاسا دیا۔

"صبر نہیں ہوتا اَدی! صبر نہیں ہوتا' میرا دل جلتا ہے اک آگ ہے جو اندر لگی ہوئی ہے۔" رو رو کر اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ اس کے موروں نے سانپ مارنے چھوڑ دیے؟ سارے ویڑھے میں اداسی کے سانپ پھنکار رہے تھے۔ اس گھر کے اوپر قحط اُمڈ پڑا تھا۔ اڑتی ہوئی دھول نے ان کی عزت دھول میں ملا دی تھی۔ افواہیں' من گھڑت الزام بھیانک رقص کر کے پورے بھالوا گاؤں کو بھوتوں سے بھر رہے تھے اور پھوگ کی کتنی بھیلنی نے ماروی کے کردار کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔

ساجن سندھی ان طرح طرح کی افواہوں کے بیچ عزم نو سے کھڑا ہوا' اپنے اور اردگرد کے گاؤں کو ٹھوں کے جنگے مرسوں (گاؤں کی سطح کے لیڈر جن کے پیچھے گاؤں کی اکثریت ووٹ دیتی ہے) کی پنچائیت بلالی۔

دن ڈھلے سارے لوگ اکٹھے ہو کر ان چارپائیوں پر آکر بیٹھے جو سارے گاؤں سے اکٹھی کی گئی تھیں۔

"میرے بھائیو! آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ آپ کو کس وجہ سے یہاں آنے کی تکلیف دی گئی ہے۔ ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا گیا ہے۔ ارباب عمر سومرو نے ہماری ماروی کو اغوا کر لیا ہے' جب وہ اپنے دستوں کے ساتھ گاؤں آرہی تھی' اپنی ماں کی بیماری کا سن کے۔ یہ خبر ان ہی لوگوں نے دی ہیں اور بھائیو! ان دو دنوں میں کئی بار پولیس اسٹیشن پرچہ کٹوانے گیا' مگر وہاں موجود اہلکاروں نے یہ کہہ کر پرچہ کاٹنے سے انکار کیا کہ تم ہماری پیٹیاں اتروانا چاہتے ہو کیا۔ ہم غریبوں کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہو رہی' مجبور ہو کر میں نے آپ کو بلایا ہے۔" ساجن سندھی ان سب کو ساری حقیقت بتا رہا تھا۔

"بیٹیاں سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ سب کی عزت برابر ہوتی ہے' آج ہماری بیٹی اغوا ہوئی ہے' کل کلاں آپ میں سے بھی کسی اور کی ہو سکتی ہے۔ عمر سومرو پر پہلے بھی یہ الزام لگتا رہا ہے' مکران کے کارندوں اور منشیوں کے مطابق وہ لڑکیاں اپنی خوشی سے ان کے ڈیرے پر آتی ہیں' ہماری غلطی تھی کہ ہم نے کبھی بھی ان سے جا کر نہیں پوچھا کہ سودا رضا خوشی کا تھا یا زور زبردستی اور ظلم کا' اگر ہم تب ہی آواز اٹھاتے تو آج ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"تم صحیح کہہ رہے ہو ساجن' میں تمہارے ساتھ ہوں۔" اجرک کے پٹکے والے نے اٹھ کر اس کا کاندھا تھپکا۔

"مگر اس کا کیا ثبوت ہے کہ پاندھی کی بیٹی بے گناہ ہے' اس کی رضامندی شامل نہیں ہوا! اک بات سب یاد رکھیں' ارباب حاکم' وقت کا حاکم ہے۔ اس سے پنگا لینا' دشمنی مول لینا عقل مندی نہیں۔ پہلے ہمیں یہ یقین کرنا پڑے گا کہ ماروی واقعی اغوا ہوئی ہے یا خود چل کر گئی ہے۔" یہ نکتہ اٹھانے والا نارنجی پٹکے میں پھوگ کا جگری یار تھا۔

"میں اس کی ساکھ (گواہی) دیتا ہوں' وہ میری ماروی ہے' اپنی چادر (عزت) نہیں اتار سکتی۔" پاندھی' اجرک شانے پر رکھ کر چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو کر سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔

"تو تو باپ ہے۔ کون باپ اپنی بیٹی کی گواہی نہیں دے گا۔" نارنجی پٹکے والے بھیل برادری کے سردار نے پھر اعتراض کیا۔

"بھاؤ ساجن! ہم تمہارا ساتھ اس شرط پر دیں گے

کہ ماروی آکر اپنی سچائی کی گواہی خود دے گی۔ اس کے لیے یہ پنچائیت جو بھی شرط رکھے گی وہ آپ لوگوں کو ماننی پڑے گی۔" چتری کے پٹکے والے نے بیچ کا راستہ نکالا۔

"بھائی راحموں صحیح کہہ رہا ہے۔ کل کلاں کو ہم بھی ارباب حاکم سومرو کو کوئی جواز تو دے سکیں نا۔ ان پر انگلی اٹھانے کا۔" سندھی ٹوپی اور اجرک پہنے نہٹیا بولا۔

"مجھے آپ لوگوں کی یہ شرط منظور ہے۔" بخار میں تپتا کھیت اٹھ کھڑا ہوا۔

"کھیت۔" ساجن سندھی زیر لب بولا۔

"کھیت وہ تمہاری منگ ضرور ہے، مگر منکوحہ نہیں۔ کیوں بھاؤ پاندھی، تمہیں منظور ہے۔" بوسکی کی پگڑی باندھے لوند سردار بولا۔

"میری ماروی کل بھی کھیت کی تھی، آج بھی کھیت کی ہے اور کل کو بھی کھیت کی ہوگی۔ جو فیصلہ کھیت کا وہ ہم سب کا۔" پاندھی نے بات ہی ختم کر دی۔

"پھر ٹھیک یہی وقت ہمیں مل کر ارباب حاکم کے پاس چلنے کا۔" ساری برادری کے لیڈروں نے مل کر حکمت عملی بنائی۔ ساجن سندھی غور سے کھیت کو دیکھ رہا تھا جو خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ کیا کھیت کے دل میں بھی شک پڑ چکا ہے اس سوال کا جواب فی الحال اس کے پاس بھی نہیں تھا اور شاید کھیت کے پاس بھی نہیں۔

لوک داستان دُنیا میں ایک بار پھر اپنا لوہا منوانے میں لگی ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس قید خانے میں درد بھرا تیسرا سورج طلوع ہوا تھا۔ کچھ بھی نہ کھانے کی وجہ سے وہ نڈھال ہو چکی تھی۔ اس ٹھری عورت نے زبردستی اسے دوبار چائے پلائی تھی اور اک بار زبردستی چند نوالے اس کے منہ میں ڈالے تھے۔ وہ بھی ماروی نے کچھ نگلا کچھ تھوکا۔ اس وقت بھی وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ ہر بار دروازہ کھلنے پر وہ باہر کی طرف لپکی تھی اور ہر بار وہ عورتیں پکڑ کر اسے کمرے میں گھسیٹتی تھیں۔

اس بار بھی وہ دروازے کی طرف لپکی تھی۔

"تم یہاں سے اس محل کے مالک کی اجازت کے بغیر نہیں جاسکتیں۔ یہ بات تم سمجھتی کیوں نہیں۔" وہ ٹھری عورت جو مائی وڈی تھی اس محل کی ساری ملازماؤں کی انچارج اس نے اک بار پھر اسے نرمی سے سمجھایا۔

"خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو۔" وہ اک بار پھر رو پڑی۔

"ماروی! تمہارا یہ رونا دھونا کسی کام کا نہیں یہاں تمہیں ہر چیز ہر خوشی مل سکتی ہے سوائے آزادی کے۔" مائی وڈی نے دوسری لڑکی سے کھانے کی ٹرے لی۔

"کچھ کھالو، اس طرح بھوکی رہ کر مر جاؤ گی۔" اس نے نوالہ اس کے منہ میں رکھا۔ ماروی نے تھوک دیا۔

"مر ہی تو جانا چاہتی ہوں، ایسی بے آبرو زندگی کا کیا فائدہ۔" آنسو تواتر کے ساتھ اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

"تو تو خوش قسمت ہے۔ اپنی خوش قسمتی پر ناز کر۔ تجھے تو پھولوں کی طرح رکھنے کو کہا ہے عمر سائیں نے، ورنہ یہاں تو جو ذرا سی اڑ جائے اسے سزاؤں سے سدھایا جاتا ہے تو پہلی اڑیل گھوڑی ہے۔ جو اس کے اصطبل میں ابھی تک آرام کر رہی ہے۔" مائی وڈی نے دوسرا نوالہ اس کے منہ کی طرف بڑھایا۔ ماروی نے منہ پھیر لیا، مائی وڈی نے اس کو جبڑوں سے پکڑ کر زبردستی نوالہ منہ میں رکھا۔ ماروی نے تھوکنے کی کوشش کی، مگر اس کے منہ پر مائی وڈی کا ہاتھ آگیا۔ نوالہ اگل نہیں پائی مجبوراً نگلنا پڑا تھا۔

"تو یہاں مرنے کے لیے نہیں، جینے کے لیے آئی ہے۔ کیوں خود کو ہلکان کرتی ہے؟"

"یہ جینا میرے لیے موت ہے، میں اپنے ماروؤں کے لیے داغ بن گئی۔" وہ گھٹنوں میں سر دے کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ مائی وڈی تھوڑی دیر اسے

دیکھتی رہی۔

"چل رو لے' دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔" اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک ملازمہ کامدانی، ہیرے جڑا عروسی جوڑا لے کر آئی۔

"اٹھ پہن لے ورنہ ہمیں زبردستی پہنانا بھی آتا ہے۔" مائی وڈی نے ماروی کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ مسلسل نفی میں سرہلا رہی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اس کی قوت مدافعت کمزور پڑ رہی ہے۔

"چل جا۔" مائی وڈی نے واش روم کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں' ہرگز نہیں۔" ماروی سختی سے بولی۔

"آرام سے زیر ہو جا۔" مائی وڈی مسکرائی۔

"میں اس کے لیے زہر بن جاؤں گی۔" ماروی کا لہجہ زہریلا ہوا۔

"وہ امرت سمجھ کر پی لے گا۔ تجھ سے محبت جو کرتا ہے ورنہ وہ کسی فتح کا جشن منانے میں دیر نہیں کرتا۔ ہمیشہ سے فاتح بن کر آتا ہے۔" مائی وڈی کا بولا' بار بار ہونٹوں سے ٹکراتا اور ہنسنے پر دانتوں سے۔ اس وقت بھی ہنس دی تھی۔

"اس کے فتح کرنے سے پہلے مجھے موت فتح کر لے گی۔ وہ اگر جیتنے والوں میں سے ہے تو ہارنے والوں میں سے میں بھی نہیں۔" اس نے مضبوطی سے چنری کو سر پر جمایا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سامنے دیکھا تھا۔ دروازے کے عین وسط میں عمر سومرو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"عمر سائیں! ہم نے بہت کہا' مگر یہ راضی نہیں ہو رہی جوڑا پہننے پر۔" مائی وڈی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر نظریں زمین پر جھکا کر عرض کی۔ ماروی نے دیکھا' دوسری لڑکی کا رنگ خوف سے زرد ہو گیا تھا۔ عمر سومرو مسکرا دیا۔

"نکاح کے لیے عروسی جوڑا شرط نہیں' ان پھٹے پرانے بوسیدہ کپڑوں میں بھی ہو سکتا ہے۔" عمر سومرو' ماروی کو دیکھتے بولا۔

"نکاح کے لیے رضا مندی' شرط اول ہے۔" ماروی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"میں تو دل و جان سے راضی ہوں۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر ہنس دیا۔

"نکاح کے لیے دونوں فریقین کی رضا مندی ضروری ہے۔" ماروی نے اک بار پھر سختی سے کہا۔

"تمہارے پاس رضا مندی کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں۔" وہ ہنس دیا۔

"میں کبھی بھی رضامند نہیں ہوں گی میرا انکار اقرار میں نہیں بدل سکتا عمر سومرو!"

"تمہاری مرضی ہے' پر حاصل تو تم مجھے ہر حال میں ہو اب۔" عمر سومرو نے انگلی سے اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی۔

ماروی نے ہاتھ مار کر اس کا ہاتھ دور کیا تھا۔ عمر سومرو استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔

"پنجرے میں چڑیا پھڑپھڑا رہی ہے۔" وہ زیر لب کہہ کر اپنے ہی جملے سے محظوظ ہوا۔ عمر نے اپنے ہاتھ کو دیکھا اور وہ ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔

"میں اپنا ہاتھ کبھی بھی تمہارے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔ یہ ہاتھ صرف اور صرف کھیت کا ہے' کھیت کا۔" ماروی نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے چنری تھامی۔ عمر سومرو بے تحاشا ہنسنے لگا۔

"کیا دے سکتا ہے' تمہیں تمہارا بنجر کھیت۔" عمر سومرو نے اس کا ہاتھ تھاما' ماروی بدک کر پیچھے ہٹی۔ جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

"مجھے حاصل ہو' ہاتھ چھڑا کر کیا کرو گی۔" عمر سومرو کو غصہ آیا۔ اس نے اس بار مضبوطی سے ماروی کی کلائی تھامی۔

"چھوڑو میرا ہاتھ۔" ماروی کی مزاحمت کمزور ہو رہی تھی۔

"آؤ میں تمہیں اپنا محل دکھاؤں۔ رانی بنا کر رکھوں گا۔" وہ اسے گھسیٹتا باہر نکلا۔

شیشوں سے منقش ہال جس کی دونوں اطراف سیڑھیاں، اوپر عین ہال کے نیچے چار فٹ کا فانوس جس میں سینکڑوں بتیاں روشن تھیں۔ وہ ہاتھ سے پکڑے اس کو اک اک کمرہ دکھاتا رہا۔ ہر کمرہ ایک سے بڑھ کر ایک، عمدہ تزئین و آرائش سے سجا تھا۔ عقل کو حیران کرنے کے لیے کافی تھے۔ وہ حتی المقدور اپنا ہاتھ اس سے چھڑانے کی کوشش میں ہلکان، کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ کوئی چیز اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"چلو آؤ، میں تمہیں جنت کا نظارہ کراؤں" عمر سومرو اسے گھسیٹتا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ماروی کے قدم عمر کے قدموں کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے، وہ گرتی پڑتی گھسٹتی جا رہی تھی۔

وہ اسے اوپر اک خوب صورت بیڈ روم میں لے آیا، اور شیشے کی دیواروں سے پردے ہٹا دیے۔ اس نے وہیں پر لگے ایک بٹن کو دبایا اور شیشے کے باہر بارش کا سماں بندھ گیا۔ گلاس ڈور سے پانی تیزی سے نیچے بہنے لگا۔ فوارے دور دور تک پانی پھینک رہے تھے۔ درختوں کے پتے بھیگ رہے تھے مصنوعی بارش شیشے سے باہر منظر کو حسین تر بنا رہی تھی۔

"یہ دیکھو! تھری ترستے ہیں نا بارش کے لیے۔" وہ کہہ کر ہنسا۔ ماروی کو غور سے دیکھا، وہ صرف چند لمحوں کے لیے حیران ہوئی تھی۔

"یہ مصنوعی بارش بے فیض ہے۔ صرف آنکھوں کو سیراب کرنے والی، دھوکا ہے، فریب ہے۔ اس سے تھر اور تھریوں کو کوئی فائدہ نہیں۔" وہ تلخی سے ہنسی۔

عمر سومرو جو محویت سے یہ حسین منظر دیکھ رہا تھا پلٹ کر ماروی کو دیکھا۔ وہ تمسخرانہ انداز میں اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ عمر سومرو کو بے تحاشا غصہ آیا۔ وہ کسی بات سے متاثر نہیں ہو رہی تھی۔

"اچھا آؤ! میں تمہیں اصلی مناظر دکھاتا ہوں۔" وہ ماروی کی طرف بڑھا۔

"ہاتھ مت پکڑو میرا میں تمہارے پیچھے چل رہی ہوں۔" ماروی دو قدم پیچھے ہٹی۔

عمر سومرو اس کے انداز پر ہنس دیا۔ "آ رہی ہو آہستہ آہستہ رستے پر۔" ماروی اس کا یہ جملہ پی گئی۔ وہ اسے لے کر دوسری طرف سے ٹیرس پر آیا۔

"یہ سو ایکڑ پر میرا آموں کا باغ ہے، ہر جنس کا آم اس میں ہے۔" منظر واقعی حقیقی اور دلکش تھا۔ قطار در قطار دور تک پھیلے ہوئے آم کے درخت، منظم طریقے سے لگائے گئے تھے۔

"بہت خوب ہے تمہارا یہ باغ عمر سومرو، مگر میری نظر میں کوڑ کے درخت زیادہ حسین ہیں کہ جب میرے مارو بکریاں چراتے ہیں تو بھوک اور پیاس مٹانے کو "لال پھول" کا شہد ایسا میٹھا پانی چوستے ہیں، پھل پکنے پر کھاتے ہیں، صبح سویرے اس کی مسواک کرتے ہیں۔" اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سارے مناظر پوری آب و تاب سے آموجود ہوئے۔ "جب پیاس سے ہلکان مارو، چرواہے رس چوستے تو ان کے تھکے ماندے جسموں میں جیسے جان واپس آجاتی تھی۔"

عمر سومرو اس کی اس بات پر طنزیہ ہنسا۔ "پھلوں کے بادشاہ کو تم ان جنگلی جانوروں کے بدذائقہ کھانے سے ملا رہی ہو۔ ماروی! تم واقعی بہت ہی بھولی بھالی ہو یا بے وقوف۔" عمر سومرو نے کہتے ہوئے اپنے مسلسل بجنے والے فون کو دیکھا اس کے سیل پر بار بار کال آ رہی تھی، مگر وہ اٹھا نہیں رہا تھا۔

"تب ہی تو کہتی ہوں عمر سومرو! تمہارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ ماروی اور مادیت کا میل ممکن نہیں، مجھے آزاد کر دو۔" ماروی نے پہلی بار نرم لہجے میں کہا۔

"اتنی مشکل سے ہاتھ لگی ہو، کیسے چھوڑ دوں۔ آج ہمارا نکاح ہے ماروی۔ حالانکہ مجھے اس نکاح سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نکاح میں صرف تمہارے اطمینان کے لیے کر رہا ہوں۔" اس نے احسان جتلایا۔ ماروی نے آنکھیں موند کر دکھ نگلا۔

"یہ ظلم ہے عمر سومرو! ظلم۔" وہ اُنگلیوں رنج سے سرہلاتے بولی۔ عمر سومرو ——— اس بار ہنس دیا تھا۔
اس کا فون پھر بجنے لگا۔ اس بار بھی اس نے کال کاٹ دی۔ وہ راہداری کا لمبا فاصلہ طے کر کے اس کے ساتھ پچھلی طرف آئی۔ کھجور کے باغات آنکھوں کو تراوٹ بخش رہے تھے۔
"کیسا ہے یہ خوب صورت منظر؟" عمر نے ماروی کو دیکھا۔
"یہ بھی حسین ہے مگر اس سے حسین سنگر کا درخت، جو مارو میرے قحط زدہ لوگ چلتے چلتے جس کی پھلیاں کچی بھی کھاتے ہیں اور توے پر سینک کر بھی۔" عمر سومرو قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ماروی کی آنکھوں میں اس بے بسی پر نمی تیرنے لگی۔
"بھوکے لوگوں کی بھوک کا مذاق مت اڑاؤ عمر سومرو! بعض دفعہ رب صرف اس پاداش میں نعمتیں چھین لیتا ہے۔" ماروی اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے بولی۔
وہ دوسری طرف سے نیچے اتر آیا۔ پھولوں کے باغ میں جہاں ہر طرح کے پھولوں کے پودے اور درخت تھے، وہ باغ بہت ہی خوب صورت تھا اور یہ منظر دل لبھانے والا، کچھ دیر کو ماروی بھی مبہوت ہوئی۔
وہ ان کیاریوں کے بیچ سبزے کے قالین پر چلتے رہے۔ فارم ہاؤس کے سامنے آکر حوض پر کھڑے ہو گئے۔ مصنوعی پہاڑ سے بنی آبشار کا پانی اس چشمے میں گر رہا تھا۔ یہ منظر بھی دل لبھانے والا تھا مگر آگے بھی ماروی تھی جو کہتی تھی۔ "جھونپڑوں کی محبت محلاتوں کے بدلے نہیں دوں گی۔"
عمر سومرو کے ہاتھ میں سیل اب بھی بج رہا تھا۔ اس کی کلائی میں بندھی سونے کی گھڑی جس پر ہیرے لگے ہوئے تھے۔ بوسکی کے لباس میں ملبوس وہ کسی بھی لڑکی کا دل جیت سکنے کی پوری شناخت رکھنے والا، صرف ماروی کا ہی دل نہیں جیت پا رہا تھا۔ وہ اس کو لے کر روش پر چلتا ہوا اندر کی جانب بڑھا۔

"سائیں بادشاہ، عمر سائیں!" پھوگ چیختا ہوا اس کے پیچھے لپکا۔
"کیا ہوا، آج ہماری خوشی کے دن تمہیں موت آرہی ہے۔ مولوی منشب، کہاں ہے؟"
"وہ نہیں لا سکا۔"
"کیوں؟" عمر سومرو نے پھوگ کو گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑا۔
"سائیں کیسے لاتا، بڑے سرکار آپ کو مسلسل فون کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے خاص آدمی آپ کو لینے کے لیے بھیج دیے ہیں۔"
"خیریت؟" اس نے جھٹکا دے کر پھوگ کا گریبان چھوڑا۔ پھوگ نفی میں سرہلانے لگا۔
عمر نے پلٹ کر ماروی کو دیکھا جو آسمان کی طرف تشکر بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔
"یہاں چاروں طرف چوکیاں بنی ہوئی ہیں، بھول کر بھی باہر جانے کی غلطی نہ کرنا۔" عمر نے ماروی کا ہاتھ پکڑ کر اندر کیا۔ اس بار بھی اس نے مزاحمت کی۔ عمر سومرو نے اس کی مزاحمت کو نظرانداز کر دیا۔
"مائی وڈی!" وہ دھاڑا۔
"حاضر سرکار۔" مائی وڈی دونوں ہاتھ باندھ کر دوڑتی آئی۔
"یہ آج سے میری ملکہ ہے، اسے ہر طرف آنے جانے کی اجازت ہے سوائے باہر نکلنے کے، مگر اس کو رتی برابر بھی نقصان پہنچا تو میں تم سب کو زندہ گاڑ دوں گا۔ سمجھیں تم۔"
"حاضر سرکار، حاضر۔" مائی وڈی تھر تھر کانپنے لگی۔
"لے جاؤ اسے اندر۔" ماروی اس کے ساتھ کمرے میں جانے لگی۔ عمر سومرو نے باورچی کو بلا کر تاکید کی کہ ——— انواع و اقسام کے کھانوں سے ٹیبل بھر دیا کرے۔
"چلو پھوگ۔"
"پا سائیں کو ایسا کیا کام آن پڑا ہے۔"
"سائیں بادشاہ! برادریوں کی پنچایت آبیٹھی ہے۔"

بڑے سرکار کے پاس ماروی کے لیے۔" ڈرائیونگ کرتے پھوگ نے آگاہ کیا۔

"تب ہی میں نے کہا آپ یہاں سے نکل چلیں کہیں وہ بندے یہاں نہ آجائیں۔"

☆ ☆ ☆

ارباب حاکم سومرو کی اوطاق ——— میں تین گھنٹوں سے پنچایت بیٹھی ہوئی تھی۔ ماحول میں عجیب سا تناؤ تھا۔ بہت بڑے سردار کے اوپر بہت بڑا الزام تھا اور پنچایت کے بہت سے لوگ ابھی تک شش و پنج میں تھے۔ ارباب حاکم سومرو نے الزامات رد کردیے تھے اور اپنے بیٹے کو پنچایت کے آگے پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اور سارے الزامات اور تردید کے بعد پنچایت عمر سومرو کا انتظار کررہی تھی۔ عمر سومرو' ارباب حاکم کا فون نہیں اٹھا رہا تھا۔ مجبورا" ارباب حاکم نے اپنے خاص کمدار خمیسو کو عمر سومرو کو لانے کے لیے بھیجا۔ خمیسو نے اپنے بیٹے پھوگ کو فون کیا' پھوگ نے فورا" پہنچنے کا یقین دلایا تھا۔

ارباب حاکم سومرو سخت پریشانی کے عالم میں تھا۔ یہ اس کی سیاسی زندگی میں پہلی بار ہوا تھا کہ وہ الیکشن کے دنوں میں اتنے دباؤ میں تھا۔ یہ بہت بڑا الزام تھا اگر واقعی عمر نے یہ غلطی کی ہے تو اس بار الیکشن جیتنے کا امکان ختم ہورہا تھا۔ پنچایت یہ چند برادریاں جن کا ووٹ بینک بہت اہمیت رکھتا تھا اس وقت — موجود تھیں۔

چائے پانی اور کھانے کے بے تحاشا اصرار کے باوجود ساجن پاندھی اور کھیت نے کچھ بھی کھانے سے انکار کردیا تھا۔ ارباب حاکم نے اک بار پھر پنچایت سے کہا۔

"جب تک عمر شکار سے واپس آئے تب تک آپ لوگ مہربانی کرکے کھانا کھالیں۔ میری اوطاق پر بھوکے بیٹھے ہیں۔ یہ بات مجھے گوارا نہیں۔" ارباب حاکم کا لہجہ منت بھرا تھا اور صرف الیکشن کے دنوں میں ہی اتنا نرم ہوتا تھا۔

"ارباب سائیں! ہمیں کوئی اعتراض نہیں' آپ کی مہمان نوازی پر' اگر ساجن بھی دو چار نوالے' لے لے۔" راھموں برادری کے ایک فرد نے کہا۔

"ارباب حاکم کا نمک پانی پیٹ میں چلا گیا تو پھر ہم اس سے کبھی سر اٹھا کے بات نہیں کرسکیں گے' یہ نمک حرامی ہمیں قبول نہیں۔ باقی آپ لوگ کھانا چاہیں تو سو بسم اللہ" ساجن نے اپنی روایت کے مطابق جواب دیا۔

"نہیں پھر ہم بھی نہیں کھائیں گے۔" پنچایت کے سارے لوگوں نے انکار کردیا۔

"السلام علیکم!" عمر سومرو اندر داخل ہوا۔

"حاضر بابا سائیں! آپ نے مجھے بلایا۔" عمر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھک کر کہا اور باری باری سب سے ہاتھ ملانے لگا۔ ساجن اور پاندھی نے اس سے بے دلی سے ہاتھ ملایا۔ سب کے ساتھ کھیت بھی کھڑا ہوگیا تھا' مگر جیسے ہی عمر سومرو نے اس سے ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ کھیت نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ہاتھ عزت کے رکھوالوں سے ملایا جاتا ہے' لٹیروں سے نہیں۔" اس کے کڑک لہجے سے نفرت چھن چھن کے نکلتی تھی۔

"میں سمجھا نہیں کیا مطلب ہے آپ کا" عمر اپنے لہجے اور انداز میں حیرانی بھر کر بولا۔

"بابا سائیں' یہ لوگ الیکشن میں ہم سے تعاون کی یقین دہانی کرانے آئے ہیں نا! ہمیشہ ووٹوں میں یہ برادریاں ہمارے ساتھ ہوتی ہیں۔" عمر بات کرتا صوفے پر باپ کے ساتھ آبیٹھا۔

"کھڑے ہوجاؤ عمر۔"

"جی' حاضر بابا سائیں۔" عمر مستعدی سے کھڑا ہوگیا۔

"ماروی کو تم نے اغوا کیا ہے۔ یہ پنچایت اس لیے آئی ہے۔" ارباب حاکم کڑک آواز میں بولے۔

"اللہ کی پناہ' بابا سائیں کیسی باتیں کررہے ہیں۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا۔" عمر نے حیرانی کی انتہا کردی۔

"ان کا کہنا ہے کہ میرپور خاص روڈ پر جب ماروی اپنے گاؤں اپنے کلاس فیلو عبداللہ اور شمع کے ساتھ آرہی تھی تو اسے اغوا کرلیا گیا۔"

"یہ کب کی بات ہے۔" عمر سومرو نے استفسار کیا۔

"تین دن پہلے کی۔"

"بابا سائیں! میں تو ان تینوں دن آپ کے ساتھ رہا ہوں۔ کارنر میٹنگز میں' کہیں گیا ہی نہیں۔ آج گیا ہوں شکار پر' وہ بھی ابوظہبی کے شیخوں کے بے حد اصرار پر۔ شام کو پھر کارنر میٹنگ ہے' ہمیں وہاں جانا ہے اور جو وقت اور دن یہ بتارہے ہیں اس دن تو ہم چانڈیہ برادری کی کارنر میٹنگ میں تھے۔" وہ فرفر بول رہا تھا۔

"بس کرو عمر سومرو' ایسے کالے دھندے تم اپنے کارندوں سے کرواتے ہو' خود نہیں۔ یہ پٹیاں کسی اور کو جاکر پڑھاؤ۔" کھیت نے کھڑے ہوکر اسے للکارا۔

"مگر میری کیا دشمنی ہوسکتی ہے' اپنے علاقے کے اک غریب چرواہے کی بیٹی کے ساتھ۔" عمر سومرو کا لہجہ حقارت آمیز ہوا۔

"ماروی نے تمہیں سرعام تھپڑ مارا' میرے سامنے تلور کے شکار سے منع کیا۔ تمہاری وڈیرانہ انا یہ بات برداشت نہیں کرسکی اور تم نے بدلہ لینے کے لیے اسے اغوا کروالیا۔" کھیت نے اک بار پھر کٹہرے میں کھڑا کردیا۔

"استغفار استغفار ہمارے سائیں کو تھپڑ توبہ توبہ۔" پھوگ جلدی جلدی بولا۔

"چپ کرو پھوگ۔" عمر نے پھوگ کو ڈانٹنے والے انداز میں کہا' پلٹ کر حاکم سومرو کو مخاطب کیا۔

"بابا سائیں! میں آپ کا بیٹا ہوں' اسی وقت اسے شوٹ کردیتا۔ یہ سراسر الزام ہے۔ باقی اس نے برابر مجھے شکار سے منع کیا تھا' میں واپس آگیا' کیونکہ ہماری روایت ہے کہ۔ علاقے کی ذیانی (بیٹی) کوئی عرض کرے تو ہم اس کی بات کا مان رکھتے ہیں' اس کو عزت دیتے ہیں۔ مجھے اگر اس بات پر غصہ آتا تو میں اس وقت ماروی کی بات کیوں مانتا بھلا' وہ میرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔"

"عمر سائیں کی باتوں میں وزن ہے۔" نارنجی پٹکے والا بھیل سردار بولا' پنچایت کے دوسرے لوگ بھی اس کی بات سے کچھ کچھ متفق لگ رہے تھے۔

"بابا سائیں! یہ ہمارے خلاف سازش ہے۔ ہمارے مخالفین کی طرف سے ہماری الیکشن مہم کو نقصان پہنچانے کے لیے۔ آپ لوگ خود بھی سمجھ دار ہیں' اول تو یہ حرکت کرہی نہیں سکتا' مگر بالفرض کر بھی لوں' تو کیا اپنے باپ کے الیکشن کے دنوں میں' اپنے باپ کے ووٹ بینک کو نقصان پہنچاؤں گا؟ کیا میں اتنا بے وقوف ہوں۔" عمر سومرو کی پٹاری سے بڑی مضبوط دلیل نکلی' سارے پنچایتی متفق ہوگئے۔

"بے وقوف تو آپ لوگوں نے عوام کو سمجھ رکھا ہے۔ آپ کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہ ساری برادریاں ہمارے ساتھ فریادی بن جائیں گی۔" کھیت نے اس کے سارے دلائل پر پانی پھیر دیا۔

"حاکم سائیں! ہم کیسے نہ آپ کے بیٹے پر شک کریں۔ عمر سومرو کا رشتہ ماروی کے لیے پھوگ لینے آیا تھا' میں نے جواب دے دیا کہ وہ بچپن سے کھیت کے ساتھ منسوب ہے اور اس کے بعد ہمیں کئی طرح کی دھمکیاں بھی ملیں۔" پاندھی بے بسی سے بولا۔

"ارباب حاکم میں! اک اک دروازے پر جاکر کہوں گا' جو عزتوں کے لٹیرے ہیں' انہیں ووٹ نہ دو' تھر ضرور قحط زدہ ہے' پر تھر کا سماج اتنا قحط زدہ نہیں کہ وہ تمہارے ظلم کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے۔ یہ سارا سماج تمہارے خلاف اٹھ کھڑا ہوگا' یہاں بڑے سماجی لوگ رہتے ہیں' جو ہماری آواز پر ہماری مدد کو پہنچیں گے۔ پورا تھر تمہارا مخالف ہوگا' اس الیکشن میں' وڈیرہ! اگر تم دو اپنے بیٹے کو' ہماری عزتیں اگر محفوظ نہیں' تو

تمہارے خلاف انقلاب میں لا کر دکھاؤں گا۔ مجھے قید کراؤ گے' تو پورا تھر تمہارے لیے قید خانہ ۔ جائے گا' اور مجھے قتل کراؤ گے' تو سارے تھر میں میری لاش جائے گی۔" ساجن سندھی کے اندر پرانا انقلابی زندہ ہو گیا تھا۔

"ٹھنڈا ہو ساجن! ٹھنڈا ہو۔ بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" لنڈ اور تھریا سردار آگے بڑھ کر' ساجن کو تھپکی دے کر بیٹھنے پر آمادہ کرنے لگے۔

"عمر سومرو جواب دو' کیا تم نے رشتہ مانگا تھا۔"

"نہیں بابا سائیں نہیں' میں دو بیٹیوں کا باپ ہوں' کوئی پاگل ہوں کہ پاندھی کی بیٹی کا رشتہ مانگوں' جو قسم و گواہی کہیں دینے کو تیار ہوں۔ پھوگ پاک کتاب لا۔" عمر سومرو نے جلدی سے پھوگ کو اشارہ کیا۔ پھوگ دوڑ کر جزدان میں لپٹی کتاب اٹھا لایا۔

"میں اس پاک کتاب پر ہاتھ رکھ کر گواہی دیتا ہوں' کہ میں نے ماروی کو اغوا نہیں کیا نہ ہی میں نے رشتہ مانگا۔" عمر کے اشارے پر پھوگ دوڑ کر' وہ کتاب اندر کمرے میں لے گیا۔

"کھول کر تو دیکھو' واقعی قرآن ہے' یا کوئی اور کتاب۔" کھیت نے تلخی سے کہا۔

"بس بابا! اتنی بے اعتمادی اچھی نہیں ہوتی۔" راھیموں سردار بولا۔

"یہ بھی پاک کتاب پر گواہی دینے کو تیار ہیں۔"

"بابا! قرآن کریم کو بار بار بیچ میں مت لاؤ۔ مل بیٹھ کر کوئی راستہ نکالو۔" لنڈ سردار نے ڈرایا۔ ارباب حاکم خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اتنی ذلت اٹھانی پڑی تھی۔

"ارباب حاکم! آپ ہمارے علاقے کے حاکم ہیں' لڑکی اگر آپ کے بیٹے نے اغوا نہیں کی پھر بھی فریادی بن کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ماروی کی واپسی میں آپ کا کردار ہونا چاہیے۔ اپنے مخالفین کی سازش کو ناکام بنا کر' ان ساری برادریوں کی ہمدردیاں سمیٹ لیں۔ ہمارا وعدہ رہا کہ اگر آپ کی کوشش کامیاب رہی' تو ان ساری برادریوں کے ووٹ آپ کو ملیں گے۔ ماروی کو الیکشن سے پہلے چھڑوانا پڑے گا۔" سارے سرداروں نے متفقہ فیصلہ سنا دیا۔

"ماروی' پاندھی کی نہیں' میری بیٹی ہے' اس کو ڈھونڈنے میں' میں اپنا تن من دھن لگا دوں گا اور ان شاء اللہ یہ جو جال میرے مخالفین نے میرے لیے بچھایا ہے' اس میں وہ خود گریں گے۔ ماروی ہم سب کی عزت ہے اور اپنی عزت ہم مل کر بچائیں گے۔" حاکم سومرو نے اٹھ کر ساجن اور پاندھی کو گلے لگایا۔

"ہمیں آپ سے انصاف کی توقع ہے' ارباب حاکم۔ وقت کے حاکم اگر ظالم بن جائیں گے' تو ہمارے جیسے مسکین مارو کہاں جائیں گے' کس در پر فریاد کریں گے۔" پاندھی رو پڑا۔

"دل بڑا کر پاندھی! ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔" ارباب حاکم نے اس کا شانہ تھپکا۔ عمر سومرو اور پھوگ اندر ہی اندر کھول رہے تھے' کاٹو تو لہو نہیں والی صورت حال تھی۔

"آج تیسرا دن ہے' تین چار دن ہم اور صبر کریں گے۔ ہفتہ گزرنے کے بعد ہم سے شکوہ نہ کرنا۔ ہم اس کے بعد اپنے لائحہ عمل میں آزاد ہوں گے۔" ساجن نے دھمکی دی۔

"لکھ لائق' آپ کے۔" ارباب حاکم نے ساجن کے آگے ہاتھ باندھے۔ "اتنا وقت بھی دیا میں شکر گزار ہوں۔"

آہستہ آہستہ ساری پنچایت اٹھنے لگی' مٹی سے اٹے ہوئے کھیت کے ننگے پاؤں پر عمر سومرو کی نظر پڑی۔

"ہونہہ اس کے لیے مرتی ہے' وہ جس کے پاؤں میں جوتی بھی نہیں۔" عمر زیر لب بولا۔

☼ ☼ ☼

مٹیالا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جھونپڑے میں اندر سکھاں اس کپڑے کے جھولے کو گھور رہی تھی۔ جب

سے اس کی گود اجڑی تھی' وہ جھولا اس نے نہیں اتارا۔ ہر آئی گئی کہتی' پاگل ہوئی ہے' اتار کیوں نہیں دیتی' اگلی بار پھر اللہ امید بچہ پیدا ہونے کی' دے گا۔ گودی میں بچہ آئے گا پھر باندھنا۔"

سکھاں نے تھی میں سہلایا' نہیں' یہ میرے بچے کی نشانی ہے' میں دیکھتی ہوں' تو دل کو ڈھارس ملتی ہے' اللہ سے دعا کرتی ہوں' اللہ اس لوڑ (کپڑے کا جھولا) اور میری گود کو پھر سے بھر دے۔"

اور آج وہ بھیلنی جھونپڑے کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہہ گئی۔

"اب اتار دے یہ لوڑ'" "کپڑے کی ہنگھ" ماروی اب محلاتوں کو پیاری ہوئی' اب واپس پلٹ کر تمہیں خوراک نہیں پہنچانے والی۔"

اس سے سکھاں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دل کے دامن سے بندھی امید کی گرہ کھل گئی۔ جیسے نئے سرے سے گود اجڑی ہو' اور وہ اپنے تین ماہ کے بچے کی لاش اٹھائے' خاموشی سے روتی ہو' مگر اس بار ماروی کا کاندھا میسر نہیں تھا' لالٹین بجھ گئی تھی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ لالٹین میں مٹی کا تیل ختم ہوا اور اس کے بچے کی زندگی کی لو بھی اس کے بھوکے تن کی سوکھی

چھاتی کا دودھ ختم ہونے سے بجھ گئی تھی۔

"تو ماروی! تم بھی بے وفا نکلیں اور آسائشوں کی اسیر ہو گئیں۔"

اور محل میں' اسیر ماروی عین اسی وقت نیر بہا رہی تھی۔ کتنے خواب تھے' جو صرف اس کی آنکھوں میں نہیں تھے' بلکہ سارے مارو اور سرتیوں (سہیلیوں) کی آنکھوں میں بھی سجے ہوئے تھے۔

"بس کر دے ماروی! اور کتنا روئے گی۔" مائی وڈی نے آگے بڑھ کر اپنے دوپٹے سے اس کے آنسو پونچھے۔

"مائی وڈی' جب سکھاں کی گود اجڑی' وہ تین دنوں سے فاقوں پر تھی۔ کئی دنوں تک گاؤں والوں نے اسے روٹی پہنچائی تھی' مگر حالات تو سب کے کم و بیش ایک جیسے ہی تھے' ان دنوں اس کا شوہر کراچی کمانے کے لیے گیا ہوا تھا' مگر جان پہچان نہ ہونے کی وجہ سے اسے مزدوری نہیں ملتی تھی۔ اور تب تک سکھاں فاقوں کی وجہ سے اپنے بیٹے کے لیے' فاقہ بن گئی۔ فاقوں کی وجہ سے وہ اجڑی گود پر رونے کی قوت بھی کھو چکی تھی۔ اس کی کھلی آنکھیں اپنے بیٹے کی لاش کی ادھ کھلی آنکھوں میں اٹکی ہوئی تھیں۔

اور پھر میں نے اس کی سکتہ زدہ آنکھوں میں آئندہ امید سے ہونے پر زچہ و بچہ کی مکمل خوراک کا خواب رکھ دیا تھا۔ اب سنا ہے وہ امید سے ہے' اور میں اسیر کیسے اس کے خواب کی تعبیر ڈھونڈوں۔" ماروی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"وہ یقیناً" مایوس ہو گئی ہو گی' مجھے بے وفا سمجھ رہی ہو گی' کہیں اس کا بچہ اس کے پیٹ میں ہی نہ سوکھ جائے۔" وہ پریشانی سے کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

"یا اللہ! مجھے آزاد کر دے۔" اس نے کھڑکی کی گرل سے آسمان کو دیکھتے ہوئے دہائی دی۔

"عمر سومرو! میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا' جو ایسا قہر کر دیا۔" وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔ مائی وڈی نے اسے شانوں سے اٹھا کر شاہی پلنگ پر بٹھایا۔

"تیری جگہ یہاں ہے' ماروی رانی۔"

"مائی وڈی! میں تھر جائی ہوں۔" زمین پر سونے والی' ایسے شاہی پلنگوں کی عادی نہیں' یہ پلنگ یہ ماڑیاں محلاتیں عمر کو مبارک۔ اس نے شیشوں سے مزین' شاہی پلنگ پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس پر صرف اک بار بے ہوشی کی حالت میں سلائی گئی تھی۔ وہ بھول کر بھی اس ہندورے (بالا کا بنا ہوا سرخ جھولا) میں نہیں بیٹھی' مائی وڈی بہتیرا کہتی' ذرا سا جھولو گی تو دل بہل جائے گا' آنکھ لگ جائے گی۔

"نہیں' مائی وڈی نہیں۔ میں تو پینگیں لینے کی عادی ہوں' میں کیا جانوں ان ہندوروں میں جھولنے کا مزہ۔" وہ لیٹتی تو زمین پر۔ بیٹھتی تو زمین پر' یہ کارپٹ میرے تھر کی ریت سے نرم نہیں' مائی وڈی کیا تم نے تھر کی

ریت کا گداز محسوس نہیں کیا۔ وہ ماں کی گود کی طرح نرم ہے۔"

اس سے مائی وڈی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں۔

"تھریانی ہوں' تھرپارکی ریت سے محبت سمجھتی ہوں' پر ماروی تو تو واقعی اصلی ماروی ہے' بھالوا سے لوٹ آئی ہے۔" اور ماروی نے اس چیزی سے آنکھیں پونچھیں' جس میں صدیاں سمٹ آئی تھیں۔

اللہ! ایسا نہ ہو کہ میں قید میں ہی مرجاؤں۔

جسم زنجیروں میں رات دن روتا ہے۔

پہلے یہ سب سہ کر اپنے ماروؤں کے پاس پہنچوں۔

بھلے میری زندگی کے دن ختم ہو جائیں؟

سے سر کتے' وقت کے سمندر میں' سانس لیتے رہے۔ دروازہ کھول کر دو ملازمائیں دست بستہ داخل ہوئیں۔

"کھانا لگ گیا ہے۔"

اس اعلان کے ساتھ ہی مائی وڈی نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا' آگے پیچھے کنیزوں کے جھمگھٹے میں وہ انواع اقسام کے طعاموں سے سجی ٹیبل تک آئی' مگر ماروی نے دنیا جہان کی نعمتوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک چپاتی' دہی کی پیالی لے کر نیچے بیٹھ گئی۔

اس کے لیے کرسی ہٹانے والی مائی وڈی' نئے سرے سے اس کی اس حرکت پر مبہوت ہوئی' شیشے کی ڈائننگ ٹیبل پر' اکیس نمکین' گیارہ میٹھے کھانے سجے ہوئے تھے' طرح طرح کے مشروبات' کیا کیا نعمتیں تھیں' جن کی طرف وہ دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہی تھی۔

مائی وڈی کے ساتھ کنیزیں' ایک ایک ڈش ٹیبل سے اٹھا کر زمین پر اس کے آگے رکھتیں' مگر وہ نفی میں سر ہلا دیتی۔

"یہ چیزیں میرے لیے طعنہ ہیں' یہ دہی چپاتی میرے لیے نعمت ہے' سب سے عمدہ اور اعلا غذا! ہے' مائی وڈی۔" اس نے دہی میں نوالہ ڈبو کر منہ میں رکھا۔

"جی میری ماروی۔" مائی وڈی اس کی پکار پر قربان ہو گئی۔

"مجھے یاد ہے بچپن کا وہ زمانہ' جب قحط آتا' آٹا کم پڑتا' تب اماں روٹی پکانا چھوڑ دیتی' اور ایک چمچہ مکھن کا ڈال کر' اس میں تین روٹی کا آٹا ڈال کر بھونتی' پھر ایک گھڑولی پانی کی انڈیل دیتی' اور تھوڑا سا گڑ ڈال دیتی۔ وہ آٹے کی پتلی یخنی بن جاتی' پھر میں بھاگ کر سکھاں اور اس کے جیسے چند اور بچوں کو لے آتی اور اماں پیالے بھر بھر کے ہم سب کو پلاتی اور جو باقی بچتا' وہ دوسرے وقت کے لیے رکھ دیتی' پھر بڑے فخریہ انداز میں "خوشی" سے کہتی۔ دیکھ ماروی! روٹی پکاتی تو ہم تینوں کے پیٹ بھرتے اور آٹے کی یخنی بنائی' تو دس لوگوں نے پی۔ بیٹا! بھوک بڑھ جائے تو' اپنا حصہ کاٹنا پڑتا ہے۔" اس کے آنسو روٹی میں جذب ہو رہے تھے۔

مائی وڈی نے اپنے پلو سے اپنے آنسو صاف کیے۔

"تو واقعی بڑی ماں کی دھی ہے ماروی۔" اور ماروی کا نوالہ زہر بن گیا۔ اس نے آدھی روٹی واپس رکھ دی۔

"ایک روٹی تو پوری کھا لے۔" مائی وڈی نے منت کی۔

"بابا کہتے تھے ماروی کی ماں اسے آدھی روٹی کی عادت ڈال' کبھی پوری میسر نہ ہو تو اسے بھوک محسوس نہ ہو' اس کے بعد مجھے رمضان میں بھوک زیادہ محسوس نہیں ہوتی تھی' اور جب آٹا کم پڑنے لگتا' قحط شروع ہو جاتا' تو ابا ریت سے تھوہر چن کر آتا' تھوہر کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ریت کے اندر دفن کرتا' جب وہ سوکھ کر کھوکے بن جاتے' ان کا زہر ریت چوس لیتی' جھڑ جاتے تو ابا سوکھے تھوہر کے ٹکڑوں کو گندم میں ملا کر آٹا پسوا لاتا' تاکہ چند کلو آٹا بڑھ جائے' پھر ہم کسیلی سی روٹی کھاتے۔" ماروؤں کی ایک ایک بات ماروی کو رلاتی رہی' حلق تک تھوہر کی کڑواہٹ پھیل گئی تھی۔

اور اس کے کرودار کی پابندی سے مائی وڈی کا دل۔

لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"دیکھے اپنے بیٹے کے لچھن۔" حاکم سومرو نے اپنی خاندانی بیوی کے آگے دکھڑا بیان کیا۔

"تمہارے بیٹے کے لچھن بھی تمہارے جیسے ہی ہوں گے۔" اس کی بیوی نے ٹانکیں دلواتے ہوئے کہا۔

"الیکشن کی ساری مہم پر پانی پھیر دیا' ارے اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ وقت ان کاموں کا نہیں' مگر اب وہ لڑکی پتا نہیں چھپائی بھی کہاں ہے' کوئی تدبیر کوئی حکمت عملی نہیں سوجھ رہی مجھے اس کھڈ سے باہر نکلنے کی' ایسی نالائق اور کمینی اولاد سے اللہ بچائے۔"

"دیکھ ارباب! اپنی زبان سنبھال کر بات کر۔ کمینی اولاد ہوگی تمہاری لاڈلی شہری بیوی کی' ارے میرا عمر تو لاکھوں میں ایک ہے۔" وہ بری طرح برا مان گئی۔

"ارے بھاگوں بھری! اس لاکھوں میں ایک ہی نے تو لٹیا ڈبوئی ہے' کوئی حکمت عملی' کوئی بہانہ گھڑ کہ اس ماروی سے اس کا دل اٹھ جائے' چھوڑ دے وہ۔"

"ارے وہ ماروی' باندھی کی بیٹی!! بڑا ہی خراب ہے عمر بھی' ملکاؤں کو چھوڑ کر چرواہے کی بیٹی پر عاشق ہوا ہے۔ عزت ہی خراب کر دی ہماری تو' بس اب تو فکر نہ کر ماروی سے ہٹانا میرا کام' تو بس لڑکی ڈھونڈ کہاں چھپائی ہے۔" اس نے فیصلہ دے دیا۔

"میری بھاگوں بھری ملکہ' سچ ہی نہیں کہہ رہا ہے' صاف مکر گیا ہے۔" حاکم سومرو نے بیوی کی خوشامد کی۔

"جیسے تم مکر گئے تھے کسی زمانے میں۔" وہ دوپٹا منہ پر رکھے ہنس دی۔

"ارے تب تو خیر تھی۔ ایسے حالات نہیں تھے۔ اب تو میں پھنس گیا ہوں بری طرح۔ ساری برادریاں مخالف ہو گئی ہیں۔ اس کو کالا منہ کرنا ہی تھا تو الیکشن کے بعد کرتا' میرے لیے تو مصیبت نہ کھڑی کرتا۔"

"سنو! تم فکر نہ کرو۔ تم خمیسو کی ڈیوٹی لگا دو۔ میں اپنی مائی سے پوچھتی ہوں۔" ملکہ نے مشورہ دیا۔

"بات پتے کی کی ہے۔" حاکم سومرو خوش ہوا۔

اس نے باہر آ کر خمیسو کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

"حاضر سرکار۔" خمیسو نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"خمیسو! تمہارا بیٹا پھوگ اس کے سارے کالے کرتوتوں کا رازدار ہے۔ اسے ضرور پتا ہوگا' عمر نے ماروی کہاں چھپائی ہے۔ یقیناً" وہ کوئی خفیہ جگہ ہی ہو سکتی ہے' میرا بیٹا مجھ سے سچ نہیں کہہ رہا' ہو سکتا ہے' تمہارا بیٹا تم سے سچ بولے۔" حاکم سومرو نے وائن کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"جی سرکار' میں اس سے اگلوانے کی پوری کوشش کرتا ہوں' ان بچوں کی غلطی نے آپ کو پریشان کر دیا ہے' اور دو ٹکے کے لوگ آپ کے منہ کو آنے لگے ہیں' یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔" خمیسو نے ازلی غلامی سے کلام کیا۔

"ہاں خمیسو خان' الیکشن کے دنوں میں کمی کمین لوگوں کی زبانیں بھی دو گز کی ہو جاتی ہیں' ان کی بکواس سننی پڑتی ہے' ورنہ ساجن لاکھ انقلابی سہی' مگر میرے سامنے زبان چلانے کی کبھی ہمت نہیں کرتا۔ کاش نہ دیتا ایسے گستاخانہ بول بولنے والی زبان کو' مگر سارا فائدہ ان دنوں کا لیا ہے۔ میں بھی بازی پلٹ کر دکھاؤں گا اور الیکشن گزرنے تک یہ ثابت ہی نہیں ہو سکے گا کہ ماروی کو عمر سومرو نے اٹھایا تھا۔"

"حاضر سرکار' ایسی تدبیر تو کرنی پڑے گی ورنہ ووٹوں پر اثر پڑے گا۔" خمیسو نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"یہ تو رہی بعد کی باتیں' پہلے اس لڑکی کو تو برآمد کرواؤ۔" ارباب حاکم نئے سرے سے پریشان ہوا۔

☆ ☆ ☆

اس شام ٹوٹ کے بارش برسی تھی گرجتے بادلوں پر ماروی نے دوڑ کر کھڑکی کھولی تھی۔ اندر کمرہ روشن تھا' مگر باہر شام ڈھلے ہی اندھیرا پھیل چکا تھا' کڑک دار آواز میں بجلی کی چھپن چھپائی جاری تھی۔

"مائی وڈی مہنہ" ماروی نے پلٹ کر مائی وڈی کو خوشی سے دیکھا۔ اس کے پیچھے مائی وڈی اس کو پہلی بار خوش دیکھ کر خوش ہوئی۔

"ہاں ماروی مہنہ" مائی وڈی ہنس دی۔

"بارش کی چھم چھم کی ردھم سماعت کو بھلی لگ رہی تھی' ہلکی سی نمی کی بوچھاڑ' ہوا کے دھکیلنے پر ماروی کے چہرے سے ٹکرائی' ماروی نے خوشی سے آنکھیں موندیں' اور پھر کھول دیں۔

"مائی وڈی میں باہر جانا چاہتی ہوں۔" اس نے پہلی بار خواہش کا اظہار کیا۔ مائی وڈی نے انٹر کام پر پہریداروں سے بات کی اور دروازہ کھل گیا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ملازماؤں کے جھمگٹے میں وہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"مجھے اکیلا کیوں نہیں چھوڑتیں؟" وہ زچ ہوئی۔

"ہمیں یہ حکم نہیں؟" یک زبان جواب آیا۔

ٹیرس پر آئی' تو اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ آسمان صاف وشفاف' روشن اور برستی بارش' اس نے دیکھا' دور دور تک آموں کی فصل ۔۔۔ غسل کر کے ہری بھری لگ رہی تھی' اس منظر نے اس کا دل خوش کر دیا۔

"بارش میرے تھر کی طرف بھی ہوئی ہے؟" اس نے پلٹ کر سوال کیا۔

"وہاں تو صبح سے ہو رہی ہے۔" ایک لڑکی نے جواب دیا۔

"اللہ تھر پر سانجھ برسا۔" وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بولی۔

"ہاں برسے تو تھر' ورنہ بر ہی بر۔ ریگستان۔" مائی وڈی کی آواز میں ریگستان [illegible]

"اب میرے ماروؤں کی بھوک ختم ہو گی۔ بال بچے بوڑھے جوان' عورتیں' لڑکیاں' سب کی بھوک مٹ جائے گی۔ ماٹھو تو ماٹھو (لوگ) مویشی بھی خوش ہو جائیں گے' ساری ترائیاں "حوض" بھر جائیں گی۔" کھانے پینے کی بہتات ہو گی' بس اب کچھ ہی دنوں میں' خربوز' تربوز' ٹنڈے' گوار' چبھڑ' سبزیاں اور پھل اتنے ہوں گے کہ پیٹ بھر بھر کے کھانے کے بعد بھی بچ رہیں گے' اور عورتیں قحط کے لیے خوراک جمع کریں گی۔ تربوز خربوز توڑ کر کھڈوں میں پھینکیں گی' بیج سوکھ جانے پر وہ نکال کے تسلوں میں رکھیں گی اور قحط کے دنوں میں وہی بیج توے پر سینک کر روٹی کے ساتھ کھائیں گے۔ پنیر بنائیں گی' ململ کے جھولے باندھیں گی' وافر مقدار میں دودھ دینے والی بھیڑ بکریوں کے دودھ کی دہی بنا کر' وہ ان جھولوں میں انڈیل دیں گی' پانی نچڑ کر نکل جائے گا' دہی سوکھ جائے گی تو وہ بھی قحط کے دنوں کے لیے جمع کر کے رکھیں گی' پھر روٹی پر رکھ کر کھائیں گی" ماروی اک اک بات مائی وڈی کو ایسے بتا رہی تھی' جیسے مائی وڈی اس تھری طرز زندگی سے ناواقف ہو۔ مائی وڈی مسلسل مسکرا رہی تھی۔

"میری سرتیاں (سہیلیاں) اب ٹنڈے اور گوار چنیں گی' تربوز خربوز توڑیں گی' چلتے پھرتے کام دھندہ کرتے کرتے گاتی رہیں گی' اور میں یہاں قید۔" ماروی کو ایک دم سے رونا آیا۔

اندر بارش' باہر بارش' مائی وڈی نے بڑھ کر اسے گلے لگایا' اس کے وجود پر اداسی کے بادل چھا گئے' دکھ کی پھوار میں پور پور بھیگ گئی' چھاجوں مینہ برسنے لگا' آنکھوں کی ترائیاں بھر گئیں۔

"اب تو وہ بیاہی بیٹیاں بھی میکے آئیں گی' جو عیدین پر نہ آسکی تھیں' قحط کی وجہ سے تھر میں یہاں قید کر دی گئی' پر کاٹ دیے گئے ہیں' اڑان پر پابندی لگا دی گئی' آہ! میرا نصیب۔" اس کے وجود سے پھوٹ کر نکلتے غموں کو سمیٹ کر مائی وڈی۔ اسے قید خانے میں لے آئی۔

"مائی وڈی تیرے دل میں ہی رحم نہیں کسی اور کو کیا کہوں' اور میرے ماروؤں نے بھی پلٹ کر خبر نہیں لی' وڈیروں کے ستم سے ڈر گئے۔ ورنہ ضرور یہاں تک پہنچتے" ماروی پہلی بار اپنے ماروؤں سے ناامید ہوئی۔

☼ ☼ ☼

ساری رات مینہ چھاجوں برسا' اور ساری رات بھاگی اکڑوں بیٹھی رہی' اور اس کے ساتھ

"جھونپڑے" کی چھت کی نوک پر مور سر جھکائے بیٹھا رہا' وہ مور جو صدیوں سے تھر کے حسن کا پیغامبر تھا' جس مور کو سندھ کے تحفے کے طور پر دربار فرعون میں بھیجا گیا' اور معبود ہونے کا جھوٹا دعویدار فرعون' اس کا حسن' اس کے رقص کو دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔

اور پھر وہ مور ماروی کو عزیز ہو گیا' اس دن سے جب ماروی لکڑیاں توڑ توڑ کر آگ جلانے کے لیے جمع کر رہی تھی۔ اور مٹی کے بنے بغیر چھت کے باورچی خانے کی دیوار سے لٹک کر' پھنکارتے سانپ نے ماروی پہ حملہ کیا' اس سے پہلے کہ وہ ماروی کی گردن پر ڈنک مارتا' جھونپڑے کی نوک سے مور اس کے ارادے کو بھانپ کر اڑا اور اپنے پنجوں میں اٹھا کر دور لے گیا۔ بھاگی کی چیخ ہنسی میں بدلی تھی اور ماروی اس نظارے سے حیران رہ گئی تھی۔ وہ گھر کے چاروں طرف تب تک پھرتا رہا' جب تک سانپ مردہ نہ ہو گیا۔

وہ وفادار مور مر گیا' مور رانی کھیت کی بیماری سے نہیں' ماروی کی یاد میں ماروؤں کے ساتھ نیر بہاتے بہاتے۔ وہ عام مور نہ تھا' جو بیماری میں مرتا' وہ خاص

خاص مور تھا' ماروی کا پالا ہوا' ماروی کی جدائی اس پر پہلے بھی شاک تھی' مگر تب وہ روزانہ فون پر ماروی کی آواز سنتا۔ کھیت اسپیکر کھول دیتا اور وہ ماروی کی آواز مٹھاس بھری پکار سن کر' پیار بھری آواز سن کر ناچنے لگتا' اب پچھلے چھ دنوں سے اس نے ناچنا چھوڑ دیا تھا' وہ ماروی کے فراق میں سر نیہوڑائے ایک جگہ بیٹھا رہتا' کسی کو یاد آیا' پانی دیتا تو ایک ٹھونگا مار دیا' نہ رکھا تو پینے نہیں جاتا۔ باجرے کے چند دانے رکھے جاتے تو چند ایک دانہ چگ کر پھر خاموشی سے بیٹھا رہتا' چاولوں کے آٹے کی گولیاں بنا کر بھاگی اس کے آگے رکھتی' مگر وہ ویسی ہی پڑی رہتیں' آنکھیں بند کر بیٹھا رہتا۔

جس دن وہ مرا' اس دن وہ سارا دن چیختا رہا تھا' جیسے ماروی کو بلا رہا ہو' اور پھر اس کے گلے سے چیخنے کی صدا بھی بلند نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ صحن کے چبوترے پر سر زمین پر رکھے لیٹا ہوا تھا' بھاگی نے کبھار اسے بارش

میں بھیگتا رہا ہے۔ سردی لگ گئی ہے' رلی کا چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ وہ پھڑپھڑایا' اک بار دوبار' اس کی آخری پھڑپھڑاہٹ بہت تیز تھی' اور پھر وہ مر گیا' بھاگی دوڑ کر آئی' اسے الٹ پلٹ کر دیکھا' مگر وہ بے جان ہو گیا تھا' بھاگی نے وہیں زمین کھودی۔ مور کو دفن کر کے اپنے صحن میں قبر بنائی۔ چھوٹا سا ایک فٹ کا ٹیلا' اس ٹیلے پر تھپکی دے کر کہتی۔

"ماروی آ کر دیکھے گی' اس کی جدائی اور داغ داری مور پر بھی بھاری پڑی۔"

اور یہ سوچ اس کے دل میں گڑ گئی "ارے بھاگی! تو تو مور سے بھی گئی گزری نکلی جو ماروی کے فراق میں مر گیا۔ تو ابھی تک جی رہی ہے' لوگوں کی باتیں ہی تجھے مارنے کے لیے کافی ہیں۔

تین دنوں سے کھیت بھی نہیں آیا تھا۔ وہ بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے تھے' وہ اندر ہی اندر باتیں پکاتی رہی۔ بے عزتی کا اک طوفان تھا جو امڈ پڑا تھا' کھیت کی ماں اب کہہ رہی تھی' "ہمیں یہ گندی ماروی نہیں چاہیے' مگر میرا چھورا' ابھی تک اس کو چھوڑنے پر راضی نہیں' ہر آئی گئی عورت اس وہمی' بیمار ماروی کے فراق میں غرق' اور داغداری سے شرمندہ بھاگی کے کان میں کوئی نہ کوئی بات انڈیل دیتی۔ ان باتوں نے اسے چارپائی سے لگا دیا۔ ——— اگلے دن وہ بھی وفاداری میں مور کے برابر ہو گئی۔

یہ داغ' اس کی زندگی کی نیا کو بھی لے ڈوبا۔ ویسے بھی جن کی بیٹیاں اغوا ہوتی ہیں وہ مائیں جیتے جی مر جاتی ہیں' مگر بھاگی نے تو واقعی مر کر دکھا دیا۔

"اٹھ جا ماروی! آج پھر عمر سائیں آ رہا ہے۔" مائی وڈی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

ماروی نے آنسوؤں سے تر آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تو کیا جانے درد پرایا۔" ماروی شکوہ کناں ہوئی۔

"یہ درد پرایا نہیں' میرا اپنا بھی بھگتا ہوا ہے۔" مائی وڈی کا بولا' آہ نما سانس سے اک لمحے کو ہونٹوں سے

الگ ہو کر پھر ہونٹوں سے چپک گیا۔
"پھر بھی احساس نہیں۔"
"داشتائیں ہر احساس سے خالی ہوتی ہیں۔"
میری طرح مظلوم میری مدد نہیں کر سکتی۔ ماروی نے اس کا ہاتھ تھاما۔
"مصلوب کر دی جاؤں گی۔" مائی وڈی کی خود کلامی ابھری۔
"مصلوب کر دی گئی ہو' کتنی بار پھانسی پر لٹکو گی۔ اس سے بہتر نہیں کہ اک بار لٹکا دی جاؤ۔" ماروی نے ترغیب دی۔
مائی وڈی کا سر ضمیر کے بوجھ سے جھک گیا۔
"تو خوش قسمت ہے ماروی! آج تیرے نکاح کی تیاری ہے۔" مائی وڈی نے بوجھ پھینکنا چاہا۔
"نکاح دل کی رضامندی کے بغیر نہیں ہوتا مائی وڈی' میرے سر پر تو آج بھی کھیت کی چنری پڑی ہے' میرا دل آج بھی کھیت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ آج بھی کھیت کی امانت ہوں' اس امانت میں خیانت کر کے عمر سومرو کے لیے ہاں نہیں کہہ سکتی۔"
ماروی نے کامدانی خوب صورت جوڑے اور جواہرات جڑے زیوروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔
"یہ دیکھو' کیسے خوب صورت زیورات ہیں' سچے ہیروں کے۔ ارے ماروی! عورتیں تو مرجاتی ہیں وہ بھی صرف ناک کی لونگ پر' عمر سومرو سائیں تو تمہیں سونے میں تول رہا ہے' ہیروں سے سجا رہا ہے۔"
ساری ملازمائیں باری باری ماروی کو راغب کرنے کے جتن کر رہی تھیں۔ ماروی اٹھ کر مائی وڈی کے مقابل آئی۔
"اگر میری جگہ تیری دھی اغوا ہوتی تو مرنہ جاتی اس کے غم میں' میری ماں پر کیا گزری ہوگی' کبھی سوچا تم نے' میرا باپ کس طرح لوگوں کے سامنے سر اٹھا کر بات کرے گا' میرا کھیت کس طرح ہم لوگوں سے نظریں ملا پائے گا' مائی وڈی' میرا پورا خاندان "مصلوب"

پر ٹنگا ہوا ہے۔" ماروی روتی رہی۔
مائی وڈی کی زبان پر تالا پڑ گیا' وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔ ڈرائنگ روم میں خمیسو خان اس کا منتظر تھا۔
"مائی وڈی! میں بڑے سرکار اور سائین ۔۔۔ کا خاص پیغام لے کر آیا ہوں۔" مائی وڈی کا دل اتھل پتھل ہو گیا۔
"سچ بتانا ورنہ انجام جانتی ہو۔ عمر سائیں بادشاہ نے ماروی کو یہاں چھپایا ہے۔" مائی وڈی نے اپنے اغوا کرنے والے کارندے خمیسو کو خون آلود نظروں سے دیکھا۔
"یہاں پر کوئی لڑکی نہیں ہے۔" مائی وڈی نے سختی سے انکار کیا۔
"دیکھو! میں ماروی کو بچانے آیا ہوں۔ بڑے سرکار ماروی کو اس کے ماروؤں کو واپس کردیں گے' ورنہ الیکشن خراب ہو جائے گا۔ سمجھ رہی ہے میری بات۔" خمیسو خان نے اسے آمادہ کرنے کی غرض سے کہا۔
"تجھے پھوگ سے پتا چل چکا ہے تو مجھ سے کیوں پوچھ رہا ہے' اپنے بیٹے کو بچانا اور مجھے مروانا چاہتا ہے۔" مائی وڈی' اس کے لہجے سے اس کے اندر سے واقف ہو گئی۔
خمیسو ہنسا۔ "کچھ بھی سمجھ لے' صرف یہ بتا دے وہ لڑکی کسی تہہ خانے میں ہے۔"
"وہ عمر سائیں کے خاص کمرے میں ہے۔ تہہ خانے میں نہیں؟" مائی وڈی نے ضمیر کی آواز پر لبیک کہہ دیا۔

☼ ☼ ☼

عمر سومرو نے بڑی مشکل سے ڈاکٹر کو دکھانے کے بہانے ارباب حاکم سے اجازت لی' ورنہ ارباب حاکم اسے اپنے سے الگ ہی نہیں کر رہا تھا' رات تین تین بجے تک الیکشن کا کام ہوتا اور تھک ہار کر وہ دن ایک بجے تک سوتا رہتا' اٹھتا تو پھر باپ اس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا' وہ لاکھ سستی دکھاتا کہ ارباب حاکم تھک ہار

کر خود بھم پر نکل جائے 'مگر وہ بھی اس کا باپ تھا' اس سے سچ اگلوا نہیں سکا تو اسے آزادی بھی نہیں دے رہا تھا۔

بڑی مشکل سے اسے ڈاکٹر سے چیک اپ کی اجازت ملی تھی۔ وہ بھی صرف دو گھنٹے کی' مسلسل تھکاوٹ سے اسے بخار آگیا تھا' اس نے میرپور خاص شہر سے پھوگ کو نکاح کے لیے مولوی لانے کا کہا۔ اور خود سیدھا فارم ہاؤس پہنچا' شہزادوں کی سی ٹھاٹ باٹ اور بادشاہوں کی آن بان شان رکھنے والا' عمر سومرو آگیا ہے' مائی وڈی کے ساتھ ساری کنیزیں کمرے سے باہر نکلیں۔

زیورات' عروسی جوڑا' بیڈ پر پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے' عمر سومرو نے لب بھینچ کر غصے کو ضبط کیا۔

"تم آج بھی میلی کچیلی اس دو ٹکے کی چنری میں بیٹھی ہو۔ کیوں اپنے حسن کی اور خوشیوں کی دشمن ہوگئی ہو۔" عمر سومرو اس کے مقابل کھڑا ہوا۔

"اپنا حسن و جمال عمر سومرو' میں نے گنوا دیا۔ میرا چہرہ میلا ہو چکا ہے

اب ماروی' (روح) ملیر' (عالم ارواح) کی طرف کیسے جائے گی' ارے عمر' نفس امارہ تیری خواہشات نے میرا منہ کالا کر دیا ہے' تو نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔" ماروی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"مجھے تم سے عشق ہے ماروی۔" عمر سومرو ریوالونگ چیئر پر جھولتے بولا۔

"مرد ایسے عشق نہیں کرتے' یہ تو بزدلوں کی اوقات ہے' کسی معصوم لڑکی کو زبردستی اٹھانا' اغوا کر کے داغدار کرنا' مرد ہو تو عشق سے لڑ کر دکھاؤ' خواہشات کے غلام نہ بنو' بس دکھا دی تم نے اپنی طاقت' یہ ہے تمہاری محبت کہ مجھے روز خون رلاتے ہو۔" ماروی نے اپنے بھڑاس نکالی۔

"ابھی تمہیں ایسا لگتا ہے' مگر جب تم میرے سنگ دنیا جہاں کی نعمتیں دیکھو گی' پاؤں گی' تو خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھو گی۔" عمر سومرو سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر مسکرایا۔

"تم ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنے وطن ملیر کو بھول بیٹھے ہو اور سمجھتے ہو' میں بھی تمہاری طرح ہوں۔ نہیں نہیں عمر سومرو' میں آج بھی ملیر کی مشتاق ہوں' یہ تمہارے زر و جواہرات' دھوکہ ہیں۔ میں اپنے ہاتھ میں اگر انہیں پہن لوں' تو یہ ہتھکڑیاں بن کر قہر بن جائیں' تمہاری نتھ' جیت کے نشے میں چور ہونے والے' میرے لیے ڈھول ہے۔ تمہارے یہ زربفت مخمل میرے اس ٹاٹ کے پیوند سے حقیر ہیں' یہ پہن لوں تو میرا تن جل جائے ——— عمر! تمہارا یہ محل یہ حویلی' میرے اس جھونپڑے سے کم تر ہے' جو بھٹوں کی اوٹ میں کھڑا میری اپنے ماروؤں سے محبت کا پیامبر ہے۔" ماروی نے ہاتھ کے اشارے سے گول دائرہ بنا کر اس کے کمرے کو طنز کا نشانہ بنایا۔

"اور تمہاری رانیاں کنیزیں' جو تم نے پال رکھی ہیں' تمہیں وہی مبارک' میرے لیے تو میری سہیلیاں اہم ہیں' جو مال مویشی چراتی ہیں' لکڑیاں جلاتی ہیں' جو آدھا پیٹ بھرتی ہیں' آدھی بھوک پالتی ہیں۔" ماروی خوفی سے کھڑی تھی چنری اوڑھے' سامنے عمر سومرو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"میری قید میں ایسی بہادری' وہ دامن ——— سے بندھی ہوئی خوشی کو جھاڑ کر دامن کو داغ ہے۔ بچاری ہے۔" عمر سومرو اس کو دیکھ کر مسلسل سوچ رہا تھا۔

"تم میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہو ماروی! لیا یہ بڑی بات نہیں کہ میری دسترس میں ہو کر' ابھی تک دسترس سے باہر ہو' میں تمہیں تمہاری مرضی سے جائز طریقے پر حاصل کرنا چاہ رہا ہوں' ورنہ تمہارے تھپڑ کا داغ میں ابھی تک بھولا نہیں۔" عمر سومرو حتی المقدور اس کا دل جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہیں کہیں انسان مجبور ہو جاتا ہے' کہ جو اسے پسند نہیں کرتا' اس کے لیے بے تحاشا اچھا بن جاتا ہے' اپنی ضد' انا' کو پس پشت ڈال کر ضبط و صبر کے بند باندھتا ہے' فطری طبیعت پر غور' عمر سومرو اس احساس سے گزر رہا تھا۔

"تمہیں تھپڑ کا داغ مار رہا ہے اور مجھے اغوا کر کے جو داغ لگایا ہے' وہ کس کھاتے میں شمار کرو گے عمر سومرو! پیسے سے جسم خرید سکتے ہو' دل نہیں۔" ماروی نے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

"میں تو تمہیں سارے کا سارا خریدنا چاہتا ہوں' اپنا تن من دھن سب تم پر لٹانے کو جی چاہتا ہے۔" عمر سومرو اٹھ کر اس کے سامنے آیا' پشت پر ہاتھ باندھ کر ماروی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

"میرے من میں تو کھیت کی محبت کی میخیں ہیں' اس کی محبت کی مہار سے بندھی ہوئی۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹتے بولی۔

"کتنا بھاگو گی مجھ سے۔" عمر سومرو استہزائیہ بولا۔ "ان دیواروں کے اندر جہاں بھی جاؤ گی وہاں عمر سومرو ہی ملے گا۔"

"صرف عمر سومرو نہیں۔" وہ اب کی بار چار قدم پیچھے ہٹی۔

"اور کون؟" عمر سومرو کے قدم تھم گئے۔

"موت۔" ماروی فخریہ انداز میں بولی۔ "آخری وصیت سن لے۔ بھٹائی کی زبانی۔

"گو وطن کو یاد کرتے ہوئے میں مر جاؤں تو میری گور میرے ماروؤں کے پاس کرنا کہ اپنے عزیزوں کی مٹی اور بیلوں پھولوں کی خوشبو آئے گی' تو میں مر کر بھی زندہ ہو جاؤں گی۔"

عمر سومرو کے دل کو کچھ ہوا۔ "ماروی! خود کو مت مارنا' تمہاری عزت پر ابھی تک آنچ نہیں آئی۔"

"میں اپنی لوئی (عزت) کو بچانے کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں عمر سومرو! جس ماروی کی غیرت غیر مرد کا ہاتھ پکڑنا قبول نہیں کر سکتی وہ اپنی عزت پر آنچ کیسے آنے دے گی۔" ماروی نے پورے عزم سے کہا۔

عمر سومرو ہنس دیا۔ "تم نے تو مجھے ڈرا دیا ماروی۔ ویسے ابھی تو تھپڑ کا بدلہ بھی باقی رہتا ہے۔ سوچ رہا ہوں اس کے بدلے میں ساری عمر کی بیڑیاں پہنا دوں بلکہ ابھی کچھ ہی دیر میں پھوگ پہنچتا ہو گا۔ نکاح خواں کو لے کر۔ بس تمہارے سکھ بھر جائیں۔"

اس وقت پھوگ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"عمر سائیں۔"

"لو آگیا۔" وہ دروازہ کھولنے کو آگے بڑھا۔ ماروی مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ سامنے پھوگ کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"غضب ہو گیا سائیں!"

"کیا ہوا؟"

"میں نے ابھی مولوی صاحب کو ڈرائنگ میں بٹھایا ہی تھا کہ دیکھا' بڑے سرکار کا کانوائے اندر داخل ہوا' بڑی مشکلوں سے نکاح خواں کو چھپانے میں کامیاب ہوا ہوں۔ آپ کو بلا رہے ہیں وہ۔ ڈرائنگ روم میں۔"

عمر سومرو نے غصے سے دروازے پر لات ماری' پلٹ کر ماروی کو دیکھا جس کے دونوں ہاتھ چنری پکڑے سینے پر دعائیہ انداز میں بندھے ہوئے تھے' وہ آنکھیں موندے تشکر کے آنسو بہا رہی تھی۔

"آج پھر قسمت تمہارا ساتھ دے گئی۔" عمر نے ماروی کو دیکھتے کہا اور عجلت میں دروازے سے باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

اس کی ماروی گم ہو چکی تھی۔ اس رات سے کھیت

بے قرار تھا' وہ ایک پل بھی چین سے نہیں بیٹھا' اپنے باپ کے ساتھ ہر ایک کے پاس انصاف کے حصول کے لیے گیا۔ سماجی کارکنوں' دیہی علاقے کے لیڈروں' برادری کے سرداروں' سب کو اپنے ساتھ ملانے کی جستجو کی اور ان کی یہ جدوجہد کامیاب گئی تھی۔

وہ لوگ جو کبھی حاکموں کے آگے سر اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ وہ عمر کو للکار رہے تھے۔ اس کی مخالفت پر آمادہ تھے۔

کھیت کی یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ عمر نے بڑی چالیں چلیں' مگر اللہ کو منظور نہ ہو' تو عمر کی کیا مجال کہ اپنی چالوں میں کامیاب ہو' اللہ کا فضل ماروی کے ساتھ ہے۔ ماروی کی ملیر کے لیے تڑپ' اللہ کا آسرا اور رب سے اچھا گمان' اسے ضرور کامیاب کرے گا۔ کھیت کو بھی اس بات کا یقین تھا۔

اس رات بھی کھیت وہاں موجود نہیں تھا۔ آٹھواں دن تھا اسے اغوا ہوئے اور کھیت اپنے الٹی میٹم کے مطابق آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں مشورے کر رہا تھا۔ جب اسے ماروی کی ماں کی موت کی اطلاع دی گئی۔

ایک اور غم نے ان کے گھر کی راہ لی تھی۔ پاندھی کے آنگن میں نیچے بچھی ہوئی رلیوں پر اس گاؤں کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ چہ میگوئیاں' سرگوشیاں اب بھی جاری و ساری تھیں۔

"ایسی اولاد سے اللہ بچائے جو انسان کو مار دے۔" سرگوشی۔

"ایسا دن کوئی ماں نہ دیکھے کہ اس کی جائی اغوا کرلی جائے۔" ہمدردی کی سرگوشی۔

"اللہ کسی کو ایسا دن نہ دکھائے۔"

"توبہ توبہ' اللہ کسی کو ایسی بیٹی نہ دے' دے تو وہ بچپن میں ہی مرجائے' ماں باپ کو داغ دار نہ کرے۔" بے رحم سرگوشی۔

کھیت یہ ساری سرگوشیاں سن رہا تھا۔ غم کی دبیز تہ فضا پر چھا چکی تھی۔ موت کا سوگ طاری تھا۔

"اس نے مرتے مرتے بھی ماروی کو پکارا' اس کی سلامتی کی دعا کی۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ "یا اللہ سائیں! ماروی کی خیر ہو' میں نے اسے تیرے حوالے کیا۔" پھر بلند آواز میں تین بار کلمہ پڑھا اور دم دھنی (مالک) کے حوالے کیا۔" پاندھی اجرک سے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"چاچا صبر کر صبر۔" ہوٹل والے نے کندھے پر تھپکی دے کر دلاسا دیا۔

"بس بابا سائیں! ہمارے ساتھ تو ___ ظلم ہو گیا' ___ سارا گھر ہی اجڑ گیا۔ بیٹی کو وڈیروں نے اٹھا لیا اور بیوی کو مالک نے اپنے پاس بلا لیا۔" پاندھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"بس بھاؤ پاندھی! جو اللہ سائیں کی مرضی۔ انسان بے چارہ کیا کر سکتا ہے۔" ساجن نے سمجھایا۔

"بھاؤ۔ اللہ کے کیے پر تو صبر آجاتا ہے۔ پر انسانوں کے کیے پر صبر بھی نہیں آتا۔ ارے بھاگی کے بچھڑنے کا غم بھگتالوں گا' مگر ماروی کے غم کا مداوا کہاں سے ڈھونڈوں۔"

پاندھی کے سوئے ہوئے ___ درد پھر سے ___ زیادہ ہوئے۔ "ہائے ہائے' کیا کروں ادا! دل غم سے پھٹ رہا ہے۔ میرا تو وڑھا ویران ہو گیا۔"

"بس کرو پاندھی بس کرو' ارے تو بھی بیمار ہو گیا تو ماروی کا اور کون ہے۔" گاؤں کے اک اور شخص نے دلاسا دیا۔

"ارے میری دھی آئے تو سہی' میں اس کے لیے سارے غم بھلا دوں گا۔"

"ہونہہ اس نے جا کر محلاتوں کے مزے لوٹے' اب لوٹ کر آئے گی؟" استہزائیہ ___ فقرہ کسی دل جلے نے پھینکا۔

"اٹھ جا پاندھی۔ تدفین کے لیے رات پڑ جائے گی۔" وہ جنازہ لے کر قبرستان آئے۔ تدفین کے بعد ہوٹل والے نے اجازت لی اور ٹھیک بیس منٹ بعد اسی ہوٹل والے کا فون آیا۔ کھیت نے ریسیو کیا اضطراب سے۔

"کیا ماروی؟" کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

"سائیں! موقع اچھا ہے۔ کل الٹی میٹم بھی ختم ہو رہا ہے اور ماروی کہاں ہے یہ بھی پتا چل گیا ہے۔ آپ حکم کریں تو کارروائی شروع کریں۔" خمیسو نے آکر حاکم سومرو کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں، مگر ایسے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو نہ ہی شک پڑے۔" حاکم سومرو نے عمر سومرو کے کمرے کے دروازے کو دیکھ کر کہا۔

"بس سائیں آپ صرف ان نوجوانوں کو قابو کریں باقی کام میرا۔" خمیسو نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ حاکم نے آنکھ کے اشارے سے جانے کو کہا۔

خمیسو ایک گاڑی میں چند اہلکار لے کر روانہ ہوا۔ پھوگ باخبر تھا، عمر بے خبر تھا۔

پھوگ کیسے قبول کرتا کہ عمر اس کی ترغیب کی ترتیب تبدیل کردے۔ پھوگ (شیطان) حرام کا رسیا تھا اور عمر (نفس) حلال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کی برداشت سے باہر تھی یہ بات ہر ممکن طریقے سے اسے نکاح روکنا تھا۔ عمر کو پتا نہیں تھا کہ اس کا پالا پھوگ سے پڑا تھا جو اس کا ازل سے ابد تک کا دشمن ہے۔ جس کی دشمنی سے پاک کتاب میں خالق کائنات نے بار بار خبردار کیا تھا، جس کی چالوں سے آگاہ کردیا گیا تھا، مگر عمر بے خبر تھا۔ پھوگ نے عمر سے دوستی کی بنیاد اس دن رکھ دی اور دوست نما دشمن پھوگ نے ورغلا کر جنت سے بے دخل کروا کر اپنے ساتھ زمین پر رہنے کی سازش کی تاکہ عمر کے توسط سے وہ آدم کے قریب رہ کر اسے اپنی اصل سے الگ کرکے قالو بلیٰ کا اقرار بھلا دے۔

اس بار عمر نے ماروی کا دل جیتنے کو پھوگ کی دغابازی کی دھار کو کند کیا۔ اور پھوگ نے ایک اور چال چلی۔ بازی الٹ گئی۔ دونوں بار نکاح کو ناکام کروایا۔ اس طرح کہ اس کا نام نہ آئے۔ بھلا پھوگ کیسے قبول کرتا کہ عمر کھیل کو رانی بنادے۔ پھوگ جو انسان کا کھلا دشمن ہے۔ وہ عمر کو لے کر بڑے سرکار کے ساتھ کارنر میٹنگ میں گیا۔ اس کے بعد ایک جلسہ عام تھا ننگر پارکر میں۔ وہ رات گئے بھی فارغ ہونے والے نہیں تھے۔

ادھر میرپور محل میں ہُو کا عالم تھا۔ ساری ملازمائیں اور چوکیدار ملازم سب بے ہوش تھے۔ مائی وڈی کی چائے نے کام کر دکھایا تھا۔

مائی وڈی نے کمرے کا دروازہ کھول کر ماروی کو باہر نکالا۔ "آج تیری رہائی ہے۔ ماروی تو ملیر کی طرف جانے والی ہے۔"

"مائی وڈی میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ زندگی نے موقع دیا، اگر کچھ کرنے کے قابل ہوئی تو تمہیں ضرور آواز دوں گی۔ اپنے ساتھ کام کرنے کے لیے۔" ماروی آبدیدہ ہوئی۔

"تم آؤ گی نا میرے پاس۔" ماروی نے التجا کی۔

"اگر زندہ رہی تو ضرور۔" مائی وڈی نے اسے گلے سے لگایا۔

"ان شاءاللہ تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ابھی میرے ساتھ چلی چل۔" ماروی نے بے تابی سے کہا۔

"میری جان! یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں۔ تجھے تو نکالنے والے نکال رہے ہیں۔ ابھی گاڑی آئے گی جو تجھے لے جائے گی۔ ڈرنا نہیں اور لے یہ پی لے۔" مائی وڈی نے چائے کا کپ اس کے سامنے کیا۔

"نہیں مجھے طلب نہیں۔" ماروی نے انکار کیا۔

"ابھی میرا بھی کپ رکھا ہے جو میں نے پینا ہے، ماروی! بس اک عرض میری مان لے۔" مائی وڈی نے دونوں ہاتھ جوڑتے کہا۔ "ایک وعدہ کر۔"

"بول مائی وڈی، تو جان پر کھیل کر یہ احسان کر رہی ہے، میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔" ماروی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔

"اگر ساری عمر اس راز کو راز نہ رکھ سکے تب بھی الیکشن کے دنوں تک صرف زبان نہیں کھولنا کہ تمہیں اغوا کرنے والوں میں عمر سائیں کا نام تھا، بس ایک یہ التجا مان لے۔" مائی وڈی نے اک بار پھر ماروی

کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

"مائی وڈی! میں تمہاری وجہ سے یہاں سے اپنی لوئی (عزت) بچا کر جارہی ہوں 'تم کھوگی تو میں ساری عمر' عمر کا نام بھی زبان پر نہیں لاؤں گی۔" ماروی نے مائی وڈی کو اک بار پھر گلے سے لگا کر کہا۔

مائی وڈی نے چائے کی پیالی پھر اس کو تھمائی۔ "دو چار گھونٹ پی لے' ورنہ وہ تمہیں نشہ دے کر لے جائیں گے۔" مائی وڈی نے اپنی پیالی فٹافٹ پی لی۔ اسی وقت گیٹ کھلا' گاڑی اندر داخل ہوئی۔ اس نے عجلت میں مائی وڈی کے ہاتھ سے کپ لے کر ٹھنڈی چائے پی لی۔

مائی وڈی اسے ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی کی طرف آئی۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی' گاڑی کے کھلے دروازے سے وہ اندر داخل ہوئی۔ اس نے دیکھا اس ویگن میں کچھ نقاب پوش سوار ہیں۔ آگے والے نقاب پوش نے اتر کر دروازہ بند کیا' وہ پچھلی سیٹ پر اکیلی تھی۔ اس نے دیکھا مائی وڈی وہیں گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی اب بند ہو رہی تھیں۔

"یا اللہ میری حفاظت کرنا۔" "دعا" دل کا در کھول کر ہونٹوں کی چوکھٹ تک آئی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

ماروی اس وقت پچھلی سیٹ پر بے سدھ پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

ماروی ہوٹل پر بے ہوش پڑی ہے۔ یہ خبر سنتے ہی کھیت پاندھی' ساجن جیپ میں سوار ہو کر آندھی طوفان کی طرح پہنچے۔ ٹیاٹے مغرب زدہ اندھیرے میں اڑتی دھول نے پورے ماحول کو دھول زدہ کر دیا تھا۔ کھیت ہوٹل پہنچ کر زمین پر گری ہوئی ماروی تک پہنچا۔ ماروی کی حالت بہت ہی دگرگوں تھی' بہت ہی خراب۔

"میری دھی' میری ماروی۔" پاندھی نے اس کا سر گود میں رکھا۔ پاندھی کے آنسو تواتر سے اس کے چہرے پر گرے۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ احسان کہ میری دھی واپس آگئی۔" کھیت خاموشی سے ساکت ماروی کے وجود کو دیکھ رہا تھا جو پژمردہ لگ رہا تھا۔

"بس چاچا' جیسے ہی میں جنازہ پڑھ کر واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں روڈ کے کنارے ماروی بے ہوش پڑی ہے' میں نے فوراً" کھیت کو فون کیا۔ وہ تو اللہ سائیں کا شکر کہ چھوٹنے والے روڈ کے بیچ نہیں چھوڑ گئے ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔" ہوٹل والا ساری روداد بتا رہا تھا' مگر کھیت کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ محبت کا وظیفہ دہرانا چاہ رہا تھا' مگر بھول رہا تھا۔ اس کا دل اس کا ساتھ دینے میں ناکام تھا۔

"یار تجھے مبارک ہو۔ اوی ماروی واپس آگئی۔" ہوٹل والے نے گلے لگا کر کھیت کو مبارک باد دی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے جا کر جیپ کا دروازہ کھولنے لگا۔

ساجن اور پاندھی نے ماروی کو پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ پاندھی کی گود میں سر رکھے ماروی کو آہستہ آہستہ ہوش آرہا تھا' اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ پاندھی اسے مسلسل پکار رہا تھا۔

"او میری ماروی! او میری دھی رانی۔ میری مٹھڑی اماں' تیری ماں تیرے غم میں مر گئی۔" پاندھی کے سارے زخم نئے سرے سے تازہ ہو گئے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ماروی کے چہرے پہ گرتے آنسوؤں نے پہلے ہی غشی کمزور کر دی تھی' مگر ماں کے مرنے کی خبر پہ اس نے فوراً" آنکھیں کھول دیں۔ اس کا ذہن ایک جھٹکے کے ساتھ بے دار ہوا۔ جیپ گھر کے آنگن میں آکر رکی۔

"ابا! اماں!" ماروی کے لب ہلے۔

"تر میری بیٹی اتر۔" پاندھی نے بازو کے سہارے اسے نیچے اتارا۔ وہ لڑکھڑائی قریب تھا کہ گر جاتی' مگر کھیت نے بڑھ کر اسے نہیں تھاما۔ ساجن نے اک بار پھر حیرت سے بیٹے کو دیکھا جس کی حرکات و سکنات اسے ٹھیک نہیں لگ رہی تھیں۔ پاندھی نے لڑکھڑاتی

ماروی کو سہارا دے کر چارپائی پر بٹھایا تھا۔ تدفین کے بعد جانے والا سارا گوٹھ ایک بار پھر اُمڈ آیا تھا۔

"ہمنہ ماں کو مار کر آئی' مرنہ گئی بھاگی (بدبخت)۔" کھیت نے سر گھما کر آواز کی طرف دیکھا' بھیلنی بھنبھنا رہی تھی۔

"اماں... اماں کدھر ہے۔" ماروی کی نحیف آواز کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ وہ حیرت سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ کھیت کے قریب اس کی ماں آکھڑی ہوئی۔

"ہمنہ جس کا پسینہ پلید اس کی — چنری — پاک کیسے ہوگی۔" کھیت نے اک بار پھر غور سے ماروی کو دیکھا۔

وہ بالکل اجڑی ہوئی لگ رہی تھی۔ کھیت پہلی بار بدظن ہوا۔ میلا کچیلا اس کا لباس۔

"بڑی گئی تھی محلاتوں کے خواب سجا کر' چھوڑ گئے نا۔" اک اور سرگوشی ابھری۔

"جھونپڑے کا تنکا محل میں نہیں سجتا' خود کو گندا کر آئی نبھاگی' بھاگی کو کھا گئی۔" پاندھی بے چارگی سے یہ تہمتیں سن رہا تھا۔

"چپ کر جاؤ سب لوگ!" ساجن غصے سے چیخا۔

"کھیت! آگے بڑھو' یہاں کیوں کھڑے ہو گئے۔" ساجن نے بیٹے کو بازو سے تھاما۔ اس نے آنکھیں موندیں۔ باپ کے کاندھے کے سہارے بیٹھی ہوئی ماروی کو اک بار پھر بغور جانچا۔

پھٹی ہوئی اس کی چنری' ملگجا سا حلیہ' اس کے چاند ایسے وجود پر بے عزتی کا گرہن لگ گیا' اس چاند گرہن کو دیکھنے سارا گاؤں ان کے وڑھے میں آجمع ہوا۔ ان کی زبانوں کے خنجر تیز تر ہوتے گئے۔

کھیت مرد تھا اور شک مرد کے سینے میں گڑ جائے تو وہ اسے نگلتا نہیں' فوراً اگل دیتا ہے۔ کھیت نے بھی شک اگل دیا۔ چیخ پڑا گاؤں والوں کا ہمنوا ہوا۔

"ابا! میں وڈیروں کا جھوٹا نہیں کھا سکتا۔ نہیں چاٹ سکتا ان کا تھوکا ہوا۔"

آٹھ دنوں کی اذیت بھری سوچ بالآخر اس کی زبانی برآمد ہوئی۔

"صحیح کہہ رہا ہے کھیت۔ وڈیروں کے ہتے چڑھنے والی کیسے پاک دامن ہو سکتی ہے۔" کھیت کی ماں نے بات کھول کر رکھ دی۔ ماروی نے کھیت کی چیخ پر اسے دیکھا۔ اس کا جسم لرزنے لگا۔ لرز تو کھیت بھی رہا تھا جس کے محبت کے وظیفے میں رجعت ہو گئی تھی۔ وہ رو رہا تھا۔ ساجن سے جوان بیٹا سنبھالے نہ سنبھلتا تھا۔

اور ماروی جو ساکت وجود کے ساتھ سب کی بہ آواز بلند سرگوشیاں سن رہی تھی۔ وہ بالکل بے دم ہو گئی۔ اسے لگا اس کے پورے جسم میں تھوہر اگ آئے ہیں۔ پورا جسم کانٹوں سے مزین کر دیا گیا ہے۔ ہر چیز کا ذائقہ زہر کی مانند ہو گیا ہے۔ اس کا وجود شہد کے اس چھتے کی طرح بے کار ہو چکا ہے۔ جس سے سارا شہد نچوڑ لیا گیا ہو۔ اعتبار کا پنچھی اڑ گیا، اس سے دل کے پلو سے بندھا ہوا کھیت اعتبار کی گرہ کھلنے پر پلو سے جھڑ گیا۔ مور کے سارے رنگ ماند ہو گئے اور مور مر گیا، تھر کی خوب صورتی ختم ہو گئی، تلور کی اڑانیں ان دیکھے دیس کی طرف رواں دواں ہو گئیں۔

"ماروی سے اعتبار اٹھ گیا!! قحط آ گیا قحط۔"

صدیوں کا فاصلہ اس کی ذات میں سمٹ آیا۔ اس کا کھیت اجڑ گیا وہ بنجر ہو گئی بیاباں سی دکھنے لگی۔ سارے وڑیھے میں بچھو جمع ہو گئے۔ وہ ڈنک پر ڈنک مارتے رہے، اپنی زہریلی زبانوں سے بدبودار الزام لگا کر۔ شہد کی مکھیوں نے شہد بنانا چھوڑ دیا۔ گلوں کا رس چوسنا بند کر دیا، وہ ساری اس کے وجود سے چمٹ چکی تھیں۔ پاندھی نے ماروی کو چارپائی پر لٹایا۔ خود صدیوں کا راستہ پیدل طے کر کے آگے بڑھا۔

"چھوڑ دو میری بیٹی کو۔ ارے یہ بے گناہ ہے۔ یہ میری ماروی ہے۔ میری ماروی۔ اپنی لوئی کی لاج رکھنے والی۔ یہ کوئی بازار کی گری پڑی چیز نہیں۔ تھر کی بھوک کاٹ کر، تھر کا جنگلی اناج کھا کر جوان ہوئی ہے اس کے فاقے میں بھی فرحت ہے۔"

"بھوک ہی تو تھی جو اسے وہاں لے گئی چاچا۔"

"ارے جھوٹ بولتے ہو کھیت۔ اگر بھوکی ہی ہوتی تو لوٹ کر نہ آتی ان محلاتوں کو چھوڑ کر۔"

"چلے جاؤ سب تہمت باز، میرا خون گندہ نہیں ہو سکتا۔ میں حرام خور نہیں، میں نے اس تھر کا جنگلی اناج میوے کھا کر، اپنی ماروی کو پالا ہے۔ اس میں میرا خون دوڑتا ہے۔ تھر کی محبت پال کر جوان ہونے والی ماروی، کبھی بھی مارو سے بے وفائی نہیں کر سکتی، نہیں کر سکتی۔" وہ دونوں بازو ہلا کر زور زور سے بولا۔

"چریا ہو گیا ہے چریا (پاگل)۔" آواز آئی۔

"لج لٹنا برداشت نہیں کر پایا، چ چ، بے چارہ۔" سب چلے گئے، اس وڑھے میں ایک پاندھی اک ماروی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

کوئی کاندھا بھی نہیں تھا۔ ماں کی جھولی — بھی نہیں تھی کہاں سر رکھتی کہاں آنسو بہاتی۔ کس کس کی بات کا غم مناتی۔ کسی نے اک لحظے کو بھی نہیں سوچا کہ وہ غم زدہ ہے۔ موت کا سوگ ہے، سب انگلی اٹھانے لگے۔ اس کی چنری بوسیدہ ضرور ہو گئی تھی، مگر بے داغ تھی۔ اس کا مور مر گیا، اس کی ماں مر گئی۔ اس کا کھیت اجڑ گیا، بدظن ہوا، اس کی ساری محبتیں اجڑ گئیں۔

وہ جو عمرکوٹ سے زندہ لوٹی تھی۔ اسے کھیت نے مار دیا۔

وہ اس کے لیے نہیں مرا تھا، مگر وہ کھیت کے لیے مر چکی تھی۔ ماروی کو محلاتوں نے نہیں مارا، محبت کی بے اعتمادی نے مار دیا، چارپائی اس کے روتے وجود کے بار سے ہل رہی تھی۔ زمین پر بیٹھا پاندھی اس کے ساتھ ہچکیاں لے رہا تھا۔ سارے غم ماروی کی ذات سے چمٹ گئے۔ اس کا پورا جسم درد کر رہا تھا اور اس کی مہربان ماں بھی نہیں تھی جو درد کو جھاڑنے والی کونبھٹ (تھری درخت) کے گوند میں شیرینی ڈال کر بھون کر لڈو بنا کر ماروی کو کھلاتی۔

"سو جا میری دھی! سو جا۔" پاندھی اس کے سرہانے آبیٹھا۔

"ابا! جو ماروی بیچ کر آئی وہ یہاں آکر لٹ گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ نہ اماں، نہ کھیت، نہ مور، کچھ بھی باقی نہیں بچا۔" وہ سسک کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ چکرا کر پھر گر گئی۔ پاندھی لڑکھڑاتا اندر گیا، مٹکے سے پانی نکالا ایک پلیٹ میں چاول نکالے اس کے آگے لاکر رکھا۔

"اٹھ میری دھی، کچھ کھا پی لے۔ بڑے لمبے سفر سے آئی ہے۔" سہارا دے کر اسے بٹھایا نوالہ منہ میں ڈالا۔ وہ نگل نہیں پا رہی تھی۔ ایک گھونٹ پانی پلایا اس نے بمشکل نگلتے کہا۔

"ابا! کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ رو پڑی۔

"منہ کا ذائقہ کڑوا ہے۔"

"ہاں میری دھی، پر تو فکر نہ کر۔ میں ہوں نا، تمہارا بھی، باپ بھی، ماں بھی۔ بانہہ بیلی (ہاتھ پکڑنے والا دوست) بھی، میں ابھی زندہ ہوں۔ تمہارا ساتھ دینے کو۔" پاندھی نے لرزتا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

ماروی پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس نحیف و نزار ہاتھ کو پکڑ کر اپنے ہونٹوں سے لگایا۔

"ابا! تو تو بے اعتبار نہیں نا؟"

"نہ میری دھی نہ، اگر میں تجھ پر اعتبار نہ کروں تو سورج مغرب سے نکلے، رات دن میں نہ بدلے، کبھی صبح نہ ہو۔" پاندھی نے اس کا ماتھا چوما۔

"ابا! سارے عالم کے اندھیرے میں تو میری صبح ہے، میری روشنی ہے۔" ماروی رو پڑی۔ ایک بار پھر پوری شدت سے۔

"بس نہ رو، نہ جی جلا، تیرا رونا تیری ماں کو پسند نہیں تھا۔ پتا ہے جب تو چھوٹی تھی تو تیری ماں پہروں بیٹھ کر بیسر چنتی، میں کہتا کیوں اتنا جی کھپاتی ہو، تو وہ کہتی ماروی کے ابا جب قحط آتا ہے تو ماروی چیز کے لیے روتی ہے۔ یہ سکھا کر تھیلے میں رکھتی ہوں، رونے پر پھونک مار کر گرد صاف کر کے یہ اسے دیتی ہوں تو وہ چپ ہو جاتی ہے۔ تیرا رونا تیری ماں کو پسند نہیں تھا بیٹا۔" پاندھی اس کے بالوں میں ہاتھ گھما کر سر سہلا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس بے چین رات کی صبح بھی بے کل تھی۔ وہ علی الصبح باپ کے ساتھ ماں کی قبر پر آئی۔ تازہ مٹی کی بنی قبر وہ دیکھتے ہی پوری شدت سے رو پڑی۔

"اماں تو بھی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ میں کس کی گود میں سر رکھ کر روؤں گی، میں کس کو اپنے دکھڑے سناؤں گی، کس کس کو اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں گی تو ہوتی تو میری طرف سے بولتی، لڑتی، لوگوں کی زبانیں بند کرواتی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ غم تھا جو سیلابی ریلے کی طرح زمین پھاڑتا جا رہا تھا۔ پر بند ٹوٹ گیا۔

"بس کر بیٹا مت رو۔ تیری ماں کی روح کو تکلیف ہو گی۔" پاندھی دو زانوں بیٹی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ابا! بہار میں اماں بھیڑوں کی اون اتارتی تھی۔ اس سے شال بناتی تھی۔ اب کون بھیڑوں کی اون اتارے گا۔ چوماسو (برسات کے چار مہینے) میں اماں کتنا خوش ہوتی۔ ہر وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر بارش کی دعا مانگتی رہتی۔ بارش کے بعد جب —— لال پھول نکلتے تو اماں وہ پھول دھاگے میں پرو کر مجھے ہار بنا کر پہناتی، اب دیکھ اماں سارے لوگ مجھے کانٹوں کے ہار پہنا رہے ہیں۔"

"بس اٹھ جا بیٹا! اٹھ جا۔ اب نہ رو، چل سورج نکل آیا گھر چلتے ہیں۔" ان دونوں کے —— سر درد سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ بڑی مشکل سے چل کر گھر پہنچی۔ کھیت اور ساجن —— چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ آگے نہیں بڑھی، مور کی قبر کے پاس بیٹھ گئی۔

"تو میرا سچا عاشق نکلا، جو جان گنوا دی۔" اس نے مور کی قبر کو ہاتھ سے سہلا کر خود کلامی کی۔ کھیت چل کر اس کے پاس آبیٹھا۔

ماروی نے نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ مور کی قبر کو سہلاتی رہی۔ اس کا ہاتھ بے خودی سے اس چھوٹے ٹیلے کے گرد گھومتا رہا۔

"مور مر گئے سارے ہنس، ایک بھی نہ رہا۔
جھیل ساری بھر چکی ہے، مگر جھوٹے کووں سے۔"
ماروی نے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے بیت میں دہائی دی۔

کھیت اس کا طنز سمجھ گیا۔ بے ساختہ لب کاٹا۔ وہ اب بھی کھیت کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ بیت بھی خود کلامی کے سے انداز میں پڑھا تھا۔

"ماروی!" کھیت نے پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔

ماروی نے نظر اٹھا کر شکوہ کناں نظروں سے دیکھا۔ کھیت اس کی نگاہوں کا شکوہ سہہ نہیں پایا، فوراً" نظریں چرائیں۔

"تمہیں کس نے اغوا کیا تھا۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"بولو ماروی۔"

"میری زبان پر وعدے کا قفل لگ چکا ہے۔"

"کس کے ساتھ کیا تھا وعدہ؟" کھیت برہم ہوا۔

وہ کھیت کے لہجے میں چھپے شک پر طنزیہ مسکرائی۔

"جواب دو ماروی۔"

"جس کی مدد سے مجھے چھڑایا گیا تھا۔"

"نام لو اس کا۔"

"نہیں، وعدہ خلافی میری سرشت میں نہیں۔" ماروی نے اک بار پھر خود اعتمادی سے کھیت کو دیکھا۔ وہ اس بار بھی نظریں چرا گیا، ماروی کی نظروں کی تاب اس کی برداشت سے باہر تھی۔

"تمہیں عمر نے اٹھایا تھا؟" اس بار عمر کے نام پر انجانے میں اس کا لہجہ طنزیہ ہوا۔

"جانتے ہو تو پوچھتے کیوں ہو؟"

"تمہیں یہ جرگے میں کہنا پڑے گا۔"

"نہیں، ہرگز نہیں۔" ماروی نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر لوگ کہیں گے تم رضا خوشی سے گئی تھیں عمر کے پاس۔" کھیت نے غصے سے کہا۔

"تم بھی ان ہی لوگوں میں سے ہونا؟" اس کا سوالیہ انداز میں کہنا، پہلی بار کھیت کو گڑبڑا گیا۔

"ان ہی لوگوں میں شامل ہونے پر میری مبارک باد قبول کرو۔"

"تم بات کو بڑھا رہی ہو، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" کھیت نرم ہوا۔

"وار چھپ کر کیا جائے یا ظاہر، زخم دونوں صورتوں میں لگتا ہے۔" کھیت کے رات کے جملے نئے سرے سے رس رہے تھے، ان زخموں میں درد مچل رہا تھا۔ کھیت جان کر انجان بنا۔

"میں نے پچھلے آٹھ دنوں میں ان تھک محنت کی ہے۔ لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے، احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے، ساری برادریاں ہم سے مل گئیں، تب ہی تمہیں وہ چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اب جرگے کا فیصلہ ہمیں بھی ماننا پڑے گا، تب ہی میں کہہ رہا ہوں تمہیں جرگے کے سامنے عمر سومرو کا نام بتانا پڑے گا۔" کھیت نے صورت حال اس کے سامنے رکھی۔

"وہ اسے مار دیں گے، میں نام لے کر اس کے لیے موت نہیں لوں گی۔" اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"کون ہے وہ آخر، جسے عمر سومرو مار دے گا؟"

"میں نہیں بتا سکتی۔"

"تمہارے کیے کرائے پر پانی پھیر دینا چاہتی ہو۔ کیا سمجھیں، ہم تمہاری اس ضد کو۔"

"جو جی میں آئے سمجھو۔" ماروی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے بہتے آنسو چنری کے پلو سے پونچھے۔

"یہ وہی ماروی ہے، اپنی لوئی، چنری بچانے والی۔" کھیت کو پہلی بار اپنے کہے لفظوں پر پچھتاوا ہوا۔ ماروی کے پُراعتماد لہجے نے اس کے شک کو متزلزل کر دیا تھا۔

سکھاں صبح کی چائے روٹی لے آئی تھی۔ موت والے گھر میں روایت کے مطابق، وہ سکھاں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کھیت خاموشی سے اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"جرگہ ماروی کے بیان کی روشنی میں یہ فیصلہ کرتا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

ہے کہ ماروی اپنے اغوا کنندگان کا نام بتانے سے قاصر ہے۔

اب الزام کے مطابق وہ خود چل کر گئی ہے' ثابت ہو رہا ہے اور وہ پاک باز ہے یا نہیں۔ اسے اب اپنی پارسائی کا ثبوت آگ پر چل کر دینا پڑے گا۔" راھوں سردار نے متفقہ فیصلہ پڑھ کر سنا دیا۔

"مگر سائیں' میری بیٹی بے گناہ ہے۔" پاندھی تڑپ اٹھا۔

"دیکھ پاندھی' اسی بے گناہی کا ہی تو ثبوت مانگ رہے ہیں۔" لوند سردار بولا۔

"ارے بابا! بے گناہ تو صدیوں پہلے والی ماروی بھی تھی۔ اس نے بھی تو اپنی سچائی کی ساکھ (گواہی) آگ پر چل کر دی تھی۔ تب ہی آج تک امر ہو گئی۔ لوگوں کے دلوں سے سارے شک دور ہو گئے۔" نارنجی پٹکے والا بھیلوں کا سردار بڑھ چڑھ کر بولا۔

"پنچایت نے یہ بات جرگے کے سامنے پہلے ہی رکھ دی تھی کہ ماروی کو ساکھ دینی پڑے گی۔ ہم نے آپ کا ہر طرح کا ساتھ دیا تو آپ کو بھی یہ بات ماننا پڑے گی۔ کیوں ساجن؟" نہڑیا سردار نے ساجن سے رائے لی۔

ساجن نے ایک لمحے کو کھیت کو دیکھا' اس کی آنکھوں میں رضامندی دیکھ کر اقرار میں سر ہلا دیا۔

"ہمیں جرگے کا فیصلہ قبول ہے۔" ساجن سندھی نے دستخط کر دیے۔ پاندھی لاچارگی سے سب کو دیکھنے لگا۔

"میرا دل نہیں مانتا یہ سراسر ظلم ہے میری بیٹی کے ساتھ۔ دکھے دل کو پھر دکھانا کون سی نیکی ہے۔" پاندھی نے پھر کمزور سا احتجاج کیا۔ پورا گاؤں' جرگے کے سارے قبیلوں کے سردار' وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی کوئی۔ بھی نہیں سنے گا۔

"چاچا پاندھی! برادریوں سے مدد لینے اور ارباب حاکم پر الزام لگانے سے پہلے یہ ساری باتیں سوچ لیتے اب تو جو جرگہ فیصلہ کرے گا' وہی ماننا پڑے گا۔"

درس قبیلے کا جنگام درس پہلی بار بولا۔

"جلدی کرو آگ جلاؤ' تیاری شروع کر دو۔"

پنچایت نے فیصلہ صادر کر دیا۔

دو نوجوان بیلچے لے کر بیچ میدان میں آئے' دو فٹ چوڑی' چھ فٹ لمبی' ڈیڑھ فٹ گہری' کھدائی کر کے خندق بنائی اس میں لکڑیاں ڈال کر ان کے اوپر پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی۔ سارے سردار اس آگ سے انگارے بننے کے انتظار میں اک دوسرے کے ساتھ کانا پھوسی میں لگے ہوئے تھے' انہیں ارباب حاکم سومرو کے ہاں بھی سرخرو ہونا تھا یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔ روایت کے موجب ایسا ہو کر رہنا تھا۔ سارے سردار اپنے فیصلے پر مطمئن تھے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے جرگے کا فیصلہ نامنظور ہے۔" ماروی نے سنتے ہی شدید مخالفت کی۔

"ہم یہ فیصلہ ماننے پر مجبور ہیں بیٹا۔" ساجن سندھی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"مگر چچا! یہ زیادتی ہے۔ ساکھ ہی لینی ہے تو قرآن پر لو' قسم لو۔ یہ آگ پر چلنا کہاں کی دانشمندی ہے۔" ماروی چل کر ان کے پاس آئی' کھیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تمہیں نہیں پتا آگ ہر گناہ گار و بے گناہ کو یکساں جلاتی ہے اگر اسے لوگ پا لیں تو۔"

"آگ ابراہیم کے لیے گلزار بھی تو بن جاتی ہے۔" کھیت نے نظریں چرا کر کہا۔

"تو تم بھی اس ظلم میں شریک ہو۔" ماروی نے دکھ سے کہا۔

"نہیں مجبور ہوں۔" کھیت کی آواز مدھم ہوئی۔

ماروی چند لمحے اسے تکتی رہی تو تم بھی تھر کے موسم کی طرح ہی نکلے' سردیوں میں سرد' گرمیوں میں گرم' تمہارا اعتبار' وفا' محبت' موسم کی طرح رنگ بدلتی ہوئی۔ ماروی زیر لب بولی۔

"شاید میں تمہارا مجرم ہوں۔" کھیت نے صفائی دی۔

"تمہارے جذبے شاید کے بیچ ڈگمگا رہے ہیں۔
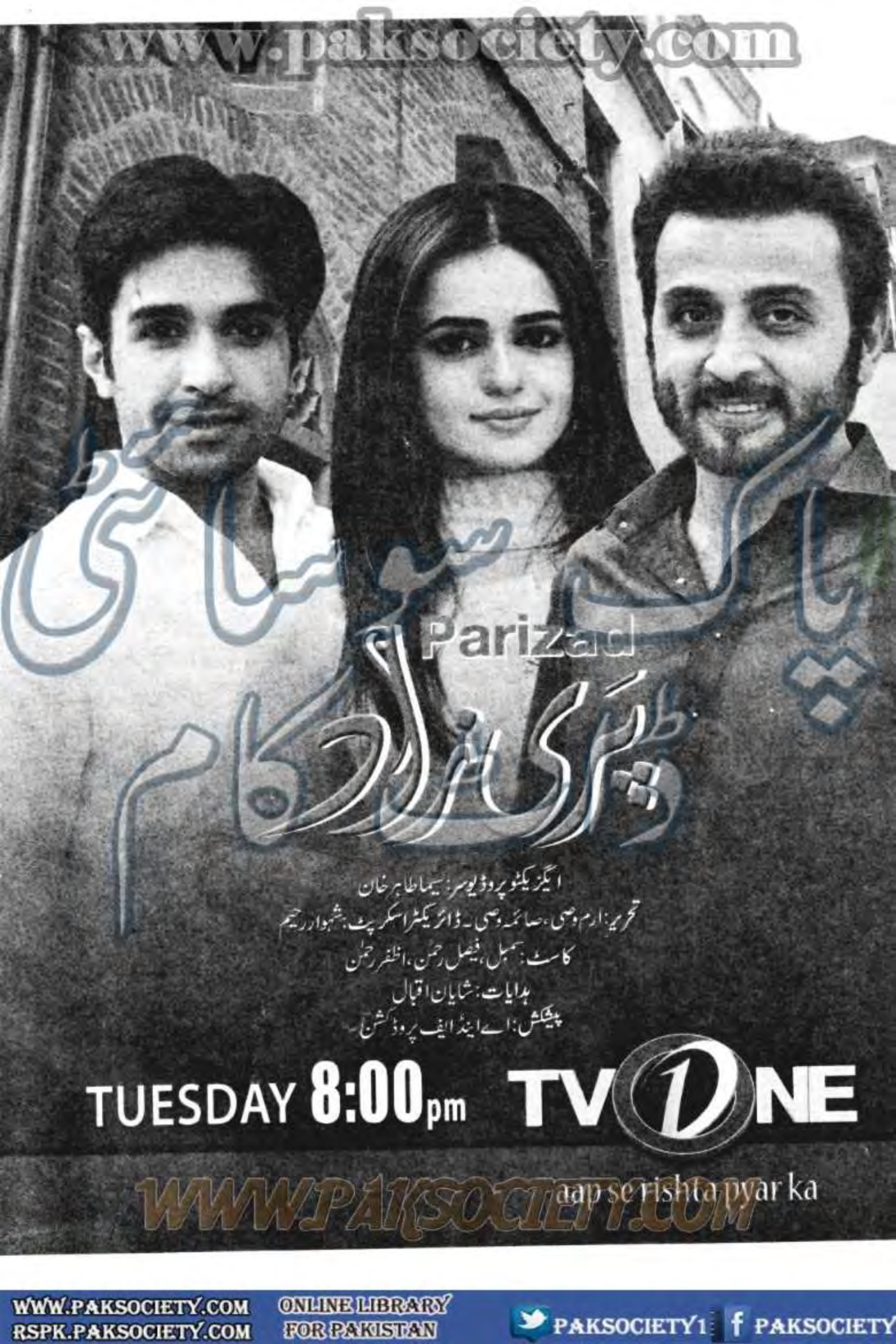
کیا توڑے گی پری زاد۔۔۔شادی کا بندھن یا محبت کی ڈور؟

پری زاد ایک ذہین اور خوبصورت لڑکی ہے جو لڑکیوں کی تعلیم کی زبردست حامی ہے۔اس کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے اپنے گھر کے خرچ میں ہاتھ بٹانے کے لیے وہ ایک اسکول میں پڑھاتی ہے اور سہ پہر میں پڑوس کی لڑکیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرتی ہے۔ وہ اسکول میں اپنے ایک کولیگ علی سے محبت کرتی ہے اور دونوں شادی کا خواب دیکھتے ہیں، مگر عین اس وقت جب علی اپنا رشتہ بھیجنے والا ہوتا ہے پری زاد کے خاندان میں ایک ایسی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے جو پری زاد کو ایک اہم فیصلے کے دوراہے پر لا کھڑا کرتی ہے۔ پری زاد کے بھائی کو ایک خطرناک مافیا اغواء کر لیتی ہے اور اس کی رہائی کے عوض بھاری معاوضہ طلب کرتی ہے، اپنے گھر کی عزت بچانے کے لیے پری زاد کو ایک مالدار شخص منصور سے شادی کرنا پڑتی ہے جس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ دو نوجوان لڑکیوں کا باپ ہے۔منصور پری زاد کے بھائی کی رہائی کے لیے مطلوبہ رقم فراہم کر دیتا ہے پری زاد کو شادی کے بعد پتہ چلتا ہے کہ منصور صاحب ایک سخت گیر انسان ہیں جو فرسودہ اور کٹر روایتی خیالات رکھتے ہیں اور وہ لڑکیوں کی تعلیم کے سخت مخالف ہیں۔منصور صاحب کے گھر کا ماحول کافی گھٹا گھٹا سا ہے منصور صاحب کا بھانجا ارشد ایک عیار، لالچی اور سازشی شخص ہے جو ماموں کی دولت اور اُن کی عزت پری زاد پر بری نظر رکھتا ہے۔پری زاد کی اس پریشان کن زندگی میں اچانک علی واپس آتا ہے اور اسے منصور سے دامن چھڑانے اور اپنی شریک زندگی بننے کی پیشکش کرتا ہے۔اب پری زاد زندگی کے ایک اہم دوراہے پر کھڑی ہے کہ وہ کیا فیصلہ کرے؟

کیا وہ علی کی محبت کو خاندان کی بھینٹ چڑھا دے گی؟

کیا وہ سخت گیر اور فرسودہ خیالات کے مالک منصور کے گھر دو سوتیلی بیٹیوں کے ساتھ گزارا کر سکے گی؟

/TvOnePK /TvOnePK.tv

یقین سے دوری سب کچھ لے ڈوبے گی۔" وہ افسوس سے نفی میں سرہلاتے بولی۔ کھیت کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"مجھے معاف کردینا میری بیٹی' میں تمہیں اس ظلم سے نہیں بچا سکا۔" پاندھی نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ساجن اس کی شدید مخالفت دیکھ کر پاندھی کو لے کر آیا تھا۔

"ابا! تو تو کڑی دھوپ میں میرا سایہ ہے' میری چھپر چھایا ہے تو حکم کر' میں جان دے دوں گی۔" ماروی نے پاندھی کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر آنکھوں سے لگائے' پاندھی پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

"مجھے پتا ہے تو انگاروں پر چل کر آئی ہے۔ بیٹا ہم نے تیرے زخموں پر مرہم نہیں رکھا' پھر انگارے جلا لیے تجھے جلانے کو۔" پاندھی نے کانپتے ہاتھوں سے بیٹی کو اپنے سینے سے لگایا۔

"چل ابا چل' تیری خاطر میں یہ گواہی دینے کو تیار ہوں۔" ماروی نے چٹری سے سر ڈھانپتے کہا۔

"یا اللہ! میری بیٹی کو ثابت قدم رکھنا۔" پاندھی گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا۔

ماروی ان کی معیت میں چل کر میدان میں جرگے کے پاس آئی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی تھی۔ عورتیں اپنے جھونپڑوں سے باہر نکل کر میدان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

لوئی جو لپٹی ہوئی تھی' لاج جو سلامت تھی' سر جو اونچا تھا' آسرا جو بڑا تھا۔ ماروی کی زبان دعا سے تر ہوئی۔

"میرے مالک حقیقی' تو اس ماروی کی حقیقت حال سے واقف ہے' تو جانتا ہے۔ سچائی تو پہچانتا ہے۔ میری پاکبازی' ماروی کو اس اندھی دنیا سے کسی انصاف کی امید نہیں' پر تو منصف ہے' بے گناہ نہیں جلاتا' وہ ابراہیم علیہ السلام جو تیرا خلیل تھا' اس کے صدقے اس آگ کو بے اثر کردے۔ بے شک ہر چیز تیرے تابع ہے۔ ہر چیز تیری قدرت سے قائم و دائم ہے۔

ماروی کو صرف تجھ سے امید ہے کسی اور سے نہیں۔"

ماروی نے اللہ کے آسرے پر تھر جتنے وسیع عزم سے دنیا کے دوزخ پر اپنے قدم دھرے' جس وقت اس نے قدم انگاروں پر رکھا۔ ہوا ساکت ہوئی ——

اور کھیت نے دم سادھ لیا۔

نیچے دہکتے انگاروں کی پل صراط پر ماروی چل رہی تھی اور اوپر اللہ سائیں کی رحمت کا آسرا تھا۔

جس کی ذات کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا ہے۔ اور جس کی رحمت اتنی وسیع ہے۔

ماروی پل صراط پار کر رہی تھی' وہ چار قدم آگ پر چلی۔ پانچواں قدم ریت پر رکھا۔ فیصلہ آیا چاہتا تھا' کھیت پل صراط کے سرے پر لٹک رہا تھا۔ تو کہ ماروی کے ہونٹ تبسم ریز تھے۔

پاندھی دوڑ کر ماروی کی طرف آیا' اسے گلے سے لگایا۔ بے اختیار پیشانی چومی۔

"ابا! کچھ نہیں ہوا۔" ماروی نے مسکرا کر باپ کو دلاسا دیا۔ ماروی چارپائی پر بیٹھ چکی تھی۔ تین سردار اس کے پاؤں دیکھنے کو فیصلہ سنانے کو آگے بڑھے۔

پاندھی نے نیچے بیٹھ کر' اس کے پاؤں سے ریت صاف کی۔ اپنی اجرک سے' ججوں نے بغور ماروی کو دیکھا' شاید کوئی درد بھری سسکی منہ سے نکلے۔ مگر وہ مسکرا رہی تھی' اس کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔

تینوں جج زمین پر بیٹھ گئے۔

اس کے پاؤں بالکل شفاف تھے' تھر کی ریت کی طرح چمکتے ہوئے۔

کوئی زخم' کوئی پھپھولا' کوئی جلنے کا نشان' ناپید تھا۔ سردار ججوں نے ایک بار جانچا' دوبار' سہ بار' حیران پسینے میں تر بتر اٹھ کھڑے ہوئے' پٹکے کے پلو سے پسینہ پونچھا۔

"ماروی بے گناہ' پارسا' پاک باز ہے۔ اس کے پاؤں پر آگ کا اک نشان بھی نہیں۔" ایک جج نے

اعلان کیا۔ دو نے ہاتھ اٹھا کر، سر ہلا کر تائید کی۔

"پاندھی کو مبارک ہو۔" اک جج نے پاندھی کا کاندھا تھپکا۔

"کسی کو شک ہو تو آ کر خود چیک کر لے۔" ایک جج نے اعلان کیا۔ پاندھی نے ماروی کو چارپائی پر لٹا دیا۔ ایک ایک کر کے لوگ اس کی پائنتی سے گزرتے جانچتے عین الیقین حاصل کرتے رہے۔

پاندھی پر مبارک باد کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے۔ معاشرے کی وڈیرانہ چال کامیاب ہو کر ناکامی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ماروی کا رب بڑا تھا اور اس کا آسرا اتنا ہی جتنا اس کا نام وہ اس یقین کے آسرے اللہ کی امید پر پار لگ گئی۔ اللہ نے اسے استقامت عطا کی۔ وہ توکل پر تکیہ کیے، مجازی محبت سے من مار کر حقیقی محبت کی حق دار بن کر، راہ عشق حقیقی میں قدم رکھ چکی تھی۔

کھیت سرخرو ہو چکا تھا، ماروی کی سرخروئی نے اسے اپنے ہم عمروں میں سربلند کر دیا تھا۔ مسرت اس کے انگ انگ سے پھوٹتی تھی۔ سب کھیت کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اس کا قد اونچا ہو رہا تھا۔

وہ ماروی کی پائنتی آ کھڑا ہوا، اس کے پاؤں پر نگاہ کر کے چہرے پر ڈالی، مسکرا کر ماروی کو دیکھا۔ ماروی کے تبسم ریز ہونٹوں نے مسکرانا ترک کر دیا۔ لب بھینچے آنکھیں بند کر لیں۔ عشق مجازی سے آنکھیں بند ہو کر عشق حقیقی میں کھلتی ہیں۔

ماروی کی نظروں میں وہ کوتاہ قامت بن گیا۔ اس کے دل سے اتر گیا۔ بس اتنی ہی تھی تیری محبت۔

وہ جو ماروی تھی، تھریائی، وہ بھٹائی کی ماروی ..... بنتی جا رہی تھی۔ وہ راہ سلوک میں ثابت قدم رہی تھی۔ اس رات، کئی راتوں کے بعد وہ بڑی گہری نیند سوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ صبح بڑی خوشگوار تھی، اس کا باپ منہ اندھیرے بھٹوں سے بکریاں واپس لا کر ان کا دودھ دوہنے لگا۔ اس نے اٹھ کر نماز فجر ادا کی۔ چولھے میں لکڑیاں جلائیں تسلے میں آٹا گوندھا، اک طرف توے پر روٹی ڈالی، دوسرے مٹی کے چولہے پر چائے چڑھائی۔

دو روٹیاں، دو کپ چائے، انتظار میں بیٹھے باپ کی طرف آئی۔

"تو بھی کھا دھی۔"

"چولھے سے لکڑیاں نکال کر آتی ہوں۔" اس نے پانی کا چھینٹا دے کر لکڑیاں بجھائیں۔ باپ کے ساتھ آ کر ناشتہ کرنے لگی، کئی دنوں کی مسلسل بھوک کے بعد روٹی کا ذائقہ اچھا لگ رہا تھا، وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر کر نوالے کے ساتھ کھاتی رہی۔ ابھی آدھی روٹی، آدھی پیالی چائے کی باقی تھی کہ ساجن اور کھیت آ گئے۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم سلام چاچا!" ماروی نے کھیت کو نظر انداز کر کے ساجن کو جواب دیا۔ ساجن سندھی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بھاؤ پاندھی، میں سوچ رہا ہوں کہ بھاجائی کا چالیسواں گزار کر ہم شادی کی تاریخ رکھ دیں۔ بہت دکھ دیکھ لیے۔ اب کچھ خوشیوں کی تیاری بھی کر لیں۔" ساجن سندھی نے ہنس کر کہا۔

پاندھی نے بے اختیار ماروی کو دیکھا، جو مسلسل سر نفی میں ہلا رہی تھی۔

"جو ماروی کی رضا۔" پاندھی بولا۔

"ابا! میں کھیت سے شادی نہیں کروں گی۔" ماروی نے فوراً کہا اور ناشتہ چھوڑ کر اندر کی طرف بڑھ گئی۔

پاندھی چپ ہو گیا۔

کھیت کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی۔

"ناراض ہے تم سے۔" ساجن نے کھیت سے کہا۔

"مناؤں گا۔" کھیت نے جواب دیا۔

"پھر جاؤ، من جائے تو منالو۔" پاندھی بولا۔

کھیت اس کے پیچھے چونرے میں داخل ہوا۔

"ماروی میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"کیسی محبت؟ کیا ایسی بے اعتبار محبت؟ تمہیں رتی بھر احساس نہیں تھا کہ میں کن انگاروں سے گزر کر آئی ہوں، تم نے پھر مجھے انگاروں پر چلنے کے لیے مجبور کیا۔"

"یہ جرگے کا فیصلہ تھا، اس کی حمایت کرنا لازمی تھا۔"

"سب حمایت کرتے بس صرف اک تم حامی نہ بنتے، ساری دنیا ایک طرف ہو جاتی کھیت، مگر تم دوسری طرف ہوتے۔ مجھے دنیا کا غم نہیں ہوتا، مجھے تو تمہارا غم کھا گیا۔ آخر کسی سورمی کو ایسا سورما کیوں نہیں ملتا، جو کہے سب جھوٹ صرف تو سچ، سب ناحق پر، صرف تو حق پر، سب غلط صرف تو صحیح، سب کے الزامات کی نفی صرف تیری بات اثبات، ایسا سورما آج تک کیوں پیدا نہیں ہوا جو سورمی کی ذات کو مکمل کر دے۔" کھیت مجرم بنا وہ ساری باتیں سنتا رہا۔

"وفا صرف عورت کے دامن سے ہی کیوں بندھی ہوئی ہے کھیت! مرد محبت کو مردہ کر کے وفا کو بے اعتباری کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ مگر تم عام مردوں سے ہٹ کر ہو کھیت، تم اس نظام کے باغی ہو۔"

کھیت کو اس کے لفظوں سے ڈھارس ملی، دل میں خوش کن امید اُمڈ آئی۔

ماروی نے پلٹ کر اس کی آنکھوں میں دیکھا، مردہ عکس، کھیت کی آنکھوں میں لہرا رہا تھا۔

"اور باغی نہ وڈیروں کا جھوٹا کھا سکتا ہے۔ نہ تھوکا ہوا چاٹ سکتا ہے۔" ماروی نے اپنی بات تلخی بھرے لہجے میں مکمل کی۔

کھیت اس کے لہجے پر لڑکھڑا گیا، پہلی بار اپنے کہے ہوئے لفظوں کی تلخی اور بے رحمی کا شدت سے احساس ہوا۔

"کوئی بھی مرد میری جگہ ہوتا تو یہی کہتا اور تمہارے ریت سے اٹے وجود کو دیکھ کر، لٹے پٹے وجود کا شک گزرتا تھا۔ بہت شرمندہ ہوں اپنے کہے لفظوں پر، ہر ازالہ کرنے کو تیار۔" وہ بہت کچھ اپنی صفائی میں کہتا گیا۔ ماروی کئی لمحوں تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"ازالہ تو وہ کرتے ہیں، جنہیں اپنی زیادتی کا یقین ہو۔ تم تو اب بھی یہی کہہ رہے ہو کہ میری جگہ کوئی بھی مرد یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میرا رویہ فطری تھا، اسی بات کا تو دکھ مارے دیتا ہے، بات تو تب بنتی یقین تو شروع ہی اس وقت ہوتا ہے، جب پوری دنیا میرے خلاف ہو جاتی اور صرف تو اٹھ کر کہہ دیتا یہ معصوم بے گناہ ہے، جس یقین کا تمہیں شک گزرا وہ یقین نہیں واہمہ ہے۔ ایمان نہیں گمان ہے۔ جن راستوں پر ہم" ماروی نے اک لمحے کو رک کر گہری سانس لی۔

"ہم قدم تھے، ان راستوں کو بے اعتباری کی دھول نے چاٹ لیا، شک نے نگل لیا، اب کچھ نہیں بچا۔ دل کو قفل لگ گیا اور چابی اس دریا میں گم ہو گئی جہاں اب ریت اُڑتی ہے۔" ماروی کے کرب کے کارن نکھر کر کھیت، مور کھیت، بیماری میں جکڑا مور دکھائی دیتا تھا۔ وہ مور جو رقص کرنا بھول گیا ہو اور جس کی خوب صورتی کو عفریت نے چاٹ لیا ہو۔ جس کے رنگ اڑ گئے ہوں اور وہ یک رنگا ہو گیا ہو، صرف شک کا رنگ رہ گیا ہو۔

کھیت نے محبت سے بھرے ماضی کو حال میں آواز دی۔

"ماروی! مجھے تم سے کل بھی محبت تھی۔ آج بھی ہے، کل بھی رہے گی۔ محبت کی ناقدری نہیں کرنا چاہیے۔ محبت وقت پر ملے تو اسے وقت پر لے لینا چاہیے۔"

"اور وقت پڑنے پر کھو جائے تو؟" ماروی کے اس سوال کا کھیت کے پاس جواب نہ تھا۔ غم کی اتھاہ گہرائیوں سے سانس لی، آنکھیں مستقبل کے وچھوڑے کے اندیشے سے بھر آئیں۔

"تو پچھتاوا پیچھا نہیں چھوڑتا۔" کھیت نے کہہ کر تھوک نگلا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔ ماروی!"

"مگر ماروی نے دنیا کی ٹھوکریں کھا کر جینا سیکھ لیا

ہے کھیت' اسے اکیلے رہنا اور اکیلے جینا آتا ہے۔ زندگی میں کسی ساتھی اور شادی کا ہونا بہت کچھ سہی' مگر سب کچھ نہیں۔ میرے ساتھی اب میرے مارو ہیں' میرے غریب لوگ' جن کی زندگیوں کو بدلنا میرا مقصد حیات' میرا عشق ہے۔ میری ترجیح اب ایک کھیت نہیں' ان ساری زمینوں کو آباد کرنا اب میرا عزم ہے۔ ان لوگوں کی مشکلات کے حل کے سلسلے میں میری روزانہ مختلف لوگوں سے بات چیت ہوگی' رابطہ ہوگا اور تمہارے جیسا بے اعتبار شخص روز مجھے ایک نئی صلیب پر لٹکائے گا۔ جو اعتماد اک بار اٹھ گیا اب وہ لوٹ نہیں سکتا زبان سے نکلی بات اور دوہا دودھ تھنوں میں واپس نہیں جاتا۔"

ماروی کہہ کر رکی نہیں' باہر نکلی۔ دروازے کی چوکھٹ پر جیپ آکر رکی تھی۔ وہ پاندھی کے پاس آئی۔

"ابا چلیں گاڑی آگئی۔" پاندھی نے اجرک اٹھا کر لپیٹ کر کاندھے پر رکھی۔

"کہاں جارہے ہو؟" ساجن نے حیرت سے کہا۔

"ماروی کو نوکری مل گئی ہے۔" پاندھی نے بولا۔

"کہاں؟"

"شمع نے فون کرکے بتایا ہے۔ آج اپائنٹمنٹ لیٹر لینے جانا ہے چاچا۔" پاندھی کے بجائے ماروی نے جواب دیا۔ کھیت لٹا پٹا اس کے پیچھے کھڑا تھا۔

"مگر شمع کا کردار تمہارے اغوا میں مشکوک تھا۔ مت جاؤ۔" کھیت فوراً بولا۔

ماروی نے رخ موڑ کر اسے دیکھا' پھر تلخی سے مسکرائی۔

"جس داغ سے عورت ساری عمر ڈرتی ہے' وہ داغ میرے دامن پر لگ چکا ہے۔ مجھے اب کسی کا نہ ڈر ہے نہ دکھ۔" ماروی باپ کا ہاتھ پکڑے جیپ میں جا کر بیٹھی۔ ساجن نے دکھ سے کھیت کو دیکھا۔ جس کے چہرے پر ناکامی رقم تھی۔

اڑتی ہوئی دھول نے اپنے پیچھے بے تابی سے آنے والے کھیت کو مٹی مٹی کردیا۔ وہ کھیت جو قحط زدہ لگ رہا تھا۔ ماروی نے کسی انجانے جذبے سے مڑ پیچھے کی طرف گھما کر کھیت کو دیکھا تھا۔ جو ویران' برباد اور تنہا کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کی پلاننگ بہت عمدہ تھی۔ وہ باپ کے ساتھ الیکشن مہم چلا رہا تھا' کسی کو اس پر شک نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر وہ جیتی بازی اپنی جلد بازی کی وجہ سے ہار گیا۔

وہ اس علاقے کا حکمران تھا۔ اگر ماروی کو اپنے علاقے سے بھی اٹھالیتا تو کون بولتا اس کے آگے۔ مگر اب حالات مختلف تھے۔ ووٹوں کی مار پڑ رہی تھی۔ برادریاں ناراض ہو رہی تھیں۔ الیکشن مہم کے ساتھ مستقبل کی وزارت بھی خطرے میں تھی۔ نااہلی کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔

کھیت نے اپنا اور پاندھی کے مویشیوں کے سارے ریوڑ بیچ دیے تھے' وکیل کرلیا تھا۔ اس دن اگر بھاگی نہ مرتی تو پٹیشن دائر کرچکا ہوتا۔

اس رات کارنر میٹنگ سے آتے ہی عمر سومرو فارم ہاؤس جانے کے لیے اٹھا۔

"کہاں جارہا ہے؟" ارباب حاکم نے بازو سے پکڑا۔

"بابا سائیں کام ہے۔" عمر سومرو نے ٹالا۔

"میں خوب جانتا ہوں' تیرے کام دھندے' باپ سے بے ایمانی۔" ارباب حاکم ہنسا۔ "بیٹھ جا' جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ جس پری کے لیے جارہا ہے' اسے پنکھ لگ گئے' اڑ کر اپنے جھگے (جھونپڑے) میں پہنچ گئی۔" ارباب حاکم مسکرا رہا تھا۔

عمر سومرو کو دھچکا لگا' وہ بھول گیا کہ اس نے باپ سے غلط بیانی کی ہے' جھوٹ بولا ہے' جھوٹی قسمیں اٹھائی ہیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں بابا سائیں!" اس نے باپ کے بجائے' پھوگ پر حملہ کیا' گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"بتا غلیظ آدمی۔"

"سرکار! میرا کوئی قصور نہیں' میں تو آپ کے ساتھ ہوں۔ کہیں گیا ہی نہیں۔" پھوگ جس کا دم گھٹتا

چاہیے تھا تاکہ آدم کی اولاد کچھ سنبھل سکے۔ مگر اس پھوگ کا صرف دم گھٹتا تھا۔ نکلتا نہ تھا۔ چوٹ سہلا کر پھر میدان میں کود پڑتا اور چاروں جانب چالبازیوں کے چکر چلا کر پھر عمر (نفس) کو گھیرتا۔

"سرکار! میں نے آپ سے بے وفائی نہیں کی۔" پھوگ گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

"تو نافرمان ہے اپنے مالک کا پھوگ (شیطان) جو تیرا سائیں ہے' تو اس سائیں کا غدار ہے' نافرمان ہے' لعنتی ہے' مردود ہے' لعین ہے' جھوٹا ہے۔" عمر سومرو پے در پے اسے تھپڑ رسید کر رہا تھا۔

"کاش عمر (نفس) تو سنبھل جائے' عقل کر لے' تو وفادار ہو جائے۔" حاکم سومرو نے عمر کو کندھے سے پکڑا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

"تجھے ذرا غیرت نہیں آئی' اپنے پرکھوں کی سات پشتوں کی جیتی ہوئی سیٹ گنوانے جا رہا تھا۔ اپنا مستقبل تاریک کرنے جا رہا تھا۔ اس پاندھی کی بیٹی کے پیچھے۔ ارے ہم بھی مرد تھے عشق کیے۔ مگر رسوا نہیں ہوئے۔ تو نے تو مجھے رسوا کر دیا۔ میری عزت داؤ پر لگا دی۔ میرا پٹکا — دھول کر دیا۔ یہ نہیں سوچا کہ باپ غریبوں سے ووٹ لینے کس منہ سے جائے گا۔" ارباب حاکم کو غصہ آگیا۔

عمر سومرو خاموشی سے مجرم بنا سنتا رہا' دلی چوٹ لگی تھی اسے' وہ دسترس میں آکر نکل گئی۔ اپنے سارے رنگ ثابت لے گئی۔ وہ ایسی تتلی تھی' جس کے سارے رنگ پکے نکلے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ باپ کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا' مگر اس وقت اس کے جانے کے غم نے جسم سے جان نکال دی تھی۔

ارباب حاکم نے خاموش ہو کر اسے جانچا' ٹٹولا۔

"عمر! عورت کو اپنی کمزوری نہ بنا بیٹا! یہ مرد کی زندگی میں طلوع و غروب ہوتی رہتی ہیں' کوئی دن ہمیشہ نہیں رہتا' ہر دن کی رات ہوتی ہے۔ وہ تمہاری زندگی سے باعزت اللہ کی حکمت سے گئی ہے۔ جا اور جا کر ماروی کی حقیقت اپنی ماں سے پوچھ۔" ارباب حاکم' عمر سومرو کو بازو سے اٹھا کر حویلی میں آیا۔ اس کی ماں نے بیٹے کی پیشانی چومی' پیار کیا۔

"تمہیں نہیں پتا عمر بیٹا! جب تم پیدا ہوئے تھے تو میں بیمار ہو گئی' ٹی بی کا روگ لگ گیا۔ ڈاکٹر نے میرا دودھ تمہیں پلانے کو منع کر دیا۔ سرکاری دودھ (ڈبے کا دودھ) تمہیں راس نہیں آتا تھا۔ بھوک میں پی تو لیتے مگر پیٹ بھاری ہو جاتا' پیٹ پھول جاتا' درد اٹھنے لگتا' ہضم نہیں ہوتا تھا' اور گائے بھینسوں کا دودھ تمہیں ہیضہ کر دیتا' تمہاری دادی نے کہا' اسے کسی عورت کا دودھ پلاؤ' پھر سارے علاقے میں پتا کروایا کہ کوئی ایسی عورت ہو' جس نے بچہ جنا ہو۔ پتا چلا وہ پاندھی کی عورت ہے' کچھ دن وہ عورت ڈیرے میں رہی اور تم اس کا دودھ پیتے رہے۔"

"یہ جھوٹ ہے' گھڑی ہوئی کہانی ہے۔ ماروی میری بہن نہیں ہے۔ یہ صرف مجھے اس سے دور رکھنے کی سازش ہے۔" عمر چیخ اٹھا' تخت پر پڑے ہوئے تکیے کو ٹھوکر مار کر نیچے گرایا۔

"یہ سچ ہے بیٹا۔"

"اگر یہ سچ ہے اماں' تو ماروی اور پاندھی کو کیوں پتا نہیں۔" عمر سومرو جھنجلا کر بولا۔

"اس لیے کہ انہیں یہ پتا ہی نہیں کہ جس لڑکے کو وہ دودھ پلانے کے لیے بلائی گئی تھی وہ ارباب حاکم سومرو کا اکلوتا بیٹا ہے۔ یہ ہماری شان کے خلاف تھا۔ کسی کی کمین چرواہے کی بیوی کا دودھ پی کر اس کا رضائی بیٹا کہلواتا۔ اس لیے ان سے یہ بات چھپائی گئی تھی۔ نہ ہی وہ حویلی میں آئی تھی۔ تمہیں دودھ پلوانے کے لیے' خاص ملازمہ تھی جو حویلی سے باہر بنے ڈیرے پر لے جاتی تھی۔ اور کہتی تھی' یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ بات راز میں رکھی گئی تھی۔ تم خود سوچو' وہ تمہارے پاس رہ کر تمہارے نکاح میں نہ آسکی۔ اللہ نے اسے بحفاظت نکالا۔ اس لیے کہ وہ تمہاری رضائی بہن تھی' میں ماں ہوں تمہاری' کیوں جھوٹ بولوں گی خوامخواہ جو گواہی چاہے لے لے۔" عمر سومرو' نڈھال ہو کر ماں کے قدموں میں گرا' بولنے کا یارا نہ تھا۔ ساری کہانی ختم ہو گئی تھی۔

✲ ✲ ✲

انسان اپنی خواہشات کے پیچھے اندھا ہو جاتا ہے۔ مگر جب ضمیر کی ندامت روشنی بن جائے تو وہی خواہشات بے معنی ہو کر مستقل کسک کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جس دن سے ماروی اغوا ہوئی۔ شمع کی بے کلی نے اسے چین لینے نہیں دیا تھا۔

وہ خود کو بے قصور ثابت کرنے کے لیے کھیت سے رابطے میں رہی تھی‘ اسے پٹیشن دائر کرنے کا مشورہ بھی اسی نے دیا تھا‘ ہر طرح کی مدد کی یقین دہانی کرواتی رہتی تھی۔

اس دن سے اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ اس نے تھر کے مسائل اور ان کے حل پر جو تجاویز ماروی کی زبانی سنی تھیں وہ اپنے باپ کے سامنے رکھیں۔

نتیجتاً آج وہ ماروی کے ساتھ ان کے آفس میں بیٹھی ہوئی تھی‘ ماروی جو اس کی بہترین دوست تھی جس کی پیٹھ میں اس نے چھرا گھونپا تھا اور اسی شرمندگی نے اسے ماروی کے لیے کچھ کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”مس ماروی! ہم آپ کو چھ ماہ کے ٹرائل بیس پر رکھ رہے ہیں۔ ہمارا کام فی الحال صرف اک یونین کونسل تک محدود ہو گا‘ ہم پہلے سروے کریں گے کہ اس یونین کونسل میں پچھلے دو سالوں میں زچہ و بچہ میں شرح اموات کتنے فیصد رہی ہے۔ اس کے بعد ہم سپلیمنٹ اور میڈیسن مہیا کریں گے۔ چھ سے آٹھ ماہ کے اندر ہم نتائج دیکھ لیں گے۔ اگر شرح اموات میں دس فیصد بھی کمی آئی تو‘ میرا آپ سے یہ وعدہ ہے کہ آپ کے پلان پر ہم مکمل عمل کریں گے اور اس پروگرام کو تعلقہ پھر ضلعی سطح پر وسیع کر دیں گے۔“ این جی او کے ڈائریکٹر نے مسکرا کر ماروی کو اپائنٹمنٹ لیٹر دیتے کہا۔

”سر! مجھے یقین ہے کہ ہمارا یہ پروگرام اسی فیصد رزلٹ دے گا۔ اگر ہم زچہ و بچہ کی غذائی قلت کو پورا کرنے کامیاب ہو گئے تو۔“ ماروی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔

”ہم آپ سے سو فیصدی تعاون کریں گے۔ اسی لیے آپ کو کنوینس اور ڈرائیور بھی دے رہے ہیں اور دو کمروں کا آفس بھی۔“ ڈائریکٹر نے اپنی بیٹی شمع کو دیکھتے مسکرا کر کہا‘ شمع نے اس کے لیے یہ ساری ڈیمانڈز پہلے سے ہی کر رکھی تھیں۔

”اور پے؟“ شمع نے سوالیہ انداز میں باپ کو دیکھا۔

”تیس ہزار ماہانہ۔“ ڈائریکٹر نے مسکرا کر کہا۔ وہ بیٹی کی ہدایت کے مطابق یہ بتانا بھول گیا تو اس نے فوراً پوچھ لیا۔

تیس ہزار سن کر پاندھی کی سانس رکنے لگی۔ اتنے پیسے تو بکریوں کا ریوڑ بھی نہیں دیتا تھا سال میں‘ یہ ہر ماہ ملنے والی رقم تھی‘ اس نے پُر اعتماد طریقے سے اس ٹھنڈے ایئر کنڈیشنڈ آفس میں بات کرتی بیٹی کو فخر سے دیکھا‘ شمع نے خوشی سے کھلتے پاندھی کو دیکھ کر ماروی کو دیکھا۔ وہ بھی باپ کو خوش دیکھ کر مسکرا دی۔

”ماروی! اگر میں نے تمہارا دل دکھایا ہو‘ کوئی غلطی ہو گئی ہو‘ تو مجھے معاف کر دینا۔“ شمع نے گاڑی کی کھڑکی کے قریب ہو کر کہا۔

”تم نے جو آج میرے لوگوں کے لیے کیا ہے‘ اس کے لیے تمہیں ہر خطا معاف ہے۔“ ماروی مسکرا دی۔ شمع کے دل سے بھاری بوجھ ہلکا ہوا۔

”بہت شکریہ محترمہ! مگر وہ صرف تمہارے مارو نہیں‘ میرے بھی ہم وطن ہیں۔“ شمع کی ازلی شوخی لوٹ آئی۔

وہ خدا حافظ کہہ کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی‘ رات گئے‘ جب ان کی جیپ گاؤں میں داخل ہوئی تو گاؤں والے اس روشنی میں مندی مندی آنکھوں سے اپنی چوکھٹ پر کھڑے ہو گئے‘ دو چار دوڑ کر پاندھی کے پاس پہنچے۔

”ارے ہم نے تو سمجھا کہ وڈیرہ آگیا ہے۔ پر یہ تو اپنا پاندھی ہے۔“ پاندھی خوشی سے ہنس پڑا اور سب کو خوشی خوشی بتانے لگا۔

"ارے پاندھی کے تو وارے نیارے ہو گئے۔"

اپنے صحن کے چبوترے پر بے کل بیٹھے کھیت کو ماروی نے جیپ سے اترتے مکمل نظر انداز کر دیا۔

☼ ☼ ☼

"کھیت اٹھ جا بیٹا! اپنے گھر جا۔" پاندھی کے کہنے پر کھیت نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ گھر پرایا کب سے ہوا' یہ گھر بھی تو میرا اپنا ہے چاچا۔" کھیت کی آواز جیسے خشک کنویں سے نکل رہی ہو۔

"ہاں مگر رات بہت ہو گئی ہے۔ جا کر سو جا' ہمیں بھی صبح سویرے پھر سے نکلنا ہو گا۔" پاندھی نے اس کے شانے پر تھپکی دے کر نرمی سے کہا۔

کوئی اور موقع ہوتا تو سب سے زیادہ خوشی وہ ہی مناتا' مگر اب تو دل کی دنیا ہی لٹ گئی۔ ہر خوشی بے سود تھی۔

اس نے اٹھ کر جانے کے لیے قدم بڑھائے' گھر کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر اک بار پھر دل کے ہاتھوں مجبور پلٹ کر دیکھا' چونترے کے دروازے پر کھڑی ماروی اسے کھڑا دیکھ کر ذرا کی ذرا اندر ہو کر کھیت کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

"تو اب تم مجھے دیکھنے کی بھی روادار نہیں۔" بھاری پتھر اس کے دل پر پڑا ——— وہ چارپائی پر ڈھے سا گیا' رات ساری بے کل تھی۔ گھر کی ٹھنڈی ہوا کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھا۔

جو خواب انہوں نے اکٹھے مل کر دیکھے تھے۔ ان کی تعبیر کے وقت وہ دونوں الگ ہو گئے تھے' کیسا المیہ در آیا' ان کی زندگیوں میں' جن کو ایک دوجے کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا تھا' وہ آج بھی بے چین تھا۔ تو وہ چین سے کیسے ہو سکتی تھی' اسے کیسے چین آ سکتا تھا' کھیت کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"وہ صرف مجھ سے ناراض ہے۔ ناراض بھی تو اپنوں سے ہی ہوا جاتا ہے۔" وہ دل کو ڈھارس دے رہا تھا۔

"وہ کہیں نہیں جائے گی' وہ ماروی ہے' جب بھی لوٹے گی میری طرف ہی آئے گی' میرے علاوہ کہیں نہیں جا سکتی' اور ناراضی میں حق بجانب تھی۔" اور کھیت انتظار کے سنگھاسن پر بیٹھا تھا۔

اور اپنے صحن میں چارپائی پر سوئی ماروی کی آنکھوں سے بھی نیند کوسوں دور تھی۔

کھیت کی معافی اس کے لگائے گئے لفظوں کے چرکے کی مرہم نہ بن سکی تھی' کتنے کڑوے لفظ تھے' جن کا زہر محبت کی مٹھاس کو زہریلا کر گیا تھا' وہ آنسو اس کے تکیے میں جذب ہوئے۔

"تو بھی عام مرد ہی نکلا' بے اعتبار' شک گزیدہ' عورت پتا نہیں کیوں اتنی بے وقوف ہوتی ہے کہ جس سے محبت کرتی ہے' اس عام کو بھی خاص بنا دیتی ہے۔" اس نے بہتیرا کوشش کی کہ نیند کی سلائی پھیر لے' مگر محبت کی روہی میں دکھ کے پہاڑ سے یاد کا سرمہ جوں کا توں پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مائی وڈی!" عمر سومرو کی دھاڑ سے پورا فارم ہاؤس گونج اٹھا۔

مائی وڈی جان گئی کہ اب اجل آیا ہی چاہتی ہے۔

مرے مرے قدموں سے عمر سومرو کے سامنے آئی۔

اس کی نظریں اس کے چمکتے جوتوں پر گڑی تھیں۔

"ماروی یہاں سے کیسے نکلی؟"

"خدا کے حکم سے۔" مائی وڈی کے پُراعتماد لہجے پر اک لمحے کو عمر سومرو ہکا بکا رہ گیا' دوسرے ہی لمحے طیش میں آیا' اسے چوٹی سے پکڑ کر اپنے چہرے کے قریب کیا۔

"تمہارا مالک میں ہوں۔ یہاں میری بادشاہی چلتی ہے۔" عمر چبا چبا کر بولا۔

مائی وڈی کا سر اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنی پشت سے لگ چکا تھا۔

"تو... تو مالک نہیں فرعون ہے۔" مائی وڈی نے دم گھٹنے کی وجہ سے ہکلا کر کلمۂ حق بلند کیا۔

عمر سومرو اس کی بہادری پر ششدر رہ گیا اور طیش میں آ کر "میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" کہتے ہوئے

اس نے مائی وڈی کے چہرے پر دونوں ہاتھوں سے تھپڑ مارنے شروع کر دیے۔ چوتھے تھپڑ پر وہ زمین پر گر گئی۔

اس وقت عمر سومرو فرعون کا روپ دھارے ہوئے تھا اور مائی وڈی صبر کا پیکر بنی ہوئی ظلم سہ رہی تھی ماروی کی قید میں سنائی گئی اس داستان عظیم نے اسے استقامت عطا کر دی تھی۔

عمر سومرو کی فرعونیت نارسائی کے زخموں نے ظاہر کر دی تھی' مائی وڈی مسلسل زیر لب کچھ دہرا رہی تھی وہ اسے مارتے مارتے ہانپ گیا اک لمحے کو رک کر اس کی جھنجھلاہٹ نما آواز سنی۔

"تم خدا نہیں ہو' تم خدا نہیں ہو۔"

"میرے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔ میرا نمک کھاتے ہو اور مجھ سے ہی غداری کرتے ہو۔" عمر سومرو غصے میں تھا۔

"میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا' جان سے مار دوں گا۔" وہ چبا چبا کر بولا۔

"تم نہ خدا ہو' نہ میری جان کے مالک۔" مائی وڈی نے ہونٹوں سے بہتے لہو کو تھوک کر نفرت انگیز لہجے میں کہا۔

"میں ہی ہوں تمہاری جان کا مالک۔ چاہوں تو تمہیں ابھی گولی ماردوں۔" اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

"فرعون کی زبان میں مارنے کے تو دعوے دار ہو' اگر ایسے ہی خدا ہو تو ذرا سورج کو مغرب سے طلوع کروا دو۔" مائی وڈی نے موسیٰ علیہ السلام کے شعور کو پکڑ کلیم اللہ کے کلام کو اپنے دور کے فرعون کے سامنے دہرا لیا۔

اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کفر بک گیا ہے' مائی وڈی اسے حیران پریشان کیے دے رہی ہے' اس کے شعور کے آگے اس کا ظلم ماند پڑ رہا ہے' اسے کوئی اور جواب نہیں سوجھا صرف اک ٹھوکر کے' جو پوری طاقت سے اس نے مائی وڈی کے کندھے پر رسید کی۔

اک کراہ اس کے لہو رنگ ہونٹوں پر آرکی۔

مائی وڈی نے سوجے ہوئے منہ کو سہلایا۔ ہمت مجتمع کرنے لگی۔

"یہاں میرا سکہ چلتا ہے' یہ میرا محل ہے' تم سب میرے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔" عمر سومرو کا تھکا ہوا لہجہ بھی رعونت سے پر تھا۔

"تمہاری خدائی بھی فرعون کی خدائی کی طرح مضحکہ خیز ہے' سارے نجومیوں کو اکٹھا کرنے کے بعد بھی اسے یہ پتا نہ چل سکا جس بچے کو ماں کے رحم میں آنے سے روکنے کے لیے بنی اسرائیل کے مردوں کو عورتوں سے الگ کر دیا گیا ہے' وہ سوئے ہوئے فرعون کے سرہانے ماں کے رحم میں آجائے گا' جس کے لیے بچوں کو قتل کروا دیا وہ موسیٰ اس کے گھر میں پل کر جوان ہو گا' کیسی خدائی تھی اس کی اور کیسی خدائی ہے تمہاری کہ تمہیں یہ پتا نہ چل سکا کہ ماروی تمہاری سلطنت کی قید سے کیسے آزاد ہو رہی ہے۔ تم دونوں کی خدائی کی لاعلمی کتنی مضحکہ خیز اور دعوا' خدائی کے جھوٹ کا پلندہ کھول دیتی ہے۔"

مائی وڈی تمسخر سے کہتے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی' عمر سومرو اسے مار مار کر تھک چکا تھا' ساری ملازمائیں اور ملازم اپنی جگہ پتھر کے ہو کر رہ گئے تھے کہ اب ان کی باری آئی کہ آئی۔ پورے میرپور محل میں خوف کا سناٹا پھیل چکا تھا۔

عمر سومرو صوفے پر بیٹھ گیا' آنکھیں موند کر ٹانگیں میز پر پھیلائیں۔

"واہ ماروی۔ تمہارے دیے گئے شعور نے آج ان غلاموں کو آگہی کا پھل کھلا دیا۔" اسے ماروی کی چاہت نے تھکا دیا تھا۔

"اسے کس نے نکالا" اس کے لہجے میں شکست تھی۔

مائی وڈی نے اپنی چنری سے ہونٹوں کے کناروں سے رستے لہو کو پونچھا۔ "وڈی سائین نے۔"

"اماں سائیں؟... اماں سائیں نے ایسا کیوں کیا۔" اس نے خود کلامی کی۔

"وڈی سائین نے کہلوا بھیجا تھا کہ وہ آپ کی رضائی بہن ہے اسے نکلوا دو اس قید سے۔"

"تم جانتی ہو نا کہ اماں سائین نے غلط بیانی سے کام

لیا ہے۔" عمر سومرو سرد مہری آواز میں بولا۔

"یہ آپ ان سے پوچھیں' مجھے یہی بتایا گیا اور اگر یہ حقیقت نہ بھی ہوتی تو بھی آپ کو پتا ہے کہ میں وڈی سائین کی حکم عدولی نہیں کر سکتی تھی' چاہے آپ مجھے جان سے مار دیں۔" مائی وڈی نے درد کی اٹھتی ٹیسوں کو دباتے کہا۔

"تمہیں ذرا شرم نہیں آئی' تمہارا مالک میں ہوں' اماں سائین نہیں' تمہیں میں نے یہاں سب سے اوپر کا درجہ دے کر رکھا' سو سکھ دیے۔ پھر میری حکم عدولی کیسے کرلی۔" عمر سومرو مشروب کا گھونٹ اپنے اندر انڈیلتے بولا۔

"جیسے آپ اپنے مالک کی حکم عدولی کرتے ہیں۔ جس نے آپ کو پیدا کیا' زندگی دی اور موت بھی وہی دے گا۔" مائی وڈی نے ماروی کے دیے گئے درس کو دہرا دیا۔

"کون سی حکم عدولی کی ہے میں نے۔" عمر سومرو نے حیرانی سے کہا۔

"پہلے اپنے ہاتھ میں پکڑے گلاس کو ہی دیکھ لیجئے۔" مائی وڈی کے کہنے پر اس نے اضطراری انداز میں گلاس کو دیکھا اور واپس میز پر رکھ دیا۔

وہ غصے میں پتا نہیں کیا کیا کفر بک گیا تھا' اسے شدت سے احساس ہوا' دل ہی دل میں توبہ کی' یہ عورت کی محبت بھی مرد سے کیا کچھ کروا جاتی ہے۔ اس نے نفی میں سر ہلاتے سوچا۔

☼ ☼ ☼

ماروی نے آٹھ دن کے اندر اپنی یونین کونسل کا سروے مکمل کرلیا۔ صرف اس کے گاؤں میں سکھاں سمیت پانچ حاملہ عورتیں تھیں۔ یوسی میں ان کی تعداد اڑتیس تھی' اور شیر خوار بچے اس کے گاؤں کے سات ملا کر ٹوٹل اکیاون بنتے تھے۔

ماہانہ چیک اپ' دوائیاں' سپلیمنٹ' انجکشنز' ڈریس' بچوں کی خوراک۔ وٹامن کے ڈراپس' دودھ وغیرہ۔ بجٹ لاکھوں میں جا رہا تھا' میڈیکل کا عملہ' ان کی تنخواہیں' گاڑی کا ایندھن علیحدہ تھا۔

"اتنا بجٹ کہاں سے آئے گا۔" وہ سوچ کر پریشان ضرور ہوئی مگر ہاری نہیں تھی' کوئی بھی کام پریشانی کے بغیر نہیں ہوتا' انسان سوچتا ہے' پلاننگ کرتا ہے پھر حکمت عملی بنا کر جدوجہد کرتا ہے' تکلیف پریشانیاں اٹھاتا ہے' تب جا کر وہ کام پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

ہمت نہیں ہارنا' ہمت ہارو گی تو کچھ بھی نہ کر پاؤ گی' وہ اندر ہی اندر خود کو ہمت دلاتی رہی' جب کوئی اور نہ ہو ہمت دلانے کے لیے تو یہ کام بھی تبدیلی لانے والوں کو خود کرنا پڑتا ہے' ماروی نے خود کو یقین دلایا اور دوسرے ہی دن کراچی میٹنگ کرنے چلی گئی۔

"مس ماروی! یہ تو ایک یونین کونسل کا ماہانہ بجٹ لاکھوں میں جا رہا ہے۔ اتنا مہیا کرنا تو ہمارے بھی بس کی بات نہیں۔" ڈائریکٹر نے کچھ مایوسی سے کہا۔

"سر میں جانتی ہوں یہ بات۔" ماروی عزم سے مسکرائی۔

"پھر کیا پلاننگ کی ہے آپ نے؟"

"ہمیں ایسے ادارے اور لوگ ڈھونڈنا پڑیں گے جو فی سبیل اللہ کام کریں اور اس نیکی میں ہمارا ہاتھ بٹائیں' جتنے بھی سوشل ویلفیئر ادارے اور تنظیمیں ان کے پاس چل کر جائیں گے' وہ اس نیک کام اور مقصد میں ہمارا ساتھ دیں گے' اگر دس میں سے نو انکار کریں گے تو ایک تو ضرور تعاون کرے گا' پاکستانی قوم ابھی اتنی بے حس نہیں ہے سر! یہاں کام کرنے والے اور اچھے کام کرنے والوں کا ساتھ ضرور دے گی۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے۔" ڈائریکٹر نے تائیداً" سر ہلا کر مسرت سے کہا۔

"اور اگر میڈیکل عملہ مفت میں کام کرنے پر راضی ہو جائے' تو ہم سو فیصد اس پروگرام پر عملدرآمد کر سکتے ہیں۔" ماروی نے اسی جوش و خروش سے کہا۔

"والنٹیئر میڈیکل اسٹاف تو مل جائے گا۔ اس کے لیے ہم ہر ہفتے میڈیکل اسٹاف بھیجیں گے تاکہ الٹرا ساؤنڈ اور دیگر ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوتے رہیں اور مکمل چیک اپ کے ساتھ سپلیمنٹ اور میڈیسن وغیرہ بھی

حاملہ عورتیں کو ملتی رہیں۔" ڈائریکٹر نے ہمت بندھائی۔

"میں اور ماروی آج اور ابھی سے اس مہم پر نکلتے ہیں۔ اس میں ہم یہ بھی اضافہ کردیتے ہیں کہ ایک ماں ایک بچے کی خوراک انفرادی طور پر کوئی دینا چاہے تو
"بسم اللہ" شمع جو ساری بات چیت میں اب تک خاموش بیٹھی ہوئی تھی۔ پورے جذبے اور جوش سے بولنے لگی۔

"اس سے تو ہمارا کام اور بھی آسان ہو جائے گا سر۔" ماروی خوشی سے ہنس پڑی۔

"اور دو بچوں کا دودھ اور دو حاملہ عورتوں کی خوراک دوائیاں میرے ذمے۔"

"ارے مس ماروی! پھر آپ کی تنخواہ تو اسی میں صرف ہو جائے گی۔" ڈائریکٹر نے حیرت و خوشی کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

"سر! ہم مارو لوگ ہیں سوکھے ٹکڑے بھی کھالیتے ہیں' اگر کسی روٹی کھانے سے کسی کی جان بچ جاتی ہے تو اس سے بڑی خوشی کی اور کیا بات ہوگی۔"

پاندھی بیٹی کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلا کر تائید کرتا رہا۔

"پھر پانچ حاملہ عورتوں اور پانچ بچوں کی ماہانہ خوراک و دوائیوں کا ذمہ میں اٹھاتا ہوں۔" ڈائریکٹر متاثر ہو کے بولا۔

"اور دو' دو میری طرف سے بھی۔" شمع نے حصہ لیا۔

"میں بہت متاثر ہوا ہوں آپ کے جذبے سے مس ماروی۔"

"سر! اخلاص اپنی ذات سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ ایدھی بننا اتنا آسان نہیں۔" ماروی کے لہجے میں اپنے لوگوں کو دکھ بول رہا تھا۔

"بالکل صحیح کہا مس ماروی۔"

"چلو اٹھو ہم اپنا کام شروع کریں۔ اگر بھیک بھی مانگنی پڑی تو مانگیں گے بھئی۔ ویسے بھی یہ کون سا مشکل کام ہے' ہمارے سارے حکمرانوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔" شمع اپنی ازلی شرارت سے بولی۔

☼ ☼ ☼

کھیت بنجر ہو چکا تھا۔

اس کے سرسبز دماغ میں اب وچھوڑے (جدائی) کی طوفانی ہوائیں چلتی تھیں' وہ بچوں کو سبق پڑھانا بھول جاتا تھا' پہروں بیٹھ کر سوچتا کہ بچوں کو کیا پڑھانا ہے' تب کہیں جا کر اسے یاد آتا کہ اس بچے کو یہ سبق دینا ہے۔ اس کے ساتھ الٹا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔

وہ الف آنکھ پڑھاتا تو الف الفت یاد آجاتا۔ جیم جتی کے بجائے جیم جدائی کہہ اٹھتا' پ پگڑی کے بجائے پ پیار بولتا۔ ح حجام بھول کر ح ہجر بولتا' میم ماہی کے بجائے میم محبت دہراتا رہتا' عین عینک کے بجائے عین عشق کی تکرار کرتا رہتا' واؤ وچھوڑا پڑھاتا تو بے یکہ بھول کر ' ے یاد کی لوری الاپتا۔

بچے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگتے' تو اسے احساس ہوتا شاید وہ کچھ غلط کہہ گیا۔

"ماسٹر کھیت چریا ہو گیا ہے۔" بچوں نے اس کے بارے میں یہ بات مشہور کردی تھی۔

اس کا سنگی ساتھیوں کے ساتھ میل جول نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ صحرا کے بھنوں کے گرد چکراتا رہتا اور ماروی کی محبت میں مجنوں کی یاد تازہ کرتا رہتا۔

بس کوئی ماروی کا نام لیتا وہ اس کا نام سنتے ہی کھڑا ہو جاتا' کوئی ماروی کو برا کہتا' وہ اسے جان سے مارنے کو دوڑتا' لوگوں نے اس کے ڈر کی وجہ سے ماروی کا نام لینا بھی چھوڑ دیا تھا' اس کا پسندیدہ مشغلہ ۔۔۔ ماروی کے لیے اونٹ کی مہار پکڑ کر پکی روڈ پر جانا' روز ماروی کی جیپ بغیر رکے اس کے اونٹ سے آگے نکل جاتی۔

وہ جیپ میں بیٹھی ماروی کی اک جھلک دیکھتا اور اس کی جیپ کے نشان پر اپنے قدم رکھ کر چلتا رہتا۔ وہ اس طرح اونٹ لے کر اس کو لینے آیا تھا' وہ اسی اونٹ کو پکڑ کر روز اس کا انتظار کرتا' بس ماروی ہی گم ہو گئی اس سے اس رات سے گم ہوئی تھی۔ کیا پتا تھا کہ اس کی

محبت بھی گم ہو جائے گی، اور وہ اس گمشدہ محبت کو ڈھونڈنے روز اس کے پیچھے چلتا شاید وہ نظر کرلے۔ اک لمحے کی خطا اور اک لفظ کی لغزش نے اس کے عشق کو عیب دار کر دیا، وہ محبت میں مٹی ہو رہا تھا۔ نہ معافی ملتی تھی نہ سزا ختم ہوتی تھی۔

وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے اس کے نقش قدم پر چلتا رہتا۔

ساجن خاموشی سے بیٹے کی حالت پر کڑھتا اور ماروی کی کامیابیوں پر خوش ہوتا رہتا۔

اس کی ماں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ ماروی کو قتل کر دیتی۔ جس نے اس کے بیٹے کو نیم پاگل کر دیا تھا۔ جو سارا دن ٹکٹکی باندھے کسی ایک نکتے کو دیکھتا رہتا۔ اس کا بس چلتا تو بیٹے کے ذہن سے ماروی کی یاد کھرچ کھرچ کر نکال دیتی۔

"تو اس کے پیچھے کیوں پاگل ہو گیا ہے کھیت؟" اس کی ماں نے پیشانی پر ہاتھ مار کر غصے کا اظہار کیا۔

"اماں محبت ہوتی ہی ایسی ہے، ہر ذی شعور کو پاگل بنانے والی۔" کھیت دور ... بھٹوں سے اڑنے والی ریت کو دیکھتے خود کلامی سے گویا ہوا۔

"تیرا اس چھوری کے پیچھے چریا ہونا، میری برداشت سے باہر ہے۔ اندر کو آگ لگ جاتی ہے۔ ساہ بل رہی ہے، ایک بیٹا وہ بھی اس بھگوڑی کے پیچھے گنوا رہی ہوں۔"

لفظوں کی تپش نے کھیت کو جلا کر راکھ کر دیا اس کے دل نے اک لمحے کو دھڑکن سے دامن چھڑایا، وہ غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"اماں یہ بات تو نے کی ہے، اگر کوئی اور کرتا تو جان سے مار دیتا، وہ میری ماروی ہے، لوئی لج کی لاج رکھنے والی، کوئی بھگوڑی نہیں۔ آئندہ ایسی بات کی تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔" کھیت نے اٹھ کر اجرک کاندھے پر رکھی اور باڑے سے جا کر اونٹ کی مہار پکڑی۔ شام ہو رہی تھی، ماروی نے آنا تھا۔

"چھورے کی تو مت ماری گئی ہے ساجن! یہ سب تیری دی گئی ڈھیل کا نتیجہ ہے۔" بیٹے سے باتوں میں ہاری تو شوہر پر چڑھ دوڑی۔

"کھیت جانے، ماروی جانے محبت جانے۔ ان کے دل جانیں، ارے ہمارا کیا جاتا ہے۔ خود روٹھے ہیں، خود ہی من جائیں گے۔ تو چپ کر کے صرف اپنی زبان کو لگام دے۔" ساجن نے کہا۔

☆ ☆ ☆

"روز تمہارے ساتھ آنا پڑتا ہے بیٹا! اب تمہارے ٹھنڈے آفس میں میرا دل نہیں لگتا۔" پاندھی جیپ میں بیٹی کے ساتھ اپنا مسئلہ بیان کر رہا تھا۔

ماروی نے فائل سے نظر ہٹا کر باپ کو دیکھا "ابا اب تو آپ کے لیے صوفہ کم بیڈ بھی ڈلوا دیا ہے تاکہ آرام کرلیں، ساری عمر دھوپ میں کالی ہے، اب سکون سے سوئیں ایئر کنڈیشنڈ روم میں۔" ماروی نے محبت سے کہا۔

"اڑے بابا! ہم ہیں مارو لوگ، کیا جانیں ایئر کنڈیشن کو، بس ہمیں اپنی زندگی اچھی لگتی ہے، لوگوں کی باتوں کی وجہ سے تم سے بندھ کر رہ گیا ہوں۔ چند دن تمہیں اکیلا چھوڑا، لوگ توبہ توبہ کرنے لگے، شام ڈھلے اکیلی لڑکی۔ ڈرائیور کے ساتھ آ رہی ہے، جن کے لیے تو ہلکان ہو کر مری جا رہی ہے۔ وہ تیرے پیچھے یہی زہر اگلتے ہیں۔" پاندھی دل برداشتہ ہو چکا تھا۔

"ابا جب تبدیلی آتی ہے، تو سب انگلی اٹھاتے ہیں۔ جب اس تبدیلی اور ترقی کا فیض ملنے لگتا ہے تو سب کو وہ تبدیلی اچھی لگتی ہے۔ ابھی فیض پانے میں کچھ عرصہ ہے۔ ثمرات ملنے میں کچھ دیر ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا آپ دیکھیے گا۔"

جیپ پکی سڑک سے اب گاؤں کے ریتیلے راستے پر مڑ چکی تھی۔ اسی راستے پر اونٹ کی مہار پکڑے کھیت کھڑا تھا۔ جیسے ہی ان کی جیپ گاؤں کے کچے راستے پر آئی، وہ بھی اونٹ کی مہار پکڑے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، روز کی طرح۔ ماروی نے یہ منظر دیکھا اور نظر انداز کر کے فائل کا ڈیٹا دیکھنے لگی۔

پاندھی دل مسوس کر رہ گیا۔ اس نے جیپ کے

ٹائروں سے اڑتی دھول میں گم ہوتے کھیت کو دیکھا اور پہلی بار اس کے لیے نرم گوشہ محسوس کیا۔

"بیٹا! کھیت پیچھے آرہا ہے' اس کی بات سن لو۔" ماروی نے فائل سے سر اٹھاتے ہوئے باپ کے چہرے کے تاثرات کو بغور دیکھا۔

"ابا! صرف بات ہی سننی ہے؟" پاندھی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

جیپ رکوا کر وہ نیچے اتر کر پیچھے کی طرف مڑی اور اس کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔

وہ اونٹ کی مہار پکڑے ٹھٹک کر رکا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھنے لگی۔ کھیت نے ساری ہمت جمع کر کے کہا۔

"ہم اسی طرح بچھڑے تھے' میں آج بھی اونٹ کی مہار پکڑ کر تمہارا منتظر ہوں' وقت کو پلٹا دو۔" اس نے اس کے اڑتے پنچھیوں کو پکڑا۔

"گیا وقت واپس نہیں پلٹتا.

کیوں آتے ہو میرے پیچھے؟"

"یہ حق بھی مجھ سے چھین لو گی کیا؟" کھیت نے مایوسی سے کہا۔

"سارے حق خود گنوا چکے ہو۔" ماروی نے رکھائی سے کہا۔

"معاف کر دو اب۔" کھیت بے بس ہوا۔

"بہت چھوٹا لفظ اور آسان طریقہ ہے۔" ماروی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"کیسے تلافی کروں۔ کہو تو زبان کاٹ دوں اپنی۔" کھیت کا لہجہ نم ہوا۔

"بس تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ جب تک دل مائل نہ ہو گا' میں تمہاری طرف نہیں پلٹ سکتی۔" ماروی نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"جب تک تمہارا دل مائل نہیں ہو گا' میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ اسی عزم سے بولا۔

"تو پھر انتظار کرو۔"

"تا عمر کرنے کو تیار ہوں۔"

وہ پلٹ کر جیپ میں آ بیٹھی۔ پاندھی مایوس ہو گیا۔ اب بھی بات نہیں بنی اور کھیت اس کے مخاطب کرنے کی خوشی سے ہی دل کو ڈھارس بندھانے لگا۔ وہ میری طرف ہی پلٹ کر آئے گی۔

☼ ☼ ☼
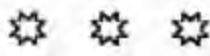
مائی وڈی کی آزادی کا سندیسہ آگیا۔ وہ سب ملازموں سے مل کر بڑی سائیں کی خدمت میں پہنچی۔

"بڑے عرصے کے بعد تمہیں دیکھا۔" تخت پر دراز وڈی سائیں نے ہاتھ بڑھایا۔

"جی وڈی سائیں! آپ کے بلاوے کے لیے ترستی رہی۔" مائی وڈی نے تعظیم سے ہاتھ چوما اور پاؤں دبانے لگی۔

"ہاں عمر کا بڑا راز اعتبار تھا تم پر بہت پیار کیا۔ مائی وڈی حویلی کے سارے کام ان کے کر دیتی ہے' سارے نظام کو جانتی ہے۔ بھیج دے۔ گھبرانا نہیں۔ تم نے بھی تو غداری نہیں کی۔ سارے لوگ تم جیسے وفادار تھوڑی ہوتے ہیں۔ بس کوئی کوئی۔" بڑی سائیں اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

صدیوں کے غلام ہیں۔ کیسے غداری کریں۔ ہم تو سانس بھی اپنی مرضی سے نہیں لیتے۔ مائی وڈی نے دل ہی دل میں سوچا۔ زبان پر قفل لگے ہوئے تھے۔

"تمہیں کام سے بلوایا ہے۔" بڑی سائیں نے راز داری سے کہا۔ "دیکھ اس چھوری کے کام' سنا ہے شہر میں آفس بنا کر بیٹھ گئی ہے' خدمت خلق کا شوق چڑھا ہے۔ پتا نہیں اتنے پیسے کہاں سے ملتے ہیں اسے۔ مٹی پاؤ۔" وڈی سائیں نے بددلی سے کہا۔

مائی وڈی کو دلی مسرت ہوئی ماروی کے بارے میں سن کر۔ مگر ظاہر نہیں کیا۔

"مگر مسئلہ تو اپنے عمر نے کر دیا ہے' کہتا ہے۔ دودھ شریک بہن محض ڈرامہ ہے۔ جھوٹ بولا ہے۔ تم

لوگوں نے۔ یقین ہی نہیں آتا اس کو۔ پتا نہیں کیا جادو کردیا ہے اس چھوری نے اس پر۔ پیچھے ہٹتا ہی نہیں اس ضد سے۔" وڈی سائیں نے اک بار پھر لمبی تمہید باندھی۔

"سنا ہے قید میں اس کے ساتھ تمہاری بن گئی تھی۔ اسی لیے تمہیں بلایا ہے۔ یہ پیسے لے کر ائے کے اور جا کر اسے۔ پیغام دے کہ عمر رابطہ کرے تو اسے بھائی کہہ کر یقین دلائے رضائی بہن ہونے کا۔ نہیں تو رفوچکر ہو جائے۔ عمر کی ضد بھی سناتا اسے۔ وہ پھر اغوا کر سکتا ہے یا شادی کرلے۔ تاکہ عمر کا آسرا ابھی ختم ہو۔"

"بس مائی وڈی! جوان اور گھوڑا اپنی ضد پر اڑ جائے تو نہ بند بڑھتا ہے۔ نہ نکیل ڈلتی ہے۔" وڈی سائیں نے گہری سانس بھری۔

مائی وڈی یہ پیغام —— پلو میں باندھ کے چلی۔

اک پرانے ملازم نے آکر ماروی کی آفس کے باہر چھوڑا۔ ماروی مائی وڈی کو دیکھ کر فرط مسرت سے کھل اٹھی۔ اپنی کرسی سے اٹھ کر فوراً" اس کے گلے لگی۔

"مائی وڈی تمہیں آزاد دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہو رہی ہے۔"

"میں آزاد نہیں ہوں ماروی! تمہارے لیے پیغام لائی ہوں۔" ماروی نے بغور دیکھتے ہوئے اسے صوفے پر بٹھایا۔ خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"بولو مائی وڈی اطمینان سے۔" مائی وڈی نے پیغام من وعن پہنچا دیا۔

ماروی نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور مسکرا دی۔

"مائی وڈی مجھے اغوا کرنا اب عمر سومرو کے بس کی بات نہیں۔ میں اب یونیورسٹی کی طالبہ اور چرواہے پاندھی کی بیٹی نہیں۔ اب میں ایک عالمی ادارے کی رکن ہوں۔ اگر وہ مجھے اغوا کرے گا تو بات میڈیا پر آئے گی۔ حکومت پر دباؤ ہو گا۔ حاکم سومرو کی وزارت بھی جائے گی' اور ایم پی اے کی سیٹ بھی۔ مجھے اغوا کرنا اتنا آسان ہوتا۔ تو عمر سومرو کب کا کر چکا ہوتا۔

میں اکیلی نہیں۔ میرے پیچھے اک پوری تنظیم ہے۔ اور عمر سومرو کے لیے میرے پہلے اغوا کا کیس ہی کافی ہے۔ صرف تمہارے وعدے کا خیال ہے۔ جو ابھی تک میں خاموش ہوں ورنہ وہ کب کا سلاخوں کے پیچھے ہوتا۔"

ماروی نے ایک ایک بات تفصیل سے سمجھائی مائی وڈی کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

"میں تو پریشان ہو گئی تھی ماروی! وڈی سائیں کا نیلا پاسن کر۔"

"وڈی سائیں کو کچھ پتا نہیں۔ وہ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہے۔ بس اب تم بھی تین طلاق دو اس غلامی کو اور میرے پاس آجاؤ۔ مل کر اپنے ماروؤں کی خدمت کریں۔" ماروی نے مائی وڈی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔" مائی وڈی نے بیچارگی سے کہا۔

"تمہیں جب بھی ضرورت پڑے بس اس نمبر پر مجھے ایک میسج کر دینا۔ میں تمہیں چھڑا لے آؤں گی۔" ماروی نے اپنا فون نمبر لکھ کر اسے تھمایا۔

"میرا خود دل نہیں چاہتا' بڑے گناہ کر لیے۔ اب توبہ کرنا' بخشوانا چاہتی ہوں۔" مائی وڈی نے آنکھوں میں آئی نمی پونچھتے کہا۔

"وہ گناہ تم نے خوشی سے نہیں جبراً" کیے۔ کروائے گئے تم سے۔ بس اب ہمت کرو۔ چھوڑ دو۔ اس گندگی کے گھر کو۔ آؤ مل کر اللہ کی مخلوق کی خدمت کریں۔" ماروی نے اسے دلاسا دیا۔

"آج تو تمہارا پیغام حقیقت لے کر جا رہی ہوں۔ مگر لوٹ کر ضرور آؤں گی۔ چاہے وہ لوگ مجھے جان سے مار دیں۔ اک دن مرنا تو ہے ہی۔" مائی وڈی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

اور ماروی کو یقین آگیا کہ اب مائی وڈی ضرور آئے گی۔ اس نے اس نظام اور غلامی سے بغاوت کرنے کی ٹھان لی ہے۔ ماروی کا سیروں خون بڑھ گیا۔ وہ اپنے حصے کی شمع جلانے کا فرض ادا کر رہی تھی۔

ماروی نے جس جذبے سے کام کیا تھا' مشکلات ضرور آئیں' مگر اس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ میڈیکل عملہ اس کے ساتھ ہوتا اور ہر ہفتے وہ دوشی کے گوٹھوں میں دوائیاں اور خوراک دیتی۔ اپنے گھر میں عورتوں کو ڈرپس لگواتی۔ ماں اور بچے میں پانی کی کمی اور خوراک کی کمی کے لیے ہر طرح کا علاج ممکن بنا دیا تھا اس نے۔

ہر حاملہ عورت کا ماہانہ مکمل چیک اپ ہوتا مہینے کی دوائیاں ملتیں اور ڈرپس لگتیں۔ شیر خوار بچوں کو وٹامنز کے ڈراپس اور عمر کے حساب سے دودھ کے ڈبے ملتے۔ ان چھ ماہ میں پچاس فیصد شرح اموات کو کم کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ عورتوں کی گودیں آباد ہونے لگی تھیں۔ زندگی کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

اس نے دوسری این جی او کے ذریعے اپنے گاؤں میں پکے اسکول کے پچاس کمروں میں ایک پنکھا ایک بلب' فراہم کر دیا تھا' ایک بینک کے تعاون سے۔ اس نے گاؤں میں قدرتی ترائی (قدرتی چشمہ جو بارش کے پانی سے بھر جاتا ہے) کو سیمنٹ سے پختہ کروانے کا پروجیکٹ شروع کروا دیا تھا' چار سو فٹ زیر زمین ہینڈ پمپ لگا کر اس پر روٹر لگوا دیا تھا' جو پٹرول پر چلتا۔ روزانہ وہ پیٹرول فراہم کرتی تھی' ایک بندہ رکھ دیا تھا جو اسے صبح چلاتا اور گاؤں کی عورتیں بنا مشقت کے یہاں سے پانی بھر کر لے جاتی تھیں۔ بس ایک پکی سڑک تھی جو ابھی تک بنانے میں ناکام تھی' وہ کسی ایسی این جی او کی تلاش میں تھی جو پکی سڑکیں بنانے کا کام کرتی ہو۔ اسے امید تھی کہ اک دن وہ یہ بھی کر دے گی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے گاؤں کی صورت ہی بدل گئی۔ سارے لوگ خوش تھے' اس تبدیلی سے اور ماروی کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کام کا دائرہ مختلف این جی اوز کے تعاون سے پوری یو سی تک پھیلانا چاہ رہی تھی۔

اس دن سکھاں کو وہ مٹھی اسپتال لے گئی۔ جہاں اس نے صحت مند بیٹے کو جنم دیا تھا۔

اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا' اس نے وعدہ وفا کر دیا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ننھے راول کو گود میں اٹھائے دیکھتی رہی تھی۔ سکھاں کے ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی خوشی کے آنسو تیر رہے تھے۔

سکھاں کتنی ہی دیر اس کا ہاتھ پکڑ کر چومتی رہی۔ دوبار اس امیونٹی کی وجہ سے اس کے بچے مر گئے تھے۔ اس بار مکمل خوراک و علاج کے ذریعے اس نے صحت مند خوب صورت بچے کو جنم دیا' اس کی خالی گود بھر چکی تھی۔ اجڑی جھولی آباد ہو گئی تھی' اس کے جھونپڑے میں بھی اب بچے کی قلقاریاں گونجیں گی۔ اس کے صحن میں بھی اب بچہ کھیلے گا۔ خوشی اور مسرت کے الفاظ اس کے احساس کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔

اسپتال سے وہ آفس پہنچی تو دو اور خوشخبریاں اس کی منتظر تھیں۔ ہیڈ کوارٹر سے زچہ و بچہ کی صحت کے لیے مستقل اسپتال بنانے کی فزیبلٹی کی منظوری کے ساتھ اس کے کام کو یونین کاؤنسل سے توسیع دے کر تعلقے کی سطح پر بڑھا دیا گیا تھا۔

پے در پے خوشیاں اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھیں' پہلی بار اس کے دل نے کہا کہ ان خوشیوں میں کھیت کو شریک کر لے۔ وہ اپنی اس سوچ پر حیران رہ گئی۔ گزرے وقت میں کھیت اسے یاد تک نہ آتا تھا' صرف کام' کام اور کام کی لگن تھی اور جب کام ہونا شروع ہوئے تو اسے کھیت یاد آیا۔ یہ سارے خواب وہ مل کر دیکھتے تھے۔ اب جب ان کی تعبیریں ملنے لگی تھیں تو وہ ایک دوسرے سے الگ جدا اور دور تھے۔

اس کی مسیج ٹون بجی۔

"سکھاں کے بیٹے اور تمہاری کامیابیوں کی خوشیاں پورا گوٹھ مل کر منائے گا۔ مگر اب مجھے معاف کر دو۔ تو میرا دل بھی خوشیاں منائے' تمہاری جدائی کے قحط کا مارا کھیت۔"

وہ میسج پڑھ کر مسکرا دی۔ اس کو کھیت کی محبت کی شوقین اور ہجر میں تباہ ہونا یاد آیا۔ تین دن سے وہ کھیت کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

جب پابندھی نے اس سے کہا۔ "اب کھیت کے بارے میں سوچنا شروع کر دو۔ دو فقروں کا زہر اس نے

خوب پی لیا۔ اس کی سالوں کی محبت کو آٹھ دنوں کی بدگمانی پر ترجیح دو۔" وہ خاموش ہو گئی تھی۔
شام کو سکھاں کو جیپ میں بٹھا کر وہ واپس جا رہی تھی۔ پیچھے سکھاں اس کا شوہر اور پاندھی بیٹھے ہوئے تھے آگے وہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔
اس کی میسج ٹون بجی "اس کے کھیت کا میسج ہو گا۔ اس سوچ کے ساتھ سیل بیگ سے نکالا۔
"میں اب بھی تمہارا منتظر ہوں ماروی۔" عمر سومرو کا نام پڑھ کر وہ تلخی سے مسکرا دی۔
"تم میرے بھائی ہو "وا عمر!" اس نے کچھ سوچ کر جوابی میسج کر دیا۔
وہ بہت خوش تھی۔ بعض دفعہ ایک خوشی کو بندہ بار بار محسوس کرتا ہے۔ اس نے سر پیچھے کر کے سکھاں کو دیکھا۔ جو بچہ گود میں لیے مسکرا رہی تھی۔
جیپ پکی سڑک سے مڑ کر گاؤں کی ریتلی پگڈنڈی پر اتری۔ اسی موڑ پر کھیت اونٹ کی مہار پکڑے کھڑا تھا۔
"بیٹا! کھیت کھڑا ہے یا اسے جیپ میں بٹھا لے یا تو اونٹ پر بیٹھ جا۔" پاندھی کا لہجہ پہلی بار حکمیہ ہوا۔
ماروی نے سر پیچھے کر کے باپ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر سر ہلا رہا تھا۔
اس نے ہاتھ کے اشارے سے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا عندیہ دیا۔
وہ آخر ماروی ہے۔ کیسے اپنے باپ کی بات سے مکر سکتی ہے۔ اس نے ایک لمحے کو دل کو ٹٹولا۔ جو راضی لگ رہا تھا۔ اس کی کامیابیوں کی تہ کے نیچے ناراضگی دب چکی تھی۔ وقت نے زخم مندمل کر دیے تھے اور دل بھی اب مسلسل کھیت کے پیچھے آنے پر مڑ کر دیکھنے لگا تھا۔
وہ آہستگی سے جیپ سے اتری۔ پیچھے پلٹ کر آتے ہوئے کھیت کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔
محبت اور دل کی رضا اس کی خاموشی سے عیاں تھی ۔ مسکراہٹ کے تبادلے نے دوریوں کو دور کر دیا تھا۔
کھیت نے اونٹ کو بٹھایا۔ وہ چنری پکڑ کر اونٹ پر بیٹھ گئی۔ دل کی کلیا محبت کی اور پلٹنے لگی تھی۔

پاندھی کی آنکھیں ماروی کی سعادت مندی اور کھیت کی آنکھیں محبت بچھڑ کر پھر ملنے پر بھیگ گئی تھیں۔ کھیت نے اونٹ کی مہار ہاتھ میں پکڑ کر اپنے شانے پر رکھی۔
ایک تو موسم پگلا ہے۔ دوجی رات ٹھنڈی ہو چکی ہے۔
ایسے میں تمہارا آنا نصیب کی گھڑی ہے۔
صحرا میں اس کی آواز پیار و پریت کا پیام بن کر لہرائی ۔ کھیت مست ہو کر گا رہا ہے۔
میرے پاس کوئی دولت بنگلہ اور محلات نہیں ہے۔
سبز لباس دھرتی نے پہنا تھر ریگستان میں برساتیں پڑی ہیں۔
میں نے بڑے پیار سے تمہارے لیے بکرے کی کھال بچھانے کے لیے بنائی ہے۔
وہ مست تھا مگن تھا۔ مور ناچنے لگے۔ اونٹ پر بیٹھی ماروی کے آگے وہ گا رہا تھا پورے جذب سے محبت سے ماروی مسکرا رہی ہے۔ اس کے دل کو گمشدہ محبت مل چکی ہے۔ تھر مسکرا رہا ہے۔ موسم مسکرا رہا ہے۔ پاندھی ہنس رہا ہے۔ سکھاں کھل اٹھی ہے۔ پورے گاؤں میں دہری خوشیاں دوڑ رہی ہیں۔
پورا گاؤں گا رہا ہے۔ ماروی اور کھیت کے ملاپ پر ۔ ساجن نے سکھ بھرا سانس لیا۔ سکون کھیت کی ماں کے چہرے پر بھی سانس لینے لگا۔ کھیت کے دوستوں نے کھیت کے گرد گھیرا ڈال کر ناچنا شروع کر دیا ہے۔
اور ماروی جو پہلے منگنی شدہ تھی وہ اب کھیت کی منکوحہ بننے جا رہی ہے۔
قسمت (تقدیر) نے قید کیا ورنہ ماروی (روح) اس کوٹ (جسم) کی قید میں کون آتا ہے۔
اور ماروی تو صرف دنیا کے نافہموں کے لیے مرتی ہے۔ ورنہ امر کو موت نہیں آتی "امر تو ہمیشہ امر ہے۔

عمیرہ احمد

آبِ حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کردیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایئر رنگز دیے ہیں۔ وہ بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کررہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی کسی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔

J۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال

کرنے آئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوے مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک صرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتادیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آجاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی، جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہال کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی سات سالہ بہن مسکرا دی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کررہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کردی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کردیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر ڈانس کی آفر کی' اس نے اس بھی انکار کردیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہورہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ آئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

تیئیسویں قسط (ل)

لاک اپ میں بیٹھ کر اس رات عائشہ عابدین نے اپنی گزری زندگی کو یاد کرنے کی کوشش کی تھی، مگر اس کی زندگی میں اتنا بہت کچھ ہو چکا تھا کہ وہ اس کوشش میں بھی ناکام ہو رہی تھی یوں جیسے وہ اٹھائیس سال کی زندگی نہیں تھی آٹھ سو سال کی زندگی تھی۔ کوئی بھی واقعہ اس ترتیب سے یاد نہیں آرہا تھا جس ترتیب سے وہ اس کی زندگی میں ہوا تھا اور وہ یاد کرنا چاہتی تھی۔

لاک اپ کے بستر پر چت لیٹے چھت کو گھورتے اس نے یہ سوچنے کی کوشش کی تھی کہ اس کی زندگی کا سب سے بدترین واقعہ کون سا تھا۔ سب سے تکلیف دہ تجربہ اور دور......

باپ کے بغیر زندگی گزارنا؟

احسن سعد سے شادی؟

اس کے ساتھ اس کے گھر میں گزارا ہوا وقت؟

ایک معذور بیٹے کی پیدائش؟

احسن سعد سے طلاق؟

اسفند کی موت؟ یا پھر اپنے ہی بیٹے کے قتل کے الزام میں دن دیہاڑے اسپتال سے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونا؟ اور ان سب واقعات کے بیچوں بیچ کئی اور ایسے تکلیف دہ واقعات جو اس کے ذہن کی دیوار پر اپنی جھلک دکھاتے ہوئے جیسے اس فہرست میں شامل ہونے کے لیے بے قرار تھے۔

وہ طے نہیں کر سکی۔ ہر تجربہ، ہر حادثہ اپنی جگہ تکلیف دہ تھا۔ اپنی طرز کا ہولناک.... وہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے جیسے زندگی کے وہ دن جینے لگی تھی اور اگلے واقعہ کے بارے میں سوچنا شروع کرتے ہوئے اسے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ پچھلا واقعہ زیادہ تکلیف دہ تھا یا پھر وہ، جو اسے اب یاد آیا تھا۔

کبھی کبھی عائشہ عابدین کو لگتا تھا وہ ڈھیٹ ہے.... تکلیف اور ذلت سہہ سہہ کر وہ اب شرمندہ ہونا اور درد سے متاثر ہونا چھوڑ چکی تھی۔ زندگی میں وہ اتنی ذلت اور تکلیف سہہ چکی تھی کہ شرم اور شرمندگی کے لفظ جیسے اس کی زندگی سے خارج ہو گئے تھے.... وہ اتنی ڈھیٹ ہو چکی تھی کہ مرنا بھی بھول گئی تھی۔ اسے کسی تکلیف سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ دل تھا تو وہ اتنے ٹکڑے ہو چکا تھا کہ اب اور ٹوٹنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ ذہن تھا تو اس پر جالے ہی جالے تھے.... عزت نفس، ذلت، عزت جیسے لفظوں کو چھپا دینے والے جالے.... یہ سوچنا اس نے کب کا چھوڑ دیا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں ہوا تھا اس نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا.... اس سوال کا جواب ویسے بھی اسے احسن سعد نے رٹوا دیا تھا۔

"لکھو اس کاغذ پر کہ تم گناہ گار ہو.... اللہ سے معافی مانگو.... پھر مجھ سے معافی مانگو.... پھر میرے گھر والوں سے معافی مانگو.... بے حیا عورت!"

پتا نہیں یہ آواز اس کے کانوں میں گونجنا بند کیوں نہیں ہوتی تھی.... دن میں.... رات میں.... سیکڑوں بار ان جملوں کی بازگشت اسے اس کے اس سوال کا جواب دیتی رہتی تھی کہ یہ سب اس کے ساتھ ہی کیوں ہوا تھا۔

وہ ایک گناہ گار عورت تھی.... یہ جملہ اس نے اتنی بار اپنے ہاتھ سے کاغذ پر لکھ کر احسن سعد کو دیا تھا کہ اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ جملہ حقیقت تھا۔ اس کا گناہ کیا تھا؟ یہ اسے یاد نہیں آتا تھا، مگر اسے پھر بھی یقین تھا کہ جو بھی گناہ اس نے کبھی زندگی میں کیا ہو گا، بہت بڑا ہی کیا ہو گا۔ اتنا بڑا کہ اللہ تعالیٰ اسے یوں بار بار "سزا" دے رہا تھا۔ سزا کا لفظ بھی اس نے احسن سعد اور اس کے گھر میں ہی سنا اور سیکھا تھا.... جہاں گناہ اور سزا کے لفظ کسی ورد کی طرح دہرائے جاتے تھے۔ ورنہ عائشہ عابدین نے تو احسن سعد کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے اللہ کو خود پر صرف "مہربان" دیکھا تھا۔

"بے حیا عورت....!" وہ گالی اس کے لیے تھی۔ عائشہ عابدین کو گالی سن کر بھی یقین نہیں آیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایک گالی اپنے لیے سن کر وہ گنگ رہ گئی تھی۔ کسی مجسمے کی طرح کھڑی کی کھڑی یوں جیسے اس نے کوئی سانپ یا اژدھا دیکھ لیا ہو.... وہ ناز و نعم میں پلی تھی۔ گالی تو ایک طرف اس نے کبھی اپنے نانا نانی یا ماں سے اپنے لیے کوئی سخت لفظ بھی نہیں سنا

تھا۔ ایسا لفظ جس میں عائشہ کے لیے توہین یا تضحیک ہوتی اور اب اس نے اپنے شوہر سے اپنے لیے جو لفظ سنا تھا اس میں تو الزام اور تہمت تھی۔

وہ "بے حیا" تھی۔ عائشہ عابدین نے اپنے آپ کو بہلایا تھا 'سو تاویلیں دے کر کہ یہ گالی اس کے لیے کیسے ہو سکتی ہے۔ یا شاید اس نے غلط سنا تھا یا پھر ان الفاظ کا مطلب وہ نہیں تھا جو وہ سمجھ رہی تھی۔ وہ اس کیفیت پر ایک کتاب لکھ سکتی تھی ان توجیہات 'ان وضاحتوں پر جو پہلی گالی سننے کے بعد اگلے کئی دن عائشہ عابدین نے اپنے آپ کو دی تھیں۔ اپنی عزت نفس کو دوبارہ بحال کرنے کے لیے اینٹی بایوٹکس کے ایک کورس کی طرح۔ لیکن یہ سب صرف پہلی گالی کی دفعہ ہوا تھا پھر آہستہ آہستہ عائشہ عابدین نے ساری توجیہات اور وضاحتوں کو دفن کر دیا تھا۔ وہ اب گالیاں کھاتی تھی اور بے حد خاموشی سے کھاتی تھی اور بہت بری بری۔ اور اسے یقین تھا وہ ان گالیوں کی مستحق تھی کیونکہ احسن سعد اس سے یہ کہتا تھا۔ پھر وہ مار کھانا بھی اسی سہولت سے سیکھ گئی تھی۔ اپنی عزت نفس کو ایک اور دلاسا دیتے ہوئے۔

پانچ افراد کا وہ گھرانہ اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اسی قابل تھی۔ وہ مومنین کے ایک ایسے گروہ میں پھنس گئی تھی جو زبان کے پتھروں سے اسے بھی مومن بنانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ "گناہ گار" تھی۔

احسن سعد اس کی زندگی میں کیسے آیا تھا اور کیوں آگیا تھا۔

ایک وقت تھا جب اسے لگتا تھا کہ وہ اس کی خوش قسمتی بن کر اس کی زندگی میں آیا ہے اور پھر ایک وہ وقت آیا جب اسے وہ ایک ڈراؤنا خواب لگنے لگا تھا جس کے ختم ہونے کا انتظار وہ شدومد سے کرتی تھی اور اب اسے لگتا تھا کہ وہ وہ عذاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اسے اس کے کردہ ناکردہ گناہوں پر اس دنیا میں ہی دے دیا ہے۔

وہ ہاؤس جاب کر رہی تھی جب احسن سعد کا پرپوزل اس کے لیے آیا تھا۔ عائشہ کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ اس کے لیے درجنوں پرپوزلز پہلے بھی آچکے تھے اور اس کے نانا نانی کے ہاتھوں رد بھی ہو چکے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ پرپوزل بھی کسی غور کے بغیر رد کر دیا جائے گا کیوں کہ اس کے نانا نانی اس کی تعلیم مکمل ہوئے بغیر اسے کسی قسم کے رشتے میں باندھنے پر تیار نہیں تھے مگر اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ احسن سعد کے والدین کی میٹھی زبان عائشہ عابدین کی فیملی پر اثر کر گئی تھی اور اس پر بھی۔

"ہمیں صرف ایک نیک اور اچھی بچی چاہیے اپنے بیٹے کے لیے۔ باقی سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ کسی چیز کی کمی نہیں ہے اور آپ کی بیٹی کی اتنی تعریفیں سنی ہیں ہم لوگوں نے کہ بس ہم آپ کے ہاں جھولی پھیلا کر آئے بغیر رہ نہ سکے۔"

احسن کے باپ نے اس کے نانا سے کہا تھا اور عائشہ عابدین کو تب پتا چلا تھا کہ اس کی ایک نند اس کے ساتھ میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی۔ ان دونوں کا آپس میں بہت رسمی سا تعارف تھا مگر اسے حیرت ہوئی تھی کہ اس رسمی تعارف پر بھی اس کی اتنی تعریفیں وہ لڑکی اپنی فیملی میں کر سکتی تھی جو کالج میں بالکل خاموش اور لیے دیے رہتی تھی۔

عائشہ عابدین کے لیے کسی کی زبان سے اپنی تعریفیں سننا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ وہ کالج کی سب سے نمایاں اسٹوڈنٹس میں سے ایک تھی اور وہ ہر شعبے میں نمایاں تھی اکیڈمک قابلیت میں 'نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں اور پھر اپنی پرسنالٹی کی وجہ سے بھی۔ وہ اپنے بیچ کی نہ صرف حسین بلکہ بے حد اسٹائلش لڑکیوں میں گنی جاتی تھی۔ بے حد باعمل مسلمان ہوتے ہوئے بھی اور مکمل طور پر حجاب لیے ہوئے بھی۔ حجاب عائشہ عابدین پر جچتا بھی تھا۔ یہ اس کی کشش کو بڑھانے والی چیز تھی اور اس کے بارے میں لڑکے اور لڑکیوں کی یہ متفقہ رائے تھی اور اب اس لڑکی کے لیے احسن سعد کا پرپوزل آیا تھا جس کی فیملی کو اس کے نانا نانی نے پہلی ملاقات میں ہی اوکے کر دیا تھا۔

پتا نہیں کون "سادہ" تھا۔ اس کے نانا 'نانی جنہیں احسن کے ماں باپ بہت شریف اور سادہ لگے تھے یا پھر وہ خود کہ انہوں نے اس خاندان کے بارے میں لمبی چوڑی تحقیق صرف اس لیے نہیں کروائی کیوں کہ انہوں نے احسن سعد کے ماں باپ کی دین داری کا پاس کیا تھا 'لیکن اس کے باوجود انہوں نے شادی سے پہلے احسن سعد اور عائشہ کی ایک ملاقات کروانا ضروری سمجھا تھا۔ احسن سعد اس وقت امریکا میں ریذیڈنسی کر رہا تھا اور چھٹیوں میں پاکستان آیا ہوا تھا۔

احسن سعد سے پہلی ملاقات میں عائشہ کو ایک لمبے عرصے کے بعد جبریل یاد آیا تھا اور اسے وہ جبریل کی طرح کیوں لگا تھا؟

عائشہ کو اس سوال کا جواب کبھی نہیں ملا۔
وہ مناسب شکل و صورت کا تھا' تعلیمی قابلیت میں بے حد اچھا اور بات چیت میں بے حد محتاط... اس کا پسندیدہ موضوع صرف ایک تھا۔ مذہب' جس پر وہ گھنٹوں بات کر سکتا تھا اور اس کے اور عائشہ عابدین کے درمیان رابطے کی کڑی یہی تھا۔
پہلی ہی ملاقات میں وہ دونوں مذہب پر بات کرنے لگے تھے اور عائشہ عابدین اس سے مرعوب ہوئی تھی۔ وہ حافظ قرآن تھا اور وہ اسے بتا رہا تھا کہ زندگی میں کبھی کسی لڑکی کے ساتھ اس کی دوستی نہیں رہی وہ عام لڑکوں کی طرح کسی الٹی سیدھی حرکتوں میں نہیں پڑا۔ وہ مذہب کے بارے میں جامع معلومات رکھتا تھا اور وہ معلومات عائشہ کی معلومات سے بہت زیادہ تھیں' لیکن وہ ایک سادہ زندگی گزارنا چاہتا تھا اور عائشہ بھی یہی چاہتی تھی۔
ایک عملی مسلمان گھرانے کے خواب دیکھتے ہوئے وہ احسن سعد سے متاثر ہوئی تھی اور اس کا خیال تھا وہ اپنی عمر کے دوسرے لڑکوں سے بے حد میچور اور مختلف ہے۔ وہ اگر کبھی شادی کرنے کا سوچتی تھی تو ایسے ہی آدمی سے شادی کرنے کا سوچتی تھی۔ احسن سعد پہلی ملاقات میں اسے متاثر کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ اس کی فیملی اس کے گھر والوں سے پہلے ہی متاثر تھی۔
یہ صرف نورین الہی تھی جس نے احسن کی فیملی پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ اسے وہ بے حد "کٹر" لگے تھے اور اس کی اس رائے کو اس کے اپنے ماں باپ نے یہ کہتے ہوئے رد کر دیا تھا کہ وہ خود ضرورت سے زیادہ لبرل ہے اس لیے وہ انہیں اس نظر سے دیکھ رہی ہے۔ نورین شاید کچھ اور بحث و مباحثہ کرتی اگر اسے یہ محسوس نہ ہوتا کہ عائشہ عابدین بھی وہی چاہتی تھی' جو اس کے ماں باپ چاہتے تھے۔ نورین الہی نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے تمام خدشات کو یہ کہہ کر سلا دیا تھا کہ عائشہ احسن کے والدین کے پاس نہیں امریکا میں احسن کے ساتھ رہے گی اور امریکا کا ماحول بڑے بڑوں کو ماڈرن بنا دیتا ہے۔
شادی بہت جلدی ہوئی تھی اور بے حد سادگی سے۔ یہ احسن سعد کے والدین کا مطالبہ تھا۔ اور عائشہ اور اس کے نانا نانی اس پر بے حد خوش تھے۔ عائشہ ایسی ہی شادی چاہتی تھی اور یہ اسے اپنی خوش قسمتی لگی تھی کہ اسے ایسی سوچ رکھنے والا سسرال مل گیا تھا۔ احسن سعد کی فیملی کی طرف سے جہیز کے حوالے سے کوئی مطالبہ نہیں آیا تھا بلکہ انہوں نے سختی سے عائشہ کے نانا' نانی کو ان روایتی تکلفات سے منع کیا تھا' مگر یہ عائشہ کی فیملی کے لیے اس لیے ممکن نہیں تھا کیونکہ عائشہ کے لیے اس کے نانا نانی بہت کچھ خریدتے رہتے تھے اور جس کلاس سے وہ تعلق رکھتی تھی' وہاں جہیز سے زیادہ مالیت کے تحائف دلہن کے خاندان کی طرف سے موصول ہو جاتے تھے اور عائشہ کی شادی کی تقریب میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ بہت سادگی سے کی جانے والی تقریب بھی شہر کے ایک بہترین ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی۔ احسن سعد اور اس کے خاندان کو عائشہ اور اس کی فیملی کی طرف سے دیے جانے والے تحائف کی مالیت بے شک لاکھوں میں تھی' مگر اس کے برعکس احسن سعد کی فیملی کی جانب سے شادی پر دیے جانے والے عائشہ کے ملبوسات اور زیورات احسن سعد کے خاندانی رکھ رکھاؤ اور مالی حیثیت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ وہ بس مناسب تھے۔
عائشہ کی فیملی کا دل برا ہوا تھا' لیکن عائشہ نے انہیں سمجھایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ "سادگی" سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ اگر انہوں نے زیورات اور شادی کے ملبوسات پر بھی بہت زیادہ پیسہ خرچ نہیں کیا تو بھی یہ ناخوش ہونے والی بات نہیں تھی۔ کم از کم اس کا دل ان چھوٹی موٹی باتوں کی وجہ سے کھٹا نہیں ہوا تھا۔
اس کا دل شادی کی رات اس وقت بھی کھٹا نہیں ہوا تھا جب کمرے میں آنے کے بعد اس کے قریب بیٹھ کر پہلا جملہ احسن سعد نے اپنی نئی نویلی دلہن اور اس کے حسن کے بارے میں نہیں کہا تھا بلکہ اس کی ماں کے حوالے سے کہا تھا۔
"تمہاری ماں کو شرم نہیں آتی... اس عمر میں فاحشاؤں کی طرح سلیولیس لباس پہن کر مردوں کے ساتھ ٹھٹھے لگاتی پھر رہی تھیں اور اسی طرح تمہاری بہنیں اور تمہارے خاندان کی ساری عورتیں پتا نہیں آج کیا کیا پہن کر شادی میں شرکت کرنے پہنچی ہوئی تھیں۔" عائشہ کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔ جو اس نے اپنے کانوں سے سنا تھا اسے اس پر یقین نہیں آیا تھا۔
احسن کا یہ لب و لہجہ اتنا نیا اور اجنبی تھا کہ اسے یقین آ بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کے درمیان نسبت طے ہونے کے بعد

وقتاً"فوقتاً"بات چیت ہوتی رہی تھی اور وہ ہمیشہ بڑے خوش گوار انداز اور دھیمے لب و لہجے میں بڑی شائستگی اور تمیز کے ساتھ بات کرتا تھا۔ اتنا اکھڑ لہجہ اس نے پہلی بار سنا تھا اور جو لفظ وہ اس کی ماں اور خاندان کی عورتوں کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ وہ عائشہ عابدین کے لیے ناقابل یقین تھے۔

"تمہاری ماں کو کیا آخرت کا خوف نہیں ہے؟ مسلمان گھرانے کی عورت ایسی ہوتی ہے۔ اور پھر بیوہ ہے وہ۔" عائشہ آنکھیں پھاڑے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے یہ سب کیوں سنا رہا تھا؟ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک دن کی دلہن تھی اور یہ وہ الفاظ نہیں تھے، جو وہ سننے کے لیے اپنی زندگی کے ایک اہم دن کے انتظار میں تھی۔

وہ آدھے گھنٹے تک ایسی عورتوں کو لعنت و ملامت کرتا رہا تھا اور اسے یہ بھی بتاتا رہا تھا کہ اس کی فیملی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ماں اور بہنیں اتنی آزاد خیال ہوں گی اور امریکہ میں ان کا یہ لائف اسٹائل ہوگا۔ انہوں نے تو اس کے نانا نانی اور خود اسے دیکھ کر یہ رشتہ طے کیا تھا۔ وہ احسن سعد سے یہ کہنے کی جرات نہیں کرسکی کہ وہ اس رشتے کے طے ہونے سے پہلے امریکہ میں دو تین بار اس کی ماں اور بہنوں سے مل چکا تھا۔ اور نسبت طے ہوتے ہوئے بھی اس کی فیملی اس کی ماں اور بہنوں سے مل چکی تھی۔ وہ آزاد خیال تھیں۔ تو یہ ان سے چھپا ہوا نہیں تھا، جس کا انکشاف اس رات ہونے پر وہ یوں صدمہ زدہ ہوگئے تھے۔

احسن سعد کے پاس مذہب ایسی تلوار تھی جس کے سامنے عائشہ عابدین بولنے کی ہمت نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں یہ مان لیا تھا کہ غلطی اس کی ماں اور بہنوں ہی کی تھی۔ وہ اسلامی لحاظ سے مناسب لباس میں نہیں تھیں اور احسن اور اس کی فیملی اگر خفا تھی تو شاید یہ جائز ہی تھا۔

اس رات احسن سعد نے اس ابتدائیے کے بعد ایک لمبی تقریر میں اسے بیوی اور ایک عورت کی حیثیت سے اس کا درجہ اور مقام بتا اور سمجھا دیا تھا جو ثانوی تھا۔ وہ سرہلاتی رہی تھی۔ وہ ساری آیات اور احادیث کے حوالے آج کی رات کے لیے ہی جیسے اکٹھا کرتا رہا تھا۔ وہ بے حد خاموشی سے سب کچھ سنتی گئی۔۔۔ وہ وقتی غصہ نہیں تھا، وہ ارادتاً"تھا۔۔۔ وہ اسے نفسیاتی طور پر ہلا دینا چاہتا تھا اور وہ اس میں کامیاب رہا تھا۔

اس پُراعتماد لڑکی کی شخصیت پر یہ پہلی ضرب تھی جو اس نے لگائی تھی۔ اس نے اسے بتایا تھا کہ اس گھر اور اس کی زندگی میں وہ اس کے ماں باپ اور بہنوں کے بعد آتی ہے اور ہاں اس فہرست میں اس نے اللہ کو بھی پہلے نمبر پر رکھا تھا۔ عائشہ عابدین کو اس نے جیسے اس دائرے سے باہر کھڑا کردیا تھا جس کے اندر اس کی اپنی زندگی گھومتی تھی۔ اکیس سال کی ایک نوعمر لڑکی جس طرح ہراساں ہوسکتی تھی وہ ویسے ہی ہراساں اور حواس باختہ تھی۔

احسن سعد نے اس سے کہا تھا اس کے اور عائشہ کے درمیان جو بات چیت ہوگی' عائشہ اسے کسی سے شیئر نہیں کرے گی۔ عائشہ نے اس کی بھی ہامی بھرلی تھی۔ اس کا خیال تھا یہ ایک عام وعدہ ہے، جو ہر مرد بیوی سے لیتا ہے' مگر وہ ایک عام وعدہ نہیں تھا۔ احسن سعد نے اس کے بعد اس سے قرآن پاک پر رازداری کا حلف لیا تھا' یہ کہتے ہوئے کہ وہ اس کی بیوی تھی اور شوہر کے طور پر وہ یہ استحقاق رکھتا تھا کہ وہ اس سے جو کہے وہ اس کی اطاعت کرے۔۔۔ اکیس سال کی عمر میں وہ عائشہ عابدین کی زندگی کی سب سے بُری رات تھی' لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کے بعد بری راتوں کی گنتی بھی بھولنے والی تھی۔

اس رات احسن سعد کا غصہ اور رویہ صرف اس کا غصہ اور رویہ نہیں تھا۔ اگلی صبح عائشہ عابدین سے اس کی فیملی بھی اسی انداز میں ملی تھی۔ بے حد سرد مہری بے حد اکھڑا ہوا لہجہ۔۔۔ اس کا احساس جرم اور بڑھا تھا اور اس نے دعا کی تھی کہ اس رات ولیمہ کی تقریب میں اس کی ماں اور بہنیں ایسا کوئی لباس نہ پہنیں جس پر اسے ایک اور طوفان کا سامنا کرنا پڑے۔

لیکن شادی کے چند دنوں کے اندر اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی فیملی کی خفگی کی وجہ اس کی اپنی فیملی کا آزاد خیال ہونا نہیں تھا۔ ان کی خفگی کی وجہ ان توقعات کا پورا نہ ہونا تھا جو وہ عائشہ کی فیملی سے لگائے بیٹھے تھے۔ شادی سادگی سے کرنے اور جہیز یا کچھ بھی نہ لانے کا مطلب "کچھ بھی" نہ لانا نہیں تھا۔ ان کو توقع تھی کہ ان کے اکلوتے اور اتنے قابل بیٹے کو عائشہ کی فیملی کوئی بڑی گاڑی ضرور دے گی۔۔۔ عائشہ کے نام کوئی گھر' کوئی پلاٹ' کوئی بینک بیلنس ضرور کیا جائے گا۔۔۔ جیسے ان کے خاندان کی دوسری بہوؤں کے نام تھا۔۔۔ شادی سادگی سے ہونے کا مطلب ان کے نزدیک صرف شادی کی تقریبات

کا سادہ ہونا تھا۔ شادی کے تیسرے دن یہ گلے شکوے عائشہ سے کرلیے گئے تھے اور اس کوشش کے ساتھ کہ وہ انہیں اپنی فیملی تک پہنچا دے، جو عائشہ نے پہنچا دیے تھے۔ اب شاکڈ ہونے کی باری اس کی فیملی کی تھی۔

شادی کے تین دن بعد پہلی بار نورین نے اپنی بیٹی کو یہ آپشن دیا تھا کہ وہ ابھی اس رشتے کے بارے میں اچھی طرح سوچ لے۔ جو لوگ تیسرے ہی دن ایسے مطالبے کرسکتے ہیں وہ آگے چل کر اسے اور بھی پریشان کرسکتے تھے۔ عائشہ ہمت نہیں کرسکی تھی۔ اپنی دوستوں اور کزنز کے ٹیکسٹ میسجز اور کالز اور چھیڑ چھاڑ کے دوران وہ یہ ہمت نہیں کرسکی تھی کہ وہ ماں سے کہہ دیتی کہ اسے طلاق چاہیے۔ اس نے وہی راستہ چنا تھا جو اس معاشرے میں سب چنتے تھے۔ سمجھوتے کا اور اچھے وقت کے انتظار کا۔ اس کا خیال تھا یہ سب کچھ وقتی تھا یہ چند مطالبے پورے ہونے کے بعد سب کچھ بدل جانے والا تھا اور پھر ایک بار وہ احسن کے ساتھ امریکا چلی جاتی تو پھر وہ اور احسن اپنے طریقے سے زندگی گزارتے۔

احسن کی فیملی کی ساری شکایات دور کردی گئی تھیں۔ اسے شادی کے ایک ہفتہ کے بعد ایک بڑی گاڑی دی گئی تھی۔ عائشہ کے نام نورین نے اپنا ایک پلاٹ ٹرانسفر کردیا تھا اور عائشہ کے نانا نے اس کو کچھ رقم تحفے میں دی تھی جو اس نے احسن کے مطالبے پر اس کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کردی تھی۔ وہ اس کے بعد دو ہفتوں کے لیے ہنی مون منانے بیرون ملک چلے گئے تھے۔

احسن سعد نے پہلی بار ہنی مون کے دوران کسی بات پر برہم ہو کر اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ اس سے پہلے اس نے اسے گالیاں دی تھیں۔ عائشہ عابدین سے بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی اپنی زندگی کے بارے میں۔ عائشہ نے جان لیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس کا شوہر بہت اچھا مسلمان ہو، لیکن اچھا انسان نہیں تھا اور عائشہ نے اس کا انتخاب اس کے اچھے مسلمان ہونے کی وجہ سے کیا تھا۔ اس دھوکے میں جس میں وہ ان بہت سارے اچھے مسلمانوں اور انسانوں کی وجہ سے آئی تھی جو منافق اور دوغلے نہیں تھے۔

وہ ایک مہینے کے بعد واپس امریکا چلا گیا تھا، لیکن اس ایک مہینے میں عائشہ بدل گئی تھی۔ وہ ایک عجیب و غریب خاندان میں آگئی تھی جو بظاہر تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھا، لیکن اندر سے بے حد گھٹن زدہ تھا اور اس گھٹن اور منافقت کا منبع احسن سعد کا باپ تھا، اس کا اندازہ اسے بہت جلد ہوگیا تھا۔

احسن خود اپنے باپ کی کاپی بن گیا تھا اور اسے اپنی ماں کی کاپی بنانا چاہتا تھا جسے وہ ایک آئیڈیل مسلمان عورت سمجھتا تھا۔ وہ اور اس کی بہنیں وہ عائشہ عابدین کو ان کے جیسا بنانا چاہتے تھے اور عائشہ عابدین کو بہت جلد اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ آئیڈیل مسلم عورتیں، نفسیاتی مسائل کا شکار تھیں۔ اس گھر کے ماحول اور سعد کے رویے اور مزاج کی وجہ سے.... اس کی نندوں کے لیے رشتوں کی تلاش جاری تھی، لیکن عائشہ کو یقین تھا جو معیار احسن اور سعد ان دونوں کے لیے لے کر بیٹھے تھے اس کو سامنے رکھ کے رشتوں کی تلاش اور بھی مشکل تھی۔

عائشہ شادی کے دو مہینوں کے اندر اندر اس ماحول سے وحشت زدہ ہوگئی تھی اور اس سے پہلے کہ وہ احسن سعد کا لیا ہوا حلف توڑ کر اپنے نانا نانی سے سب کچھ شیئر کرتی اور ان سے کہتی کہ وہ اسے اس جہنم سے نکال لیں۔ اسے پتا چلا کہ وہ پریگننٹ ہے۔ وہ خبر جو اس وقت اسے خوش قسمتی لگتی، اسے اپنی بدقسمتی لگی تھی۔ عائشہ عابدین ایک بار پھر سمجھوتا کرنے پر تیار ہوگئی۔ ایک بار پھر اس امید کے ساتھ کہ بچہ اس گھر میں اس کی حیثیت کو بدل دینے والا تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم اس کے اور احسن سعد کے تعلق کو.... تو یہ بھی اس کی خوش فہمی تھی۔ وہ پریگننسی اس کے لیے ایک اور پھندا ثابت ہوئی۔ احسن سعد اور اس کی فیملی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش تک پاکستان میں ہی رہے گی۔

عائشہ نے نو مہینے جتنے صبر اور تحمل کے ساتھ گزارے تھے، صرف وہ ہی جانتی تھی۔ وہ ہاؤس جاب کے بعد جاب کرنا چاہتی تھی، لیکن اس کے سسرال والوں اور احسن کو یہ پسند نہیں تھا اس لیے عائشہ نے اس پر اصرار نہیں کیا۔ اس کے سسرال والوں کو عائشہ کا بار بار اپنی نانی نانا کے گھر جانا اور ان کا اپنے گھر آنا بھی پسند نہیں تھا تو عائشہ نے یہ بات بھی بنا چوں چرا کے مان لی تھی۔ وہ اب کسی سوشل میڈیا پر نہیں تھی کیونکہ احسن کو خود ہر فورم پر موجود ہونے کے باوجود یہ پسند نہیں تھا کہ وہ وہاں ہو اور اس کے کانٹیکٹس میں کوئی مرد ہو، چاہے وہ اس کا کوئی رشتہ دار یا کلاس فیلو ہی کیوں نہ ہو اور عائشہ نے اپنی بہنوں کے اعتراضات کے باوجود اپنی ID ختم کردی تھی اس کے پاس ویسے بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کے

اظہار کے لیے اسے فیس بک سے کسی اکاؤنٹ کی ضرورت پڑتی۔

احسن سعد کی ماں کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھے۔ صبح دیر تک سوتی رہے عائشہ صبح سویرے فجر کی نماز پڑھنے کے بعد ہر حالت میں لاؤنج میں آجاتی تھی۔ گھر میں ملازم تھے لیکن ساس سسر کی خدمت اس کی ذمہ داری تھی اور اس پر اسے اعتراض بھی نہیں تھا۔ کھانا بنانے کی ذمہ داری جو اس سے پہلے خواتین میں تقسیم تھی' اب عائشہ کی ذمہ داری تھی اور یہ بھی ایسی بات نہیں تھی جس سے اسے تکلیف پہنچتی۔ وہ بہت تیز کام کرنے کی عادی تھی اور نانا نانی کے گھر میں بھی وہ بڑے شوق سے ان کے لیے کبھی کبھار کھانا بنایا کرتی تھی۔ وہ ذمہ داریوں سے نہیں گھبراتی تھی' تذلیل سے گھبراتی تھی۔ اس گھر کے افراد ستائش اور حوصلہ افزائی جیسے لفظوں سے ناآشنا تھے۔ وہ تنقید کر سکتے تھے' تعریف نہیں۔ یہ صرف عائشہ نہیں تھی جس کی خدمت گزاری کو وہ سراہنے سے قاصر تھے وہاں کوئی بھی کسی کو سراہتا نہیں تھا۔

وہ اس گھر میں یہ سوال کرتی تو اپنے آپ کو ہی وہ احمق لگتی کہ اس نے کھانا کیسا بنایا تھا۔ شروع شروع میں بڑے شوق سے کیے جانے والے ان سوالات کا جواب اسے بے حد تضحیک آمیز جملوں اور تمسخر سے ملا تھا۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ بھی نفسیاتی ہونا شروع ہو گئی ہے۔

احسن سعد اس کے لیے ایک ضابطہ طے کر گیا تھا۔ وہ غلطی کرے گی تو کاغذ پر لکھ کر اپنی غلطی کا اعتراف کرے گی۔ اللہ سے حکم عدولی کی معافی مانگے گی پھر اس شخص سے۔ جس کی اس نے نافرمانی کی ہو گی۔

ہفتے میں ایک بار عائشہ ایسا ایک معافی نامہ گھر کے کسی نہ کسی فرد کے نام لکھ رہی ہوتی تھی اور پھر آہستہ آہستہ اسے اندازہ ہوا وہ معافی نامہ بھی سعد کی ایجاد تھی.... احسن سعد اپنا سارا بچپن اپنی غلطیوں کے لیے اپنے باپ کو ایسے ہی معافی نامے لکھ لکھ کے دیتا رہا تھا اور اب اپنی بیوی کے گلے میں اس نے وہی رسی ڈال دی تھی۔

عائشہ پہلے حجاب کرتی تھی اب وہ نقاب اور دستانے بھی پہننا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے بال کٹوانا چھوڑ دیا تھا۔ میک اپ' فیشل' چہرے کے بالوں کی صفائی' سب کچھ چھوڑ دیا تھا کیونکہ اس گھر کی عورتیں ان میں سے کوئی کام نہیں کرتی تھیں۔ وہ آئیڈیل عورتیں تھیں اور عائشہ عابدین کو اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھالنا تھا۔ اپنے باہر کو دوسروں کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھالتے ڈھالتے عائشہ عابدین کے اندر کے سارے سانچے ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔

اس کے نانا نانی اور فیملی کو یہ پتا تھا کہ اس کے سسرال والے اچھے لوگ نہیں تھے' لیکن عائشہ اس گھر میں کیا برداشت کر رہی تھی' انہیں اس کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ اس حلف کو نبھا رہی تھی جو وہ شادی کی پہلی رات لے بیٹھی تھی۔ کوئی بھی اس سے ملنے پر اس سے فون پر بات کرنے پر اسے کرید تا رہتا مگر عائشہ کے پاس بتانے کو کچھ بھی نہیں ہوتا تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی اور اس کی ناخوشی دوسرے کی غلط فہمی تھی اور ان نو مہینوں کے دوران اس کا اور احسن سعد کا تعلق نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ واپس جانے کے بعد بچے کی پیدائش تک دوبارہ واپس نہیں آیا تھا۔ ان کے درمیان فون پر اور اسکائپ پر بات بھی' بہت مختصر ہوتی اور اس میں بھی تب وقفہ پڑ جاتا جب احسن کے گھر میں کوئی اس سے خفا ہوتا' امریکا میں ہونے کے باوجود گھر میں ہونے والے ہر معاملے سے اسے آگاہ رکھا جاتا تھا' خاص طور پر عائشہ کے حوالے سے۔

عائشہ کو کبھی کبھی لگتا تھا وہ شوہر اور بیوی کا رشتہ نہیں تھا۔ ایک بادشاہ اور کنیز کا رشتہ تھا۔ احسن سعد کو اس سے ویسی ہی اطاعت چاہیے تھی اور وہ اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے ایسی بیوی بننے کی کوشش کر رہی تھی جیسی احسن سعد کو چاہیے تھی۔

اسفند کی پیدائش تک کے عرصے میں عائشہ عابدین کچھ کی کچھ ہو چکی تھی۔ جس گھٹن میں وہ جی رہی تھی اس گھٹن نے اس کے بچے کو بھی متاثر کیا تھا۔ اس کا بیٹا اسفند نارمل نہیں تھا' یہ عائشہ عابدین کا ایک اور بڑا گناہ تھا۔

☆ ☆ ☆

اوول آفس سے ملحقہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پروٹوکول آفیسر کی رہنمائی میں داخل ہوتے ہوئے سالار سکندر کے انداز میں اس جگہ سے واقفیت کا عنصر بے حد نمایاں تھا۔ وہ بڑے مانوس انداز میں چلتے ہوئے وہاں آیا تھا اور اس کے بعد

ہونے والے تمام Rituals (آداب) سے بھی واقف تھا۔ وہ یہاں کئی بار آچکا تھا۔ کئی وفود کا حصہ بن کر۔۔۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا جب وہ وہاں تنہا بلایا گیا تھا۔

اسے بٹھانے کے بعد وہ آفیسر اندرونی دروازے سے غائب ہو گیا تھا۔ وہ پندرہ منٹ کی ایک ملاقات تھی، جس کے اہم نکات وہ اس وقت ذہن میں دہرا رہا تھا۔ وہ امریکہ کے کئی صدور سے مل چکا تھا، لیکن وہ صدر جس سے وہ اس وقت ملنے آیا تھا، خاص تھا۔ کئی حوالوں سے۔۔۔

وال کلاک پر ابھی 9:55 ہوئے تھے۔

صدر کے اندر آنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ اس سے پہلے 9:56 پہ ایک ویٹر اس کو پانی پیش کر کے گیا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ 9:57 پہ ایک اور اٹینڈنٹ اسے کافی سرو کرنے آیا تھا۔ اس نے منع کر دیا۔ 9:59 پہ اوول آفس کا دروازہ کھلا اور صدر کی آمد کا اعلان ہوا۔ سالار اٹھ کھڑا ہوا۔

اوول آفس کے دروازے سے اس کمرے میں آنے والا صدر، امریکہ کی تاریخ کا کمزور ترین صدر تھا۔ وہ 2030ء کا امریکہ تھا۔ بے شمار اندرونی اور بیرونی مسائل سے دوچار ایک کمزور ملک۔۔۔ جس کی کچھ ریاستوں میں اس وقت خانہ جنگی جاری تھی۔ کچھ میں نسلی فسادات۔۔۔ اور ان سب میں امریکہ کا وہ پہلا صدر تھا جس کی کابینہ اور تھنک ٹینکس میں مسلمانوں اور یہودیوں کی تعداد اب برابر ہو چکی تھی۔ اس کی پالیسیز کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ بھی اندرونی خلفشار کا شکار تھی۔ لیکن یہ وہ مسائل نہیں تھے جن کی وجہ سے امریکہ کا صدر اس سے ملاقات کر رہا تھا۔

امریکہ اپنی تاریخ کے سب سے بڑے مالیاتی اور بینکنگ بحران کے دوران اپنی بین الاقوامی پوزیشن اور ساکھ کو بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا اور SIF (ایس آئی ایف) کے سربراہ سے وہ ملاقات ان ہی کوششوں کا ایک حصہ تھی۔ ان آئینی ترامیم کے بعد جو امریکہ کو اپنے ملک کی حیثیت کو مکمل طور پر ڈوبنے سے بچانے کے لیے کرنی پڑی تھیں۔

اپنی تاریخ کے اس سب سے بڑے مالیاتی بحران میں جب امریکہ کی اسٹاک ایکسچینج کریش کر گئی تھی۔ اس کے بڑے مالیاتی ادارے دیوالیہ ہو رہے تھے۔ ڈالر کی ویلیو کو کسی ایک جگہ روکنا مشکل ہو گیا تھا اور مسلسل گرتی ہوئی اپنی کرنسی کو استحکام دینے کے لیے امریکہ کو تین مہینے کے دوران تین بار اس کی ویلیو خود کم کرنی پڑی تھی۔ صرف ایک ادارہ تھا جو اس مالیاتی بحران کو جھیل گیا تھا۔ لڑکھڑانے کے باوجود وہ امریکہ کے بڑے مالیاتی اداروں کی طرح زمین بوس نہیں ہوا تھا، نہ ہی اس نے ڈاؤن سائزنگ کی تھی، نہ بیل آؤٹ پیکجز مانگے تھے۔ اور وہ SIF تھا۔ پندرہ سال میں وہ ایک بین الاقوامی مالیاتی ادارے کے طور پر اپنی شان دار ساکھ اور نام بنا چکا تھا اور امریکہ اور بہت سے دوسرے چھوٹے ملکوں میں وہ بہت سے چھوٹے بڑے اداروں کو ضم کر کے اپنی چھتری تلے لا چکا تھا اور وہ چھتری مغربی مالیاتی اداروں کی شدید مخاصمت اور مغربی حکومتوں کے سخت ترین امتیازی قوانین کے باوجود پھیلتی چلی گئی تھی۔

پندرہ سالوں میں SIF نے اپنی بقا اور ترقی کے لیے بہت ساری جنگیں لڑی تھیں اور ان میں سے ہر جنگ جو کبھی تھی۔ لیکن SIF اور اس سے منسلک افراد ڈٹے رہے تھے اور پندرہ سال کی اس مختصر مدت میں مالیاتی دنیا کا ایک بڑا مگر مچھ اب SIF بھی تھا جو اپنی بقا کے لیے لڑی جانے والی ان تمام جنگوں کے بعد اب بے حد مضبوط ہو چکا تھا۔

یورپ اور ایشیا اس کی بڑی مارکیٹیں تھیں۔ لیکن یہ افریقہ تھا جس پر SIF مکمل طور پر قابض تھا۔ وہ افریقہ جس میں کوئی گورا 2030ء میں SIF کے بغیر کوئی مالیاتی ٹرانزیکشن کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ افریقہ SIF کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ سالار سکندر کے ہاتھ میں تھا، جسے افریقہ اور اس کے لیڈرز نام اور چہرے سے پہچانتے تھے۔ پچھلے پندرہ سالوں میں صرف سالار کا ادارہ وہ واحد ادارہ تھا جو افریقہ کے کئی ممالک میں بدترین خانہ جنگی کے دوران بھی کام کرتا رہا تھا اور اس سے منسلک وہاں کام کرنے والے سب افریقی تھے اور SIF کے مشن اسٹیٹمنٹ پر یقین رکھنے والے۔۔۔ جو یہ جانتے تھے جو کچھ SIF ان کے لیے کر رہا تھا اور کر سکتا تھا۔ وہ دنیا کا کوئی اور مالیاتی ادارہ نہیں کر سکتا تھا۔

SIF افریقہ میں ابتدائی دور میں کئی بار نقصان اٹھانے کے باوجود وہاں سے نکلا نہیں تھا، وہ وہیں جما اور ڈٹا رہا تھا اور اس کی وہاں بقا کی بنیادی وجہ سود سے پاک وہ مالیاتی نظام تھا جو وہاں کی مقامی صنعتوں اور صنعت کاروں کو صرف سود سے پاک قرضے دے رہا تھا بلکہ انہیں اپنے وسائل سے اس انڈسٹری کو کھڑا کرنے میں انسانی وسائل بھی فراہم کر رہا تھا۔

پچھلے پندرہ سالوں میں SIF کی افریقہ میں ترقی کی شرح ایک اسٹیج پر اتنی بڑھ گئی تھی کہ بہت سے دوسرے مالیاتی اداروں کو افریقہ میں اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے SIF کا سہارا لینا پڑا تھا۔
سالار سکندر سیاہ فاموں کی دنیا کا بے تاج بادشاہ تھا اور اس کی یہ پہچان بین الاقوامی تھی۔ افریقہ کے مالیاتی نظام کی کنجی SIF کے پاس تھی۔ اور سالار سکندر کے اس دن وائٹ ہاؤس میں بیٹھے ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ امریکہ ورلڈ بینک کو دیے جانے والے فنڈز میں اپنا حصہ ادا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا اور ورلڈ بینک کو فنڈز کی فراہمی میں ناکام رہنے کے بعد اس سے سرکاری طور پر علیحدگی اختیار کر رہا تھا۔ ورلڈ بینک اس سے پہلے ہی ایک مالیاتی ادارے کے طور پر بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ یہ صرف امریکہ نہیں تھا جو مالیاتی بحران کا شکار تھا۔ دنیا کے بہت سے دوسرے ممالک بھی اسی کساد بازاری کا شکار تھے اور اس افراتفری میں ہر ایک کو صرف اپنے ملک کی معیشت کی پروا تھی۔ اقوام متحدہ سے منسلک ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے اداروں کے ذریعے ترقی پذیر ممالک کی اقتصادیات پر قابض رہنا اب نہ صرف ناممکن ہو گیا تھا' بلکہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں آئے ہوئے مالیاتی بحران کے بعد اب یہ بے کار بھی ہو گیا تھا۔
ورلڈ بینک اب وہ سفید ہاتھی تھا جس سے وہ ساری استعماری قوتیں جان چھڑانا چاہتی تھیں اور کئی جان چھڑا چکی تھیں۔ اقوام متحدہ کا وہ چارٹر جو اپنے ممبران کو ورلڈ بینک کے ادارے کو فنڈز فراہم کرنے کا پابند کرتا تھا۔ اب ممبران کے عدم تعاون اور عدم دلچسپی کے باعث کاغذ کے ایک پرزے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اقوام متحدہ اب وہ ادارہ نہیں رہا تھا جو بین الاقوامی برادری کو سیکڑوں سالوں سے چلے آنے والے ایک ہی مالیاتی نظام میں پروئے رہنے پر مجبور کر سکتا۔
دنیا بدل چکی تھی اور گھڑی کی سوئیوں کی رفتار کے ساتھ مزید بدلتی جا رہی تھی اور اس رفتار کو روکنے کی ایک آخری کوشش کے لیے امریکہ کے صدر نے SIF کے سربراہ کو وہاں بلایا تھا۔
ایوان ہاکنز نے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنے اس پرانے حریف کو ایک خیر مقدمی مسکراہٹ دینے کی کوشش کی جو اس کے استقبال کے لیے مؤدبانہ اور بے حد باوقار انداز میں کھڑا تھا۔ سیاست میں آنے سے پہلے ایوان ایک بڑے مالیاتی ادارے کا سربراہ رہ چکا تھا۔ سالار سکندر کے ساتھ اس کی سالوں پرانی واقفیت بھی تھی اور رقابت بھی۔ SIF نے امریکہ میں اپنی تاریخ کا پہلا بڑا انضمام اس کے ادارے کو کھا کر کیا تھا۔ اور اس انضمام کے بعد ایوان کو اس کے عہدے سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ وہ آج امریکہ کا صدر تھا' لیکن وہ ناکامی اور بدنامی آج بھی اس کے ریکارڈ میں ایک داغ کے طور پر موجود تھی۔ یہ ایوان کی بدقسمتی تھی کہ اتنے سالوں کے بعد وہ اسی پرانے حریف کی مدد لینے پر ایک بار پھر مجبور ہوا تھا۔ وہ اس کے دور صدارت میں اسے ڈھول پیٹتے آن پہنچا تھا۔ یہ اس کے احساسات تھے۔ سالار کے نہیں۔ وہ وہاں کسی اور ایجنڈے کے ساتھ آیا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور پھنسا ہوا تھا۔
''سالار سکندر...'' چہرے پر ایک گرم جوش مسکراہٹ کا نقاب چڑھائے' ایوان نے سالار کا استقبال تیز رفتاری سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے یوں کیا تھا جیسے وہ حریف نہیں رہے تھے' بہترین دوست تھے' جو وائٹ ہاؤس میں نہیں کسی گالف کورس پر مل رہے تھے۔ سالار نے اس کی خیر مقدمی مسکراہٹ کا جواب اتنی ہی خوش دلی کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے دیا تھا۔ دونوں کے درمیان رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا۔ موسم کے بارے میں ایک آدھ بات ہوئی' جو اچھا تھا اور اس کے بعد دونوں اپنی اپنی نشست سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ وہ ون آن ون ملاقات تھی۔ کمرے کے دروازے اب بند ہو چکے تھے اور وہاں ان دونوں کا اسٹاف نہیں تھا اور اس ون آن ون ملاقات کے بعد ان دونوں کی ایک مشترکہ پریس کانفرنس تھی' جس کے لیے اس کمرے سے کچھ فاصلے پر ایک اور کمرے میں بیٹھے دنیا بھر کے صحافی بے تابی سے منتظر تھے۔
اس ملاقات سے پہلے ان دونوں کی ٹیم کے افراد کئی بار آپس میں مل چکے تھے۔ ایک فریم ورک وہ ڈسکس بھی کر چکے تھے اور تیار بھی۔ اب اس ملاقات کے بعد باضابطہ طور پر وہ دونوں وہ اعلان کرتے جس کی بھنک میڈیا کو پہلے ہی مل چکی تھی۔
امریکہ اب ورلڈ بینک کے ذریعے نہیں SIF کے ذریعے دنیا کے ترقی پذیر ممالک میں گھسنا چاہتا تھا۔ خاص طور پر افریقہ میں اور اس کے لیے وہ ورلڈ بینک سے باضابطہ علیحدگی اختیار کر رہا تھا۔ مگر اس کے سامنے مسئلہ صرف ایک تھا۔ امریکہ کا ایجنڈا SIF کے ایجنڈے سے مختلف تھا اور اس ملاقات میں سالار سکندر کو غیر رسمی انداز میں... آخری بار

ان امریکی مفادات کے تحفظ کی یاددہانی کروائی تھی۔ امریکہ SIF کی ٹیم کے بہت سارے مطالبات مان کر اس فریم ورک پر تیار ہوا تھا۔ یہ وہ امریکہ نہیں رہا تھا جو بندوق کی نوک پر کسی سے کچھ بھی کروا سکتا تھا۔ یہ انتشار کا شکار ایک کھوکھلا ہوتا ہوا ملک تھا جو بات سنتا تھا۔ مطالبات مانتا تھا اور اپنی پوزیشن سے پیچھے ہٹ جاتا تھا یا پھر آخری حربے کے طور پر اپنے مفادات کی خاطر وہ کرتا تھا جو اس بار بھی اس میٹنگ کے اچھے یا برے نتیجے کے ساتھ پہلے سے مشروط تھا۔

میٹنگ کا نتیجہ ویسا ہی نکلا تھا۔ جیسی ایوان کو توقع تھی۔ سالار سکندر کو SIF کے ایجنڈے کے حوالے سے کوئی ابہام نہیں تھا۔ نہ ہی امریکی حکومت کے ایجنڈے کے حوالے سے۔ وہ امریکی حکومت کی مدد کرنے پر تیار تھا۔ اس فریم ورک کے تحت جو اس کی ٹیم نے تیار کیا تھا، لیکن SIF کو امریکہ کا ترجمان بنانے پر تیار نہیں تھا۔ اس نے ایوان کی تجویز کو شکریہ کے ساتھ رد کردیا تھا۔ دو مگرمچھوں کے درمیان دشمنی ہوسکتی تھی، دوستی نہیں۔ مگر دشمنی کے ساتھ بھی وہ ایک ہی پانی میں رہ سکتے تھے۔ بڑے محتاط اور پرامن طریقے سے، اپنی اپنی حدود میں، اور اس نے ایوان کو بھی یہی مشورہ دیا تھا جس سے ایوان نے اتفاق کیا تھا۔ سالار سکندر سے انہیں جیسے جواب کی توقع تھی انہیں ویسا ہی جواب ملا تھا۔

SIF کو اب ایک نئے سربراہ کی ضرورت تھی جو زیادہ لچک دار رویے کا حامل ہوتا اور زیادہ سمجھ دار بھی۔ سالار سکندر میں ان دونوں چیزوں کی اب کچھ کمی ہوگئی تھی۔ یہ ایوان کا اندازہ تھا۔

سی آئی اے کو SIF کے نئے سربراہ کے بارے میں تجاویز دینے سے پہلے SIF کے پرانے سربراہ کو ہٹانے کے لیے احکامات دے دیے گئے تھے اور یہ اس میٹنگ کے بعد ہوا تھا۔

اس سے پہلے ایوان نے سالار سکندر کے ساتھ اس پریس کانفرنس میں شرکت کی تھی، جس میں امریکہ نے باقاعدہ طور پر ملک میں ہونے والے مالیاتی بحران سے نپٹنے کے لیے نہ صرف SIF کی مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا بلکہ SIF کے ساتھ طے پانے والے اس فریم ورک کا بھی اعلان کیا تھا، جس کی منظوری صدر نے بے حد دباؤ کے باوجود دے دی تھی۔

ایوان ہاکنز کو اس اعلان کے وقت ویسی ہی تضحیک محسوس ہورہی تھی جتنی اس نے اس وقت محسوس کی تھی۔ جب اس کے مالیاتی ادارے کا انضمام SIF کے ساتھ ہوا تھا اور جس کے بعد وہ اپنے عہدے سے فارغ ہوگیا تھا۔ اسے یقین تھا تاریخ اس بار اپنے آپ کو کچھ مختلف طریقے سے دہرانے والی تھی۔ اس دفعہ اسکرین سے غائب ہونے والا اس کا پرانا حریف تھا، وہ نہیں۔

☆ ☆ ☆

رئیسہ سالار کی زندگی پر اگر کوئی کتاب لکھنے بیٹھتا تو یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ خوش قسمت تھی۔ جس کی زندگی میں آتی تھی، اس کی زندگی بدلنا شروع کردیتی تھی۔ وہ جیسے پارس پتھر تھی جو اس سے چھو جاتا۔۔۔ سونا بننے لگتا تھا۔

سالار سکندر کے خاندان کا حصہ بننے کے بعد وہ ان کی زندگی میں بھی بہت ساری تبدیلیاں لے آئی تھی اور اب ہشام سے منسلک ہونے کے بعد اس کی زندگی کے اس خوش قسمتی کے دائرے نے ہشام کو بھی اپنے گھیرے میں لینا شروع کردیا تھا۔

بحرین میں ہونے والے اس طیارے کے حادثے میں امیر سمیت شاہی خاندان کے جو افراد ہلاک ہوئے تھے وہ دراصل بحرین کی بادشاہت کے حق داروں کی ہلاکت تھی۔ پیچھے رہ جانے والا ولی عہد نوجوان، ناتجربہ کار اور عوام سے بہت دور تھا اور اس حلقے میں بے حد ناپسندیدہ تھا جو امیر کا حلقہ تھا۔

ہشام کے باپ صباح بن جراح کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں تھا کہ وہ امیر اور شاہی خاندان کے افراد کی تدفین کی تقریبات میں شرکت کے لیے جب بحرین پہنچے گا تو بادشاہت کا ہما اس کے سر پر آن بیٹھے گا۔ بحرین کی کونسل کے ایک ہنگامی اجلاس میں ولی عہد کو برطرف کرتے ہوئے بادشاہت کے حق داروں کی فہرست میں بہت نیچے کے نمبر پر براجمان صباح کو اکثریتی تائید سے بحرین کا نیا امیر نامزد کردیا گیا تھا۔ اس عہدے پر اسے وقتی طور پر فائز کیا گیا تھا۔ مگر اگلے چند ہفتوں میں کونسل نے اس حوالے سے حتمی فیصلہ بھی کردیا تھا۔ ولی عہد کی نامزدگی کونسل کے اگلے اجلاس تک کے لیے ملتوی کردی گئی تھی۔

یہی وہ خبر تھی جو رئیسہ کو حمین نے سنائی تھی۔ خبر اتنی غیر متوقع اور ناقابل یقین تھی کہ رئیسہ کو بھی یقین نہیں آیا تھا،

لیکن جب اسے یقین آیا تو وہ پرجوش ہو گئی۔

"اور اب بری خبر کیا ہے؟ وہ بھی سنا دو۔" اس نے حمین سے پوچھا تھا۔

"ہشام اور تمہاری شادی میں اب بہت ساری رکاوٹیں آئیں گی۔ صرف اس کے خاندان کی طرف سے نہیں پورے شاہی خاندان کی طرف سے۔" حمین نے بنا کسی تمہید کے کہا۔ وہ فکر مند ہونے کے باوجود خاموش ہو گئی تھی۔

ہشام سے اس کی ملاقات امریکہ واپسی کے دوسرے دن ہی ہو گئی تھی۔ وہ ویسا ہی تھا۔ بے فکر۔ لاپروا۔ اپنے باپ کے بدلے جانے والے اسٹیٹس کے بارے میں زیادہ دلچسپی نہ دکھاتا ہوا۔ اس کا خیال تھا اس کے باپ کو ملنے والا وہ عہدہ وقتی تھا۔ چند ہفتوں کے بعد کونسل اس کے باپ کی جگہ شاہی خاندان کے ان افراد میں سے کسی کو اس عہدے پر فائز کرے گی جو جانشینی کی دوڑ میں اس کے باپ سے اوپر کے نمبر پر تھے۔

"تم نے اپنی فیملی سے بات کی؟" اس نے چھوٹتے ہی رئیسہ سے وہی سوال کیا تھا جس کے حوالے سے وہ فکر مند تھی۔

"حمین سے بات ہوئی میری اور حمین نے پاپا سے بھی بات کی ہے' لیکن پاپا کو ہمارے حوالے سے پہلے ہی کچھ اندازہ تھا۔ انہوں نے کہا ہے وہ مجھ سے اس ایشو پر آمنے سامنے بات کریں گے۔ لیکن حمین تم سے ملنا چاہتا ہے۔"

رئیسہ نے اسے بتایا۔ حمین 'ہشام سے چند بار سرسری انداز میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ لیکن یہ پہلی بار تھا کہ حمین نے خاص طور پر اس سے ملنے کی فرمائش کی تھی۔

"مل لیتا ہوں۔ میں تو اتنا مصروف نہیں رہتا' وہ رہتا ہے' تم اس سے پوچھ لو کہ کب ملنا چاہے گا۔" ہشام نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا تھا۔

"تمہاری فیملی کو میری ایڈاپشن کا پتا ہے؟" اس بار رئیسہ نے بالآخر اس سے وہ سوال کیا تھا جو بار بار اس کے ذہن میں آرہا تھا۔

"نہیں۔ میری کبھی ان سے اس حوالے سے بات نہیں ہوئی۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟" ہشام اس کی بات پر چونکا تھا۔

"انہیں اعتراض تو نہیں ہوگا کہ میں ایڈاپٹڈ ہوں۔"

"کیوں اعتراض ہوگا؟ میرا نہیں خیال کہ میرے پیرنٹس اتنے تنگ نظر ہیں کہ اس طرح کی باتوں پر اعتراض کریں گے۔" ہشام نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "میں اپنے والدین کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

حمین سے اس کی ملاقات دو ہفتے بعد طے ہوئی تھی مگر اس سے پہلے ہی ہشام کو ایک بار پھر ایمرجنسی میں بحرین بلالیا گیا تھا۔ اس کے باپ کی کونسل نے متفقہ فیصلے سے امیر کے طور پر توثیق کردی تھی اور ہشام بن صباح کو بحرین کا نیا ولی عہد نامزد کردیا گیا تھا۔ ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ہشام کو بحرین بلایا گیا تھا اور وہاں پہنچنے پر یہ خبر ملنے پر اس نے سب سے پہلے فون پر رئیسہ کو یہ اطلاع دی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا۔ رئیسہ چاہتے ہوئے بھی خوش نہ ہو سکی۔ وہ ایک عام آدمی سے یک دم ایک "خاص آدمی" ہو گیا تھا۔ حمین کی باتیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

ہشام بہت جلدی میں تھا۔ ان دونوں کے درمیان صرف ایک آدھ منٹ کی گفتگو ہو سکی تھی۔ فون بند ہونے کے بعد رئیسہ کے لیے سوچ کے بہت سارے در کھل گئے تھے۔ وہ پریوں کی کہانیوں پر یقین نہیں کرتی تھی۔ کیونکہ اس نے جس فیملی میں پرورش پائی تھی وہاں کوئی پریوں کی کہانی نہیں تھی۔ وہاں اتفاقات اور انقلابات نہیں تھے۔ کیریئر' زندگیاں' نام' سب محنت سے بنائی جارہی تھیں اور رئیسہ سالار کو اپنے سامنے نظر آنے والی وہ پریوں کی کہانی بھی ایک سراب لگ رہی تھی۔

وہ ایک عرب امریکن سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ ایک عرب بادشاہ سے نہیں۔ اسے آسائشات کی ہوس نہیں تھی اور اس کی زندگی کے مقاصد اور تھے۔ اور چند دن پہلے تک اس کے اور ہشام کی زندگی کے مقاصد ایک جیسے تھے۔ اب وہ لمحہ بھر میں ریل کی پٹری کے دو ٹریک نہیں رہے تھے۔ مخالف سمت میں جانے والا ایک دوسرا ٹریک ہو گئے تھے۔

وہ بہت غیر جذباتی ہو کر اب حمین کی اس گفتگو کو یاد کر رہی تھی جو اس نے ہشام کے حوالے سے کی تھی اور وہ تب کی تھی جب وہ ولی عہد نہیں بنا تھا۔ اسے اب جاننا تھا کہ حمین 'ہشام کے بارے میں اب کیا سوچتا ہے۔

ہشام کے حوالے سے یہ خبر بھی حمین نے ہی اسے اسی رات دی تھی جب وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ایک کانفرنس اٹینڈ کرنے کے لیے مانٹریال میں تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے جواباً" حمین کو ٹیکسٹ کیا۔

"مجھے تمہیں مبارک باد دینی چاہیے یا افسوس کرنا چاہیے؟" جواباً" ٹیکسٹ آیا تھا۔ وہ اس کے مزاج سے واقف تھا۔ وہ مسکرادی۔

"تمہاری رائے کیا ہے؟" اس نے جواباً" پوچھا۔

"افسوس ناک خبر ہے۔"

"جانتی ہوں۔" اس نے حمین کے ٹیکسٹ پر اتفاق کیا۔

جواباً" اس کی کال آنے لگی تھی۔

"اتنا بھی اپ سیٹ ہونے والی بات نہیں ہے۔" حمین نے ہیلو سنتے ہی بڑے خوش گوار لہجے میں اس سے کہا تھا۔ وہ اس کی آواز کا ہر انداز پہچانتا تھا۔

"نہیں اپ سیٹ تو نہیں ہوں۔ بس یہ سب غیر متوقع ہے' اس لیے۔" رئیسہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"میرے لیے غیر متوقع نہیں ہے یہ۔ مجھے اندازہ تھا اس کا۔" اس نے جواباً" کہا تھا۔

"تو پھر اب۔؟" رئیسہ نے ایک بار پھر ادھورے جملے میں اس سے مسئلے کا حل پوچھا۔

"تم نے کہا تھا۔ تم اس پروپوزل کے حوالے سے بہت زیادہ جذباتی نہیں ہو۔" حمین نے اطمینان سے لمحے بھر میں تصویر کا سیاہ ترین پہلو اسے دکھایا۔ یعنی ہشام کو بھول جانے کا مشورہ دیا۔

"تم واقعی ایسا سوچ رہے ہو؟" رئیسہ کو جیسے یقین نہیں آیا۔ "تمہیں لگتا ہے میری اور اس کی شادی نہیں ہوسکتی؟"

"ہوسکتی ہے' لیکن اس کی شادی صرف تمہارے ساتھ ہو اور تمہارے ساتھ ہی رہے' یہ میرے لیے زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔" عرب بادشاہ "حرم" رکھتے ہیں۔" حمین نے اسے جتایا تھا۔ تصویر کا ایک اور رخ اسے دکھایا جو اس نے ابھی دیکھنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔

"میں جانتی ہوں۔" اس نے مدھم آواز میں کہا پھر اگلے ہی جملے میں جیسے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کی "لیکن ہشام کے باپ نے شاہی خاندان کا حصہ ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کبھی نہیں کی۔"

"وہ امریکہ میں سفیر رہے ہیں۔ بادشاہ کبھی نہیں رہے۔" حمین نے ترکی بہ ترکی کہا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آیا۔

"So it's all over-"

(تو پھر سب ختم)

اس نے بالآخر حمین سے پوچھا۔ حمین کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ پہلی محبت تھی جو اس نے کبھی نہیں کی تھی مگر اس نے پہلی محبت کا انجام بہت بار دیکھا تھا اور اب رئیسہ کو اس انجام سے دوچار ہوتے دیکھ کر اسے دلی تکلیف ہو رہی تھی۔

"تمہارا دل تو نہیں ٹوٹے گا؟" وہ بے حد فکر مند انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ رئیسہ کا دل بھر آیا۔

"ٹوٹے گا۔ لیکن میں برداشت کرلوں گی۔" رئیسہ نے بھرائی آواز میں اپنی آنکھوں میں آئی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔

حمین کا دل اور پگھلا۔ "ساری دنیا میں تمہیں یہی ملا تھا۔" اس نے دانت پیستے ہوئے رئیسہ سے کہا تھا۔

"مسئلہ شادی نہیں ہے رئیسہ! مسئلہ آئندہ کی زندگی ہے۔ کوئی گارنٹی نہیں ہے اس رشتے میں۔" حمین نے ایک بار پھر اس کے ہتھیار ڈالنے کے باوجود جیسے اس کا دکھ کم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ کال ختم ہو گئی تھی۔ مگر ہشام نہ رئیسہ کے ذہن سے نکلا تھا نہ ہی حمین کے۔

اگلے دن کے اخبارات نہ صرف بحرین کے نئے امیر اور ولی عہد کی تصویروں اور خبروں سے بھرے ہوئے تھے بلکہ ان خبروں میں ایک خبر نئے ولی عہد ہشام بن صباح کی منگنی کی بھی تھی جو بحرین کے ہلاک ہونے والے امیر کی نواسی سے طے پا رہی تھی۔ وہ خبر حمین اور رئیسہ دونوں نے پڑھی تھی اور دونوں نے ایک دوسرے سے شیئر نہیں کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"کوئی تم سے ملنا چاہتا ہے۔"
وہ اگلی صبح تھی.... ساری رات لاک اپ میں جاگتے رہنے کے بعد وہ ناشتے کے بعد کافی کا ایک کپ ہاتھ میں لیے بیٹھی تھی جب ایک آفیسر نے لاک اپ کا دروازہ کھولتے ہوئے ایک کارڈ اس کے ہاتھ میں تھمایا اور کارڈ پر لکھا ہوا نام دیکھ کر عائشہ عابدین کا دل چاہا کہ کاش وہاں کوئی سوراخ ہوتا تو وہ اس میں گھس کر چھپ جاتی۔ پتا نہیں اس شخص کے سامنے اسے اب اور کتنا ذلیل ہونا تھا... دنیا سے غائب ہو جانے کی خواہش اس نے زندگی میں کئی بار کی تھی لیکن شرم کے مارے اس نے پہلی بار کی تھی۔
وہ پولیس آفیسر کے ساتھ وہاں آئی تھی جہاں وہ ایک اٹارنی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا' اس کی رہائی کے لیے کاغذات لیے جس پر اب صرف اس کے دستخط ہونے تھے۔
جبریل اور اس کے درمیان رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا تھا' ایک دوسرے سے نظریں ملائے بغیر۔ پھر اس اٹارنی سے اس کی بات چیت شروع ہو گئی تھی۔ کاغذات دستخط' اور پھر اسے رہائی کی نوید دے دی گئی تھی۔
بے حد خاموشی کے عالم میں وہ دونوں بارش کی ہلکی پھوار میں پولیس اسٹیشن سے باہر پارکنگ میں گاڑی تک آئے تھے۔
"میں بہت معذرت خواہ ہوں۔ میری وجہ سے بار بار آپ کو بہت پریشانی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ نسا کو آپ کو فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں کچھ نہ کچھ انتظام کر لیتی' یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔"
گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر اس کے برابر بیٹھے عائشہ نے پہلی بار اپنی خاموشی توڑتے ہوئے بے حد شائستگی سے جبریل کی طرف دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا تھا۔
جبریل نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ اس کے جملے میں وہ آخری بات نہ ہوتی تو وہ نسا کی اس بات پر کبھی یقین نہیں کرتا کہ وہ ذہنی دباؤ میں بھی۔ وہ اپنے خلاف parental negligence (والدین کی عدم توجہ میں) کے تحت فائل ہونے والے قتل کے ایک الزام کو معمولی بات کہہ رہی تھی۔
"آپ نے کچھ کھایا ہے؟" جبریل نے جواب میں بڑی نرمی سے اس سے پوچھا تھا۔ عائشہ نے سر ہلا دیا۔ وہ اب اسے بتانے لگی تھی کہ وہ کسی قریبی بس اسٹاپ یا ٹرین اسٹیشن پر اسے ڈراپ کر دے تو وہ خود گھر پہنچ سکتی تھی۔
جبریل نے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اس کی ہدایات سنیں اور "ٹھیک ہے" کہہ دیا.... مگر وہ وہاں رکا نہیں تھا جہاں وہ اسے ڈراپ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ وہ سیدھا اس کے گھر پہنچ گیا تھا.... اس بلڈنگ کے سامنے جہاں اس کا اپارٹمنٹ تھا۔ عائشہ نے اس سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ اسے اس کے گھر کا ایڈریس کیسے پتا چلا۔ وہ اس کا شکریہ ادا کر کے گاڑی سے اترنے لگی تو جبریل نے اس سے کہا۔
"کافی کا ایک کپ مل سکتا ہے؟ وہ ٹھٹکی اور اس نے پہلی بار جبریل کا چہرہ دیکھا۔
"گھر پر کافی ختم ہو چکی ہے۔ میں کچھ ہفتوں سے گروسری نہیں کر سکی۔" اس نے کہتے ہوئے دوبارہ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔
"میں چائے بھی پی لیتا ہوں۔" جبریل نے اسے پھر روکا۔
"میں چائے نہیں پیتی' اس لیے لاتی بھی نہیں۔" عائشہ نے اس بار اسے دیکھے بغیر گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔
"پانی تو ہو گا آپ کے گھر میں؟" جبریل اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا اور اس نے گاڑی کی چھت کے اوپر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
اس بار عائشہ اسے صرف دیکھتی رہی تھی۔
اس کا اپارٹمنٹ اس قدر صاف ستھرا اور خوب صورتی سے سجا ہوا تھا کہ اندر داخل ہوتے ہی جبریل چند لمحوں کے لیے ٹھٹک گیا تھا جن حالات کا وہ شکار تھی۔ وہ وہاں کسی اور طرح کا منظر دیکھنے کی توقع کر رہا تھا۔
"آپ کا ذوق بہت اچھا ہے۔" وہ عائشہ سے کہے بغیر نہیں رہ سکا۔ عائشہ نے جواباً "کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ اپنا لانگ

ماہنامہ داستانِ دل ساہیوال

ادب کی دنیا میں ایک نیا نام

نئے لکھنے والوں کے لئے ایک بہترین پلیٹ فارم

اگر آپ لکھاری ہیں اور تحریر کسی مستند ادارے میں بھیجنا چاہتے ہیں تو ابھی داستانِ دل کو بھیجیں۔ آپ کی تحریر قریب کے شمارے میں پبلش کی جائے گی۔ آپ اپنے افسانے، ناولٹ، ناولز، کہانیاں، جگ بیتیاں، آپ بیتیاں، غزلیں یا پھر نظمیں ہمیں ای میل کے ذریعے، ڈاک کے ذریعے یہاں تک کہ وٹس ایپ کے ذریعے بھی بھیج سکتے ہیں۔ بس آپ کی تحریر اردو میں لکھی ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نئے لکھاری ہیں تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، آپ اپنی تحریر ہمیں بھیجیں ہم اس کو صحیح کر کے اپنے شمارے کا حصہ بنائیں گے۔ اگر آپ لکھنا نہیں جانتے تب بھی آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں آپ ہمیں کوئی بھی اچھی سی غزل یا اقوال زریں انتخاب کے لئے بھیج سکتے ہیں۔ وہ بھی داستانِ دل کا حصہ بنے گا۔ اس کے علاوہ آپ اپنی تحریر موبائل پر بھی میسج کر سکتے ہیں بس اردو میں تحریر ہو۔

ہمارے داستانِ دل کے سلسلے کچھ اس طرح سے ہیں

محبت نامے، ملک کی ممتاز شخصیات کا انٹرویو، افسانے ناولز، ناولٹ، غزلیں، نظمیں، حمد، نعت اور انتخاب

اس کے علاوہ آپ کی ہر تحریر کو ہمارے شمارے میں خاص جگہ دی جائے گی۔ آپ ہمارے سارے شمارے پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر پڑھ سکتے ہیں اور پڑھ کر اپنی رائے دے سکتے ہیں

ہمارا ایڈریس ہے۔

ندیم عباس ڈھکو چک نمبر L-5/79 ڈاکخانہ L.5/78 تحصیل و ضلع ساہیوال

وٹس ایپ نمبر: 03225494228

ای میل ایڈریس ہے abbasnadeem283@gmail.com

کوٹ اتارتے اور دروازے کے پیچھے لٹکاتے ہوئے۔ وہ لاؤنج میں سیدھا کچن ایریا کی طرف گئی کچھ بھی کہے بغیر اس نے ایک کیبنٹ کھول کر کافی کا جار نکال لیا تھا اور پھر پانی گرم کرنے لگی۔

جبریل لاؤنج میں کھڑا اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا جہاں آنے والا کوئی شخص بھی یہ جان جاتا کہ اس گھر میں ایک بچہ تھا جو اس گھر میں رہنے والوں کی زندگی کا محور تھا۔

لاؤنج میں بنے پلے ایریا میں اسفند کے کھلونے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر جگہ جگہ عائشہ اور اس کی تصویریں... جبریل نے نظر چرالی تھی۔ پتا نہیں اس guilt (احساس جرم) کو وہ کیا کہتا اور اس کا کیا کرتا جو بار بار عائشہ عابدین کے بچے کے حوالے سے اسے ہوتا تھا۔ اس نے مڑ کر عائشہ کو دیکھا تھا۔ وہ بے حد میکانیکی انداز میں اس کے لیے کافی کا ایک کپ تیار کر رہی تھی۔ یوں جیسے وہ کوئی ویٹرس تھی۔ پورے انہماک سے ایک ایک چیز کو ٹرے میں سجاتے اور رکھتے ہوئے باقی ہر چیز سے بے خبر۔ اس بات سے بھی کہ وہاں جبریل بھی تھا۔

وہ اب کافی کی ٹرے لے کر لاؤنج میں آگئی تھی۔ سینٹر ٹیبل پر کافی کے ایک کپ کی ٹرے رکھتے ہوئے وہ کچھ کہے بغیر صوفہ پر بیٹھ کر اس سے پوچھنے لگی۔

"شوگر..."

"مجھے کافی کڑوی نہیں لگتی۔" جبریل اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا تھا۔

"کریم' ملک۔" عائشہ نے شوگر پاٹ چھوڑ کر باقی دو چیزوں کے بارے میں پوچھا جو ٹرے میں رکھی ہوئی تھیں۔

"یہ بھی نہیں... مجھے کچھ دیر میں اسپتال کے لیے نکلنا ہے۔" جبریل نے اب مزید کچھ کہے بغیر وہ کپ اٹھا لیا تھا جو عائشہ نے میز پر اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس نے بڑی خاموشی سے کافی پی۔ کپ دوبارہ میز پر رکھا اور پھر اپنی جیب سے ایک لفافہ نکال کر میز پر رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

"اسے آپ میرے جانے کے بعد کھولیں... پھر اگر کوئی سوال ہو تو میرا نمبر یہ ہے۔"

اس نے کھڑے ہوتے ہوئے جیب سے ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر میز پر اسی لفافے کے پاس رکھ دیا۔

"حالانکہ میں جانتا ہوں آپ سوال نہیں کرتیں... مجھے فون بھی نہیں کریں گی۔ اس کے باوجود مجھے اسے پڑھنے کے بعد آپ کے کسی سوال کا انتظار رہے گا۔"

عائشہ نے خاموشی سے میز پر پڑے اس لفافے اور کارڈ کو دیکھا پھر سر اٹھا کر کھڑے جبریل کو۔ دنیا میں ایسی تمیز اور تہذیب والے مرد کہاں پائے جاتے ہیں۔ اس نے سامنے کھڑے مرد کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور اگر پائے جاتے تھے تو ان میں سے کوئی اس کا نصیب کیوں نہیں بنا تھا... وہ کھڑی ہو گئی تھی۔

جبریل کو اپارٹمنٹ کے دروازے پر چھوڑ کر آنے کے بعد اس نے اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے جھانک کر پارکنگ کو دیکھا جہاں وہ ابھی کچھ دیر میں نمودار ہوتا اور پھر وہ نمودار ہوا تھا اور وہ تب تک اسے دیکھتی رہی جب تک وہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا نہیں گیا۔

پھر وہ میز پر پڑے اس لفافے کی طرف آئی تھی۔ اس نے لفافے کو اٹھا کر دیکھا جس پر اس کا نام جبریل کی خوب صورت طرز تحریر میں لکھا ہوا تھا۔

"مس عائشہ عابدین۔"

پھر اس نے لفافے کو کھول لیا۔

☆ ☆ ☆

کاغذ کی اس چٹ پر احسن سعد کا نام اور فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ریسپشن سے جبریل کو بتایا گیا تھا کہ وہ شخص کئی بار اسے کال کر چکا تھا اور ایمرجنسی میں اس سے بات کرنا یا ملنا چاہتا تھا۔ جبریل اس وقت چھ گھنٹے آپریشن تھیٹر میں گزارنے کے بعد بے حد تھکا ہوا گھر جانے کے لیے نکل رہا تھا جب یہ چٹ اس کے حوالے کی گئی تھی۔ اس چٹ پر اس کے لیے ایک میسج بھی تھا۔

نیلی اسکوپ سے اس نے ایک بار پھر اس بینکویٹ ہال کی کھڑکی سے اندر نظر ڈالی۔ ہال میں سیکیورٹی کے لوگ اپنی اپنی

جگہوں پر مستعد تھے۔ کیٹرنگ اسٹاف بھی اپنی اپنی جگہ پر تھا۔ اس بینکوئٹ ہال کا داخلی دروازہ اس قد آدم کھڑکی کے بالکل سامنے تھا جس کھڑکی کے بالمقابل ساٹھ فٹ چوڑی ' دو رویہ مرکزی سڑک کے پار ایک عمارت کی تیسری منزل کے ایک اپارٹمنٹ میں وہ موجود تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی کے سامنے ایک کرسی رکھے وہ ایک جدید اسنائپر رائفل کی ٹیلی اسکوپک سائٹ سے کھڑکی کے پردے میں موجود ایک چھوٹے سے سوراخ سے اس بینکوئٹ ہال میں جھانک رہا تھا۔

بینکوئٹ ہال کا داخلی دروازہ کھلا ہوا تھا اور کوریڈور میں استقبالی قطار اپنی پوزیشن لے چکی تھی۔ اس کی گھڑی میں نو بجے تھے۔ مہمان نو بج کر پندرہ منٹ پر اس کوریڈور میں داخل ہونے والا تھا اور تقریباً" ایک گھنٹہ اور پندرہ منٹ وہاں گزارنے کے بعد وہ وہاں سے جانے والا تھا۔ مہمان کے اس ہوٹل میں پہنچنے سے لے کر اس کی روانگی کے بعد تک تقریباً" ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے ہر طرح کا مواصلاتی رابطہ جام ہونے والا تھا۔

یہ سیکیورٹی کے ہائی الرٹ کی وجہ سے تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے وہاں سیل فون اور متعلقہ کوئی ڈیوائسز کام نہیں کر سکتی تھیں لیکن وہ ایک پروفیشنل ٹارگٹ کلر تھا۔ اس سے پہلے بھی اسی طرح کے ہائی الرٹس میں کامیابی سے کام کرتا رہا تھا۔ اس کو ہائر کرنے کی وجہ بھی اس کی کامیابی کا تناسب تھا جو تقریباً" سو فیصد تھا وہ صرف دو افراد کو مارنے میں ناکام رہا تھا اور اس کی وجہ اس کے نزدیک اس کی بڑی قسمت تھی۔ پہلی بار اس کی رائفل لاسٹ سیکنڈز میں اس اسٹینڈ سے ہل گئی تھی جس پر وہ رکھی تھی اور دوسری بار... خیر دوسری بار کا قصہ طویل تھا۔

وہ پچھلے دو مہینے سے اس اپارٹمنٹ میں رہ رہا تھا۔ اس دن سے تقریباً" ایک مہینہ پہلے سے جب یہ ہوٹل اس بینکوئٹ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جنہوں نے اسے اس اہم کام کیلئے ہائر کیا تھا اس تقریب کے لیے اس ہوٹل اور اس کے اس بینکوئٹ ہال کا انتخاب کرنے والے بھی وہی تھے۔

اس "مہمان" کو ختم کرنے کا فیصلہ چار ماہ پہلے ہوا تھا۔ وقت' جگہ اور قاتل کا انتخاب بے حد ماہرانہ طریقے سے بڑے غور و خوض کے بعد کیا گیا تھا۔ اس مہمان کی سال بھر کی مکمل مصروفیات کے شیڈول میں سے تمام ممکنہ اور ممکنہ قاتلوں کے نام شارٹ لسٹ لیے گئے تھے پھر ہر جگہ اور تاریخ پر ہونے والے اس حادثے کے اثرات پر سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ فوری اثرات اور اس سے نمٹنے کی حکمت عملی پر بات کی گئی تھی۔ ممکنہ رد عمل کے نقصانات سے بچنے کے لیے منصوبے تیار کیے گئے تھے۔ قاتلانہ حملے کے ناکام ہونے کی صورت میں ہونے والے ممکنہ رد عمل اور نقصانات پر غور کیا گیا تھا اور ہر میٹنگ کے بعد کام کی جگہیں اور تاریخیں بدلتی رہتی تھیں لیکن قاتل ایک ہی رہا تھا کیونکہ وہ موزوں ترین تھا۔

اس شہر میں اس تاریخ پر اس تقریب کے لیے سیکیورٹی کی وجوہات کے باعث تین مختلف ہوٹلز کا نام لسٹ میں رکھا گیا تھا لیکن اسے ہائر کرنے والے جانتے تھے کہ تقریب کہاں ہوگی۔

اس کو دو ماہ پہلے ہی اس اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر ستائیس سالہ لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لڑکی کے چار سالہ پرانے بوائے فرینڈ سے بریک اپ (تعلقات ختم کرنے) کے لیے ایک پروفیشنل کال گرل کا استعمال کیا گیا تھا جو اس کے کار ڈیلر بوائے فرینڈ سے ایک کار خریدنے کے بہانے ملی تھی اور اسے ایک ڈرنک کی آفر کر کے ایک موٹیل لے گئی تھی۔

اس کال گرل کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کی ریکارڈنگ دوسرے دن اس لڑکی کو میل میں موصول ہوئی تھی۔ اس کا بوائے فرینڈ نشے میں تھا۔ اسے پھنسایا گیا تھا اور یہ سب ایک غلطی تھی۔ اس کے بوائے فرینڈ کی کوئی تاویل اس کے غصے اور رنج کو کم نہیں کر سکی تھی۔ اس کی گرل فرینڈ کے لیے یہ بات اس لیے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ زیادہ ناقابل برداشت تھی کیونکہ وہ تین ہفتے میں شادی کرنے والے تھے۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ کا سامان گھر کے دروازے سے باہر نہیں پھینکا تھا اپنے اپارٹمنٹ کی کھڑکی سے باہر پھینکا تھا۔

سڑک پر بکھرے سامان کو اکٹھا کرتے ہوئے خود کو اور اس کال گرل کو کوستے ہوئے بھی اس کا بوائے فرینڈ یہ سوچ رہا تھا کہ چند ہفتوں میں اس کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور وہ دونوں دوبارہ اکٹھے ہو جائیں گے۔ جنہوں نے ان کا تعلق ختم کروایا تھا انہیں اس بات کا اندیشہ بھی تھا۔ چنانچہ معاملات کو منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے اس لڑکے کے کمپیوٹر کو ہیک کیا گیا تھا۔ اس کی اور اس کی گرل فرینڈز کی بے حد قابل اعتراض تصویروں کو اس کی ای میل آئی ڈی کے ساتھ بہت ساری ویب پر اپ لوڈ کر دیا گیا تھا۔

یہ جیسے تابوت میں آخری کیل تھی۔ اس لڑکی نے اپنے بوائے فرینڈ کی ای میل آئی ڈی سے بھیجا ہوا پیغام پڑھا تھا جس میں لکھا تھا کہ اس نے اپنے بریک اپ کے بعد اس کی ساری پکچرز کو قابل اعتراض ویب سائٹس پر اپ لوڈ کر دیا تھا۔ اس کی گرل فرینڈ نے پہلے وہ لنکس کھول کر دیکھے تھے پھر اپنے بوائے فرینڈ کی اس کال گرل کے ساتھ ویڈیو کو اپ لوڈ کیا تھا اور اس کے بعد اپنے سابقہ بوائے فرینڈ کو اس کے شوروم میں جا کر اس کے کسٹمرز کے سامنے اس وقت پیٹا تھا جب وہ انہیں ایک جدید ماڈل کی گاڑی بیچنے میں تقریباً" کامیاب ہو چکا تھا۔

"Happy Families Drive this car"

(یہ گاڑی خوش باش لوگ چلاتے ہیں) اس نے تقریباً" ایک سو چھپن بار یہ جملہ اس جوڑے کے سامنے دہرایا تھا جو ٹیسٹ ڈرائیو کے لیے وہاں موجود تھے اور اس کے ساتھ اس نے ایک سو چھپن بار یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ کس طرح خود بھی اس کار کو ذاتی استعمال میں رکھنے کی وجہ سے اس کا اور اس کی گرل فرینڈ کا تعلق مضبوط ہوا تھا۔ اس کے بوائے فرینڈ کو مار کھانے پر اتنا شاک نہیں لگا تھا۔ چار سالہ کورٹ شپ کے دوران وہ اپنی گرل فرینڈ کے ہاتھوں اس شہر کی تقریباً" ہر مشہور پبلک پلیس پر پٹ چکا تھا اور یہ تو بہرحال اس کا اپنا شوروم تھا۔ جتنا اسے اپنی گرل فرینڈ کا الزام سن کر شاک لگا تھا۔

اس کے چیخنے چلانے اور صفائیاں دینے کے باوجود اس کی گرل فرینڈ کو یقین تھا کہ اس نے شراب کے نشے میں یہ حرکت کی ہوگی ورنہ اس کے ذاتی لیپ ٹاپ میں موجود تصویریں اس کے ای میل ایڈریس کے ساتھ کون اپ لوڈ کر سکتا تھا۔

اس بریک اپ کے ایک ہفتے کے بعد وہ نائٹ کلب میں اس سے ملا تھا۔ چند دن ان کی ملاقاتیں یوں ہی بے مقصد انداز میں ہوتی رہی تھیں۔

وہ میڈیکل ٹیکنیشن تھی اور اس نے اپنا تعارف پینٹر کے طور پر کرایا تھا۔ وہ ہر بار اس لڑکی کے ڈرنکس کی قیمت خود ادا کر رہا تھا۔ چند دن کی ملاقاتوں کے بعد اس نے اسے گھر مدعو کیا تھا اور اس کے بعد وہاں اس کا آنا جانا زیادہ ہونے لگا تھا۔ وہ اس بلڈنگ کے افراد کو — روزانہ کا ملاقاتی ہونے کا تاثر دینا چاہتا تھا اور دو ماہ کے اس عرصہ کے دوران وہ اس اپارٹمنٹ کی دوسری چابی بنوا چکا تھا اور ایک ہفتہ پہلے وہ اس لڑکی کی عدم موجودگی میں اس کے اپارٹمنٹ پر وہ اسنائپر رائفل اور کچھ دوسری چیزیں بھی منتقل کر چکا تھا۔ وہ جانتا تھا اس تقریب سے ایک ہفتہ پہلے اس علاقے کی تمام عمارتوں پر سیکیورٹی چیک ہوگا۔ وہ تب ایسا کوئی بیگ اسکریننگ کے بغیر عمارت میں منتقل نہیں کر سکے گا اور اس وقت بھی اس علاقے کی تمام عمارات بے حد سخت سیکیورٹی میں تھیں۔ وہ ایک ریگولر وزیٹر نہ ہوتا تو اس وقت اس بلڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس بلڈنگ سے پچاس میل دور اس کی گرل فرینڈ کو ہسپتال میں کسی ایمرجنسی کی وجہ سے روک لیا گیا تھا ورنہ وہ اس وقت اپنے اپارٹمنٹ میں ہوتی۔ پارکنگ میں کھڑی اس کی کار کے چاروں ٹائرز پنکچرڈ تھے اور اگر وہ ان دونوں رکاوٹوں سے کسی نہ کسی طرح بچ کر پھر بھی گھر روانہ ہو جاتی تو راستے میں اس کو روکنے کے لیے کچھ اور بھی انتظامات کیے گئے تھے۔

نو بج کر تیرہ منٹ ہو رہے تھے۔ وہ اپنی رائفل کے ساتھ مہمان کے استقبال کے لیے بالکل تیار تھا۔ جس کھڑکی کے سامنے وہ تھا وہ کھڑکی بلٹ پروف شیشے سے بنی ہوئی تھی۔ ڈبل گیزڈ بلٹ پروف شیشہ.....

یہی وجہ تھی کہ ان کھڑکیوں کے آگے سیکیورٹی اہلکار تعینات نہیں تھے۔ تعینات ہوتے تو اسے یقیناً" نشانہ باندھنے میں دقت ہوتی لیکن اس وقت اسے پہلی بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے پہلے کسی کو مارنے کے لیے اتنی شاندار سہولیات نہیں ملی تھیں۔ مہمان کو کوریڈور میں چلتے ہوئے آنا تھا۔ ایلویٹر سے نکل کر کوریڈور میں چلتے ہوئے بینکوئٹ ہال کے داخلی دروازے تک اس مہمان کو شوٹ کرنے کے لیے اس کے پاس پورے دو منٹ کا وقت تھا۔ ایک بار وہ اپنی بینکوئٹ ہال کی ٹیبل کی طرف چلا جاتا تو اس کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا لیکن دو منٹ کا وقت اس جیسے پروفیشن کے لیے دو گھنٹے کے برابر تھا۔

اس بینکوئٹ ہال کی کھڑکیاں بلٹ پروف تھیں صرف اس کھڑکی کے سوا جس کے سامنے وہ تھا۔ تین ہفتے پہلے بظاہر ایک اتفاقی حادثے میں اس کھڑکی کا شیشہ توڑا گیا تھا۔ اسے تبدیل کروانے میں ایک ہفتہ لگا تھا۔ اور تبدیل کیا جانے والا شیشہ ناقص تھا۔ یہ صرف وہی لوگ جانتے تھے جنہوں نے یہ منصوبہ بندی کی تھی۔

اسٹیج تیار تھا اور اس پر وہ فنکار آنے والا تھا جس کے لیے یہ ڈراما تیار کیا جا رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

عمیرہ احمد

میں حسین ہوں اور میں عام ہوں!

میرے اور تمہارے اندھیروں میں جانتے ہو کیا
فرق ہے؟
میں اپنی برائی کا سامنا کر کے اس کو قبول کر سکتی ہوں
جبکہ تم اپنا آئینہ سفید چادر سے ڈھکنے میں مصروف
ہو!

میرے اور تمہارے گناہوں میں فرق یہ ہے کہ
جب میں گناہ کرتی ہوں تو جانتی ہوں کہ یہ گناہ ہے
جبکہ تم اپنے من گھڑت سرابوں کا شکار ہو چکے ہو
میں ایک جل پری ہوں
میں جانتی ہوں کہ میں سمندر کی لہروں پہ رقص
کرتے
کتنی حسین دکھتی ہوں
مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اسی سمندر کی تہہ میں
میں ہڈیاں اور گوشت چیر پھاڑ کے کھا سکتی ہوں
تم ایک جادوگر ہو۔ ایک شعبدہ باز

ستائیسویں قسط

تمہارے منتر تمہاری ہیر پھیری باتیں ہیں
جنہم کے ابلتے کڑاہوں جیسی باتیں!
پھر بھی تم اپنے گرد سفید چادر لپیٹے پھرتے ہو
پھر بھی تم انصاف کی سفید وگ لگائے گھومتے ہو!

ی جوائے بیل ی

ہاشم کاردار قدم قدم کمرہ عدالت میں آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ہر کام ست روی سے ہوتا دکھائی دے رہا تھا' جیسے کوئی گونگی سلو موشن فلم پردے پر چل رہی ہو۔ آوازیں بند ہوں۔ بس لب ہلتے دکھائی دے رہے ہوں۔

ہاشم کو محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پس منظر میں کوئی اداس گیت گنگنا رہا ہو۔ اس گیت میں اعتبار ٹوٹنے کا کرب تھا۔ ارمانوں کا لہو تھا۔ جیسے کوئی اپنا' ساتھ چھوڑ کے غیروں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ وہ گم صم

نگاہوں سے پیچھے کرسیوں پہ بیٹھی آب دار کو دیکھنے گیا۔ وہ وقت کاٹنے کو اپنے سیل فون کے ساتھ لگی تھی اور مسلسل جھنجلائی ہوئی تھی۔ وہ آن ہو کے ہی نہیں

دے رہا تھا۔ ارد گرد کاغذ سرسرانے' سرگوشیاں جج صاحب کی ہتھوڑی' ہر شے کی آوازیوں سنائی دیتی تھی گویا کہیں دور کسی گہری کھائی سے آ رہی ہو۔

اس کا دل ٹوٹا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ابھی تک سینے سے خون رس رہا ہے۔

کٹہرے میں موجود میری اینجیو کے سامنے زمر کھڑی تھی۔ ہاشم نے بدقت توجہ ادھر مبذول کرنی چاہی۔ یہاں سے اسے سیاہ کوٹ والی زمر کی پشت پہ گھنگھریالی پونی ٹیل دکھائی دیتی تھی۔ یا پھر چند قدم اوپر کھڑی سپاٹ چہرے لیے میری دکھائی دے رہی تھی۔ اب دونوں کے بیچ خلا تھا۔ ہاشم کا دماغ خلا میں اٹکنے

مکمل ناول

لگا۔

"میری اینجیو! آپ کتنے سال سے جواہرات کاردار کی ملازمہ ہیں؟" شل ہوتے ذہن سے اس نے زمر کو سپاٹ انداز میں پوچھتے سنا۔

"بارہ سال سے۔"

"آپ کا تعلق کس ملک سے ہے؟"

"فلپائن سے۔"

"کیا آپ کی ایجنسی جس کے توسط سے آپ کاردار صاحب کے پاس آئی تھیں' آپ کو کسی دوسرے گھر میں کام کرنے کی اجازت دیتی ہے؟"

"نہیں۔ یہ قانوناً جرم ہے۔ ایک وقت میں ایک ہی گھر میں کام کر سکتی ہوں میں۔" وہ سپاٹ انداز میں سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

"میری! کیا آپ اس نوجوان کو پہچانتی ہیں؟" زمر نے پیچھے بیٹھے سعدی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ آج نیلی جینز پہ سفید شرٹ پہنے ہوئے تھا اور بھوری آنکھوں میں شدید الجھن لیے میری کو دیکھ رہا تھا۔ میری نے ایک سرسری سی نظر اس پہ ڈالی۔

"یہ سعدی یوسف ہے۔" چہرہ زمر کی طرف پھیر لیا۔

"آپ کی سعدی یوسف سے پہلی ملاقات کب ہوئی؟"

"آٹھ سال پہلے۔ یہ قصر آیا تھا اور میں نے اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔"

"اس کے بعد دوبارہ کبھی ملاقات ہوئی آپ کی اس سے؟"

"جب بھی یہ قصر آتا۔ میں ہیڈ ہاؤس کیپر تھی تو ظاہر ہے ملاقات ہو جاتی تھی۔"

کیا آپ دونوں کبھی ذاتی نوعیت کی گفتگو کرتے تھے؟"

میری نے لمحے بھر کا توقف کیا اور پیچھے بیٹھے سعدی کو دیکھا۔ پھر نظریں زمر پہ جما دیں۔

"جی نہیں۔"

"یعنی آپ نے اپنے بیٹے کے کینسر اور علاج کے بارے میں سعدی یوسف سے کبھی گفتگو نہیں کی تھی؟"

"جی نہیں۔ میرا اس سے ایسا تعلق نہ تھا کہ اپنے ذاتی معاملات اس سے ڈسکس کرتی۔" سعدی بس اسے اسی طرح دیکھتا رہا۔ ملامت سے۔ افسوس سے۔

"او کے!" زمر نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میری اینجیو کیا یہ درست ہے کہ آپ نے مسز کاردار کا نیکلس چرایا تھا جس کی بنا پہ انہوں نے آپ کو نوکری سے برخاست کر کے ڈی پورٹ کرنے کا حکم جاری کیا تھا؟"

"یہ غلط ہے۔ میں نے کبھی چوری نہیں کی' نہ مجھے نوکری سے نکالا گیا۔"

"اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ ڈی پورٹ کرنے کے بجائے غیر قانونی طور پہ نوشیرواں کاردار نے آپ کو کولمبو بھجوا دیا تھا جہاں آپ آٹھ ماہ تک سعدی یوسف کی کیئر ٹیکر رہی تھیں؟"

"یہ غلط ہے۔ میں زندگی میں کبھی کولمبو نہیں گئی۔ میرا پاسپورٹ اس بات کا ثبوت ہے۔" وہ گردن اکڑا کے بولی تھی۔ بار بار وہ تائیدی نظروں سے ہاشم کو بھی دیکھتی تھی مگر وہ اس وقت غائب دماغی کے عالم میں بیٹھا تھا۔

"تو آپ کہہ رہی ہیں کہ آپ کبھی کولمبو کے اس ہوٹل میں گئی ہی نہیں ہیں جس کے تہہ خانے میں میرے مؤکل کو قید رکھا گیا تھا۔"

"جی ہاں۔ میں کبھی وہاں نہیں گئی۔"

"اور نہ ہی آپ سعدی کو حبس بے جا میں رکھنے کے بارے میں جانتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔"

"تو پھر آپ 21 مئی سے 22 جنوری تک۔ ان آٹھ ماہ میں کہاں تھیں میری اینجیو؟"

"میں۔ قصر کاردار میں ملازمت کر رہی تھی۔ اور آفس کی پارٹیز کی پلاننگ بھی کرتی تھی۔ سب نوکر گواہ

ہیں کہ میں قصر میں تھی۔ اس دورانیے میں۔"

زمر اپنی میز کی طرف آئی اور کاغذات کا ایک پلندہ اٹھا کر اوپر جج صاحب کے ساتھ کھڑے آدمی کو تھمایا جس نے اسے ڈیسک پہ لا رکھا۔

"یہ قصر کاردار کی پچھلی آٹھ ماہ کی ان تمام پارٹیز کی تصاویری کہانی ہے جو مختلف فوٹو گرافرز نے کور کی تھیں۔ یہ ان فوٹو گرافرز کے میموری کارڈز کا ڈیٹا ہے۔ اور ان میں کسی ایک تصویر میں بھی میری اینجیو نہیں ہیں۔ جبکہ یہ دوسری فائل... "اس نے اشارہ کیا۔

"اس میں سعدی کے اغوا سے ایک سال قبل کی پارٹیز کا ڈیٹا ہے اور ہر پارٹی میں میری اینجیو پس منظر میں کہیں نہ کہیں نظر آ رہی ہیں۔ میری اینجیو' آپ کے پاس کیا ثبوت ہے کہ آپ ان آٹھ ماہ میں پاکستان میں ہی تھیں؟"

"آبجیکشن یور آنر!" ہاشم قدرے سست روی سے کھڑا ہوا۔ "قانون کے مطابق برڈن آف پروف استغاثہ کے اوپر ہے۔"

(یعنی جو شخص الزام لگاتا ہے اسے ہی ثبوت ڈھونڈ کر لانے ہیں۔)

"یور آنر! پھر میں کورٹ سے استدعا کروں گی کہ ہاشم کاردار کے گھر کے تمام سی سی ٹی وی ریکارڈ کو عدالت میں منگوایا جائے اور وہ ہمیں تاریخوں کے ساتھ دکھایا جائے کہ میری اینجیو اس وقت گھر میں تھی۔"

جج صاحب نے ہاشم کو دیکھا ہی تھا کہ وہ کھنکھار کے بولا۔ "یور آنر' فروری میں ہمارے کنٹرول روم میں شارٹ سرکٹ کے باعث آگ لگی تھی۔ گھر کے ملازم اور میرے خاندان والے گواہ ہیں اس بات کے۔ ہمارا ڈی وی آر جل چکا ہے۔ اسی بات کا استغاثہ فائدہ اٹھا رہی ہیں۔"

"ریئلی ہاشم؟" زمر ابرو حیرت سے اٹھاتی اس کے قریب آئی اور آہستہ سے بولی۔ "آپ کی کریٹی اینٹوٹی

اس سے زیادہ اچھا بہانا ڈھونڈ سکتی تھی۔ اتنا پرانا حیلہ کیوں؟" ہاشم نے شانے اچکائے۔

"واقعی میں زیادہ اچھا بہانا بنا سکتا تھا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ اب سنبھل کے سرگوشی میں بولا تھا۔

زمر نے ستائش سے سر کو خم دیا اور واپس جج صاحب کی طرف آئی جو اس کے اعتراض پہ رولنگ دے رہے تھے۔

"کیا آپ کبھی زرنگار عبید سے ملی ہیں؟" زمر نے واپس میری سے سوال پوچھا تو ہاشم نے چونک کے فوراً" آبدار کی طرف دیکھا۔ آبی سامنے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہاشم کو نظر انداز کر رہی تھی۔

میری نے جواب دینے میں چند لمحے لیے۔ "جی۔"

"ان کی بیماری کے دوران میں نے سنا ہے' آپ نے ان کی بہت خدمت کی۔ بلکہ یہ تصویر بھی ہے ہمارے پاس. جس میں آپ ان کو سرو کرتی نظر آ رہی ہیں۔" زمر نے ایک تصویر کی کاپی اس کے سامنے لہرائی پھر جج صاحب کی میز پہ جا رکھی۔ میری نے ہاشم کو دیکھا۔ وہ آبی کو دیکھ رہا تھا۔

"مجھے ایک بات سمجھائیں میری اینجیو آپ کو یہاں آئے نو دس سال ہوئے ہیں۔ زرنگار عبید دس سال میں ایک دفعہ بھی پاکستان نہیں آئی تھیں۔ وہ اپنے اسکینڈل کے بعد سے سری لنکا میں رہائش پذیر تھیں' وہیں مقیم رہیں' اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ان کی خدمت کے لیے' اور ان پہ نظر رکھنے کے لیے ہارون عبید اور جواہرات کاردار نے آپ کو وہاں بھیجا تھا۔"

"میں کبھی کولمبو نہیں گئی۔" وہ ہٹ دھرمی سے بولی۔

"اپنے پاسپورٹ کے مطابق آپ کولمبو نہیں گئیں۔ لیکن یہ تصویر کولمبو میں لی گئی ہے اور آبدار عبید اس بات کی گواہ ہیں۔" اور اب تک خاموشی سے ساری کارروائی دیکھتے فارس نے اچنبھے سے زمر کو دیکھا اور پھر مڑ کے آبی کو۔ آبی نے اس کے دیکھنے پہ مسکرا کر

شانے اچکائے تھے۔

"اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے پاس کوئی دوسرا پاسپورٹ بھی ہے، جو آپ ملک سے باہر جانے کے لیے استعمال کرتی ہیں، کیونکہ آپ کی ایجنسی کی طرف سے ایک مالک کے ہوتے ہوئے دوسرے کی خدمت کرنا غیر قانونی ہے۔ تو عدالت کو بتائیے میری اینجیو صاحبہ کہ آپ کس پاسپورٹ پہ سری لنکا جاتی تھیں؟"

میری کا چہرہ پھیکا پڑ چکا تھا۔ وہ بار بار ہاشم کو دیکھتی تھی جو اپنے سامنے رکھی فائلز کو دیکھ رہا تھا۔ بنا پلک جھپکے۔ زمر بھی کن انکھیوں سے اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی طرف سے کوئی اعتراض نہ ہوا تو میری ذرا کھنکھاری۔

"یہ تصویر پاکستان کی ہے۔ میں کبھی کولمبو نہیں گئی۔"

"جب مس عبید عدالت میں اپنا بیان دیں گی تو آپ کا یہ بیان پرجری کے زمرے میں آئے گا۔ میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ میری اینجیو کے پاسپورٹ پہ کوئی مہر نہ دیکھ کر یہ نہ سمجھے کہ سعدی یوسف جھوٹ بول رہا ہے۔ جیسے میری پہلے کولمبو جا چکی ہیں۔ یہ اس دفعہ بھی گئی تھیں۔ اور آٹھ ماہ ادھر رہی تھیں۔ یور وِٹنیس!" وہ مڑی اور ہاشم کو مخاطب کر کے کہا، پھر سیدھی اپنی میز پہ آ گئی۔ ہاشم اٹھا نہیں، اس نے بیٹھے بیٹھے سوال کیا۔

"میری اینجیو۔۔۔ استغاثہ نے جو تصاویر عدالت کو دکھائی ہیں، پارٹیز والی۔۔۔ کیا ان پارٹیز کی ایونٹ پلاننگ آپ نے کی تھی؟"

"جی ہاں۔"

"اور ان پارٹیز کو ممکن بنانے کے لیے تقریباً" کتنے ملازم کام کرتے تھے؟"

"ساٹھ سے زیادہ۔"

"اور کیا وہ ساٹھ کے ساٹھ ملازم ہمیشہ فوٹو گرافر کی کھینچی گئی ان تصاویر میں نظر آتے ہیں؟"

"نہیں۔ مشکل سے پانچ دس نظر آتے ہیں۔ فوٹو گرافر کو ملازموں کی نہیں مہمانوں کی تصاویر کھینچنے کی ہدایت ہوتی ہے۔"

"اور ان ساٹھ میں سے کتنے لوگ صرف کچن میں کام کرتے ہیں اور پارٹی کی جگہ پہ نہیں آتے؟"

"تقریباً" بیس پچیس ملازم۔"

"اور کیا درست نہیں ہے کہ آپ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے کچن اور اس کے ساتھ بنے اپنے کمرے میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے لگی تھیں اور باہر کم ہی نکلتی تھیں؟"

"آبجیکشن یور آنر۔" زمر بےزاری سے بولی۔ "ہاشم کاردار لیڈنگ کوئسچن پوچھ رہے ہیں۔"

(گواہ کی کسی جواب کی طرف رہنمائی کرنا، سوال میں ہی جواب دینا یا اس کے منہ میں الفاظ ڈالنا لیڈنگ کوئسچن پوچھنا کہلاتا ہے۔)

"یور آنر یہ مسز زمر کا گواہ ہے۔ میں تو اس کو "کراس" کر رہا ہوں۔ میں لیڈنگ کوئسچن کر سکتا ہوں۔"

"اوور رولڈ۔ وہ کراس کے دوران لیڈنگ سوال پوچھ سکتے ہیں۔" جج صاحب نے اعتراض رد کیا تو زمر سر جھٹک کے رہ گئی۔ میری بولنے لگی۔

"جی میں زیادہ تر پیچھے کچن میں ہی رہتی تھی اور پارٹیز میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔"

"میری اینجیو! کیا یہ درست ہے کہ سونیا کاردار کی سالگرہ پہ، یعنی سعدی کے اغوا سے چند دن قبل آپ کی سعدی سے ملاقات ہوئی تھی؟"

"جی۔ وہ پارٹی میں آیا تھا اور میں چونکہ کچن میں ہوتی تھی اور کچن گھر کی پچھلی طرف ہے تو میں نے اسے وہاں ٹہلتے دیکھا تھا۔ وہ کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔"

"اور کیا آپ بتائیں گی کہ وہ کیا بات کر رہا تھا؟" سعدی حیرت سے آگے کو ہوا۔ میری فرفر بولنے لگی۔

"وہ ایک نمبر دہرا رہا تھا اور جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا کہ وہ جلد ہی چند ماہ کے لیے منظر عام سے غائب ہو جائے گا اور آرام سے جے کے فائیو فیسیلٹی پہ آکر پوری لگن سے کام کرے گا اور اس نے کچھ ایسا بھی کہا تھا کہ ڈیزائننگ مکمل ہو گئی ہے 'اب صرف ان کو اس میزائل کی میکنگ پہ کام کرنا ہے اور یہ بھی کہ وہ رقم کا انتظام کر رہا ہے۔" زمر بے چینی سے اٹھی۔

"یور آنر! ہاشم کاردار کیس کو کہاں سے کہاں لے جا رہے ہیں۔ ان بے بنیاد باتوں کا اس کیس سے کیا تعلق ہے؟"

"نہیں جناب عالی۔ میں صرف وہ وجہ عدالت کے سامنے رکھ رہا ہوں جس کی بنیاد پر سعدی یوسف نے میرے گھر سے نیکلس چرایا اور چونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ میری اس کی باتیں سن چکی ہے 'اس لیے اس نے میری کو اس کیس میں گھسیٹنا چاہا' اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ ایک بچے کی ماں ہے۔ اور عدالت کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جے کے فائیو شوال میں واقع ایک مسجد کے انڈر گراؤنڈ میں بنی دہشت گردوں کی آماجگاہ ہے جہاں وہ اسلحہ تیار کرتے ہیں۔ دفاع آج بھی اپنی اس بات پہ قائم ہے یور آنر کہ سعدی یوسف نے صرف اپنی غیر قانونی سرگرمیوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے اور لوگوں کی ہمدردی لے کر ایک اسٹار بن جانے کے لیے یہ ڈراما رچایا ہے۔ اب سعدی ایک اسٹار ہے۔ اس کو بڑے بڑے فورمز پہ بلایا جاتا ہے جہاں جانے کے لیے پہلے اس کے پاس کوئی سیکیورٹی کلیئرنس نہیں تھی 'مگر جس دن ایسے کسی حساس نوعیت کے فنکشن میں کوئی دھماکا یا ٹارگٹ کلنگ ہوگی نا یور آنر تو دفاع کی ساری باتیں سچ ثابت ہو جائیں گی۔"

وہ اب گواہ کو واپس بھیج رہا تھا اور زمر اور سعدی ایک دوسرے کو اچنبھے سے دیکھ رہے تھے۔

پیچھے بیٹھا فارس آخر میں بیٹھے شخص پہ نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔ وہی گول عدسوں والی عینک والا ادھیڑ عمر شخص زنانہ انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھا خاموشی سے ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

اب ایک دوسرے گواہ کو پیش کیا جا رہا تھا۔ ایسے میں فارس اٹھا اور موبائل پہ بٹن دباتا' سر جھکائے اس آدمی کے قریب آبیٹھا۔ اس شخص نے محض ایک دفعہ فارس کو دیکھا' پھر سامنے دیکھنے لگا۔

زمر اس گواہ سے سوالات پوچھ رہی تھی جبکہ فارس جیب سے قلم کاغذ نکال رہا تھا۔ پھر وہ گھٹنے پہ کاغذ رکھے موبائل اسکرین سے چند نمبرز دیکھ کر اتارنے لگا تھا کہ یکایک قلم اس کی انگلیوں سے پھسلا اور اس شخص کے قدموں میں جا گرا۔

"اوہو ہو!" فارس جھنجلایا تھا۔ اس آدمی نے سرسری نظر اس پہ ڈالی' پھر جھکا اور قلم اٹھا کر فارس کی طرف بڑھایا۔

"جزاک اللہ خیرا" کثیرا!" وہ ممنون سا قلم کو کنارے سے تھامتا اٹھ کھڑا ہوا' اور اپنی چیزیں سنبھالتا باہر کی جانب بڑھ گیا۔ باہر نکلتے ہی اس نے ایک اور پلاسٹک بیگ جیب سے نکال کر احتیاط سے قلم اس میں ڈال کر سیل کیا۔ پھر موبائل پہ میسج لکھا۔

"اس آدمی کے فنگر پرنٹس لے لیے ہیں' فیشل ریکگنیشن سے کچھ نہیں ملا تو شاید فنگر پرنٹ سے مل جائے۔ میں کچھ دیر میں تمہاری طرف آرہا ہوں' یہ سب مجھے پتا کر کے دو کون ہے یہ۔" اپنے ایک پرانے کولیگ کو پیغام لکھ کر اس نے احتیاط سے قلم کا پیکٹ جیب میں ڈالا اور پھر مڑا ہی تھا کہ ٹھٹک گیا۔

آبدار اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ سرخ رومال سر پہ باندھے' اور اس سے نکلتے سیدھے سرخ بالوں کو چہرے کے ایک طرف ڈالے' بلی جیسی سرمئی آنکھیں اس پہ جمائے' وہ مسکرا رہی تھی۔

"آپ!" وہ لمحے بھر کو چپ ہوا۔

"میری اینجیو والی فوٹو میں نے صبح مسز زمر کو دی تھی۔" اس نے مسکرا کے اطلاع دی۔

"دیکھیں آبدار! اگر تو آپ۔۔۔"

"میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔" وہ اتنی

سادگی سے گویا ہوئی کہ فارس کے الفاظ لبوں پہ آکر ٹوٹ گئے۔ وہ اس بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ نا سمجھی سے اسے دیکھے گیا۔ "اس روز جو میں نے کیا' وہ بہت غلط تھا۔ یا اس کا طریقہ غلط تھا۔"

وہ ندامت سے کہہ رہی تھی۔ نظریں نہ جھکی تھیں نہ ہاتھ مل رہی تھی۔ بلکہ سینے پہ بازو لپیٹے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مدھم آواز میں کہہ رہی تھی۔

"میں نے آپ کو یوں بلایا اور مجھ سے بچنے کے لیے آپ کو حنین کو بھیجنا پڑا۔ آئی ایم سوری کہ میں نے اپنا اتنا غلط امپریشن دیا۔ آپ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔" اس نے افسوس سے "چچ" کیا تھا۔ "اصل میں میری زندگی میں' فارس' بہت لوگ نہیں ہیں۔ صرف بابا ہیں اور ان کے پاس میرے لیے وقت نہیں ہوتا تو میں دوسرے لوگوں سے خود کو زبردستی اٹیچ کرنے لگ جاتی ہوں۔ ذرا مجھ سے کوئی ہمدردی سے بات کرے تو میں اس کو اپنا گائیڈ' اپنا دوست ماننے لگتی ہوں۔ کتنی بے چاری ہوں نا میں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ خفت سے بولا تھا۔

آبدار زخمی سا مسکرائی۔

"ایسی ہی بات ہے۔ مجھے اگر ثبوت دینا تھا تو مجھے بدلے میں آپ سے آپ کا وقت نہیں مانگنا چاہیے تھا۔ میں صرف اپنے بابا کے متعلق چند باتیں کرنا چاہتی تھی مگر میری اپروچ غلط تھی۔ اس لیے میں نے صبح جو ٹپ دی وہ ڈائریکٹ زمر کو دے دی اور بدلے میں کسی چیز کی امید نہیں رکھی۔ آپ سے معافی مانگنا چاہتی ہوں۔ پلیز میرے امیچور رویے کے لیے مجھے معاف کر دیجیے گا۔ آئندہ آپ کو میں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔"

ماحول کا تناؤ دھیرے دھیرے فضا میں گھل کے ختم ہو گیا تھا۔ فارس کے تنے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ اس نے رسان سے سر ہلا کر بس اتنا کہا۔ "گڈ! اب آپ کو یوں سر راہ مجھ سے ملنا نہیں چاہیے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو مجھ سے کسی بھی قسم کے تعلق کی وجہ سے نقصان پہنچے۔"

وہ دامن بچانے والے انداز میں کہہ کر ایک طرف سے نکل گیا۔ قوی امید تھی کہ وہ پیچھے سے پکارے گی۔ کوئی نئی بات کرے گی' نیا موڑ دے گی۔ مگر اس نے نہیں پکارا۔ وہ راہداری میں آگے بڑھتا گیا۔ سماعت ختم ہو چکی تھی اور تمام افراد باہر آ رہے تھے۔

ہاشم بھی سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ فارس اس سے لاتعلق سا پاس سے گزرنے لگا تھا کہ جب ہاشم نے اس کے کندھے سے اپنا کندھا ٹکرایا۔ فارس ٹھہر گیا۔

"اوو!" فارس نے فکرمندی سے لب سکیڑے۔ "میں ڈر گیا۔ دیکھو میرے ہاتھ بھی کانپ رہے ہیں۔" ہاشم خاموشی سے آگے بڑھ گیا تو فارس نے سر جھٹکا اور موبائل نکالتے ہوئے قدم مخالف سمت میں بڑھا دیے۔

پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھتی آبدار مسکراتے ہوئے' سوچ میں گم چلتی جا رہی تھی۔ جب پیچھے سے کسی نے اسے کہنی سے پکڑ کے موڑا۔ وہ جھٹکا کھا کے مڑی۔ سامنے جواہرات سرخ انگارہ آنکھوں کے ساتھ اسے گھور رہی تھی۔

"جو تم نے کیا ہے نا اس پہ تمہاری جان بھی لے سکتی ہوں۔" وہ زخمی سا غرائی تھی۔ آبدار نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"بنو مت۔ مجھے کہا کہ وہ ویڈیو ضائع کر دی اور خود ہاشم کو دے دی۔ مجھے میرے بیٹے سے دور کرنا چاہتی ہو؟"

"اوہ!" آبدار نے چونک کر اسے دیکھا۔ "ہاشم نے دیکھ لی وہ؟ مگر میں نے اسے نہیں دی۔"

"سنو تم!" وہ نفرت سے انگلی اٹھا کے پھنکاری تھی۔ جواہرات کے پیچھے آبی دیکھ سکتی تھی کہ دور راہداری کے دوسرے سرے پہ زمر سعدی اور فارس' ندرت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

کے ساتھ کھڑے تھے۔ سب سے نمایاں زمر نظر آرہی تھی۔ اپنی گھنگھریالی پونی کے باعث جو اس کے سرہلانے سے جھولنے لگتی' وہ مسکرا کر فارس سے کچھ کہہ رہی تھی' کوئی جلا کٹا تبصرہ اور وہ بھی شاید جواب میں کوئی برابر کا جملہ کس رہا تھا اور حنین ہنس رہی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں تمہارے ساتھ وہ کروں گی اب کہ تم۔"

"وہ ویڈیو ہاشم کو زمر نے دی ہے۔ میں نے نہیں۔" وہ تیزی سے بولی تھی۔ "میں نے تو اس کو ضائع کر دیا تھا مگر زمر اور اس کی وہ چھوٹی بھتیجی' ان دونوں نے مجھے ڈنر پہ بلایا' میرا لیپ ٹاپ ہیک کیا' ڈیٹا کاپی کیا اور چلتی بنیں۔ یہ میری کی تصویر بھی وہیں سے ملی ان کو۔ میں ان کی تجزیر نہیں ہوں' ان لوگوں نے مجھے استعمال کیا تھا۔"

جواہرات ٹھہری تھی مگر پھر نفرت میں ڈوبی بے یقین نظروں سے اسے دیکھ کے نفی میں سرہلایا۔ "مجھے یقین نہیں ہے۔"

"تو ہاشم سے پوچھ لیں۔ میں نے اسے ایسا کچھ نہیں دیا۔ ان لوگوں نے ہی دیا ہوگا۔ جان لینی ہے تو شکار سامنے کھڑا ہے۔" وہ شہلا نے اچکا کے' اپنا بازو چھڑاتی واپس مڑ گئی۔ جواہرات غصے سے چنگارتی کھڑی رہ گئی۔ ایک نظر مڑ کے اس دور کھڑی خوش باش فیملی کو دیکھا اور پھر پیر پٹختی آگے بڑھ گئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے حکم صادر کیا تھا۔ "کلب چلو۔" مگر چونک کے ڈرائیور کو دیکھا۔ پھر فرنٹ سیٹ پہ بیٹھے لحیم شحیم گارڈ کو۔

"بخت خان کہاں ہے؟ اور تم دونوں آفس سے یہاں کیوں آئے ہو؟"

ہٹے کٹے گارڈ نے رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ "ہم آپ کی نئی سیکیورٹی ٹیم کا حصہ ہیں۔ کاردار صاحب نے کہا ہے کہ آپ کی زندگی کو خطرہ ہے' ہمیں آپ کو چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔"

"مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ نکلو میری کار سے اور میری ذاتی ٹیم کو واپس بلاؤ۔" وہ تلملا کر بولی تھی۔

"ہمیں اس کا حکم نہیں ہے' میم! اب ہمیں چلنا چاہیے۔ رات آٹھ بجے سے پہلے ہمیں آپ کو گھر پہنچانا ہوگا۔ اس سے زیادہ باہر رہ کر خطرہ مول لینے کی اجازت سر نے ہمیں نہیں دی۔ چلو!" وہ ڈرائیور کو اشارہ کر کے بولا۔

جواہرات نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا۔ ایک دم اپنا آپ بے حد کمزور اور ناتواں لگنے لگا تھا۔ لمبی سی گاڑی کے سیاہ شیشے کسی قید خانے کی سلاخوں سے کم نہیں لگ رہے تھے۔ اسے ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔

☆

ڈاکٹر اسمٰعیل حسن اپنے گھر کی چھوٹی سی لائبریری میں اس وقت بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے مطالعے کے لیے چند کتابیں کھلی تھیں اور وہ بہت انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھے جب ان کی بیٹی نے اندر جھانکا۔

"بابا۔" انہوں نے سر اٹھایا۔ وہ سفید داڑھی اور صاف ستھری شلوار قمیص پہنے' شفیق اور مہربان چہرے والے انسان لگتے تھے۔

بیٹی کو دیکھ کر مسکرائے۔ "جی بیٹا؟"

"میرا ایک پرانا کلاس فیلو آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" وہ قدرے متذبذب تھی۔ "لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کو جج نہ کریں۔ وہ آج کل پوری دنیا میں اتنا تماشا بنا ہوا ہے کہ بہت مشکل سے میں نے اس کو راضی کیا کہ وہ آپ سے بات کرلے۔" وہ ان کو سمجھا رہی تھی۔

ٹھیک دس منٹ بعد وہ نوجوان اندر داخل ہوا تھا۔ ڈاکٹر اسمٰعیل نے اسے ایسے ہی دیکھا جیسے ہر نئے ملنے والے کو دیکھتے تھے۔ مسکرا کر اٹھے اور اسے خوش آمدید کہا۔ وہ متذبذب لگتا تھا۔ لباس اچھا تھا اور بال اوپر اسپائیکس کی صورت اٹھا رکھے تھے۔ آنکھوں تلے گہرے حلقے تھے۔ کلائی میں چند بینڈز پہن رکھے تھے۔ وہ اسی تذبذب سے ان کے سامنے بیٹھا تو انہوں نے

پوچھا۔
"کیا نام ہے آپ کا؟"
"نوشیرواں کاردار۔" اس نے جھجک کر بتایا۔ "ٹی وی پہ ذکر تو سنا ہو گا آپ نے میرا۔" وہ ذرا تلخی سے بولا۔
"نہیں' میں نے واقعی آپ کا ذکر نہیں سنا۔ نوشیرواں! آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے' آپ مجھے بتائیں۔ شاید میں کوئی مدد کر سکوں۔"
اس نوجوان نے سر نیہوڑا دیا' پھر کان کھجایا۔ پھر اسی طرح بولا۔ "میں نے ایک گناہ کیا ہے۔"
"اگر گناہ راز ہے تو اسے راز رہنے دیں۔" انہوں نے اسے روکا مگر وہ چہرہ اٹھا کر تلخی سے بولا۔ "بچے بچے کو پتا ہے' میں نے اپنے دوست کو تین گولیاں ماری تھیں۔ پھر میرے بھائی نے اسے اغوا کیا' اور اس سے پہلے میرے بھائی نے۔۔۔"
"آپ مجھے وہ بتائیں جو آپ نے کیا ہے۔ بھائی کو چھوڑیں۔"
وہ ٹھہرا۔ پھر نظریں ان پہ جمائے ذرا مدھم آواز میں بولا۔ "میں نے اپنے دوست کو تین گولیاں ماری تھیں۔"
"وہ مر گیا؟"
"نہیں' بچ گیا۔"
"آپ کیا چاہتے تھے؟ کہ وہ مر جائے۔"
"پتا نہیں۔ میں اسے۔۔۔"
"انسان کو سب پتا ہوتا ہے۔ آپ کیا چاہتے تھے؟"
"میں اسے اذیت دینا چاہتا تھا' شاید معذور کرنا چاہتا تھا' مارنا بھی چاہتا تھا۔ میں سب کچھ چاہتا تھا۔"
"اب وہ کیسا ہے؟" انہوں نے دھیمے انداز میں پوچھا تھا۔
"وہ میرے خلاف مقدمہ لڑ رہا ہے۔"
"آپ نے اعتراف جرم کیا؟"
"نہیں کر سکتا۔ قانون کی محبوب اولاد ہوں' خاموش رہنے کا حق ہے مجھے۔"
"اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"
"میں اس سب سے نکلنا چاہتا ہوں۔" اس کی آواز میں کرب در آیا۔ "میں نادم ہوں۔ شرمندہ ہوں۔ دکھ میں ہوں۔ میں چاہتا ہوں وہ مجھے معاف کر دے۔"
"ایسے جرائم میں توبہ پکڑے جانے سے پہلے ہوتی ہے' پکڑے جانے کے بعد معافی ہوتی ہے اور چونکہ مقدمہ چل رہا ہے تو فیصلہ آنے کے بعد یا تو آپ کو اپنی سزا بھگتنی ہو گی یا آپ کو اس سے معافی مانگنا ہو گی۔"
"میں سزا نہیں بھگت سکوں گا۔"
"معافی مانگ سکتے ہو؟"
"مجھے نفرت ہے اس سے۔"
"محبت کرنے کو کہہ بھی نہیں رہا۔ کسی کو معاف کرنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کو گلے سے لگایا جائے' اس کو دوست بنا لیا جائے۔ صرف ایک عہد کرنا ہوتا ہے کہ جو اذیت اس نے مجھے دی وہ میں نے اس کو نہیں دینی۔ اور اگر دوبارہ اس پہ ظلم کرنے کا موقع آئے تو اب میں نے وہ نہیں کرنا جو پہلے کیا تھا۔"
"کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟" اس کی آنکھیں بھیگیں۔ وہ اس وقت بہت بے بس نظر آ رہا تھا۔ "میں نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔"
"اگر آپ اللہ سے معافی مانگیں تو اللہ لوگوں کے دلوں میں بھی آپ کے لیے رحم ڈال دیتا ہے۔ آپ کے اندر ایک اچھا انسان ہے اور آپ کو اسے باہر نکالنا ہے۔"
"سوری مگر یہ جھوٹے دلاسے مجھے نہ دیں۔ میرے اندر کوئی اچھا انسان نہیں ہے۔ میں نے اپنی جان بچانے والے دوست کو گولی ماری۔ اپنے بھائی کی بیوی پہ نظر رکھتا تھا میں۔" وہ زہرخند سا گویا ہوا۔ آنکھیں اب تک گیلی تھیں۔
"نوشیرواں! یہاں ہر کوئی گناہ گار ہے۔ گناہ کرنا' پھر توبہ کرنا' پھر گناہ کرنا پھر توبہ کرنا پھر گناہ پھر توبہ۔۔۔ یہ مومنین کے اخلاق میں سے ہے۔ اچھے لوگ وہ ہوتے

ہیں جو گناہوں کے بعد توبہ کرتے ہیں پھر اپنی توبہ پر قائم رہتے ہیں اور برے وہ ہوتے ہیں جو گناہوں کے بعد توبہ نہیں کرتے۔"

"یعنی دونوں برابر گناہ کرتے ہیں۔ تو پھر اچھے لوگ جنت میں کیسے جائیں گے؟"

"جنت میں ہمیں ہمارے اعمال نہیں اللہ کی رحمت لے جائے گی۔ اللہ پہ توکل لے جائے گا۔ توکل ہوتا ہے اللہ سے اچھی امید باندھنا۔ اگر آپ کے گناہ بڑے ہیں تو آپ کو مایوس نہیں ہونا۔ ہر چیز معاف ہو سکتی ہے اگر آپ معافی مانگیں۔ اور اس گناہ سے باز رہنے کا عزم کریں۔ بڑے گناہوں کے بعد بڑی نیکیاں کریں۔ بڑے بڑے اچھے کام۔ یوں آپ کے گناہ دھل جائیں گے۔"

"اور کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟" اس کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"جب آپ اپنے گناہ دھوتے جائیں گے' اور اللہ سے معافی مانگیں گے تو اس کا دل بھی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے نا' وہ اسے آپ کی طرف سے پھیر دے گا' لیکن اس سے پہلے آپ کو اچھے کام کرنے ہوں گے۔ ایسے اچھے کام جو آپ کے چہرے کی ساری کالک دھو دیں۔"

"مثلاً "کیا؟ میں کیا کر سکتا ہوں؟" وہ الجھ گیا تھا۔ اسے دور دور تک کوئی ایسی نیکی نظر نہ آتی تھی جسے کرنے کے وہ لائق ہو۔ وہ جواب میں گہری سانس لے کر اسے سمجھانے لگے تھے۔ انہیں وہ لڑکا بھلا معلوم ہوتا تھا اور وہ اس پہ کچھ وقت صرف کرنا چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆
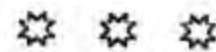
اب کوئی چاند میرا ہے نہ ستارہ محسن
اب کہاں جاؤں گا میں درد کا مارا محسن

مور چال کی سبز بیلیں اس کھلتی ہوئی صبح میں فخر سے سارا گھر ڈھانکے' سورج کے سامنے تن کر جمی نظر آتی تھیں۔ اندر آملیٹ کی خوشبو' چائے اور کافی کی مہک کے ساتھ فضا میں رچی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل سے زمر اٹھ چکی تھی اور اب کورٹ کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ فارس کو بے روزگار ہونے کا طعنہ اور نئی نوکری ڈھونڈنے کے لیے غیرت دلانا بے کار تھا۔ وہ ڈھٹائی سے سست انداز میں اپنی کافی پی رہا تھا۔ جب سعدی نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ سعدی تیار سا کھڑا تھا۔

"چلنا نہیں ہے؟"

"کار اسٹارٹ کرو میں آرہا ہوں۔"

"ڈرائیور کب سے ہو گیا میں آپ کا؟" وہ خفا سا کہتا جیسے ہی پلٹا' سامنے بیٹھی ندرت نے آنکھوں سے فارس کو اشارہ کیا۔ فارس نے جواباً "سر کو خم دے کر تسلی دینے والا اشارہ کیا۔ چائے کے گھونٹ بھرتی حنین نے مشکوک نظروں سے دونوں کو دیکھا۔ پھر سعدی کو پکارا۔

"بھائی! امی اور ماموں آپ کے بارے میں اشاروں

میں۔ "آوچ۔" ندرت نے ہلکی سی سہی مگر اس کی سر کی پشت پہ چپت لگائی تھی۔

سعدی اپنی ایڑیوں پہ گھوما اور باری باری امی اور ماموں کو دیکھا۔ "امی اور ماموں کیا؟"

حنہ نے اپنے سر کو سہلاتے ہوئے فارس کو دیکھا جس نے اسے گھورا تھا' پھر خفگی سے بولی۔

"امی اور ماموں ہم سے بالکل پیار نہیں کرتے۔ مجھے یقین ہے انہوں نے مجھے کسی اسپتال سے چرایا تھا۔ امی کسی زمانے میں وہ ڈراموں والی نرس ہوں گی' وہ جو لوگوں کے بچے ایکسچینج (تبدیل) کرتی ہیں۔" وہ بولتی ہوئی کرسی سے اٹھی اور آگے بھاگ گئی۔

"بے غیرت' بد تمیز۔" ندرت نے برے موڈ کے ساتھ جوتا اس سمت میں پھینکا جہاں وہ گئی تھی۔ حنہ اندر مڑ گئی۔ جوتا راہداری میں گر گیا۔

لمحے بھر بعد حنہ نے ستون کے پیچھے سے گردن نکالی۔

"امی' آپ ہماری ون ڈے ٹیم میں کیوں نہیں چلی جاتیں؟ نشانہ آپ کا بالکل ان کے جیسا ہی ہے۔" اور چھپاک سے اندر غائب ہو گئی۔

فارس اور سعدی نکل گئے تو امی' حنہ کو دو ہزار صلواتیں سنا کر "دوسروں کی بیٹیاں دیکھی ہیں' کتنی تمیز دار سگھڑ' صوم و صلوۃ کی پابند ہوتی ہیں منہ میں زبان نہیں ہوتی اور ایک یہ بے غیرت اولاد میرے ہی حصے میں آنی تھی۔" کچن میں جا چکی تھیں' اور اب نشانہ حسینہ تھی۔

"ٹھیک سے گوندھو آٹا۔ اور یہ روز روز نیا سونے کا زیور چڑھا کے کام کرنے نہ آیا کرو۔ آیا وڈا تیرا میاں' اگر لے کر دیتا ہے تو یہاں سے جا کر پہنا کرو' شوخی نہ ہو تو۔" یہ ندرت کی روٹین کی ٹون تھی اور اس پہ حسینہ نے دل ہی دل میں روٹین کے کئی کوسنے ان کی نذر کیے تھے' مگر بظاہر سر جھکائے آٹا گوندھتی رہی۔

ایسے میں حنہ دوبارہ لاؤنج میں آ گئی تھی اور اب دوپٹا کس کے' بال باندھ کے' جوش سے' کھڑی گردن اٹھائے چاروں طرف دیکھے جا رہی تھی۔ وہیل چیئر پہ بیٹھے بڑے ابا نے اخبار سے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟ پھر سے گھر کی صفائی؟"

"جتنی صفائی کرنی تھی کر لی۔ اب میں وہ کروں گی ابا جو آج کل کی نکمی' سست اور لاپروا یعنی' عام لڑکیاں بالکل نہیں کرتیں۔"

"اور وہ کیا ہے؟" مسکراہٹ دبا کر پوچھا۔

"میں عام لڑکی نہیں ہوں' یہ تو آپ جانتے ہیں۔ اس لیے میں DIY گرل بن رہی ہوں ابا self Do it your عام لڑکیوں کو پکی پکائی کھانے کی عادت ہوتی ہے۔ نکمی نہ ہوں تو امیر جیسی ہر کام خود کرتی ہیں۔ وہ گھر ڈیکوریٹ کرنے کے لیے انٹیریر ڈیکوریٹر نہیں ہائر کرتیں' گھر پینٹ کرنے کے لیے مستری مزدور نہیں بلواتیں۔ دیواروں پہ فریمز ٹھونکنے کے لیے یا پردوں کی ریلنگ لگانے کے لیے لمبے بھائیوں یا ملازموں کی منتیں نہیں کرتیں۔ مجھے کسی مستری مزدور' ترکھان' پردوں والے' پینٹ والے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اب یہ سارے کام خود کر سکتی ہوں۔ صرف چند دن کی محنت سے ابا ہم لڑکیاں اپنے گھروں کو اتنا خوب صورت اور اتنا آرام دہ بنا سکتی ہیں جتنے امیر لوگوں کے اونچے اونچے قصر بھی نہیں ہوتے۔ میں سمجھتی تھی' بڑے گھر خوبصورت ہوتے ہیں' مگر نہیں ابا۔ خوب صورت گھر ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ پھر وہ بڑے ہوں یا چھوٹے مگر یہ عام لڑکیاں ان کو خوبصورت نہیں بنا سکتیں۔ صرف میرے جیسی خاص لڑکیاں یہ کر سکتی ہیں۔" وہ ایک عزم سے کہہ رہی تھی۔ ابا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تمہارا مطلب ہے اب تم دیواروں پہ خود کیل ٹھونکتی پھرو گی؟ ہرگز نہیں۔ ایسے تو چوٹ لگ جائے گی۔" "نہیں" بات پسند نہیں آئی تھی۔

"دیکھا!" حنین نے چٹکی بجائی۔ "یہ آپ مرد ہی ہوتے ہیں جو ہم لڑکیوں کو آگے نہیں بڑھنے دیتے۔ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کا مطلب دس مردوں میں

بیٹھ کے مردوں کی طرح قہقہے لگانا اور رات دیر دیر تک باہر گھومنا نہیں ہوتا۔ بلکہ مردوں کے جیسے کام خود کرنا ہوتا ہے' دوسروں کی محتاجی سے بچنا ہوتا ہے۔ آج سے میں اپنے سارے گھر کو ری ماڈل کرنے جا رہی ہوں۔ اور مجھے کوئی نہیں روکے گا۔" پھر ہونٹوں کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنا کر آواز لگائی۔ "تدرت بہن! آپ بھی نہیں۔"

"ہاں ہاں ابھی تجھے میں کرنے دیتی ہوں اپنے گھر کا بیڑا غرق۔" وہ جواباً" وہیں سے غرائی تھیں۔ حنین نے افسوس سے اپا کو دیکھا۔

"چچ۔ چچ۔ پتا نہیں جب یہ نرس تھیں تو مجھ جیسے کتنے بچے اپنے اصلی ماں باپ سے جدا کیے تھے۔"

"بڑے موڈ میں ہو آج!" زمر باہر آئی تو مسکرا کر اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ کوٹ پہنے' بال بنائے' وہ کچہری کے لیے نکل رہی تھی۔ ہاتھ کی انگوٹھی اور ناک کی لونگ جگمگا رہی تھی۔ حنہ نے مسکرا کر شانے اچکائے۔

"میری زندگی کے سارے مسئلے حل ہو چکے ہیں' اور اب میری زندگی میں مزید کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس لیے میں خود کافی ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی ہوں۔" اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور وہ کھلی کھلی تازہ دم لگ رہی تھی۔ کہ کر وہ مڑ کے پھر سے درودیوار کو دیکھنے لگی اور چونکہ سوچ بھی رہی تھی تو عادتاً" ناخن چبانے لگی۔

"خاص لڑکی! پہلے اپنی اس عادت کو تو بدلو۔" زمر نے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگائی وہ چونکی۔ جلدی سے ناخن دانتوں سے نکالے۔

"تمہیں اندازہ ہے کہ تم بچے منہ میں ہاتھ ڈال کر کھڑے کتنے برے لگتے ہو؟ اور ناخن چاہے کھا رہی ہو یا دانتوں سے کتر کے پھینک رہی ہو' یہ تمہارے جسم کا حصہ ہے اور اس کو یوں چیرنے کی اجازت اللہ نے تمہیں نہیں دی۔ سوال ہوگا اس کے بارے میں بھی۔ اپنی اس عادت کو تمہیں خود ختم کرنا ہوگا۔ کم از کم اتنی کمزور نہیں ہو تم کہ اپنے دانتوں سے ہار مان جاؤ۔ ناخن کترنے سے دماغ کمزور ہوتا جاتا ہے حنہ! لیکن سب سے زیادہ ہمیں اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں اللہ ہم ناخن کھانے والوں کو مردہ انسانوں کا گوشت کھانے والوں کے ساتھ ہی نہ کھڑا کردے قیامت کے دن کیونکہ بات تو ایک ہی ہے نا۔"

"اچھا اچھا نہیں کھاتی۔" اس نے گھبرا کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ لیے تھے۔ ڈور بیل بجی تو زمر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

"حنین!" زمر واپس آئی تو اس کا چہرہ سنجیدہ سا تھا۔ حنہ نے چونک کے اسے دیکھا۔ "کون ہے؟"

"حنین! میری بات غور سے سنو!" وہ سنجیدگی سے ٹھہر ٹھہر کے بول رہی تھی۔ "اگر میں یہ نہ کرتی تو ہاشم کر دیتا' اس لیے میں نے سوچا کہ میں ہی کر دوں۔"

"باہر کون ہے؟" حنہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"وہ جو بھی ہے' اور اس کے پاس جو بھی کچھ بھی ہے' اگر تم چاہو تو ہم اس کو روک سکتے ہیں۔ تمہیں ملک سے باہر بھجوا دیں گے۔ لیکن اگر تم اسے وصول کرنا چاہو تو۔" زمر کی آواز پس منظر میں چلی گئی۔ حنین بالکل سن سی کھڑی رہ گئی۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں اس کو معلوم ہو گیا تھا کہ باہر کون تھا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔

"حنین! مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ آج ہی آجائے گا۔ پہلے سوچ لو۔" زمر فکرمندی سے کہہ رہی تھی مگر حنین کے کان' آنکھیں سب بند ہو چکا تھے۔ وہ ہوا میں قدم رکھ رہی تھی۔ بادلوں پہ چل رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ پورچ خالی تھا۔ وہ گیٹ تک آئی اور چھوٹا دروازہ کھول دیا۔

سامنے کورٹ کا ملازم کھڑا تھا۔ "حنین یوسف خان آپ ہیں؟" اس نے نام پڑھ کر دہرایا۔

حنین نے بنا پلک جھپکے سر اثبات میں ہلایا۔ اس کا بدن دھیرے دھیرے کانپنے لگا تھا۔ ملازم نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

"یہ آپ کے لیے ہے۔" حنین نے کپکپاتے ہاتھوں سے کاغذ تھاما اور پھر قلم سے اس جگہ دستخط کرنے لگی

جہاں وہ کہہ رہا تھا۔

"آپ کو اس درج کی گئی تاریخ پہ کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ آپ کو بطور گواہ طلب کیا گیا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا اور حنین اس کاغذ کو پڑھ رہی تھی۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ ماضی کو دفن کر کے شہد کی مکھی نے راستہ بھی بدل لیا تھا، رنگوں اور خوشبوؤں سے بھرے رس سے اپنی زندگی کو سجانے بھی لگی تھی، دل کو شفا بھی مل رہی تھی، لیکن آج معلوم ہوا تھا کہ... ہاشم اور حنین کی کہانی ابھی باقی تھی۔

دھوپ میں کھڑی لڑکی نے حکم نامہ پکڑے ہوئے، آنکھیں کرب سے بند کرلیں۔ آخر کب ختم ہوگی۔ ان بے لذت غلطیوں کی داستان؟

✡ ✡ ✡

سنا ہے شہر میں زخمی دلوں کا میلہ ہے
چلیں ہم بھی مگر پیرہن رفو کر کے

گالف کلب کے سرسبز میدان دور تک پھیلے نظر آتے تھے۔ اندرونی سٹنگ ایریا میں رکھی کرسیوں پہ بیٹھی خواتین بے فکری سے باتیں کرتی نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک جواہرات کاردار بھی تھی جو بظاہر مسکراتی، بسلسل بولتی خاتون کو سن رہی تھی اور اضطراب سے گلے کا لاکٹ اپنی انگلی پر لپیٹ رہی تھی۔ قریب میں دو مستعد گارڈز ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

"ویسے جواہرات یہ تمہاری عمر نہیں تھی ریٹائرمنٹ کی۔ اب تو تم کسی ایگزیکٹو گیدرنگ میں نظر تک نہیں آتیں۔" ایک بھورے سنہری بالوں والی عورت شکوہ کر رہی تھی۔

"اور یہ Paranoia" (وہم خوف)۔ دوسری نے ناک سکیڑ کر گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں ہر وقت ان کی موجودگی سے الجھن نہیں ہوتی؟"

"جتنا اعلا خاندان، اتنے ہی سیکیورٹی تھریٹ۔" جواہرات نے بظاہر بے نیازی سے شانے اچکائے۔

"ہاں اگر لوکیشن کو گارڈ کرنا زیادہ بہتر ہے، پرسن کو گارڈ کرنے سے۔ ان کو سارا ایریا کور کرنا چاہیے، نہ کہ تمہارے سر پہ کھڑے ہو کے ہماری باتیں سنیں۔"

وہ ذرا ہنس کر طنزیہ انداز میں بولی۔ جواہرات نے بہت سے کڑوے گھونٹ مسکرا کر اندر اتارے۔

"ان کو ہوشیار رہنا پڑتا ہے عائلہ، کہ کہیں کوئی فرسٹریٹڈ سوشلائیٹ اپنے بوٹوکس کے غلط نتیجے کا غصہ میرے کھانے میں زہر ملا کے نہ اتارنے یا کوئی..." دوسری خاتون کا چہرہ دیکھا۔ "زیادہ فرسٹریٹڈ عمر رسیدہ عورت اپنے شوہر کے اس کی فنانشل ایڈوائزر سے چلتے افیئر سے تنگ آکر مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ Paranoia؟ اونہوں۔ سیکیورٹی تھریٹ!" مسکرا کے اس نے گلاس اٹھایا اور چیئرز کے انداز میں اوپر لہرایا، مگر دونوں متعلقہ خواتین کے چہرے سیاہ پڑ چکے تھے، کوئی گلاس نہ ٹکرایا تو وہ مسکرا کے اپنے مشروب کے گھونٹ بھرنے لگی۔ اس کا اندر ابھی تک جل رہا تھا۔

ان سے دور... قصر کاردار میں ہاشم اپنی اسٹڈی میں بیٹھا تھا۔ گھر کے کپڑوں میں ملبوس، شرٹ کی آستینیں اوپر چڑھائے، وہ گہری سوچ میں گم لگتا تھا۔ دو انگلیوں کے درمیان سگریٹ دبا تھا جسے وہ ہولے ہولے ایش ٹرے پہ جھٹک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس تھیں اور جیسے دور کہیں قید ہو چکی تھیں۔ چہرے پہ عجب مردنی چھائی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا اور رئیس اندر داخل ہوا۔ دن کے باوجود اتنا اندھیرا تھا کہ اسے چند لمحے لگے ہاشم کو دیکھنے میں۔ پھر کھنکھارا۔

"سر؟"

"اس کا موبائل واپس رکھ دیا؟" وہ بھاری کھوئی کھوئی آواز میں بولا تھا۔ اس کے چہرے کے سامنے دھوئیں کے مرغولے رقص کرتے اڑ رہے تھے۔

"جی سر!"

"کیا فارس غازی کا نام جنوری اور فروری میں سری لنکا سفر کرنے والوں کے نام میں شامل ہے۔"

"نہیں سر! اس کی سفری دستاویزات کہیں بھی

موجود نہیں۔"

"اس کا چہرہ تو ہے نا۔ اس کی تصویر سے چیک کرو۔"

وہ اب ایش ٹرے پہ سگریٹ جھٹکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں نے کہا تھا وہ کولمبو گیا تھا۔ کولمبو جانے والے ہر پاکستانی کی سفری دستاویزات سے اس کا چہرہ میچ کرو۔ ہمارے ایرپورٹ سیکیورٹی فورس کے کانٹیکٹس تمہاری مدد کریں گے۔ اگر اس کا چہرہ کہیں نظر آتا ہے تو دیکھنا۔" اس نے سرخ پڑتی متورم سی آنکھیں اوپر اٹھائیں۔

"کہ اس کے ساتھ ہارون عبید کا کوئی ملازم تو نہیں ہے؟ یا کوئی ایسا شخص جس کا تعلق ہارون یا آبدار سے ہو۔ مجھے ایک بات پتا کر کے دو خاور!"

"رئیس سر!" اس نے دھیرے سے تصحیح کی۔ ہاشم نے نہیں سنا۔ وہ اب اسی منہمک انداز میں سگریٹ جھٹک رہا تھا۔ راکھ ہی راکھ ایش ٹرے میں بھرتی جارہی تھی یا شاید اس کی سانسیں تھیں جو راکھ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

تھا جنہیں زعم وہ دریا بھی مجھ میں ڈوبے
میں کہ صحرا نظر آتا تھا' سمندر نکلا

"فوڈ لی ایور آفٹر کی بالائی منزل کی شیشے کی دیوار سارے زمانے کی روشنی اندر لے آئی تھی۔ ہال کمرہ منور تھا۔ ایک طرف ایک چینی نقوش کی حامل درمیانی عمر کی عورت بیٹھی ایک کمپیوٹر اور ٹیبلٹ سامنے رکھے کام کر رہی تھی۔ اس کے سر پہ کھڑا اسعدی بار بار اس کو انگریزی میں لقمے دے رہا تھا۔

"نہیں' یوں نہیں۔ کمان کی طرح آئی بروز بناؤ۔ ہاں اس طرح۔ اور ناک ذرا۔" دفعتاً اس نے سر اٹھا کے سامنے کرسیوں پہ آمنے سامنے بیٹھے فارس اور احمر کو دیکھا جو کافی پیتے نظر آرہے تھے اس نے احمر کو مخاطب کیا۔

"اس کو اردو نہیں آتی؟"

"بالکل بھی نہیں۔" اس نے گویا تسلی دی۔
سعدی سر ہلا کے اس کی اسکرین کو دیکھنے لگا۔ وہ باوجود کوشش کے جاب پہ دوبارہ اپائنٹ نہیں کیا جا رہا تھا۔ دو دفعہ جوائننگ کے بعد کے اسے گھر واپس بھیج دیا گیا تھا۔ سرکاری رکاوٹوں کا بہانا' ہونہہ۔۔۔۔

ادھر احمر سفید ٹی شرٹ پہنے' سر پہ الٹی پی کیپ رکھے عام دنوں سے مختلف لگ رہا تھا۔ فارس نے کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بغور اسے دیکھا۔

"تمہاری مالکن تمہیں اس حلیے میں برداشت کرلیتی ہے؟"

"اور ان کو تمہیں یوں دیکھ کے فکو نہیں ہوتا؟" مسکراہٹ دبائے کہتا سعدی فارس کے ساتھ کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ اب وہ دونوں ساتھ تھے اور احمر ان کے مقابل۔ چینی عورت لاتعلق سی اپنا کام کر رہی تھی۔

"اہم!" احمر کھنکھارا۔ سر نیچے کیا۔ "ہاشم صاحب نے مجھے۔۔۔ آ۔۔۔ میری خدمات کو سراہتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ میں ان کے لیے ظاہر ہے اتنا کام کرچکا ہوں تو اب مجھے اپنی فری لانس جاب دوبارہ سے کرنی چاہیے تو انہوں نے مجھے۔۔۔"

"فارغ کردیا ہے' ہے نا؟" فارس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"اور تمہارا سامان اٹھا کر باہر پھینک دیا ہے؟" سعدی نے پھر لقمہ دیا۔

"اور تمہیں ان تین کپڑوں میں سڑک پہ دھکیل دیا ہے؟" سعدی نے لقمہ دیا۔

"انہوں نے بہت سلیقے سے میرا استعفیٰ وصول کیا' میرے چیک کلیئر کیے اور۔۔۔"

"اور پھر تمہیں باہر دھکیل دیا۔ ہاہاہا۔۔۔" وہ گردن پیچھے پھینک کے دل کھول کے ہنسا تھا۔ سعدی بھی مسکرا کے گھونٹ بھرنے لگا۔

"ایکسکیوزمی! اتنا فنی کیا ہے اس میں؟" احمر دانت پہ دانت جمائے خفگی سے بولا تھا۔ فارس نے ہنستے ہوئے نفی میں سر ہلایا' پھر سعدی کی طرف چہرہ موڑ کے کہنے لگا۔

"یار! مجھے کوئی چند دن پہلے جاب لیس کہہ رہا تھا۔"

"اور یہ بھی کہہ رہا تھا کہ وہ کاردارز کے ساتھ کام کر کے بہت پیسہ بنا رہا ہے۔" سعدی تیزی سے بولا۔

"اور یہ کہ ہم اس کی ترقی سے جل رہے ہیں۔"

"اور میں نے سنا ہے وہ کاردارز کے لیے کیے گئے اپنے سارے کام جسٹی فائی بھی کر رہا تھا۔" سعدی اس کے فقرے مکمل کر رہا تھا۔

"اور میں نے اس کہا کہ کاردارز کی نوکری چھوڑو' کیونکہ یہ تمہیں اس طرح ایک دن پٹخ دیں گے۔"

"تو اس نے کہا کہ وہ خاور کی جگہ لے چکا ہے اور اپنی پیاری مالکن کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے۔"

"اور وہ بڑی ڈیزائنر شرٹس اور سلک ٹائی پہننے لگا تھا۔"

"جوتے بھی بڑے چمک دار ہوتے تھے ماموں! ہمیں تو اپنی شکلیں بھی ان میں صاف نظر آتی تھیں۔"

"اور۔۔۔ آ۔۔۔ آج وہ بھی جاب لیس ہے۔"

"بالکل ہماری طرح!" اور وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے۔ اتنے عرصے بعد سعدی اتنا کھل کے ہنسا تھا۔

احمر نے یہ ساری بکواس بہت خاموشی سے سنی اور برداشت کی تھی۔ پھر بہت تحمل سے بولا۔ "تھینک یو ویری مچ غازی! بہت نوازش آپ کی۔ لیکن میں ان کی جاب ویسے بھی چھوڑ دیتا' میرا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔"

"یار سعدی! وہ کیا چیز تھی کھٹی سی اس کہانی میں۔۔۔" وہ ٹھوڑی کو ناخن سے رگڑتے' مسکراہٹ دبائے سعدی سے پوچھنے لگا۔

"انگور' ماموں انگور!" وہ اب آخری گھونٹ بھر رہا تھا۔

"ہاں صحیح۔۔۔ اچھا۔ تم کیا کہہ رہے تھے؟" پھر احمر کی طرف متوجہ ہوا۔ (سعدی اب رخ پھیر کے بیٹھا چینی عورت کو دوبارہ سے ہدایات دینے لگا تھا۔)

"ٹھیک ہے۔ کہہ رہا تھا کہ۔" دانت پہ دانت جمائے وہ برداشت سے بولا تھا۔ "کہ اس آدمی کا پتا چلا؟ وہ چشمے والا؟"

"صرف اتنا پتا چلا ہے کہ وہ ایک گھوسٹ (بھوت) ہے۔" فارس سنجیدہ ہوا۔ احمر توجہ سے سننے لگا۔ "اس کی تصویر ریکارڈ میں نہیں ہے۔ اس کے فنگر پرنٹ ریکارڈ میں نہیں ہیں۔ وہ عدالت میں داخلے کے وقت جو آئی ڈی کارڈ دکھاتا ہے' وہ بھی جعلی ہے۔ میرا خیال ہے یہ وہی آدمی ہے۔ جس نے سعدی کا پاسپورٹ ہاشم کو دیا ہے اور ہمارا میموری کارڈ بھی اس کے پاس ہے۔"

"کیا یہ ہاشم کے لیے کام کر رہا ہے۔" سعدی نے گردن پھیر کے پوچھا تھا۔

"ہاشم اس کو نہیں جانتا۔" احمر نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "اس کے کسی انداز سے شناسائی کی ذرا سی جھلک بھی نہیں دکھتی۔ یہ آدمی کوئی تیسرا فریق ہے۔"

"اور یہ تیسرا فریق ہاشم کی مدد کر رہا ہے' سعدی کو دہشت گرد ثابت کروانے کے لیے۔" فارس سوچتے ہوئے بولا تھا۔ "یہ یقیناً" ہمارا کوئی دشمن ہے۔"

"میرا تو نہیں ہو سکتا۔ ہاں آپ کے کام ایسے ہوتے ہیں' دشمنی والے۔" سعدی نے شانے اچکا کے کہا تھا۔ فارس نے بس گھور کے اسے دیکھا۔

"وہ صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ تمہارا کوئی جیل کا دشمن ہو سکتا ہے۔"

"میں کسی کا چہرہ نہیں بھولتا اور یہ آدمی جیل میں نہیں تھا میرے ساتھ۔"

"تو ہو سکتا ہے' یہ کسی اور کے لیے کام کر رہا ہو' مگر زیادہ ضروری یہ ہے کہ تمہارے گھر میں اس کے لیے کون کام کر رہا ہے۔"

"ہمارے گھر میں ایسا کوئی نہیں ہے۔" سعدی نے تیزی سے اس کی بات کاٹی تھی۔ فارس البتہ خاموشی سے کچھ سوچتا رہا تھا۔

"سعدی! میں تمہاری فیملی کی بات نہیں کر رہا۔ کوئی ملازم' کوئی ہمسایہ' کوئی کالونی کی کسی شاپ والا' کوئی بھی ہو سکتا ہے یہ۔"

"ہو تو سکتا ہے۔" فارس نے کہا تو سعدی نے قدرے برہمی سے اسے دیکھا۔

"ہمارے گھر میں کم از کم کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھے دہشت گرد ثابت کروانے کی کوشش کرے۔ کوئی ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟ ریسٹورنٹ کے ملازم بھی بہت پرانے ہیں' گھر کے ملازموں کی تو بات ہی نہ کریں۔ ہم ان سب کو جانتے ہیں۔"

"جانتے تو ہم ہاشم کو بھی تھے۔" وہ اداسی سے مسکرا کے بولا تھا۔ سعدی چپ ہو گیا۔

"ٹھیک ہے سعدی' ہم کسی کے بارے میں خوامخواہ غلط گمان نہیں کریں گے اب' مگر ہمیں اپنی آنکھیں اور کان اب کھلے رکھنے ہوں گے۔ اوکے! اور یہ مت بھولنا کہ ہم اس پچویشن میں اس لیے ہیں' کیونکہ تم نے اپنا پاسپورٹ لاپروائی سے۔ پھینک دیا تھا۔" وہ جتاتے ہوئے بولا تھا۔ سعدی خفیف تھا' سو گردن موڑ کے چینی عورت کا کام دیکھنے لگا۔

"فیس کٹ ذرا گول تھا۔ ہاں کچھ اسی طرح کا' نہیں تھوڑا کم کرو۔"

"تو پھر۔" فارس نے مسکراہٹ دبا کے احمر کو دیکھا۔ "تم آج کل بے روزگار ہو اسٹینی!"

"ہاں بالکل۔ سوچ رہا ہوں جیل چلا جاؤں' وہاں دو وقت کی روٹی تو مل ہی جاتی ہے۔" وہ جل کے بولا تھا۔ فارس ہنس کے سر جھٹکتا اپنا موبائل نکال کے دیکھنے لگا۔ سعدی اب چینی عورت کو مزید ہدایات دے رہا تھا اور وہ اسی طرح اسکیچ بناتی جا رہی تھی۔

"سنیے محترمہ!" غازی مسکراہٹ دبائے موبائل پہ ٹائپ کرنے لگا۔ مخاطب زمر تھی۔ "آج رات ڈنر پہ چلیں گی میرے ساتھ؟"

چند لمحوں میں جواب آیا تھا۔ "آپ کون؟"

فارس کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ "آپ کا نکما' بے روزگار' دو لوگوں کا قاتل' جیل پلٹ شوہر' جس نے آپ کی دولت کے لیے آپ سے شادی کی تھی۔ آٹھ بجے کی بکنگ کروالوں؟"

"بل کون دے گا؟"

"ظاہر ہے آپ... میں تو کماتا ہی نہیں ہوں۔"

"کروالو... ہونہہ..." اور وہ تصور کر سکتا تھا۔ سر جھٹک کر لکھتی۔ ہونہہ...

"یہی ہے... بالکل یہی ہے۔" سعدی اب اس عورت کے ساتھ جھک کے کھڑا اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ بالآخر امید نظر آنے لگی تھی۔ چینی عورت نے اسکرین کا رخ ان دونوں کی طرف پھیرا تو وہ بھی غور سے دیکھنے لگا۔ وہاں ایک خوب صورت نوجوان لڑکی کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ اسکرین ٹون بھی مناسب حد تک بھری جاچکی تھی اور وہ اسکیچ کسی اصلی تصویر کے قریب قریب ہی تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ اس کے نقوش ایسے ہی تھے؟" فارس نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ سعدی نے پورے وثوق سے سر اثبات میں ہلایا۔

"اس کا نام ڈاکٹر مایا تھا' وہ روز میری پٹی کے لیے آتی تھی اور گڈ کاپس جیسی باتیں کرتی تھی۔ مجھے اس کی شکل یاد ہے۔ نوے فیصد یہی شکل تھی اس کی۔ اب کیا کرنا ہے ہمیں؟ اس اہم گواہ کو کیسے ڈھونڈنا ہے؟"

"اگر تو وہ پاکستانی ہوئی تو مل جائے گی۔" احمر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

"وہ پاکستانی ہی تھی۔ جتنی اردو اس کی صاف تھی اور جتنی جلدی وہ مجھے بات بات پہ اینٹی بائیوٹک کے کورس پہ لگادیتی تھی' وہ پاکستانی ڈاکٹر ہی تھی۔" وہ بہت سنجیدگی سے بولا تھا۔ "اسے ہاشم یہاں سے لے کر گیا تھا۔ دوبارہ وہ نظر نہیں آئی۔ یقیناً" واپس آگئی ہوگی۔ لیکن تم اسے کیسے ڈھونڈو گے احمر؟"

"بالخصوص اب جبکہ تم جاب لیس ہو۔" فارس نے دھیرے سے فقرہ مکمل کیا۔ احمر نے صرف ایک تندو تیز نظر اس پہ ڈالی اور پھر سعدی کو دیکھا۔

"یہ کم عمر لڑکی ہے۔ گریجویٹ ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہوگا۔ پی ایم ڈی سی کے پچھلے دس سال کے ریکارڈ میں اسے ڈھونڈ لوں گا میں' جب تم یہ رقم..." ایک کاغذ پہ چند ہندسے لکھ کر اسے فارس کی طرف بڑھایا۔ "میرے اکاؤنٹ میں جمع کروادوگے' دوسری صورت میں نہ تو تمہیں اس جیسی اسکیچ آرٹسٹ ملے گی' اور نہ ہی یہ جو اسکیچ بنایا ہے' اس کا ایک بھی پرنٹ آؤٹ ملے گا۔ جس کو بھی ہائر کروگے' وہ ہاشم کو بتادے گا۔ سو اب فیصلہ کرنے کے لیے تمہارے پاس دس سیکنڈ ہیں اور وائر ٹرانسفر کے لیے ایک منٹ..." پھر گھڑی دیکھی۔" 59 سیکنڈ... 58 سیکنڈ۔"

"اچھا... اچھا..." فارس نے برا سامنہ بنا کے اسے دیکھا اور موبائل آن کرتے ہوئے اس کاغذ کو پکڑا۔ نقوش تن گئے تھے اور ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ وہ منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا موبائل پہ بٹن دبانے لگا۔ احمر نے ایک دوسرا کاغذ سعدی کی طرف بڑھایا۔

"میری کنسلٹنسی فیس جو آپ ادا کریں گے' کیونکہ آن لائن بینکنگ تو آپ کی بھی ایکٹیو ہے۔" جب سعدی اسے گھورتا رہا تو اس نے زور دے کر کہا۔

"مطلب میں اس اسکیچ کو ڈیلیٹ کروادوں؟" سعدی نے چٹ جھپٹی اور اسے گھورتے ہوئے موبائل نکالا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد احمر کے موبائل پہ یکے بعد دیگرے دو نوٹیفکیشن موصول ہوئے۔

"اب بے فکر ہو جاؤ۔ میں اس لڑکی کو ڈھونڈ لوں گا۔" اس نے چینی عورت کو چلنے کا اشارہ کیا تو وہ کسی روبوٹ کی طرح اٹھی اور باہر نکل گئی۔ وہ دونوں اسی طرح تندی سے اسے گھور رہے تھے۔

احمر شفیع نے کافی کا آخری گھونٹ حلق کے اندر انڈیلا' مگ سامنے رکھا اور پھر گہری سانس لے کر مسکرا کر ان کو دیکھا۔

"میں جاب لیس نہیں ہوں۔ فری لانسر ہوں۔ تم لوگوں کے ساتھ "جاب" ہی کر رہا تھا جس کی مجھے اچھی خاصی تنخواہ تم دونوں... میرے دو بے روزگار دوستوں نے دے دی ہے۔ بہت شکریہ۔ اب چلتا ہوں۔" کالر جھٹک کے کہتا وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں ابھی تک بالکل چپ ہو کر اسے گھور

رہے تھے۔ (پیدائشی فراڈیا!)

٭ ٭ ٭

میرا چہرہ میری آنکھیں ہیں سلامت ابھی
کون کہتا ہے وضاحت نہیں کی جاسکتی

جواہرات کاردار اپنے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا چہرہ لہانت سے تمتما رہا تھا۔ کلب کی عورتوں کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ اس نے سن گلاسز پہ پھینکے 'ایئر رنگز نوچ کے اتارے۔ پھر اپنے سراپے کو قد آور آئینے میں دیکھا۔ یہ جھریاں 'یہ لکیریں 'یہ کہاں سے نظر آنے لگی تھیں؟ غصے اور پریشانی سے اس نے گالوں پہ ہاتھ پھیرا۔ وہ مضطرب تھی 'شکست خوردہ تھی۔ وہ کیا کرے؟

کھلے دروازے سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ لاؤنج میں میری اینجیو اور فیونا ایک ساتھ کھڑی ہو کر دھیمی آواز میں کچھ بات کر رہی تھیں۔ موضوع یقیناً" مالکن کی دلچسپ حالت تھی۔

"یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو' جاؤ..." وہ چلا کر کفن پھاڑ انداز میں بولی تھی۔ میری پلٹ گئی۔ فیونا رہ گئی۔

"ہاشم صاحب کا حکم ہے کہ آپ کی طبیعت درست نہیں۔ آپ کو اکیلا نہ چھوڑوں۔ مجھے آپ کے دس میٹر قریب کے وائرے کار میں رہنے کا حکم دیا ہے۔ اس لیے مجھے آپ کے کمرے کے باہر رہنا پڑے گا۔ میں معذرت چاہتی ہوں۔ "میم!" مگر اس کا انداز معذرت چاہنے والا نہیں تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولی تھی اور لبوں پہ مسکان جلوہ گر تھی۔

"دفع ہو جاؤ 'اس سے پہلے کہ میں تمہاری جان لے لوں۔" وہ سرخ بھبھوکا چہرے کے ساتھ چلائی تھی۔ فیونا نے ادب سے سر کو خم دیا اور اس کے دروازے کے ساتھ رکھے اسٹول پہ جا بیٹھی۔ اس کا انداز فاتحانہ تھا کہ جو کرنا ہے اب کرلو۔

جواہرات اس پہ جھپٹنا ہی چاہتی تھی 'گویا اسے ہاتھوں سے نوچ کھائے گی' مگر اوپر سے زینے اترتا نوشیرواں نظر آیا تو وہ رکی۔ وہ بے زار سا 'رف حلیے میں نیچے آتا دکھائی دے رہا تھا۔

"شیرو..." وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس کی طرف لپکی۔ وہ آخری قدمچے تک پہنچ گیا تھا۔ ایک بے زار نظر اس پہ ڈالی۔ "آپ کو کیا ہوا؟"

"دیکھ رہے ہو تمہارا بھائی کیا کر رہا ہے میرے ساتھ؟" اب اسے پروانہ تھی کہ کون سنتا ہے 'کون نہیں۔ "وہ مجھے سزا دے رہا ہے۔ وہ مجھے اذیت دے رہا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟ میں نے صرف وہی کرنا چاہا جس سے اس کے مسئلے کم ہوں۔"

"تو میں کیا کروں ممی؟" وہ اس کے قریب سے گزر کے آگے بڑھ گیا۔ اور سینٹر ٹیبل سے ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آن کیا۔ دیوار پہ نصب دیوہیکل اسکرین چمک اٹھی۔ جواہرات ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑ کے جلدی جلدی بولی۔ "تم اس سے بات کرو۔ اس سے کہو کہ وہ اپنا رویہ بدلے۔"

"بھائی میری نسبت آپ کی زیادہ مانتا ہے ممی۔ آپ دونوں کا آپس میں زیادہ اچھا رابطہ ہے۔ مجھے پتا نا ہو یا علیشا کے شیئرز واپس خرید کے مجھے کمپنی سے کک آؤٹ کرنا ہو 'ہر چیز آپ دونوں جیسے پہلے طے کرتے تھے 'ویسے ہی کرلیں۔"

"نوشیرواں... میں تمہاری ماں ہوں۔" وہ بے یقینی سے چلائی تھی۔

"اور آپ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔" وہ ترحم زدہ نظر اس پہ ڈال کے بولا تھا۔ "کہ ہمیشہ اپنا مفاد دیکھو... کبھی بڑے بھائی کی غلط باتوں پہ اس کو ٹوکو نہیں 'بس پیسہ خرچ کرو' سکون سے عیش کرو۔ بزنس کے معاملات 'کس کو کب قتل کرنا ہے 'کس کو اغوا کرنا ہے' یہ سب ہمیں ہینڈل کرنے دو۔ آپ نے مجھے کبھی کچھ ہینڈل کرنا سکھایا ہی نہیں۔ کبھی بڑا ہونے ہی نہیں دیا تو اب میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ آپ کا مسئلہ حل کرسکوں۔"

"تم..." اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"تم اس سے بات تو کر سکتے ہو۔ اس کو اتنا تو کہہ سکتے ہو کہ وہ بے حس نہ بنے۔"

"اسے ایسا آپ نے بنایا ہے۔ ظالم' بے حس۔۔۔ اب اس کا دل پتھر کا ہو چکا ہے۔ اب اسے کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ بھائی کو پتھر کا مجسمہ آپ نے بنایا ہے۔ سنگ مرمر کی طرح اس کو رگڑ رگڑ کے پالش کیا ہے۔ یہ چمکتے ہوئے پتھر سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں ممی۔۔۔ میں آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے کچھ کرنا آتا ہی نہیں ہے۔ میں ایک ٹوٹل فیلیو (ناکام) ہوں اور اب جبکہ میں اپنی روشنی ڈھونڈنے جا رہا ہوں تو مجھے اتنا خود غرض بنا دیا ہے ان گزرے سالوں میں آپ نے کہ میں خود اکیلا ہی منور ہونا چاہتا ہوں۔ آپ دونوں کے گناہوں کا بوجھ اپنے کندھوں پہ نہیں اٹھانا چاہتا۔ مجھے معاف رکھیں اپنے معاملوں سے۔۔۔ ہم یوسفز نہیں ہیں' چھوٹے گھر میں رہنے والے عام لوگ نہیں ہیں' وہ' جن کا بچہ بچہ اپنے مسئلے خود حل کر سکتا ہے۔ میں نہیں کر سکتا۔ جانتی ہیں کیوں؟" وہ کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں گلابی پڑ رہی تھیں۔

"کیونکہ کٹھن وقت میں اپنے مسئلے صرف وہی شخص خود حل کر سکتا ہے جو اچھے وقتوں میں دوسروں کے مسئلے حل کرتا آیا ہو۔ ان کی ماں نے ان کو دوسروں کے مسئلے حل کرنا سکھایا ہے اور میں تو کسی قابل نہیں ہوں۔ مجھے آپ نے کبھی کسی قابل ہونے ہی نہیں دیا۔" سر جھٹک کے اس نے ٹی وی بند کیا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

جواہرات بے بسی سے آنکھوں میں آنسو لیے اسے جاتے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

بولوں گا جھوٹ تو مر جائے گا ضمیر
کہہ دوں اگر میں سچ تو مجھے مار دیں گے لوگ

اس پرسکون سی کالونی میں سبز بیلوں سے ڈھکے مور چال کے اندر تناؤ زدہ ماحول چھایا تھا۔ لاؤنج کے ایک کونے میں فارس اور سعدی آمنے سامنے کھڑے تھے اور سعدی بڑی ہمی سے کہہ رہا تھا۔ "میری بہن گواہی نہیں دے گی۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"سعدی! زمر اسے نہیں بلائے گی تو ہاشم اسے بلائے گا۔ اسے پیش ہونا پڑے گا۔" فارس اس کو دھیمی آواز میں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں بے غیرتوں کی طرح اس کو بے عزت ہوتے دیکھوں؟ وہ آدمی ہر طرح کے سوال پوچھے گا۔" سعدی کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا اور وہ بار بار نفی میں سر ہلاتا تھا۔

"آہستہ بولو۔ تمہاری امی سن لیں گی تو ان کو کیا وضاحتیں دیتے پھرو گے۔" اس نے دبی آواز میں جھڑکا تھا۔

ندرت کچن میں کھڑے ہو کے چولہا اپنی نگرانی میں حسینہ سے صاف کروا رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ لاؤنج کے پرلے کونے میں کھڑے وہ دونوں کس بات پہ بحث کر رہے تھے اور زمر اندر کمرے میں حنین کو کن سوالات کی تیاری کروا رہی تھی۔ وہ زخمی تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکتے ہوئے سوچ رہی تھیں۔ یہ اولاد کیا سمجھتی ہے؟ ماں کچن میں مصروف ہے اور باپ دفتر میں تو ان کو کچھ پتا نہیں چلتا؟ اس اولاد کو کون سمجھائے کہ ماں باپ کو ان کی رگ رگ کی خبر ہوتی ہے۔ یہ رات کو کمبل میں موبائل جلا کے کیا کر رہے ہیں یا باتھ روم موبائل ساتھ کیوں لے جا رہے ہیں' کس کتاب میں رکھ کے کون سا رسالہ پڑھتے ہیں' سب طرف نظر ہوتی ہے ماں کی۔ بس جب نظر آ رہا ہو کہ بچہ بگڑ رہا ہے تو بروقت کی روک ٹوک سے معاملہ خراب کرنے کے بجائے اسے مزید توجہ اور پیار دینے کی کوشش کرتے ہیں میرے جیسے والدین۔۔۔ اور اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ان کو لوٹا لائے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ماں کو کبھی نہیں پتا چلے گا کہ کیا کیا گل کھلائے ہیں انہوں نے۔ بے غیرت نہ ہوں تو۔" وہ ساتھ ساتھ چیزیں اٹھا پٹخ بھی کر رہی تھیں۔

"پھر میں سماعت پہ نہیں آؤں گا۔" وہ خفا اور برہم سا کہہ رہا تھا۔ فارس نے مزید کوفت سے اسے دیکھا۔

"مطلب اپنی بہن کو اکیلا کر دو گے؟ اس سے ہاشم کو کیا پیغام ملے گا ہاں۔۔۔؟" سعدی خاموش ہو گیا' مگر ابرو ہنوز بھینچے ہوئے تھے۔

اوپر حنین کے کمرے میں آؤ تو وہ بیڈ پہ سر جھکائے اکڑوں بیٹھی تھی۔ ہاتھ باہم پھنسائے' وہ لب کاٹے جا رہی تھی۔ سامنے کرسی پہ بیٹھی زمر نوٹ پیڈ ہاتھ میں لیے غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ کھنکھاری۔۔۔

"ایک دفعہ پھر سے شروع کرتے ہیں۔ لیکن تم نے اب نہیں رونا۔ اگر فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اس سب کا سامنا کرو۔" حنین نے جھکے چہرے کے ساتھ گیلی آنکھیں رگڑ لیں۔

"مجھے اندازہ ہے کہ ہاشم کی اپروچ کیا ہو گی۔ دیکھو تم میری گواہ ہو' جب حلف لو گی تو میں پہلے سوال کروں گی۔ (اسے ایگزامینیشن ان چیف کہتے ہیں۔) پھر وہ آئے گا اور تم سے جرح کرے گا۔ (جرح کو کراس کرنا کہتے ہیں۔) اور ضروری نہیں کہ ان سوالوں کا تعلق میرے سوالوں سے ہو۔ وہ تمہارا کردار مسخ کرنے کی کوشش کرے گا۔" (حنین نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔) تمہاری کریڈیبلٹی کو ٹھیس پہنچائے گا' تم نے جواب میں صرف سچ بولنا ہے۔ عزت صرف سچ دلایا کرتا ہے۔ محتاط سچ' پھر میں دوبارہ تمہیں re-exmanie کر سکتی ہوں' لیکن اب میں صرف ان باتوں کی وضاحت کے لیے سوال کر سکتی ہوں جو اس نے پوچھی تھیں۔ نئی بات ایڈ کر نہیں سکتی۔ پھر وہ دوبارہ میری بات کا تاثر زائل کرنے کے لیے کوئی بھی سوال پوچھ سکتا ہے۔ (اسے ری کراس کہتے ہیں۔" حنین کچھ نہیں بولی' چہرہ جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

"میں تم سے سوال پوچھ چکی ہوں۔ تم جو جانتی تھیں کاردارز کے بارے میں' سب بتا چکی ہو۔ اب سمجھو کہ میں ہاشم کاردار ہوں اور میں یہاں تمہیں کراس کرنے لگی ہوں۔ اوکے!"

حنین نے اثبات میں سر ہلایا۔ نظریں اب بھی جھکی تھیں۔

"حنین یوسف خان۔۔۔" زمر نوٹ پیڈ کو دیکھ کر بولی۔ "ملزم نوشیرواں کاردار کو آپ کتنے عرصے سے جانتی ہیں؟"

"تقریباً" آٹھ سال سے۔۔۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"اور یقیناً" آپ مجھے بھی جانتی ہوں گی؟" حنہ نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ ایک دم لگا وہ کٹہرے میں کھڑی ہے اور سامنے قیمتی سوٹ میں ملبوس' تیز پرفیوم کی خوشبو سے مہکتا ہوا' وہ کھڑا ہے اور مسکرا کے اسے دیکھ رہا ہے۔

"جی!" اس کی آواز پست تھی' سو ل کانپا تھا۔

"ابھی آپ نے کہا کہ آپ کئی ماہ سے میرے خاندان کی اصلیت سے واقف تھیں' لیکن کیا آپ نے میرے منہ پہ مجھ سے کبھی ایسی بات کہی؟"

"نہیں!" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "مجھے دیر سے پتا چلا تھا۔"

"کتنی دیر سے؟ اور کیا یہ درست نہیں ہے کہ کئی ماہ آپ مجھ سے واٹس ایپ پہ رابطے میں رہی تھیں' دن میں کئی دفعہ میسج کرتی تھیں؟"

"یہ درست ہے' مگر مجھے اس وقت آپ کی اصلیت پتا نہیں تھی۔"

"اور وہ باتیں آپ اپنی فیملی سے چھپ کے کرتی تھیں۔ کیا معلوم ہو کہ یہ آپ کی فیملی اس بات کو پسند کرتی؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

"اور جیسا کہ آپ نے in chief Examination کے دوران کہا۔ ایک جمعے کی دوپہر بریانی کھاتے ہوئے آپ کے گھر میں' میں نے وہاں بیٹھ کے آپ لوگوں سے معافی مانگی تھی۔"

"جی۔۔۔ آپ نے ایسا ہی کیا تھا۔"

"حنین' کیا یہ درست ہے کہ آپ ایک بہت اچھی ہیکر ہیں؟"

"جی!" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے

گرنے لگے۔ سارے منظر دھندلا رہے تھے۔

"اور کیا آپ کے فیملی اینڈ فرینڈز آپ سے فیورز مانگتے رہتے ہیں؟"

"میں ناجائز کام نہیں کرتی۔"

"چلیں۔۔۔ اپنے دوستوں کو کسی کرائسز سے نکالنے کے لیے اپنی ہیکنگ Skills (مہارت) تو آزمائی ہوں گی آپ نے؟"

"جی!" وہ بولی تو زمر کی آواز پس منظر میں سنائی دی۔

"حمر نے بتایا ہے کہ وہ جانتا ہے او سی پی صاحب کے بارے میں سب کچھ۔ اب وہ لیڈنگ سوال پوچھے گا۔" پھر جیسے اسے ہاشم کی آواز سنائی دینے لگی۔ ہر سو دھند تھی اور وہ خود کو کٹہرے میں کھڑا محسوس کر رہی تھی۔

"کیا کبھی کسی بارسوخ عہدے پہ موجود آدمی نے آپ کی خدمات کے لیے آپ سے رابطہ کیا؟"

"جی۔۔۔" اس کی آواز کپکپائی۔

"اور کیا مدد مانگی تھی انہوں نے آپ سے؟ اب یہاں حنہ! میں اعتراض کروں گی کہ وہ موضوع سے ہٹ رہا ہے، مگر جج میرا اعتراض رد کر دیں گے۔ پھر تم جواب دو گی۔"

"ان کی بیٹی کی عزت خطرے میں تھی، وہ اس کو بچانا چاہتے تھے۔"

"اور یہ کام کرنے کے لیے آپ نے بدلے میں کوئی فیور مانگا تھا ان سے؟"

"جی۔۔۔ مانگا تھا۔"

"آپ ان صاحب کا نام اور اس کام اور فیور کی تفصیل کورٹ کو بتائیں گی، تاکہ کورٹ کو معلوم ہو سکے کہ آپ کس کردار کی حامل ہیں۔"

"وہ مر چکے ہیں، میں ان کا نام نہیں لے سکتی۔" اس نے ہچکی لی۔

زمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "ایسے نہیں حنہ! تمہیں جواب دینا ہو گا، لیکن احتیاط سے۔۔۔" پھر وہ ٹھہری۔

"آپ ہاشم کاردار نہیں ہیں۔" وہ ایک دم گیلا چہرہ اٹھا کر بولی تو زمر نے دیکھا اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "اس لیے آپ یہاں سے جائیں۔"

"حنہ۔۔۔ پھر گواہی کی تیاری کیسے کرو گی؟ تمہاری وکیل ہونے کی حیثیت سے۔"

"آپ میری وکیل نہیں ہیں۔ آپ سعدی یوسف کی وکیل ہیں۔ میں اپنی وکیل خود ہوں۔ میں اپنا مسیحا خود ہوں۔ یہ میری غلطی تھی۔ میں اسے خود فکس کروں گی۔ پلیز آپ جائیں۔"

زمر گہری سانس لے کر اٹھ گئی۔ باہر آئی تو فارس سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑا تھا۔

"ہمیں اسے دبئی بھیج دینا چاہیے۔" وہ اسے دیکھ کے ناخوشی سے بولا تھا۔ سعدی کو جو کہنا سو کہا، مگر وہ خود بھی خوش نہیں تھا۔

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ آزردگی سے سر ہلا کے رہ گئی۔ پھر چونک کے اسے دیکھا۔

"وہ ڈنر۔۔۔" "ابھی یاد آیا۔"

"ویک اینڈ پہ۔" وہ تکان سے مسکرایا۔ "مگر بل آپ دیں گی۔"

"ہاں ہاں، ٹھیک ہے۔" وہ خفگی سے آگے بڑھ گئی۔

ہاتھوں کا ربط حرفِ خفی سے عجیب ہے
ہلتے ہیں ہاتھ راز کی باتوں کے ساتھ ساتھ

وہ رات قصر کاردار پہ پہلے سے زیادہ ویران اور بوجھل سی اتر رہی تھی۔ لاؤنج میں ٹی وی چلنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ ایسے میں جواہرات بڑے صوفے پہ بیٹھی تھی۔ وہ پہلے سے بہت بہتر اور سنبھلی ہوئی لگ رہی تھی۔ دوا کا اثر تھا۔ موڈ بھی ٹھیک تھا۔ ساتھ سونیا پیر اوپر کر کے بیٹھی ٹیبلیٹ گھٹنوں پہ رکھے گیم کھیل رہی تھی۔

"ممی!" دفعتاً اس نے سر اٹھا کے جواہرات کو مخاطب کیا۔ وہ چونکی، پھر مسکرا کے اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ "ہوں" اور نرمی سے اس کے بالوں میں

انگلیاں پھیرنے لگی۔

"بابا! اب اتنے بزی کیوں ہوتے ہیں؟"

"بابا کے کچھ پرابلمز ہیں نا۔ اس لیے۔" وہ پیار سے بولی تھی۔ سونی چونکی۔ آنکھیں اٹھا کے اسے تعجب سے دیکھا۔ بالکل ہاشم کی آنکھوں جیسی تھیں وہ۔ چمکدار اور ذہین۔

"بابا کے کیا پرابلمز ہیں؟"

"کچھ برے لوگ ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔ فارس غازی جیسے۔"

"فارس انکل؟" سونی نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "وہ برے نہیں ہیں۔"

"بہت بہت برے ہو گئے ہیں اب چندا۔ وہ چاہتے ہیں کہ مجھے، تمہیں، تمہارے بابا، شیرو سب کو مار دیں۔ ہمیں جیل میں ڈال دیں۔ وہ ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔ انہوں نے ہمارے پلانٹ میں آگ لگوائی، شیرو کو اتنے دن جیل میں قید رکھا، وہ بہت خطرناک ہیں۔"

سونیا حیرت اور تعجب سے اس کو دیکھے گئی۔

"تو بس تمہیں ہمیشہ یہ یاد رکھنا ہے کہ تمہارے بابا سب سے اچھے ہیں اور ان کے دشمن بہت برے۔ کبھی بھی اپنے بابا، مجھے، شیرو کو doubt (شک) نہیں کرنا اور اگر کبھی فارس سے ملاقات ہو تو ان سے بات تک نہیں کرنی۔ وہ گندے لوگ ہیں۔ دہشت گرد اور قاتل، آئی سمجھ۔"

سونی نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کا ننھا دماغ ان باتوں کو ہضم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ گم صم سی ہو گئی۔

"مس سونیا! کھانا کھا لیں۔" فیونا کی آواز آئی تو سونی اٹھ کے اس کی طرف بھاگ گئی۔ فیونا ٹرالی دھکیلتی ڈائننگ ہال میں جا رہی تھی۔ ایسے میں جواہرات نے دیکھا، سونی کا ٹیب وہیں صوفے پہ رکھا تھا۔ جواہرات نے کشن اٹھایا، اس کی آڑ میں ٹیب بھی۔ (اس سمت سے جہاں سی سی ٹی وی کیمرہ اس کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔) اور اسے لیے اندر کمرے میں آ گئی۔

گویا سونے کے لیے جا رہی ہو۔

دروازہ بند کرتے ہی اس نے ٹیب کھولا اور تیز تیز کیز دبانے لگی۔ ٹیب کی چمکتی اسکرین کی روشنی اس کے چہرے پہ پڑ رہی تھی اور وہ نیلاہٹ بھری سفیدی سے روشن لگ رہا تھا۔ ایسا نیلا سفید جو زہر سے بھرے وجود کا ہوتا ہے۔

☆ ☆ ☆

پھرتے ہیں مثل موج ہوا شہر میں
آوارگی کی لہر ہے اور ہم ہیں دوستو

اس صبح یوں لگتا تھا پورا شہر سینے سے چپ چپ ہو رہا ہو۔ ایسے میں جیل کے ملاقاتی ہال میں شدید گھٹن اور حبس محسوس ہوتا تھا۔ بوتھز کے دونوں اطراف میں انسانوں کی قطاریں تھیں۔ قیدی باری باری اپنے عزیز و اقارب سے ملاقات کر رہے تھے۔

چار سال تک وہ سوراخوں والی اسکرین سے مزین بوتھ کے دوسری طرف ہوتا تھا۔ آج وہ اس طرف بیٹھا تھا اور نگاہیں سامنے بیٹھے نیاز بیگ پہ جمی تھیں۔ قیدیوں کا لباس پہنے، بڑی مونچھوں والا، تیوریاں چڑھائے نیاز بیگ ناخوش لگتا تھا۔

"تمہاری بی بی چکر لگا گئی ہے۔ میرا بیان نہیں بدلے گا۔ میں نے ماری تھیں سعدی یوسف کو گولیاں۔"

"شاید تم مجھے جانتے نہیں ہو۔" وہ ٹھنڈے سے انداز میں بولا، مگر دوسری طرف کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔

نیاز تلخی سے مسکرایا تھا۔ "جانتا ہوں صاب۔ بہت قصے سنے ہیں تمہارے اس جیل میں۔" اور ناک سے مکھی اڑائی۔

فارس نے غور سے اسے دیکھتے، لہجے کو دھیما کیا۔ "دیکھو، تم دو کیسز میں نامزد ہو۔ شہزا ملک اغوا کیس میں تم بے قصور ہو اور اگر میں چاہوں تو شہزا کو منا سکتا ہوں، وہ تمہارا نام واپس لے لے گی۔ سعدی یوسف اغوا کیس میں تم اغوا کے مجرم ہو، اقدام قتل کے نہیں،

لیکن ہم تمہارا نام خارج کردیں گے اور تم آزاد ہو جاؤ گے اگر...." اس نے وقفہ دیا۔ نیاز بیگ غور سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا۔

"اگر تم عدالت میں سچ بول دو۔"

"میں نے سعدی یوسف کو گولی ماری تھی، یہی سچ ہے۔"

"نیاز بیگ...." فارس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "کتنے پیسے دینے کا کہا ہے ہاشم کاردار نے؟ وہ میرا کزن ہے۔ خون ہے میرا۔ میں اسے جانتا ہوں۔ ادھر تم نے گواہی دی، ادھر تم اس کے لیے خطرہ بن جاؤ گے۔ وہ تمہیں جیل میں ہی ختم کروا دے گا۔"

نیاز بیگ کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کے ابھری، مگر وہ ان ہی سخت تاثرات کے ساتھ اسے دیکھتا رہا۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ تم نے یہ نہیں کیا۔" اس نے میز پہ رکھے پرنٹ آؤٹس اٹھائے اور شیشے کی اسکرین کے سامنے کیے۔ پہلے میں سعدی یوسف کا خون میں لت پت وجود پڑا تھا۔ "یہ تم نے نہیں کیا۔ اتنے پیارے نوجوان کو تم نے نہیں مارا۔ وہ بھی چند ڈالرز کے پیچھے۔ یا اس کے اس سیل فون کے پیچھے جسے تمہارے بیان کے مطابق تم نے بیچ دیا تھا۔" اس نے دوسرا کاغذ سامنے کیا۔ نیاز بیگ خاموشی سے شیشے کے پار لہراتے کاغذ دیکھنے لگا۔

"کوئی کیسے یقین کرے گا کہ تم ایک لڑکے کو اتنی بری طرح پیٹ سکتے ہو، اس کو اتنی گولیاں مار سکتے ہو، وہ بھی صرف اس سام سانگ گلیکسی ایس 6 کے لیے؟ کتنے کا بک گیا ہو گا یہ فون؟ عدالت کو کیا اس فون کی قیمت نہیں معلوم ہو گی؟" کاغذ پہ اب سیاہ رنگ کا موبائل نظر آرہا تھا۔ اس نے کاغذ نیچے رکھے اور ترحم سے اسے دیکھا۔ "تمہارا بیان کمزور ہے، کوئی یقین نہیں کرے گا اور وقت پڑنے پہ ہاشم کاردار تم سے چھٹکارا حاصل کرلے گا۔ اس لیے اس کی باتوں میں مت آؤ۔ عدالت میں کم از کم اتنا کہہ دو کہ تم نے سعدی کو گولیاں نہیں ماری تھیں۔"

"اور بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔ فارس کے چہرے پہ بالآخر مسکراہٹ ابھر آئی۔

"پیسے چاہئیں تمہیں؟ میں دوں گا اور تمہاری حفاظت بھی کروں گا۔ کیا سمجھے؟" نیاز بیگ نے اثبات میں سر ہلایا۔ فارس نے اب ایک اور کاغذ سامنے کیا۔ "تمہاری بیرک کا سپاہی تمہیں یہ کاغذات دے دے گا۔ یہ چند فقرے یاد کرلینا۔ یہ بولو گے تم عدالت میں...."

"تم واقعی مجھے پیسے دو گے؟" وہ اب مشکوک لگتا تھا۔

"آزما کے دیکھ لو۔" نیاز بیگ نے اب کے محض سر ہلانے پہ اکتفا کیا۔ وہ گہری سوچ میں گم تھا۔

فارس وہاں سے باہر آیا تو جیل کی حدود سے نکل کر اس نے زمر کو فون ملایا۔

"کام ہو گیا ہے۔ نیاز بیگ مسئلہ نہیں کرے گا۔ اس کی جرح ہمارے حق میں جائے گی۔"

"پکی بات ہے نا؟" وہ مشکوک تھی۔ "وہاں جا کر وہ تمہاری ہر بات بھول گیا تو؟"

"نہیں، میں تو بے کار آدمی ہوں، مجھے تو کچھ کرنا آتا ہی نہیں ہے، جاب لیس، نکما ہوں میں...."

"ساتھ میں دو نمبر بھی ہو۔" اور وہ ڈھیرے سے ہنس دیا تھا۔

اور ادھر اس کے جاتے ہی نیاز بیگ واپس آکر ایک بڑے کمرے میں آیا جہاں موبائل جیمرز اثر نہیں کرتے تھے۔ وہاں لیٹے لیٹے آدمی سے اس نے موبائل مانگا اور پھر کونے میں جا کر کال ملائی۔ فون کان سے لگاتے ہی وہ بولا تھا۔ "کاردار صاحب۔ نیاز بیگ بول رہا ہوں۔"

"اتنی صبح فون کرنے کا مطلب ہے فارس غازی آیا تھا تمہارے پاس؟" ہاشم اپنے آفس میں بیٹھا چند فائلز دیکھ رہا تھا، انداز میں اطمینان تھا۔

"جی.... ابھی ابھی گیا ہے۔"

"کیا کہا اس نے؟ وہی جو میں نے کہا تھا؟ کہ ہاشم کاردار تمہیں مروا دے گا، میں تمہیں زیادہ پیسے دوں گا وغیرہ وغیرہ۔" وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا تھا۔

"ایک ایک حرف وہی کہا اس نے۔" وہ آگے سے ہنسا تھا۔

"گڈ... تم نے کیا کہا؟"

"وہی جو آپ نے کہا تھا۔ اسے سوچنے کا تاثر دیا ہے مگر اسے یقین ہے کہ میں مان گیا ہوں۔"

"ویری گڈ... اب وہ عدالت میں جرح کی تیاری غلط رخ سے کریں گے۔ تم اپنی تیاری پوری رکھو۔"

"جو حکم صاب۔ ہم تو آپ کے حکم کے غلام ہیں۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔" نخوت سے کہہ کر ہاشم نے فون میز پہ ڈال دیا۔ پھر تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹکا۔ "میں شہر بھر کے گواہوں کو خرید سکتا ہوں' جانتا نہیں ہے یہ کیا؟" منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہ کاغذ الٹ پلٹ کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جی میں آئے جو کر گزرتا ہے
تو کسی کا کہا نہیں کرتا

مورچال کے لاؤنج میں چھٹی والے دن کی رونق تھی۔ زمر' فارس اور سعدی مخالف صوفوں پہ بیٹھے تھے اور تینوں اپنے اپنے فونز پہ مصروف تھے۔ نیچے کشن پہ سیم لیٹا تھا اور وہ بھی ٹیب پہ کچھ کھیل رہا تھا۔ ایک کونے میں ڈسٹنگ کرتی حسینہ کام چھوڑ کے اپنا فون دیکھ رہی تھی۔ ایسے میں وہیل چیئر پہ بیٹھے بڑے ابا خاموشی سے باری باری سب کے جھکے چہرے تک رہے تھے۔

"کیا ہم یہ طے نہیں کر سکتے کہ جب سارے گھر والے ساتھ بیٹھے ہوں تو کوئی اپنے موبائل کو نہیں دیکھے گا؟ (سب کے موبائل ایک ساتھ نیچے ہوئے) اور اسامہ۔ کیا تمہیں ایسے گیمز کھیلنے کا شوق نہیں ہے جو تمہیں باہر جا کے کھیلنے ہوں۔ چل پھر کے۔ بھاگ دوڑ کے۔" ابا نے اسے پکارا تو سیم اسکرین پہ نگاہیں جمائے خوشی سے بولا تھا۔

"ہے نا بڑے ابا۔ لیکن پتا نہیں Pokemon Go پاکستان میں کب آئے گی۔" (اس نے اس موبائل گیم کا نام لیا جس کو کھیلنے کے لیے موبائل ہاتھ میں لے کر چلنا پھرنا پڑتا ہے۔)

"ابا صحیح کہہ رہے ہیں۔" زمر اپنا فون رکھتے ہوئے بولی تھی۔ "جب ساری فیملی ساتھ بیٹھی ہو تو کوئی موبائل استعمال نہیں کرے گا اور حسینہ آپ کی ڈسٹنگ نہیں ہوئی۔" ساتھ ہی خفگی سے اس کو بھی لتاڑا۔ وہ جلدی سے فون رکھ کے ہڑبڑا کے کام کرنے لگی۔

فارس جو اپنا موبائل جیب میں رکھ ہی رہا تھا' ایک دم چونک کے حسینہ کو دیکھنے لگا جس نے ابھی ابھی ایک چمکتا ہوا اسمارٹ فون سائیڈ ٹیبل پہ دھرا تھا۔ پھر اس نے سعدی کو دیکھا۔ وہ فون رکھ کے بڑے ابا سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ فارس نے پھر سے حسینہ کے فون کو دیکھا۔

"حسینہ۔ یہ نیا ہے؟ کافی مہنگا لگتا ہے۔ کس نے لے کر دیا؟ ابا نے؟" وہ بلند آواز میں بولا تھا۔ سعدی بھی چونک کے اس طرف دیکھنے لگا۔ حسینہ نے ایک دم سب کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔

"نہیں فارس بھائی! صداقت نے لے کر دیا ہے۔"

"ماشاء اللہ صداقت لگتا ہے' پیسے جوڑ جوڑ کے رکھنے لگ گیا ہے۔" وہ ماہ پہلے تک تو نیا جوتا خریدنے سے پہلے بھی سو بار سوچتا تھا۔" اس نے چبھتی نظروں سے حسینہ کو دیکھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"نہیں جی۔ کمیٹی ڈالی تھی ہم نے۔ ابھی قسطیں دینی ہیں۔" وہ سر جھکا کر کام کرنے لگی۔ فارس "ہوں" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"حمر کی باتوں پہ نہ جائیں ماموں۔ ہمارے ملازم ایسے نہیں ہیں۔" وہ انگریزی میں تنبیہہ کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے پتا ہے' میں تو بس یوں ہی۔" اس نے سر جھٹکا۔ زمر اور بڑے ابا بھی نا دہی نظروں سے اسے دیکھنے لگ گئے تھے۔

"اس نے واقعی کمیٹی ڈالی ہے اور مجھے پتا ہے کہ کہاں ڈالی ہے۔" زمر نے اسے گھور کے دبی آواز میں کہا تھا۔ بڑے ابا کو بھی برا لگا تھا شاید اور حسینہ کو بھی احساس ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم دکھی نظر آنے لگی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" فارس نے جان چھڑانی چاہی۔

"ہم صداقت کو عرصہ دراز سے جانتے ہیں' فارس۔ وہ بہت ایمان دار اور شریف لڑکا ہے۔" ابا نے سمجھاؤ سے اس کو گویا سمجھایا یا شاید بہت کچھ واضح کیا۔

"جی۔۔۔ مگر۔۔۔" وہ گہری سانس لے کر اٹھا۔ "ہم اس کی بیوی کو تو عرصہ دراز سے نہیں جانتے۔ خیر میں بس ایک بات کر رہا تھا۔" انگریزی میں کہہ کر معذرت کرتا وہ باہر کی طرف بڑھ گیا۔ فارس سے کون بحث کرتا' لیکن حسینہ کے لیے بھی سب کو برا محسوس ہو رہا تھا۔ بے چاری بے گناہ غریب لڑکی پہ وہ شک کرنے لگا تھا۔ یونہی خواہ مخواہ میں۔ اسے ایسے نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ زمر' ابا اور سعدی سب یہی سوچ رہے تھے۔

اوپری منزل پہ آؤ تو حنین اپنے کمرے کے بند دروازے کے اندر' آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ پژمردہ چہرہ' حلقوں والی آنکھیں لیے وہ اپنے عکس کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے گردن اکڑا کر کہنے کی کوشش کی۔

"یور آنر' یہ مجھ پہ الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے ان سے کبھی موبائل پہ باتیں نہیں کیں۔" آواز کپکپاتی ہوئی اور لہجہ کمزور تھا' مگر اس نے پھر سے کہنے کی کوشش کی۔

"جی نہیں۔۔۔ میں کسی او سی پی کو نہیں جانتی۔ جی نہیں' میرے پاس کبھی فرینڈز اینڈ فیملی فیورز لینے نہیں آتے۔ آپ بے بنیاد الزام لگا رہے ہیں۔ میں آپ پہ کیس کر سکتی ہوں۔" آواز پھر سے کانپی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ پھر آنکھیں رگڑیں اور اپنا موبائل اور پرس اٹھا کے کمرے سے باہر نکلی۔

اسے سیم کے ساتھ وال پیپر لینے بلیو ایریا جانا تھا۔ حنین اور سیم کو صداقت ڈرائیو کر کے ابھی کالونی کے اختتام تک ہی لایا تھا جب ایک لمبی چمکتی ہوئی کار سامنے سے آتی دکھائی دی۔ جب دونوں گاڑیوں نے ایک دوسرے کو پاس کیا تو حنین نے دیکھا' پچھلی سیٹ پہ آب دار عبید بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ (کار کے شیشے سیاہ تھے' مگر اس نے شیشہ گرا رکھا تھا' اس لیے دکھائی دیتی تھی۔) زندگی میں پہلی بار حنین جان گئی تھی کہ جواہرات جوانی میں کیسی ہوتی ہوگی۔

وہ برآمدے میں کرسی پہ ٹیک لگائے سوچ میں گم بیٹھا تھا جب کھلے گیٹ کے پار وہ آتی دکھائی دی۔ فارس چونک کے سیدھا ہوا۔ وہ بال چہرے کے ایک طرف ڈالے' سر پہ سرخ ریشمی رومال لپیٹے' سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اسے بیٹھا دیکھ کر مسکرائی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سر کو خم دیا۔ آبدار اس کے بالمقابل آ رکی۔ سبز سرمئی آنکھوں سے اس کی سنہری آنکھوں میں دیکھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔ آپ ادھر کیسے؟" آج تیوری نہیں چڑھی تھی۔

"اس دن بات ادھوری رہ گئی تھی میں اپنی پوزیشن کلیئر کرنا چاہتی تھی ذرا۔ اگر آپ مجھے چند منٹ مزید برداشت کر سکیں تو بیٹھ کے بات کر لیں؟" کہتے کے ساتھ اس نے کرسی کھینچی۔ وہ "جی بیٹھیے" کہتا دوسری کرسی کی طرف آیا۔ بار بار غور سے اس کو دیکھتا بھی تھا۔ گویا الجھن کا شکار ہو۔

"میری وجہ سے آپ کو مشکلات پیش آ رہی ہیں' میں جانتی ہوں۔" وہ کرسی پہ ٹیک لگا کے اپنے ازلی شاہانہ انداز میں بیٹھ گئی اور دو انگلیوں سے کان کی بالی چھیڑتے ہوئے' نظروں کے حصار میں اس کا چہرہ مقید کیے گویا ہوئی۔

"میری ہر وقت آپ کی توجہ حاصل کی خواہش سے آپ کی وائف ان سیکیور رہنے لگی ہیں۔ پھر میری اس معصوم خواہش کو غلط رنگ دے کر ابا نے جو کیا' میں اس کے لیے بھی شرمندہ ہوں' اسی لیے وہ ہیرے کی لونگ واپس کرنے آگئی تھی' ہاں مگر تب مجھے لگا تھا کہ

آپ کی وائف آپ کے ساتھ مخلص نہیں ہیں' وہ آپ کو ڈیزرو نہیں کرتیں۔ لیکن میں غلط تھی۔ میں ان کو سمجھی نہیں تھی شاید۔ ایک دوست کی حیثیت سے صرف آپ کو خبردار کرنا چاہتی تھی' مگر ان کے خلاف نہیں کرنا چاہتی تھی اور اب جبکہ مجھے احساس ہو چکا ہے کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں' تو میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ دونوں کے درمیان کسی بھی قسم کی کوئی غلط فہمی در آئے۔ امید ہے میری طرف سے آپ کا دل صاف ہو گیا ہوگا۔"

فارس نے ہلکا سا سر اثبات میں ہلایا۔ "آپ یہ سب پہلے کلیئر کر چکی ہیں۔"

"مجھے آپ سے ایک گلہ بھی کرنا تھا۔" وہ چونک کے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اداس مسکراتی نظریں اس پہ جمائے کہہ رہی تھی۔ "آپ نے مجھے استعمال کیا' سعدی تک پہنچنے تک کے لیے۔ مجھے برا نہیں لگا' مگر اچھا بھی نہیں لگا۔"

"چلیں۔ کولمبو میں' میں نے آپ کو ایڈونچر تو دیا نا۔"

"کون سا ایڈونچر؟ آپ تو فرار ہو گئے تھے' میں تو اکیلی رہ گئی تھی۔ آپ بار بار بھول جاتے ہیں کہ میں اتنے مسائل کا شکار آپ کی وجہ سے ہوں۔" اور پہلی دفعہ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ چہرے پہ افسوس در آیا۔ اس نے سر جھکا دیا۔ پھر گہری سانس لی۔

"آئی ایم سوری۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔"

"مسز کاردار مجھے مسلسل نفرت انگیز پیغامات بھیج رہی ہیں۔" اس نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا جسے فارس نے قدرے بھاری ہوتے دل کے ساتھ تھام لیا۔ وہ عجیب کیفیات کا شکار ہو رہا تھا۔

"آپ نے وہ ویڈیو ہاشم کو دے دی' میرا نہیں سوچا' اب وہ اس کا انتقام مجھ سے لیں گی۔"

"آپ خود ہی تو وہ ثبوت ہمیں دینا چاہتی تھیں' یہ بات آپ کو پہلے سوچنی چاہیے تھی۔" آواز پہ ان دونوں نے چونک کے دیکھا۔ زمر باہر آتے ہوئے ٹھنڈے انداز میں بولی تھی۔ آبدار بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مسز زمر!" مسکرا کے گویا ہوئی۔ "میں آپ سے معذرت کرنے آئی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ آئندہ میری وجہ سے آپ دونوں کے درمیان کوئی غلط فہمی پیدا ہو۔"

زمر نے فارس کے برابر میں کرسی کھینچی اور اس پہ بیٹھی۔

"آپ کو کیوں لگا آپ کی وجہ سے ہمارے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گی؟ ہم آؤٹ سائیڈر کی وجہ سے آپس میں جھگڑا نہیں کرتے۔"

فارس نے کچھ نہیں کہا' وہ موبائل پہ میسجز دیکھ رہا تھا۔

آبدار کے چہرے پہ افسوس اتر آیا۔ "لگتا ہے آپ ابھی بھی خفا ہیں۔ مگر چلیں' میں خوش ہوں کہ فارس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ اور ہاں۔ یہ میں آپ کے لیے لائی تھی۔" اس نے پرس کے ساتھ پکڑا ننھا سا باکس میز پہ رکھا۔

فارس نے خاموشی سے فون اسے واپس کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے باکس کو دیکھا۔

"یہ ایک چھوٹا سا تحفہ ہے۔ پرفیوم۔ مجھے اچھا لگا' میں نے لے لیا۔"

"سوری' میں یہ تحفہ نہیں لے سکتا۔" وہ شائستگی سے معذرت کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔ (زمر نے بڑھ کے اس تحفے کو دیکھا تھا۔)

"مجھ سے میرے پلین میں رائیڈ لے سکتے ہیں' میری انجیو کے خلاف ٹپ لے سکتے ہیں' مسز کاردار کی ویڈیو لے سکتے ہیں' میرا اپارٹمنٹ لے سکتے ہیں' مگر تحفہ نہیں لے سکتے؟" وہ مسکرا کے بولی تھی۔ "اگر آپ نہیں لیں گے تو مجھے لگے گا کہ آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔"

"اوکے!" اس نے سر کو خم دیا۔ زمر نے چونک کے بے یقینی سے اسے دیکھا' مگر وہ اس کی طرف متوجہ

نہیں تھا۔ وہ اب اس کو سی آف کرنے اس کے ساتھ گیٹ کی طرف جارہا تھا۔ "مگر آئندہ آپ کوئی چیز نہیں لائیں گی یوں۔ اور مسز کاردار کو جواب نہ دیں۔ بس اگنور کریں۔ چند گارڈز مزید رکھ لیں۔ تنہا گھر سے نہ نکلیں۔"

وہ ہدایات دے رہا تھا' انداز میں فکر مندی تھی۔ گیٹ تک وہ اس کے ساتھ گیا پھر وہ چلی گئی تو فارس واپس گیا۔ ابھی تک سوچ میں گم تھا۔ جیسے افسردہ ہو۔

"تم اس کا تحفہ کیسے لے سکتے ہو؟ تم جانتے نہیں ہو اس کو؟" وہ برہمی سے کہہ رہی تھی۔ پہلی دفعہ وہ بے زار سا ہوا۔

"زمر' وہ اچھی لڑکی ہے' معافی مانگ رہی تھی' رویہ بدل لیا ہے اس نے اپنا۔ پھر تم اس سے اس طرح بات کیوں کر رہی تھیں؟"

"رویہ نہیں بدلا اس نے۔ تیکنیک بدلی ہے۔ تمہیں نظر کیوں نہیں آرہا؟"

"اچھا تو تیکنیک بدل کے وہ کیا کرلے گی؟ وہ تمہارا اتنا نقصان نہیں کر سکتی' جتنا میں اس کا کرچکا ہوں۔" تلخی سے کہتا وہ وہیں بیٹھ گیا۔

"اس نے کوئی احسان نہیں کیا ہم پہ ہماری مدد کر کے۔ یہ سب اس کے باپ اور اس کے ہاشم کاردار کا کیا دھرا ہے۔ اس کو تو اپنے خاندان والوں کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اس سے بھی زیادہ کرنا چاہیے تھا۔ سارے نقصان ہمارے ہوئے ہیں۔ مجھے تو تم پہ حیرت ہو رہی ہے' تم......"

"اگر تمہیں یہی باتیں کرنی ہیں تو میں جارہا ہوں۔" اکتاہٹ سے کہتے اس نے جیب سے چابی نکالی اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"تم اس کی وجہ سے مجھ سے لڑ رہے ہو؟" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا گلا رندھ گیا۔ وہ تیورا کے پلٹا۔

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت اس کو اپنا کمپیٹیٹر سمجھنے کے بجائے اسے ایک انسان سمجھو جس نے ہماری مدد کی ہے' اور جس کو میں نے کئی مشکلات میں ڈال دیا ہے۔ اور اب مجھے ہی اس کو سب سے نکالنا ہوگا۔ کھانے پہ میرا انتظار مت کرنا۔ میں دیر سے آؤں گا۔" تلخی سے کہتا وہ مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ زمر یاسیت اور خفگی کے ملے جلے تاثر کے ساتھ اسے دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

اتنی جلدی تو بدلتے نہیں ہوں گے چہرے
گرد آلود ہیں آئینے انہیں دھویا جائے

شاپ میں کھڑی حنین بے دھیانی سے وال پیپرز دیکھ رہی تھی۔ سیم قریب میں کمپیوٹر شاپ کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کو اپنا ٹیب ٹھیک کروانا تھا۔ (اسی لیے وہ بنا چوں چراں حنین کے ساتھ آگیا تھا۔) صداقت باہر کار میں انتظار کر رہا تھا۔

حنین کی توجہ' وال پیپر کے بجائے اندر کے گہرے منجدھار میں گول چکر کھا رہی تھی۔ بار بار وہ سر جھٹکتی تھی مگر سوچیں۔۔۔ اف۔ ہاشم کاردار کی متوقع جرح کی آواز اس کے کانوں میں بار بار گونج رہی تھی۔ وہ جتنا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتی' اتنا وہ سر پہ سوار ہونے لگتا' یہاں تک کہ وہ اس کی خوشبو تک محسوس کرنے لگی تھی۔ کرنٹ کھا کے حنین مڑی تو گویا اگلا سانس لینا ہی بھول گئی۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ہاشم کاردار۔ مسکراتا ہوا' بااختیار سا' مہنگی پرفیوم کی خوشبو میں بسا۔

وہ واقعی اس کے سامنے تھا۔ حنین کے ہاتھ سے وال پیپر چھوٹ کر نیچے جا گرا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھے گئی۔

"کیسی ہو؟" اس کا انداز اتنا نرم' اتنا مسحور کن تھا کہ وہ بنا پلک جھپکے' اس پہ نظریں جمائے کھڑی رہی۔ لب آدھے کھلے تھے۔ جسم برف ہو رہا تھا۔

"تمہارے سیل فون سے ٹریس کیا تمہیں' اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا جہاں تمہارے خاندان کے وہ سیلفش (خود غرض) لوگ آس پاس نہ ہوں۔ پتا ہے وہ سیلفش کیوں ہیں' پیاری لڑکی؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کے پوچھ رہا تھا۔

وہ سن نہیں رہی تھی' بس اسے دیکھ رہی تھی۔

"پیاری لڑکی" کی صدائیں بار بار دیوار سے ٹکرانے لگی تھیں۔ پیاری لڑکی۔ پیاری لڑکی۔۔۔۔۔

"ان کو صرف اپنی فکر ہے۔ زمر اور فارس کو اپنا رشتہ قائم رکھنے کی فکر ہے۔ سعدی کو کیس جیتنے کی پڑی ہے تاکہ وہ سچا ثابت ہو' وہ آگے بڑھ سکے۔ ایسے میں کسی کو بھی تمہاری فکر نہیں ہے۔ حنین کٹہرے میں کھڑی ہو' ایک دنیا اس کی باتیں سنے' اس کی باتیں لکھے۔ وہ اخباروں کی سرخیوں کی زینت بنے۔ اس کا کردار تار تار ہو جائے' یہ سب باتیں ان کو ثانوی لگتی ہیں۔ ان کا انتقام پورا ہو جائے' باقی سب خیر ہے۔"

وہ موم کا مجسمہ بنی اس کو دیکھے گئی۔ ٹھنڈے پسینے سے اس کا وجود گویا موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

"کسی کو تمہاری فکر نہیں حنین۔" وہ ہمدردی سے کہہ رہا تھا۔ "میں تمہیں کبھی سمن نہ بھیجتا۔ زمر غلط کہتی ہے کہ میں تمہیں سمن بھیجتا۔ میں بچوں سے مقابلہ نہیں کرتا۔ بچوں کو درمیان میں نہیں لاتا۔ میری بھی ایک بیٹی ہے۔ میں جرح بھی نہیں کرنا چاہتا تم پر۔ مگر زمر اور سعدی تمہیں درمیان میں لاتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں صلیب پہ چڑھایا ہے؟ تم اپنا سوچو حنین۔ میرا نہیں' کسی کا بھی نہیں۔

اپنا فیملی بیک گراؤنڈ دیکھو۔ شادی کیسے کرو گی؟ سر اٹھا کے کیسے جیو گی؟ لوگ میرے اور تمہارے افیئر کی باتیں زمانوں تک کریں گے' یہ سب جرح میں کہنا پڑے گا اور یقین کرو میں نہیں کرنا چاہتا یہ سب' میں تو آگے بڑھنا چاہتا تھا' لیکن سعدی نے مجھے اس مقام پہ لا کھڑا کیا ہے۔ اب تم میری مدد کرو۔" وہ سُن تھی۔ مجسمہ تھی۔ موم کی طرح پگھل رہی تھی اور وہ آگ کے شعلے کی طرح اس کے گرد ہالہ بنائے ہوئے تھا۔

"تم کورٹ میں کہو کہ تمہیں کچھ یاد نہیں۔ جو پولیس کو تم نے حلیمہ سے متعلق بیان دیا ہے نا' اس کو واپس لے لو پیاری لڑکی۔ تم اتنی ارزاں نہیں ہو کہ تمہیں کورٹ میں کوئی استعمال کرے۔ تم میرے خلاف کوئی بات مت کہو' میں جرح نہیں کروں گا۔ کوئی تمہارے کردار کے بارے میں بات بھی نہیں کرسکے گا۔ تمہیں صرف اتنا کہنا ہے کہ سعدی جھوٹ بول رہا ہے اور تمہاری رائے میں شیرو ایسا نہیں کرسکتا۔ یوں تم محفوظ رہو گی' کیونکہ یہ عزت ایک دفعہ چلی گئی نا حنین تو واپس نہیں آئے گی۔"

ایک آنسو حنین کی آنکھ سے ٹوٹا اور گال پہ لڑھکا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میری بات سمجھ میں آرہی ہے نا؟"

"جی!" اس نے خود کو کہتے سنا۔ "یہ عزت ایک دفعہ چلی گئی تو واپس نہیں آئے گی۔" وہ کسی روبوٹ کی طرح بولی تھی۔

"گڈ۔ تم جب کٹہرے میں کھڑی ہو تو مجھے فیور دینا۔ میں تمہیں دوں گا۔ اور اپنے خود غرض خاندان سے ڈرنا نہیں۔ ان کو شرمندہ ہونا چاہیے' تمہیں نہیں۔ کیونکہ اگر میں نے او سی پی صاحب والی باتیں جرح کے دوران کہہ دیں' اور یقین مانو میں نہیں کہنا چاہتا' تو تمہارے خلاف انکوائری ہوگی۔ تم نے ابھی بی اے کیا ہے نا؟ ایف ایس سی کا رزلٹ کینسل ہوگا۔ تین سال تک تمہیں کوئی تعلیمی ادارہ داخلہ نہیں دے سکے گا۔ تین سال بعد تم دوبارہ سے ایف اے بی اے کرو گی کیا؟ تین سال بعد سات سال پیچھے چلی جاؤ گی کیا؟ تم جس یونیورسٹی یا کالج میں جاؤ گی' وہاں بے عزت ہو کر رہو گی۔ سب تمہیں چیٹر کہیں گے' حقارت سے دیکھیں گے۔ اس لیے تمہیں اس وقت صرف اپنا سوچنا چاہیے۔ ہوں۔"

وہ کوٹ کی نادیدہ شکن درست کرتا اس پہ ایک نرم سی آخری نظر ڈال کے مڑ گیا۔ سیلز مین بھی اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ چلا بھی گیا اور وہ ہنوز بت بن کے کھڑی تھی۔ موم کے قطرے پگھل پگھل کے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ آگ جا چکی تھی۔ تپش باقی تھی۔

☆ ☆ ☆

ابھرتے ڈوبتے سورج سے توڑ لوں رشتہ
میں شام اوڑھ کے سو جاؤں اور سحر نہ کروں

وہ گھر آئی تو اس کا جسم یوں جل رہا تھا گویا اردگرد ایک ہزار تنور جل رہے ہوں۔ وہ لاؤنج میں خاموش بیٹھی زمر کے سامنے پل بھر کو رکی۔

"میں گواہی دوں گی' لیکن میں بس وہی کہوں گی جو میری مرضی ہوگی۔ کوئی میرے منہ میں الفاظ نہیں دے گا۔ آپ میں سے کوئی مجھے نہیں بتائے گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میں وہی کہوں گی جو میرے لیے ٹھیک ہوگا۔" درد سے پھٹی آواز میں کہہ کر وہ آگے بڑھی تو دیکھا' سامنے سعدی کھڑا تھا اور اس کی آنکھوں میں دکھ تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تم گواہی دو حنہ۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ تمہیں یوں اذیت دیں۔"

پھر کمرے میں آکر وہ جو سر منہ لپیٹ کے لیٹی تو کتنے ہی گھنٹے نہ اٹھی۔ مغرب کی اذانیں ہوئیں تو اٹھ کے نماز پڑھی اور پھر سے لیٹ گئی۔ جسم بخار میں دہک رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو ابل ابل کر گر رہے تھے۔ کب تک میں یوں سزا کاٹتی رہوں گی ان کچی عمر کی کچی غلطیوں کی؟ خدایا وہ کیا کرے؟ عشاء بھی یوں ہی پڑھی اور پھر سے لیٹ گئی۔ رات تاریک ہوتی گئی۔ شہر اندھیرے میں ڈوبتا گیا۔ جانے وہ کون سا پہر تھا جب اس نے محسوس کیا کوئی دروازے میں آکھڑا ہوا ہے۔ وہ فارس کی چاپ پہچانتی تھی مگر اسی طرح کروٹ لیے لیٹی رہی' ہلی تک نہیں۔ وہ آگے آیا اور پائنتی پہ بیٹھا۔

"اگر تم نہیں دینا چاہتیں گواہی تو مجھے بتاؤ۔ ہم کوئی راستہ نکال لیں گے۔"

"پتا ہے کیا ماموں۔" وہ تاریک خلا میں تکتی ہوئی عجیب خالی پن سے بولی۔ "میں سمجھتی تھی کہ میں ذہین ہوں۔ کئی ممالک کے پاپ کلچر' ڈراموں اور کتابوں سے واقف ہوں تو عام لڑکیوں سے مختلف ہوں۔ برتر ہوں۔ مگر میں غلط تھی۔"

گرم گرم آنسو ابل کے گالوں پہ لڑھکتے تکیے میں جذب ہونے لگے۔

"ہم مڈل کلاس لڑکیاں جتنا پڑھ لکھ لیں' جتنا کمپیوٹر استعمال کرلیں' دنیا بھر کی سیاست پہ تبصرے کرلیں ہم رہتی وہی مڈل کلاس ہی ہیں۔ عام شکل و صورت کی بے بس لڑکیاں جن کو عزت کے نام پہ کوئی بھی بلیک میل کرسکتا ہے۔ جن کی عزت ایک دفعہ چلی جائے تو اسے کوئی واپس نہیں لاسکتا۔ ہم بہت بے چاری لڑکیاں ہیں فارس ماموں۔ ہم کچھ نہیں کرسکتیں۔ ہم ٹوٹل فیلیئر (ناکام) ہوتی ہیں۔"

"جب میں جیل میں گیا تھا تو میں نے بہت سی باتیں سیکھی تھیں' جن کا مجھے زندگی میں پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔" وہ دھیرے سے بولا تھا۔ "میں نے سیکھا تھا کہ اگر کوئی آپ کے عقائد پہ حملہ کرے تو زبان سے جواب دو' اگر کوئی آپ کے جسم پہ حملہ کرے تو ہاتھ سے جواب دو' اگر کوئی آپ کے خلوص نیت پہ شک کرے' تو اپنے اچھے عمل سے جواب دو اگر کوئی آپ کی دیانت داری پہ انگلی اٹھائے تو دلائل سے جواب دو' لیکن۔۔۔"

وہ ٹھہرا۔ اندھیرے کمرے میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

"لیکن اگر کوئی آپ کے کردار پہ' آپ کی عزت پہ حملہ کرے تو کوئی جواب نہ دو۔"

"تو پھر کیا کریں؟" وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی۔ وہ چند لمحے کچھ نہ بولا پھر جب لب کھولے تو اس کی آواز بہت دھیمی اور سرد سی محسوس ہوئی تھی۔

"Then you make bleed!" (تو ان کو تڑپا تڑپا کے مار دو۔)

وہ کب کمرے سے گیا' اسے پتا نہ چلا۔ بس وہ گم صم سی بیٹھی رہی۔ پھر بدقت تمام وہ اٹھی اور باتھ روم جاکے وضو کیا۔ آنکھیں جل رہی تھیں' جسم بخار میں پھنک رہا تھا۔ بمشکل دوپٹا سر پہ لپیٹتی وہ کمرے میں آئی۔ جائے نماز بچھائی اور دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔

"کیا ہم لڑکیاں ٹوٹل فیلیئر ہیں اللہ تعالیٰ؟" سلام پھیر کے وہ دوزانو بیٹھی' دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے گم صم سی پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہم لڑکیاں واقعی اتنی بے بس

اور لاچار اور بے چاری ہوتی ہیں کہ عزت کے نام پہ کوئی بھی ہمیں بلیک میل کر سکتا ہے؟ کیا ہماری غلطیوں کی کہانیوں کے "مرد" کرداروں کے ہاتھوں میں ہماری عزت ہوتی ہے یا تیرے ہاتھ میں؟ کیا تیری مرضی کے بغیر کوئی بھی کسی کو بے عزت اور ذلیل و رسوا کر سکتا ہے؟ مجھے بتا دے مالک تو کہتا ہے ناکہ اگر اللہ کو معلوم ہوا تمہارے دلوں میں کچھ خیر ہے تو وہ تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لیا گیا ہے اور تمہیں بخش دے گا۔ (سورۃ الانفال: 70) تو اگر میرے اندر کوئی خیر ہے تو کیا میری عزت مجھے واپس مل سکتی ہے؟ کیا دنیا والوں کی نظر میں میرا پردہ رہ سکتا ہے کہ وہ تو واقف ہی نہیں ہیں اور میرے گھر والے جو واقف ہیں' ان کی نظر میں پھر سے معتبر ہو سکتی ہوں میں؟ کیا سعدی کو جھوٹا کہنے کے بجائے کوئی اور راستہ ہے؟"

وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ وہ پوچھ رہی تھی' الجھ رہی تھی' تعجب کا شکار ہو رہی تھی۔ ہاں اب وہ رو نہیں رہی تھی۔

سیڑھیوں سے نیچے آؤ تو فارس اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ زمر جو بے مقصد سی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی' اس کو نظر انداز کیے برش اٹھا کے بالوں میں چلانے لگی تھی۔ خفا نظریں آئینے پہ جمائے وہ لب بھینچے ہوئے تھی۔

"اہم!" وہ ذرا سا کھنکھارا۔ انداز بے چارے شوہر والا تھا۔ زمر برش کرتی رہی۔ وہ اس کے قریب آیا اور سنگھار میز کے کنارے بیٹھا۔

"سوری۔ میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔" ایک انگلی سے گردن کھجاتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"کیا اس نے گھر سے نکال دیا جو آپ کو اپنے گھر کی یاد آئی؟" وہ سلگتی نگاہیں اٹھا کے اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔

"حمر سے ملنے گیا تھا۔ سعدی کی ڈاکٹر کا پوچھنا تھا کہ وہ ملی یا نہیں۔ اس کے پاس نہیں گیا تھا۔"

"تو وہیں رہ جاتے' واپس آنے کی کیا ضرورت تھی؟" برش زور سے پٹخا تھا۔ اس کی وضاحت پہ بالکل یقین نہیں کیا۔

"آگیا ہوں تو کیا گھر سے نکالو گی؟" زمر نے جواباً" محض سر جھٹکا۔ غصہ آرہا تھا اس پہ۔

"اچھا سنو۔" وہ مصالحتی انداز میں اس کی طرف ذرا سا جھکا۔ نظروں کے حصار میں اس کا خفا چہرہ لیے مسکراہٹ دبائے بولا۔ "چلو ڈنر پہ چلتے ہیں۔"

"یہ ڈنر کا نہیں سحری کا وقت ہے۔" وہ اسے گھور کے بولی تھی۔

"آپ ایسی بھی کوئی رات نہیں بیتی کہ ایک آدھ ڈھابا بھی نہ کھلا ہو۔"

"ہاں بس مجھ پہ پیسہ خرچ نہ کرنا۔ ڈھائی سو کی انگوٹھی دلانا اور کھانا ڈھابوں سے کھلانا۔" وہ مارے تاسف کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

فارس نے افسوس سے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ "تم ہمیشہ سے اتنی لالچی تھیں یا وکالت پڑھنے کے بعد ہوئی ہو۔"

"تم نا واپس اسی کے پاس چلے جاؤ۔"

"ارے یار نہیں جاتا میں اس کے پاس۔ میں تو عرصے سے اس کے گھر بھی نہیں گیا۔ اور وہ اس رات بھی ڈنر پہ میں نہیں حسنین لے گئی تھی' وہ ویڈیو بھی اس نے بنائی تھی۔ اب بس کرو وہ شک کرنا۔" وہ مسکراہٹ دبائے صفائی دے رہا تھا۔

"ہاں ہاں' مجھے یقین آگیا۔ ہونہہ۔" اس نے بدقت چہرے کو ویسا ہی سخت رکھا البتہ دل سے بوجھ سا اترتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اچھا اب موڈ تو ٹھیک کر لو۔ ایسا نہ ہو کہ کل کو مجھے کچھ ہو جائے اور تم یہ وقت ضائع کرنے پہ پچھتاتی رہو۔" وہ ازراہ مذاق کہہ رہا تھا مگر بالوں میں سے برش گزارتا اس کا ہاتھ کانپا۔ اس نے دہل کر فارس کو دیکھا۔

"تم کتنا فضول بولتے ہو۔"

"بس؟" اسے مایوسی ہوئی۔ "میں تو امید کر رہا تھا کہ تم "میری عمر تمہیں لگ جائے" جیسا مکالمہ

بولوگی۔"

"کتنا شوق ہے تمہیں مجھ سے چھٹکارا پانے کا۔"
اسے از سر نو غصہ آنے لگا۔

"ہے تو بہت زیادہ' لیکن۔۔۔" اس نے برش اس کے ہاتھ سے لے کر میز پہ رکھا اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ "لیکن تم اس بات کا یقین رکھو کہ موت کے علاوہ ہمیں کوئی چیز یا کوئی شخص جدا نہیں کر سکتا۔"

وہ اداسی سے مسکرائی۔ ساری کلفت' ساری تلخی زائل ہو گئی۔ اس کا مضبوط انداز' پریقین لہجہ۔ اور آنکھوں سے چھلکتا عزم۔۔۔ بس اس سرکس بنی زندگی میں ایک یہی چیز تو اسے بہادر بنائے رکھتی تھی۔

"تم مجھ سے واقعی محبت کرتے ہو نا فارس!"

"ہوں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ سچی والی محبت نا؟" زمر نے ابرو اٹھایا۔

"نہیں جاپانی والی۔" وہ جل کے بولا تو وہ ایک دم ہنس پڑی۔ ساری اداسیاں فضا میں گھل کے ختم ہو گئی تھیں جیسے۔

☼ ☼ ☼

ضمیر مرتا ہے احساس کی خاموشی سے
یہ وہ وفات ہے جس کی خبر نہیں ہوتی

اس صبح ہاشم کاردار کے آفس میں ہوا بالکل ساکن تھی۔ ایک ڈراؤنی سی خاموشی چھائی تھی اور ہاشم بالکل سانس روکے بیٹھا سامنے میز پہ رکھے کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سی سی ٹی وی سے نکالے گئے اسٹل امیج تھے اور رئیس ایک ایک کی تفصیل بتا رہا تھا۔

"نہ صرف فارس غازی نے سری لنکا جانے کے لیے ہارون عبید کا طیارہ استعمال کیا بلکہ مس آبدار بھی ان کے ساتھ گئی تھیں۔ یہ دیکھیے۔ وہ تصاویر میں جس اپارٹمنٹ سے نکلتا دکھائی دے رہا ہے' وہ بھی آبدار عبید کے نام پہ ہے۔" ہاشم نے اثبات میں سر کو خم دیا۔ وہ اس جگہ کو پہچانتا تھا۔

"گارڈ کمار کی موت سے پہلے آبدار صاحبہ سعدی سے ملنے گئی تھیں' اور اس سے بھی پہلے وہ پاکستان میں فارس غازی سے ملتی رہی تھیں' جس سے ہم نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ۔"

"وہ سرنج آبدار نے ہی سعدی کو دی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ تھینک یو رئیس! تم جا سکتے ہو۔" ایک دم خشک سے انداز میں کہتا وہ کاغذ سمیٹنے لگا۔ رئیس چپ ہو گیا اور پھر سر کو خم دے کر باہر نکل گیا۔

اب وہ کمرے میں تنہا تھا۔ وہ تنہائی جان لیوا تھی۔ وحشت سی وحشت تھی۔ دکھ سا دکھ تھا۔ وہ بار بار ایک ایک تصویر کو دیکھتا تھا۔ کبھی بے یقینی سے' کبھی ملال سے۔ کبھی آنکھوں میں کرب سمٹ آتا' کبھی غصہ۔ اس کا سر دکھنے لگا تھا۔ بلڈ پریشر بڑھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور سر دونوں ہاتھوں میں گرا دیا۔

"بھائی!" نوشیرواں کی آواز پہ وہ چونکا اور چہرہ اٹھایا۔ وہ جانے کب وہاں آکھڑا ہوا تھا۔ ہاشم نے ڈھیلے سے انداز میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" وہ بیٹھا تو اس کا چہرہ بھی شدید اندرونی خلفشار کا شکار لگتا تھا۔

"بولو۔" وہ سنبھل کے پوچھنے لگا۔ پچھلے دو' تین ماہ سے وہ مقدمے میں یوں الجھے تھے کہ آپس میں اب نہ پیار رہا تھا نہ ماضی کے اختلافات۔ بس نارمل ہو گئے تھے دونوں۔

"میری وجہ سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ میری وجہ سے ہمارا خاندان اس اسکینڈل میں پھنسا ہوا ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔ پھر؟"

"میں۔۔۔ میں اعتراف جرم کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے الفاظ تھے کہ کیا' ہاشم کرنٹ کھا کے سیدھا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ندامت سے سر جھکائے۔ "میں اللہ سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں سعدی سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں جج صاحب کو سچ بتا دینا چاہتا ہوں' میں۔۔۔" وہ فقرہ مکمل نہیں کر سکا۔ ہاشم کاردار نے پانی کا بھرا ہوا ٹھنڈا ٹھار گلاس اس کے منہ پہ پھینکا۔ ٹھنڈے یخ پانی نے اس کا چہرہ گردن اور بالوں کو نہلا دیا تھا۔ اس نے ہکا بکا سا چہرہ اٹھایا۔

"تم اگر نیند سے آنکھ کھل گئی ہو تو میری بات سنو۔" برہمی سے کہتا وہ آگے کو ہوا۔

"تم نے سعدی کے ساتھ یہ اس لیے کیا کیونکہ وہ یہ ڈیزرو کرتا تھا۔ کیونکہ تم ہمیشہ سے ایک نالائق اور کم عقل لڑکے تھے، مگر تم میں بھی کچھ کوالٹیز تھیں۔ ان دونوں بہن بھائی نے تمہیں ہمیشہ ڈی گریڈ کیا۔ تمہارے راز کھولے۔ تمہیں احساس کمتری کا شکار کیا۔ ان کو وہ ملا جو انہوں نے بویا تھا۔ وہ اپنے احساس برتری سے نکل پاتے تو ان کی سمجھ میں آتا کہ کسی کا اتنا مذاق نہیں اڑاتے جتنا وہ تمہارا اڑاتے تھے۔ تم نے نوشیرواں! اگر کچھ غلط کیا ہے تو اس لیے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ غلط کیا تھا۔"

"میں اس سارے کرب سے نکلنا چاہتا ہوں بھائی۔ مجھ سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا۔" وہ دبا دبا سا چلایا تھا۔ گیلے چہرے پہ آنسو کہاں تھے، اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

"چپ کر کے میری بات سنو۔" ہاشم اٹھا۔ میز پہ ہتھیلیاں رکھے، اس کی طرف جھکا۔ اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے غرایا۔ "میں نے اغوا کیا اسے، میں نے قید میں رکھا اسے۔ پھر وہ تمہیں کیوں نامزد کر رہا ہے؟ وہ لوگ تم پہ غلط الزام لگا رہے ہیں اور میں تمہیں وہاں سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ میں ہوں جو تمہیں اس سے نکال لوں گا۔"

"لیکن اگر میں ان سے معافی مانگ لوں؟ اگر اللہ ان لوگوں کے دل میں میرے لیے رحم۔"

"ڈیم اٹ!" ہاشم نے غصے سے میز پہ ہاتھ مارا۔ "انہوں نے تمہیں معاف کرنا ہوتا تو یہ سب کرتے ہی کیوں؟ وہ تمہیں پھانسی پہ لٹکا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ انصاف نہیں چاہتے۔ وہ انتقام چاہتے ہیں۔" پھر وہ واپس کرسی پہ بیٹھا، چند ٹھنڈے سانس لے کر خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ اور بولا۔

"دیکھو شیرو۔ تمہارے اعتراف سے ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔ تم یاد کرو جیل کے وہ چند دن، جو تم گزار کے آئے ہو۔ تم نہیں سہار سکو گے۔ تم پھندے سے پہلے ہی مر جاؤ گے۔ تم میرے بھائی ہو شیرو! میں تمہیں مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکوں گا۔" اس کا لہجہ آخر میں بالکل ٹوٹ سا گیا۔ شیرو کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے کرب سے دونوں کنپٹیاں تھامیں۔

"میں کیا کروں بھائی؟"

"تم اپنے بھائی پہ بھروسا رکھو۔ مجھے اپنا کیس لڑنے دو۔ ان لوگوں نے ہمارے خاندان کو مذاق بنا دیا ہے۔ میں ان کو مذاق بنا دوں گا۔ تم دیکھنا میں عدالت میں کیا کرتا ہوں اس کے خاندان کی عورتوں کے ساتھ۔" ایک نظر اس نے سامنے رکھے کاغذات کو دیکھا۔ آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی۔

(اس نے مجھ سے وہ عورت چھین لی جس سے میں سب سے زیادہ محبت کرتا تھا۔ میں اس سے وہ عورت لے لوں گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔)

"میں کیا کروں بھائی!" نوشیرواں بھیگی آنکھوں کے ساتھ نفی میں سر ہلا کر پوچھ رہا تھا۔

"تم خاموش رہو۔ اور مجھے میرا کام کرنے دو۔" وہ پورے وثوق سے بولا تو شیرو نے شکستگی سے اثبات میں گردن ہلا دی۔ وہ عجیب دوراہے پہ آکھڑا ہوا تھا جہاں ہر راستہ تباہی کی طرف جاتا دکھائی دیتا تھا۔

ان سے کئی کوس دور ایک ہوٹل کے ڈائننگ ایریا میں زرد روشنیوں نے پرفسوں، خوابناک سا ماحول بنا رکھا تھا۔ ایسے میں ایک ٹیبل کے گرد دو مرد اور تین خواتین بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سربراہی کرسی پہ جواہرات بیٹھی تھی اور مسکراتی ہوئی بظاہر دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہی تھی مگر گاہے بگاہے موبائل کی گھڑی پہ نظر ڈالتی تھی۔ کن اکھیوں سے قریب کھڑے گارڈز کو دیکھ رہی تھی۔

دفعتاً" جواہرات کی آنکھیں چمکیں۔ دور سے ویٹر دھواں اڑاتی ٹرے اٹھائے چلا آرہا تھا۔ وہ مسکرا کے اب ساتھ والی خاتون سے بات کرنے لگی۔ جیسے ہی ویٹر قریب آیا اور تیزی سے ان کے قریب جھک کے ٹرے کے لوازمات نیچے اتارنے چاہے، جواہرات نے اپنا پاؤں اس کے راستے میں رکھا۔ وہ، جو عادتاً" تیز تیز کام

کررہا تھا غیر متوقع رکاوٹ سے اس کا پیر رپٹا اور ٹرے ٹیڑھی ہوئی۔ وہ سنبھل جاتا مگر جواہرات چلا کے کھڑی ہوئی اور یوں گریوی کا باؤل اس کے کپڑوں پہ لڑھک گیا۔

اگلے چند لمحے وہاں عجب کہرام سا مچا رہا۔ جواہرات کا سفید لباس داغ دار ہو گیا تھا اور وہ چلا چلا کر اس غریب لڑکے کی بے عزتی کر رہی تھی۔ دوسرے ویٹرز اور گارڈز ٹوٹی بکھری چیزوں کو درست کرنے اس طرف لپکے تھے۔ لڑکا سہم کے دو قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ایسے میں وہ نیپکن سے اپنے چہرے کے چھینٹے صاف کرتے ہوئے گارڈ سے غرا کے بولی تھی۔

"میں جب تک یہ صاف کر کے نہ آؤں' اس ویٹر کو بھاگنا نہیں چاہیے یہاں سے۔ تم اس کو سنبھالو اور منیجر کو بلا کے لاؤ۔ کیا مہمانوں کو اذیت دینے کے لیے کھول رکھا ہے یہ ہوٹل؟" وہ غصے میں بڑبڑاتی پرس اٹھائے آگے بڑھ گئی اور گارڈز فوراً سے ان ہی کاموں میں لگ گئے جن کا وہ حکم دے کر گئی تھی۔

لیڈیز ریسٹ روم کا پہلا دروازہ کھولا تو سامنے قطار در قطار سنک نظر آ رہے تھے اور ان کے پیچھے شیشے کی بڑی سی دیوار۔ اور وہاں وہ کھڑا تھا۔ پی کیپ پہنے' بار بار گھڑی دیکھتا۔

"اوہ احمر! شکر تمہیں میرا پیغام مل گیا تھا۔" وہ گہری سانس لے کر اندر آئی تو احمر نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور ہینڈل میں کچھ پھنسا دیا۔ پھر متعجب سا اس کی طرف پلٹا۔

"مسز کاردار! ایسا بھی کیا کہ آپ مجھے کال تک نہیں کر سکتی تھیں؟"

"میں خطرہ نہیں لے سکتی تھی۔ ابھی زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہاشم مجھ پہ شک کرنے لگا ہے' میں اسے مزید خود سے متنفر نہیں کر سکتی۔" وہ تیز تیز بے ربط سا بول رہی تھی۔

"او کے او کے۔ آرام سے بتائیں۔ کیا مدد کر سکتا ہوں میں آپ کی؟" وہ رسان سے اسے تسلی دینے لگا۔

"تمہیں میرا ایک کام کرنا ہے۔ یہ میرے ایک خفیہ اکاؤنٹ کی تفصیلات ہیں۔ اس میں ایک لاکر ہے جس میں کچھ زیور ہے اور بہت سی رقم۔ تمہیں وہ سب کچھ میرے پاس پہنچانا ہے۔" وہ اب چند کاغذات نکال کے اسے دکھا رہی تھی۔ احمر غور سے ان کو دیکھ رہا تھا۔

وہ واپس آئی تو لباس کا داغ ہنوز موجود تھا البتہ چہرہ تر و تازہ اور دھلا ہوا لگتا تھا۔ مسکرا کے وہ واپس بیٹھی تو دیکھا' سامنے منیجر' عملے کے چند نمائندے اور گارڈ کھڑے تھے۔ متعلقہ ویٹر کو انہوں نے پکڑ رکھا تھا۔ منیجر سینے پہ ہاتھ رکھے ندامت سے بار بار معذرت کر رہا تھا۔ جواہرات ٹیک لگا کے بیٹھی اور فخر و غرور سے اس غریب نوجوان کو دیکھا۔

"اس نے نہ صرف میرا لباس خراب کیا بلکہ میری دوپہر برباد کر دی۔ اس کو کڑی سے کڑی سزا ملنی چاہیے۔ نہ صرف اس کو نوکری سے فارغ کیا جائے بلکہ یہ ایک بھاری جرمانہ بھی بھرے گا۔"

"مجھے معاف کر دیں' میری غلطی نہیں ہے' میرے آگے..." وہ نوجوان بے بسی سے کہنا چاہتا تھا مگر گارڈز اس کو کچھ بولنے سے پہلے ہی خاموش کرا دیتے تھے۔ جواہرات اب مزید حکم صادر کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ہر شخص بااصول ہے' ہر شخص باضمیر
پر اپنی ذات تک' ذاتی مفاد تک!

کمرہ عدالت کی اونچی کھڑکی سے مئی کا سورج اندر جھانک رہا تھا۔ جج صاحب اپنی کرسی پہ قدرے ترچھے ہو کر بیٹھے' رخ کٹہرے کی جانب کیے ہوئے تھے جہاں نیاز بیگ موجود تھا اور اس کے سامنے... نیچے... زمر کھڑی تھی۔ نیچے بیٹھا سعدی فکر مندی سے گواہ کو دیکھ رہا تھا۔ ہاشم البتہ ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے ہوئے تھا۔ آج وہ چشمے والا آدمی نہیں آیا تھا' اس لیے پیچھے بیٹھے فارس کی توجہ کا مرکز صرف نیاز بیگ تھا۔

"کیا یہ درست ہے کہ اسپتال میں سعدی یوسف کا اسٹریچر لے کر جانے والے آپ ہی تھے؟" زمر پوچھ

رہی تھی۔

"جی ہاں۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"کیا یہ درست ہے کہ آپ نے سعدی یوسف کے اغوا کا الزام قبول کیا تھا؟"

"جی۔"

"آپ نے سعدی یوسف کو قتل کرنے کا ارادہ کرنے کا الزام بھی اپنے سر لیا تھا لیکن استغاثہ ایک دفعہ پھر آپ سے حلف اٹھوا کے پوچھ رہا ہے کہ نیاز بیگ صاحب..." زمر ٹھہر ٹھہر کے بول رہی تھی۔ "کیا آپ اپنے بیان پہ قائم ہیں؟"

عدالتی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سناٹا در سناٹا۔ نیاز بیگ نے ہاشم کو دیکھا پھر پیچھے بیٹھے فارس کو۔ دونوں اسے مختلف قسم کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ زمر کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں سچ بولوں گا۔ میں اپنے بیان پہ قائم ہوں۔ میں نے ہی سعدی یوسف کو گولیاں ماری تھیں۔"

"واو!" سعدی نے بے بسی کے سر جھکا تھا۔ ہاشم نے مسکرا کے زمر کو دیکھا جس کی یہاں سے پشت دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

"آپ کو یقین ہے کہ آپ ہی سعدی کے ساتھ اس زیر تعمیر گھر میں اس رات تھے؟"

"جی۔ میں ہی تھا۔" ہاشم نے مڑ کے فارس کو دیکھا۔ وہ بالکل خاموش اور سپاٹ سا دکھائی دے رہا تھا۔

"عدالت کو بتایئے کہ آپ کا سعدی یوسف سے کس بات پہ جھگڑا ہوا تھا۔"

"یہ لڑکا مجھ سے کوکین خریدتا تھا کافی دن سے پیسے پورے نہیں دیے تھے اس نے۔ میں نے کہا بدلے میں اس کا ریسٹورنٹ قسطوں پہ خرید لوں گا' یہ اس پہ مجھ سے لڑنے جھگڑنے لگا۔ اس نے مجھے گالی دی تھی پھر میں نے..." وہ وہی واقعہ دہرانے لگا۔

"اسے ایمبولینس میں ڈال کے کوڑے کے ڈھیر پہ پھینکنے کے بعد آپ نے کیا کیا نیاز بیگ صاحب؟"

"میں اپنے گھر گیا۔ کپڑے بدلے۔ اس کا موبائل جو اٹھایا تھا وہ اسی رات اپنے دوست کو بیچ دیا۔ اس کی دکان اسی علاقے میں ہے' جہاں آپ کا گھر ہے۔"

"مگر سعدی کے فون کے سگنل اس رات وہاں ملے تھے جہاں قصر کاردار واقع ہے۔"

"میرے دوست کی دکان بھی اسی علاقے میں ہے۔" نیاز بیگ نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلایا۔

زمر نے ہاشم کو دیکھا اور ستائشی انداز میں سر کو خم دیا۔

"امپریسیو ٹینس پریپ!" اس نے مسکرا کے تعریف وصول کی۔ زمر فوراً" ہی واپس گھومی۔

"اور اس فون کا ماڈل کون سا تھا؟"

لمحے بھر کو کمرے میں سکوت چھا گیا۔ ہاشم کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔

"آبجیکشن یور آنر۔" ہاشم تیزی سے اٹھا۔ "اس بات کو ایک سال گزر گیا ہے اب..."

"اوور رولڈ۔ کاردار صاحب! بیٹھ جائیں اور گواہ کو جواب دینے دیں۔" جج صاحب نے ناپسندیدگی سے اسے ٹوکا۔

"وہ سام سنگ کا اسمارٹ فون تھا۔ جلدی میں پچیس ہزار کا بکا تھا۔ ایس سکس تھا۔" نیاز بیگ جھٹ سے بولا۔

"اور اس کا رنگ کون سا تھا؟" وہ تڑنت بولی۔

"سیاہ رنگ تھا۔" وہ اعتماد سے بولا۔ (اف) نوشیرواں نے سر گرا دیا۔

زمر نے ہاتھ میں پکڑے کاغذات جج صاحب کے سامنے رکھے۔ "یور آنر! سعدی کے زیر استعمال ایک ہی فون تھا اور وہ آئی فون تھا' سفید رنگ میں۔ یہ اس فون کی خریداری کی سلپ ہے اور یہ ابتدائی ایف آئی آر کی کاپی ہے۔ جس میں ہمیں نے فون کا رنگ اور ماڈل مینشن کیا تھا۔ استغاثہ عدالت سے درخواست کرتا ہے کہ نیاز بیگ کی گواہی پہ یقین نہ کیا جائے کیونکہ جس فون کے پیچھے سعدی کو مارنے اور وہ بھی دو ڈھائی لاکھ کے امپورٹڈ پستول سے مارنے کا یہ دعوا کر رہا ہے' وہ

فون اس نے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔"
"یور آنر وہ ایک عام آدمی ہے۔" ہاشم تورا کے اٹھا۔ "عام آدمی نے سام سنگ اور آئی فون دیکھے تک نہیں ہوتے اور اس بات کو ایک سال گزر چکا ہے۔"
"کاردار صاحب۔" زمر مسکرا کے اس کی طرف گھومی۔ "آپ بہت خاص آدمی ہیں' بڑے آدمی ہیں۔ امیر۔ بادشاہ لوگ۔ کبھی اپنے محل سے نکل کر اس ملک کی سڑکوں پہ دیکھیں۔ ماشاء اللہ سے روٹی ہو یا نہ ہو' ہر دوسرے عام آدمی کے پاس یا تو اسمارٹ فون ہے یا سیل فون کے متعلق تمام اپ ڈیٹس ہیں۔ خود نیاز بیگ کی گرفتاری کے وقت ان کے پاس سے دو قیمتی اسمارٹ فونز نکلے تھے۔ یو نو واٹ۔" وہ نیاز بیگ کی طرف گھومی جو اب جلدی جلدی وضاحت دے رہا تھا۔ "آپ موقع پہ نہ تھے نہ آپ نے سعدی یوسف پر حملہ کیا تھا۔ مجھے مزید کوئی سوال نہیں پوچھنا۔"
اب ہاشم اور زمر ایک ساتھ بول رہے تھے۔ مچھلی منڈی کی سی آوازیں آرہی تھیں۔ ایسے میں سعدی پیچھے اس کے ساتھ آبیٹھا۔
"تھینک یو۔" اس نے فارس کا شکریہ ادا کیا۔
"یو آر ویلکم۔" اس نے سعدی کا کندھا تھپتھپایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔
ادھر زمر اب اگلی تاریخ مانگ رہی تھی تاکہ حسین یوسف کو پیش کرسکے جو ناسازیٔ طبع کی وجہ سے آج پیش نہیں ہو سکی تھی۔ نیاز بیگ کے چہرے کے سارے رنگ اڑ چکے تھے اور وہ بار بار گھبراہٹ سے خود کو گھورتے ہاشم کو دیکھتا تھا۔ اسے اب ہاشم سے کون بچائے گا' یہ سوچ جان لیوا تھی۔

☼ ☼ ☼

مستقل صبر میں ہے کوہ گراں
نقش عبرت صدا نہیں کرتا

فوڈلی ایور آفٹر شام کے نیلگوں اندھیرے میں جگمگا رہا تھا۔ ندرت کاؤنٹر پہ کھڑے ہو کر فون پہ جھنجلا کر کسی وینڈر سے کچھ کہہ رہی تھیں جب ان کی نگاہ دروازے پہ پڑی اور لمحے بھر کے لیے وہ منجمد ہو گئیں۔
چوکھٹ میں ہاشم کاردار کھڑا تھا۔ اپنے تھری پیس کی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ مسکراتا ہوا اس طرف آرہا تھا۔ ندرت نے فقرہ سست روی سے مکمل کیا۔ وہ قدم قدم چلتا آگے آیا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ان کے بالکل قریب سے گزرا تھا وہ۔ ان کو نظرانداز کرکے۔ وہ پلٹ کے اسے جاتے دیکھنے لگیں۔ وہ واقف تھا کہ زمر کہاں ملے گی مگر پہلی دفعہ آنے کے باعث گردن گھما گھما کے وہ ریسٹورنٹ دیکھ رہا تھا۔ ندرت کی نگاہوں نے تب تک اس کا پیچھا کیا جب تک وہ اوپری ہال کے دروازے کے پیچھے گم نہ ہو گیا۔
زمر اپنی مخصوص میز کرسی پہ موجود تھی۔ ٹیبل لیمپ جلا ہوا تھا' چھت پہ لگا فانوس بھی روشن تھا اور وہ کہنیاں میز پہ جمائے کام کررہی تھی جب دروازہ کھلنے کی آہٹ پہ نظریں اٹھائیں۔ ہاشم کو وہاں دیکھ کے لبوں پہ تلخ مسکراہٹ در آئی۔ وہ مسکراتا ہوا "گڈ ایوننگ" کہتا سامنے آیا اور کرسی کھینچی۔
"آیئے کاردار صاحب بیٹھیے۔ کیا خدمت کرسکتی ہوں میں آپ کی۔" وہ بظاہر خوش دلی سے بولتی قلم بند کرکے پیچھے ہو بیٹھی۔
"پہلے تو چائے منگوائیں' لیکن بغیر شوگر کے۔"
زمر نے انٹرکام اٹھایا اور بولی۔ "جنید! اوپر دو کافی بھیجیں۔" اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ گھنگریالے بال اونچی پونی میں باندھے وہ کورٹ کے صبح والے سفید کپڑوں میں ملبوس تھی۔ (کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔) باہم پھنسے ہاتھوں میں نیلے پتھر والی انگوٹھی دمک رہی تھی۔
"اچھا ہے ریسٹورنٹ۔" وہ ستائشی انداز میں سر کو خم دے کر کہہ رہا تھا۔ "انٹیریر اچھا ہے' ٹریڈیشنل ہے۔ تھوڑا سا ماڈرن ٹچ بھی آرہا ہے جو کہ نہیں آنا چاہیے' لیکن خیر یہ وال کلر بدلنا چاہیے۔"
"ہم ایک دفعہ کیس سے فارغ ہو جائیں' پھر ری ماڈلنگ کریں گے اس کی۔"
"او زمر!" وہ افسوس سے گہری سانس لے کر بولا۔

"I miss old times"

آواز میں ملال بھی تھا۔ اس پہ نگاہیں جمائے وہ یاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "آپ ڈی اے تھیں، سوری پراسیکیوٹر۔ میں آپ کے آفس میں آتا تھا ہم ایک ساتھ چائے پیتے تھے، بہت سے کیسز کی ڈیل فائنل کرتے تھے، حکومت کا وقت اور پیسہ بچاتے تھے۔ اچھے دن تھے وہ۔"

"آپ کو کبھی افسوس ہوا ہاشم؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ "جو آپ نے میرے ساتھ کیا، اس پہ؟"

"بہت زیادہ!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ٹیک لگائے، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھا، وہ یاد کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "مجھے زندگی میں سب سے زیادہ ملال اسی بات کا ہے، میں نے آپ سے وہ خوشی لے لی جو مجھے سونیا کو پانے سے ملی تھی۔ آئی ایم سوری، زمر!"

"بہت شکریہ۔ خیر، یہ اچانک آپ کیوں آئے ادھر؟" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"میں کافی بور ہو چکا ہوں ٹرائل سے۔" اس نے ٹھوڑی پہ ناخن رگڑتے ہوئے سوچنے والا انداز اپنایا۔

"یا شاید چیزیں آپ کے خلاف جانے لگی ہیں۔"

"ڈیل کر لیتے ہیں زمر! اس کیس کو ختم کر دیتے ہیں۔ چلیں، صلح کرتے ہیں۔"

"مجھے سوچنے دیں۔" زمر نے کنپٹی پکڑ کے سر جھکا کے آنکھیں بند کیں پھر دو سیکنڈ بعد ہاتھ نیچے گرایا اور آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔

"میں نے بہت سوچا، مگر نہیں۔ میں اس کیس کو جیتنے میں انٹرسٹڈ ہوں۔"

"میں دیت دینے کو تیار ہوں۔ خون بہا۔ name a price"

"جتنی آپ دے سکتے ہیں ہم اس سے دگنی رقم میں آپ کو دیتی ہوں، بدلے میں نوشیرواں کو ہمارے حوالے کر دیں۔"

"صرف شیرو کیوں؟ میں کیوں نہیں؟"

"اس کا جواب میں فیصلہ آنے کے بعد دوں گی۔"

"اور کچھ کہنا ہے آپ کو؟"

"زمر! میں ہار نہیں رہا۔" وہ سمجھانے والے انداز میں آگے کو ہوا اور ہمدردی سے اسے دیکھا۔ "میں جیت جاؤں گا۔ آپ کے پاس ایک بھی کریڈیبل (معتبر) گواہ نہیں ہے۔ لیکن... فیصلہ آنے تک آپ لوگ بہت کچھ کھو چکے ہوں گے۔ چاہے وہ عزت ہو، نیک نامی ہو یا جان ہو۔ اور میں نہیں چاہتا کہ آپ کا مزید نقصان کروں۔"

"اگر آپ کا دل اتنا ہی افسردہ رہتا ہے ہمارے مستقبل کا سوچ سوچ کے تو آپ ہمارا نقصان کرنے کا سوچتے ہی کیوں ہیں؟ یا شاید یہ باتیں کہہ کر آپ خود کو تسکین دیتے ہیں کہ میں کتنا اچھا ہوں، بس یہ لوگ مجھے برا کرنے پہ مجبور کر رہے ہیں۔"

وہ ہلکا سا ہنس دیا۔ "آپ نہیں مانیں گی؟"

"آپ کو میرا جواب معلوم ہے اور آپ اس ڈیل کے لیے یہاں آئے بھی نہیں۔ کیوں نا اب آپ وہ بات کریں جس کے لیے آپ یہاں آئے ہیں۔"

ہاشم مسکرا کے چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ "میں نے آپ کو ہمیشہ بہت ایڈمائر کیا ہے۔ گو کہ آپ کے پیچھے آپ کو گھمنڈی اور مغرور کہتا رہا ہوں، مگر آپ کے ساتھ کام کر کے اچھا لگتا ہے مجھے۔ میں یہاں صرف اس لیے آیا ہوں کہ میں ان اچھے پرانے دنوں کو بھی مس کرتا ہوں۔ میں چاہتا تھا ایک آخری بار ان دنوں کی یاد تازہ کروں۔ شاید پھر دوبارہ آپ کے ساتھ اس طرح بیٹھنے کا موقع نہ ملے۔"

"کیا آپ مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں؟"

"میں کچھ نہیں کرنا چاہتا زمر۔ آپ مجھے مجبور کر دیں تو یہ الگ بات ہے۔ آپ کی کافی نہیں آئی!" وہ اٹھتے ہوئے کوٹ کا بٹن بند کرتے ہوئے بولا تھا۔ چہرہ پرسکون تھا اور آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔

"جب میں جنید کو دو کافی لانے کا کہتی ہوں تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ ٹھیک دس منٹ بعد دروازے پہ آ کر کہے کہ میرے چند اہم مہمان آئے ہیں تاکہ میں جلدی جان چھڑا سکوں۔"

تب ہی دروازہ کھلا اور جنید نے اندر جھانکا۔ "میم! آپ کے مہمان آئے ہیں۔"

زمر نے مسکرا کے ابرو اچکا کے ہاشم کو دیکھا۔ وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ پھر میز پہ دونوں ہاتھ رکھے جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"میں آپ کو مس کروں گا۔" اس کی آواز میں کچھ ایسی ٹھنڈک سی تھی کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر سی دوڑ گئی' مگر بظاہر مسکراتی رہی۔

"اور کچھ؟"

ہاشم نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک پھولا ہوا لفافہ نکالا اور اس کے سامنے رکھا۔

"کچھ دن سے میں اپنی ماں کی کی گئی تمام فنانشل ٹرانزیکشن کا حساب کتاب کر رہا تھا تو فارس کی دوسری گرفتاری کے وقت' جب آپ اس کا کیس لڑ رہی تھیں' مجھے چند بے ضابطگیاں ملیں۔ معلوم کروانے پہ علم ہوا کہ... خیر جو علم ہوا وہ آپ کے ڈاکٹر نے اس کاغذ پہ لکھ دیا ہے۔ میں اس سب سے ناواقف تھا۔ پھر بھی معذرت کرتا ہوں اور صرف یہ چاہتا ہوں کہ جدا ہونے سے پہلے آپ اپنے بارے میں ساری حقیقت جانتی ہوں۔" لفافہ رکھ کے وہ اسے چونکتا چھوڑ کے مڑ گیا۔ دروازے تک پہنچ کے وہ مڑا۔

" taupe - (سلیٹی) ان دیواروں پہ taupe کلر کا پینٹ ہونا چاہیے۔" خلوص سے مشورہ دیا اور باہر نکل گیا۔ زمر تیزی سے لفافہ چاک کر رہی تھی۔ اس کے ابرو اکٹھے ہوئے تھے اور لب بھنچے ہوئے تھے۔

ندرت ابھی تک کاؤنٹر کے قریب کھڑی تھیں۔ بس چپ سی۔ وہ ان کے قریب سے گزرنے لگا تو رکا۔

"آپ کو چاہیے کہ اپنی بیٹی کو عدالت کی بھینٹ نہ چڑھائیں' اس کی عزت ایک دفعہ چلی گئی نا تو واپس نہیں آئے گی۔" نرمی سے ان کو دیکھ کر دھیرے سے بولا تھا۔ ندرت کی آنکھیں اسی طرح اس پہ جمی رہیں۔

"میں کثرات کو تسبیح پڑھتے پڑھتے میں سوچتی ہوں' تمہارا انجام کیسا ہوگا' ہاشم! پھر میں کوشش کرتی ہوں کہ اس انجام کی نسبت سے تمہارے لیے بددعا کروں' مگر نہیں کر پاتی۔ تمہاری سب سے بڑی سزا کیا ہونی چاہیے؟ تمہیں ہدایت مل جائے اور پھر تم ساری زندگی اپنے گناہوں کو یاد کر کے پچھتاتے رہو۔"

"تھینک یو۔ واٹ ایور!" وہ سر جھٹک کے آگے بڑھ گیا۔ ریسٹورنٹ کے مہمان مڑ مڑ کے اس کو دیکھ رہے تھے۔ ستائش سے۔ مرعوبیت سے۔ تحیر سے۔ سب کی نظریں مختلف تھیں۔ اگر پھر سب کی نظریں ایک سی ہوتیں تو یہ دنیا تو جنت ہوتی!

☼ ☼ ☼

اجاڑ بن میں اُترتا ہے ایک جگنو بھی
ہوا کے ساتھ کوئی ہم سفر بھی آتا ہے

سڑک رات کے اندھیرے کے باعث تاریک بھی تھی' مگر جابجا لگے اسٹریٹ پولز کی تیز روشنی کے باعث روشن بھی تھی۔ وہ سامنے دیکھتا توجہ سے ڈرائیو کر رہا تھا جب موبائل اسکرین چمکی۔ فارس نے مصروف انداز میں اسے اٹھایا' مگر اگلے ہی لمحے تیزی سے بریک پہ پاؤں رکھا۔ آبی نے لکھا تھا۔

"ہاشم نے مجھے یہ تصویر بھیجی ہے۔ ساتھ لکھا ہے۔

He cannot protect his women - (وہ اپنی عورت کو تحفظ نہیں دے سکتا)

"میں کیا کروں؟" اور نیچے تصویر میں وہ دونوں۔ فارس اور آبی۔ ایئرپورٹ سے نکلتے دکھائی دے رہے تھے۔

فارس نے آنکھیں بند کیں۔ (میں نے اس لڑکی کو کتنا نقصان پہنچا دیا۔ اف) پھر وہ جلدی جلدی لکھنے لگا۔

"کہاں ہیں آپ؟ میں آ رہا ہوں۔"

قریباً" ایک گھنٹے کے بعد وہ ہارون عبید کی رہائش گاہ میں بنے لان میں کھڑا تھا۔ سامنے اداس نظر آتی آبدار موجود تھی اور وہ اسے تسلی دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"میں نے آپ کی سیکورٹی ٹیم ری اسمبل کروی ہے۔ آپ کے فون میں ایک ایپ بھی ڈال دی ہے جس کے ذریعے آپ جہاں بھی ہوں گی، مجھے خبر ملتی رہے گی۔"

ابدار نے اثبات میں سر ہلایا۔ نگاہیں اس کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"میں نے آپ کو اس مصیبت میں ڈالا ہے، میں نکال بھی لوں گا۔ ڈونٹ وری۔"

"اگر اس نے مجھ سے کچھ پوچھا تو؟" وہ ڈری ہوئی نظر آتی تھی۔

"تو سارا الزام میرے اوپر ڈال دیجیے گا۔ میں نے آپ کے والد کی زندگی کو نشانہ بنا کر آپ کو بلیک میل کیا۔ کچھ بھی کہہ دیجیے گا، مگر یہ نہیں کہنا کہ آپ نے اپنی خوشی سے سب کیا۔" وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"میں آپ پہ الزام ڈال دوں؟ اتنی خود غرض لگتی ہوں میں آپ کو۔"

"بس وہی کریں جو میں نے کہا ہے۔ مجھ پہ الزام ڈالیے گا۔ بس۔" وہ ہاتھ اٹھا کے قطعیت سے کہہ رہا تھا۔ آنکھوں میں عجیب بے بسی بھری فکر مندی بھی تھی۔

"وہ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا فارس! اس نے آپ سے منسوب عورتوں کی بات کی ہے۔ میں تو آپ سے منسوب نہیں ہوں۔"

"جو بھی ہے۔ میں اس دفعہ اس کو اپنے سے جڑے لوگوں کو نقصان نہیں پہنچانے دوں گا۔" اس کی آواز میں برہمی در آئی۔ ابدار ہلکا سا مسکرائی۔ (تو یہ تھی فارس غازی کی کمزوری جس پہ وہ دوڑا چلا آیا تھا۔ اس کی حمیت۔ بے بسی کا وہ احساس کہ وہ اپنی عورتوں کی حفاظت نہیں کر سکا تھا پہلے۔)

"کاش میرے بابا بھی آپ جیسے ہوتے۔ اپنی عورتوں کے لیے اتنے ہی کیئرنگ ہوتے، جب کہ وہ تو اندر بیٹھے اس بات پہ خوش ہیں کہ مجھے آپ کی شکل میں ایک باڈی گارڈ مل گیا۔ اب وہ اس بات کو بھی کسی طرح ہاشم پہ دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کریں گے۔"

فارس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر بند کر لیے۔ ابدار کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"ہاں وہ سب سچ ہے۔" وہ چونکا۔

"میں نے تو کچھ نہیں پوچھا۔"

"مگر پوچھنا تو چاہتے تھے نا۔ بیٹھیے میں بتاتی ہوں۔" اس نے لان چیئر کی طرف اشارہ کیا تو وہ دھیرے سے کرسی کھینچ کے بیٹھا۔ وہ ہر آخری موڑ پہ ایک نئی سڑک کھول دیتی تھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنے پہ مجبور تھا۔

اب وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی اور نظریں کیاریوں میں لگے پھولوں پہ جمائے ہوئے تھی۔

"وہ اسکینڈل سچا ہے۔ میری ماں کے بارے میں مسز کاردار نے خبریں چھپوائی تھیں اخبار میں کہ وہ فلاں شخص کے ساتھ۔"

اس نے تکلیف سے سر جھٹکا۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا۔

"پھر بابا نے میری ماں کو قید کر دیا۔ کولمبو کے اسی تہ خانے میں۔ کرنل خاور نے اس جیل کو بنایا تھا اور اس میں جھول رکھے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پہ وہ ان کو نکال کر لے جا سکے۔ ہم لوگ کراچی چلے گئے۔ بابا نے سیاست ترک کر دی۔ ہم گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ فون نمبرز بدل دیے۔ سوشلائزنگ چھوڑ دی، مگر ماں کو نہیں چھوڑا بابا نے۔ ان کے سوئس اکاؤنٹ میں کافی رقم پڑی تھی۔ بلیک منی جو لانڈرنگ کر کے ادھر بھیجی گئی تھی، مگر ماں کو پتا تھا کہ جس دن اس اکاؤنٹ کا کوڈ ان کو دے دیا، یہ لوگ ان کو مار دیں گے۔ انہوں نے ہر تشدد سہا، مگر اکاؤنٹ نہیں دیا۔ پھر ایک دن خاور ان کو نکال کر لے گیا مسز جواہرات کے پاس۔ جو کام اتنے عرصے کا تشدد نہ کرا سکا، وہ مسز کاردار کے چند میٹھے بولوں، ہمدردی اور اعتماد نے کر دیا۔ میری ماں نے ان کو ساری معلومات دے دیں اور کہا کہ وہ پیسے نکلوا کر انہیں دے دیں تاکہ وہ روپوش ہو سکیں۔ وہ زخمی تھیں، ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتی تھیں۔ مسز کاردار نے اس اکاؤنٹ کو اپنے قبضے میں لیا، ان سے

مختلف کاغذات پہ دستخط کروائے اور پھر ان کو مروا دیا۔
وہ بہت بڑی رقم تھی اور وہ آج بھی ان ہی کے پاس ہے۔ نہ صرف رقم بلکہ میری ماں کے لاکر میں جیولری بھی بہت تھی۔ مسز کاردار ان سے صرف بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ انہوں نے بابا کو مسز کاردار سے چھینا تھا نا۔ اس دن سے بابا ان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں۔"

وہ بولے جا رہی تھی اور وہ سنے جا رہا تھا۔ غور سے' توجہ سے۔

"مجھے بابا کا ان کی طرف التفات دیکھ کر ڈر لگتا تھا کہ بابا ان کو اپنا ہی نہ لیں' مگر اب میں جان گئی ہوں کہ وہ ان کو صرف اذیت دینا چاہتے تھے۔ مسز کاردار مجھے پسند کرتی تھیں' ہاشم کے لیے' مگر جب سے میں نے ان کو بلیک میل کرنا شروع کیا ہے' وہ میری سب سے بڑی دشمن بن گئی ہیں۔"

"ہاشم کو آپ کب سے جانتی ہیں؟" اس نے اپنائیت سے پوچھا تھا۔

آبدار ابھی تک کیاری کو دیکھ رہی تھی' گو اسی سے ذرا سا مسکرائی۔ "اس نے میری جان بچائی تھی۔ میں سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ وہ مجھے باہر لایا تھا' اس نے مجھے نئی زندگی دی تھی۔"

"اور تب سے ہی آپ دوسروں کے NDEs میں دلچسپی رکھنے لگی ہیں؟ آپ خود بھی چند لمحے کے لیے کلینکل ڈیتھ کا شکار ہوئی تھیں شاید۔"

آبی نے چونک کے اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ بہت سے رنگ آکر گزر گئے۔ جیسے وہ ہیجان کا شکار ہو۔

"آپ کلینکل ڈیتھ کے تجربات پہ یقین رکھتے ہیں؟"

"نہیں آبدار! مجھے لگتا ہے یہ لوگ خواب دیکھتے ہیں اور اس کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں۔"

"وہ خواب نہیں تھا۔" آبی نے آنکھیں بند کیں۔

"وہ حقیقت تھی۔ میں نے پہلی دفعہ جانا تھا کہ روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ میری روح میرے جسم سے نکل گئی تھی۔ پانی کے اندر سے ہوتی ہوئی وہ ایک گہری تاریک سرنگ سے گزر رہی تھی۔ سرنگ بہت لمبی تھی۔ اختتام پہ روشنی تھی۔ میں بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ہوا سے ہلکی۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں اپنے جسم سے اوپر اٹھ گئی ہوں۔ اور نیچے میں نے دیکھا' وہ مجھے پانی سے باہر لا رہا تھا۔ اس کی شرٹ کی پشت پہ سیپی چپکی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے وہ منظر۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر ایک آڑ تھی۔ سفید لکیر۔ مگر وہ لکیر نہیں تھی وہ کچھ اور تھا۔ اس کے پار میری ماں کھڑی تھی۔ اور ایک کزن جو کچھ عرصہ پہلے فوت ہوا تھا۔ وہ مجھے واپس مڑنے کو کہہ رہے تھے۔ شاید وہیں میں نے اسے دیکھا۔ وہ ایک روشنی سے بنا وجود تھا۔ انسان نہیں۔ بس ایک وجود تھا۔

A being of light ۔

سراپا نور۔ اس سے پھوٹتے رنگ بدل رہے تھے۔ سرخ ہو رہے تھے جیسے وہ غصے میں ہو۔ وہ مجھ سے خفا تھا۔ میں نے بہت لوگوں کے انٹرویو کیے' یہودی' عیسائی' ہندو حتی کہ لادین لوگوں کے بھی۔ وہ کسی سے خفا نہیں تھا۔ کسی نے اس کے بدلتے رنگ نہیں دیکھے۔ تو میں نے کیوں دیکھے؟ سب کو اس نے علم حاصل کرنے کا اور لوگوں سے محبت کرنے کا پیغام دیا۔ میرے اوپر اس نے غصہ کیا۔ کچھ کہا نہیں۔ بس غصہ' طیش۔ غضب۔ یہی محسوس ہوا مجھے۔ کیوں؟"

"کیونکہ آپ نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی۔" وہ ہلکا سا مسکرا کے بولا۔ وہ بالکل ٹھہر گئی۔ یک ٹک ساکت سی اسے دیکھے گئی۔

"آپ اپنے والد کی توجہ کے لیے خودکشی کرنے جا رہی تھیں۔ آپ نے پہلے بتایا تھا ایک دفعہ۔ یہ جان اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے یوں ضائع کیا جائے۔ کبھی کسی خودکشی کر کے واپس آنے والے مریض کا انٹرویو کیا آپ نے؟"

آبی نے نفی میں سر ہلایا۔

"جو اپنی جان کو بے مقصد ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں یا دوسروں کی جانوں کے ساتھ کھیلتے ہیں' وہ توبہ کیے بغیر مر جائیں تو قابل معافی نہیں ہوتے۔ اس لیے شاید

اس نے آپ پہ غصہ کیا ہو۔" پھر گھڑی دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اب چلتا ہوں۔ کوئی مسئلہ ہو تو بتایئے گا۔"

آپی نے بدقت اثبات میں سر ہلایا۔

"تھینک یو۔ مسز زمر کو میرا اسلام کہیے گا۔"

"شیور۔" وہ گہری سانس لے کر پلٹ گیا۔ آبدار کی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

خالی دامن سے شکایت کیسی؟
اشک آنکھوں میں تو بھر جاتے ہیں

حنین نے آج پھر سبق نہیں سنایا تھا۔ میمونہ کا فون آیا تو اس نے سر درد کا بہانا کر دیا، لیکن وہ اصرار کرنے لگی کہ۔۔۔

تھوڑا سا قرآن سے دیکھ کر ہی سنا دو، بس ناغہ نہ ہو۔

تب وہ وضو کر کے اس کے بیڈ پہ آبیٹھی اور قرآن کھول لیا۔ سورۂ مریم آج کل وہ حفظ کر رہی تھی۔ قرآن سے دیکھ کر سنانے لگی۔ چند آیات کے بعد ہی اس کی سانس اتھل پتھل ہونے لگی، مگر وہ تلاوت کرتی رہی۔

" (کہا ابراہیم نے۔۔) اے میرے باپ! بے شک مجھے خوف ہے کہ تم پر اللہ کا عذاب آئے، پھر شیطان کے ساتھی ہو جاؤ۔ باپ نے کہا۔ اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے پھر گیا ہے۔ البتہ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور نکل تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے الگ ہو جا۔ کہا (ابراہیم نے) سلام ہے آپ کو، میں اپنے رب سے دعا کروں گا کہ آپ کو معاف کر دے۔ بے شک وہ مجھ پر بڑا مہربان ہے۔ اور میں آپ لوگوں کو بھی چھوڑتا ہوں اور جنہیں آپ لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں اور میں اپنے رب ہی کو پکاروں گا۔ امید ہے میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا۔ پھر جب ان سے علیحدہ ہوا اور اس چیز سے جنہیں وہ اللہ کے سوا پوجتے تھے۔ ہم نے اسے اسحٰق اور یعقوب جیسی اولاد دی اور ہم نے ہر ایک کو نبی بنایا اور ہم نے ان سب کو اپنی رحمت سے حصہ دیا اور ہم نے ان کے لیے "لسان الصدق" (سچی نام وری) بنائی۔"

سانس مزید پھول گیا تو اس نے بس کر دیا۔ "صدق اللہ العظیم" کہہ کر اجازت مانگی۔ فون بند کرنے کے بعد وہ ٹیرس پہ آبیٹھی اور کتنی ہی دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ڈپریشن سا ڈپریشن تھا۔ اور تب اس کی نظر کالونی میں دور ایک درخت سے ٹیک لگائے شخص پہ پڑی۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا اس عام سے مورچال کو بہت حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ تاریکی کے باوجود وہ اس کی آنکھیں پڑھ سکتی تھی۔ وہ تیزی سے نیچے بھاگی۔

"نوشیرواں بھائی!" چند منٹ بعد وہ اپنا گیٹ عبور کر کے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کے سیدھا ہوا، مگر خاموش ویران آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟ جانتے ہیں نا کورٹ میں یہ بات آپ کے خلاف جا سکتی ہے؟ اس لیے چلتے بنیں۔" درشتی سے وہ بولی تھی۔

"لوزر۔۔۔ سپر لوزر۔۔۔ یہی کہا تھا نا تم نے مجھے۔ اگر پیچھے مڑ کے دیکھو تو یہ سب تمہاری زبان کی وجہ سے شروع ہوا تھا۔" وہ تلخی سے بولا تھا، ایسی تلخی جس میں ملال زیادہ تھا۔

حنین چونک کے واپس گھومی۔ "کیا؟"

"تم دونوں کو کبھی احساس ہوا حنین! کہ تم لوگ اپنے احساس برتری میں مجھے کتنا ہرٹ کر جاتے تھے؟ میری کتنی بے عزتی کرتے تھے؟ اور آئی ڈونٹ کیئر اگر تم یہ سب ریکارڈ بھی کر لو، لیکن میں نے جو کچھ کیا، وہ اس لیے کیا کیونکہ تم دونوں نے مجھے ہمیشہ بے عزت کیا۔ کبھی میری عزت نہیں کی۔"

"صحیح!" حنین نے سینے پہ بازو لپیٹ لیے اور سر کو خم دیا۔ "میں نے واقعی آپ کو بہت ڈی گریڈ کیا ہے۔ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"لیکن اس کے باوجود میں پورے ملک میں بدنام ہو چکا ہوں اور تمہارا بھائی دو قتل کر کے بھی بدنام نہیں ہوا۔ اس کے خلاف انکوائری نہیں ہوتی۔۔۔ وہ ہر دفعہ بچ

جاتا ہے۔ کوئی ایک لمحے کے لیے بھی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ وہ اور تم... تم دونوں بھی میرا دل دکھاتے تھے۔" وہ دکھی دل سے کہہ رہا تھا گویا پھٹ پڑا تھا۔

"کیونکہ ہم "لوگ" تھے اور "لوگ" باتیں کرتے ہیں نوشیرواں بھائی! لوگوں کا کام ہی باتیں کرنا ہے۔ آپ کو لوگوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے تھی' لیکن آپ بھی کیسے پروا نہ کرتے۔" وہ تلخی سے ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"جب لوگ ہمارے بارے میں باتیں کرتے ہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے ہمیں لگتا ہے' ہماری عزت خراب ہوگئی ہے۔ ہم دوبارہ سر اٹھا کے نہیں جی سکیں گے۔ ہمارا خاندان ہمیں رسوا کردے تو لگتا ہے ساری زندگی ہی ختم ہوگئی ہے۔ بدکاری کی سزا سنگسار کرنا ہے۔ سرعام پتھر مار کر ہلاک کرنا۔ یہ ایک توہین آمیز سزا ہوتی ہے۔ ایک زمانے میں ابراہیم علیہ السلام کو ان کے والد نے بھی سزا سنائی تھی۔ ان کی عزت ختم کرنے کے لیے۔ کیونکہ لوگ ان کے بارے میں باتیں کررہے تھے کہ ان کے بتوں کو زمین بوس کرنے والا ہے ایک نوجوان... کہتے ہیں جسے ابراہیم۔ وہ سچے تھے' مگر زمانے بھر نے ان کے خلاف باتیں کیں' سازشیں کیں۔ ان کو تنہا کردیا۔ ان کی عزت ختم ہو کر رہ گئی۔ ان کو ان کے گھر سے نکال دیا گیا' جب آگ میں نہ جلا سکے تو ملک سے نکال دیا۔ پھر کیا ہوا؟" وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی۔ شیرو یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔

"پھر یہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اسحق بھی دیا' اور یعقوب بھی۔ ان کو اللہ نے کعبہ بنانے کا شرف بھی دیا اور ان کو رہتی دنیا تک ہماری نمازوں کا' ہمارے درود کا حصہ بنا دیا۔ تین بڑے مذاہب کے پیروکار یہود... عیسائی... مسلمان... اس بات پہ جھگڑتے ہیں کہ ابراہیم ہمارا ہے۔ سب ان کو اپنانا چاہتے ہیں' ان کو اپنے دین میں داخل دکھانا چاہتے ہیں جن کو ان کے گھر والوں نے نکال دیا تھا۔ جن کی وہ لوگ عزت نہیں کرتے تھے۔"

وہ بول رہی تھی اور اس کا سانس مزید پھولتا جارہا تھا۔ اس کی رنگت سرخ ہوکے تمتمانے لگی تھی اور آواز بلند ہورہی تھی۔

"اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کے لیے لسان الصدق بنائی۔ سچی زبان۔ سچی تعریف۔ نیک نامی۔ جو رہتی دنیا تک اور اس کے بعد بھی قائم رہے گی۔ مگر ہم' نوشیرواں بھائی! ہم کتنے بھلکڑ لوگ ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ لوگ ہمیں بے عزت کریں گے تو ہماری عزت اور نیک نامی چلی جائے گی؟ ہم رسوا ہو جائیں گے؟ لوگ ہمارے بارے میں باتیں کریں گے تو ہم کبھی سر اٹھا نہیں سکیں گے؟ تو پھر کون تھا وہ شخص جس نے اپنے وقت کے بڑے بڑے خداؤں کو کلہاڑا مار کے توڑا تھا' جس کے بارے میں سب لوگ بری بری باتیں کرتے تھے مگر آج اس جیسا نیک نام کوئی نہیں؟ نہیں' نوشیرواں بھائی... لوگوں کا کام تو ہوتا ہے باتیں کرنا۔ کسی انسان کی عزت لوگوں کی زبانوں سے نہیں بندھی ہوتی کہ وہ زبان کھولیں گے اور عزت گرجائے گی۔ اللہ..."

اس نے انگلی اٹھا کے اوپر اشارہ کیا۔

"صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے ہر انسان کی عزت۔ وہ نہ چاہے تو کوئی رسوا نہیں ہو سکتا۔ اور جانتے ہیں کیوں اچھے بھلے دین دار لوگ ایک دن اچانک سے ہماری نظروں سے گرجاتے ہیں؟ جب ان کی سیاہ کاریاں سامنے آتی ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ یہ بدل گئے ہیں' مگر وہ پہلے بھی اچھے نہیں تھے۔ ان کی نیت شروع سے خراب تھی اور شروع میں اللہ نے ان کو چانس دیا مگر جب انہوں نے اپنی نیت درست نہ کی تو اللہ نے ان کی تمام محنتوں اور کوششوں کو ان ہی کے ہاتھوں برے کاموں میں لگایا' یوں ان کی نیتیں سب پہ کھل گئیں۔ انسان بری نیت نہ رکھے تو اللہ اسے کبھی رسوا نہیں کرتا۔ یہی پوچھنا چاہتے تھے نا آپ۔ یہی ہے آپ کا جواب۔

کسی کی عزت کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ہمارا سارا خاندان ہماری بے عزتی کرے گا تو اللہ اس سے کہیں زیادہ لوگ پیدا کردے گا جو ہماری عزت

کریں گے اگر ہم نے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لی ہے' اور دوسروں کا بھلا سوچنے لگ گئے ہیں نا' ہماری نیت درست ہے نا' تو اللہ ہمیں کسی انسان کے ہاتھوں رسوا نہیں کرے گا۔ اگر ہم انسانوں کی بھلائی سوچیں' اور اپنی نیت کو نیک کرلیں تو ملے گی ہمیں وہ عزت جسے کوئی انسان داغ دار نہیں کرسکے گا۔ اس لیے ان بتوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ کلہاڑا مار کے ان کو توڑ دینا چاہیے۔ کوئی ہمارے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھے تو اس کی آنکھ کو تیر مار کے پھوڑ دینا چاہیے۔ کسی کو نقصان پہنچانے میں پہل کرنے کا نہ سوچنا ہے' نہ کرنا ہے۔ لیکن ہماری غلطیوں کی کہانیوں کے مرد کردار اگر ہم عام لڑکیوں کو یہ کہہ کے دھمکائیں کہ وہ ہماری تصاویر یا ہمارے راز پوری دنیا کو دکھادیں گے تو ان کو کہنا چاہیے کہ جاؤ جاؤ... دکھادو سب کو۔ تم پھر بھی مجھے رسوا نہیں کرسکتے۔ دنیا کے سارے بدکردار مرد اکٹھے ہوجائیں وہ تب بھی تائب ہوئی ہم عام لڑکیوں کو رسوا نہیں کرسکتے۔ یہ ہوتی ہے توبہ اور اچھی نیت۔

عزت پانا چاہتے ہیں نا آپ؟ تو لوگوں کی بھلائی کے لیے کام کرنا شروع کریں۔ میں بھی عزت پانا چاہتی ہوں' اس لیے میں اب ڈرے بغیر دوسروں کے لیے سوچوں گی۔ اپنے بھائی کا سوچوں گی جس کے لیے مجھے گواہی دینی ہے۔ پھر تیر مارنا پڑے یا کلہاڑا' اللہ شاہد ہوگا کہ میری نیت بری نہیں تھی۔"

اس کی گلابی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ چہرہ دہک رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سن سا ہوا اسے دیکھے جارہا تھا۔ وہ اب اندر کی طرف مڑ گئی تھی مگر وہ ہنوز وہیں کھڑا تھا۔ اس کے الفاظ کی بازگشت ابھی تک کالونی کے درختوں سے ٹکرا کے پلٹ رہی تھی۔

فارس جس وقت کمرے میں آیا' وہ بیڈ پہ کروٹ لیے لیٹی تھی۔ رخ دوسری طرف تھا۔ آنکھوں پہ بازو رکھے ہوئے تھی۔

"محترمہ... وہ دن کب آئے گا جب میں گھر آؤں گا اور آپ میرے کسی جرم کی پاداش میں مجھ سے خفا نہیں بیٹھی ہوں گی؟" وہ سنگھار میز کے قریب کھڑا' گھڑی اتارتے ہوئے مسکراہٹ دبائے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا جو ہنوز کروٹ لیے لیٹی نظر آرہی تھی۔

"تو پھر پاکستان پینل کوڈ کی کون سی دفعہ کے تحت میرے اوپر آج چارجز فریم کیے جائیں گے؟ میں آپ سے بات کررہا ہوں' زمر بی بی۔" گھڑی اتار کر رکھی اور آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے شرٹ کی آستینیں موڑنے لگا۔

"نہیں لگایا میں نے اس کا دیا ہوا پرفیوم۔ پھر کیا ہوا ہے؟ کس بات پہ ناراض ہو؟" وہیں سے اسے پکارا۔ وہ ہلی بھی نہیں۔ نہ کوئی جنبش' نہ آواز۔ وہ پہلے قدرے حیران ہوا' اور پھر گھوم کے اس کی طرف آیا۔ وہ چہرے پہ دونوں بازو رکھے ہوئے تھی۔ گرچہ چہرہ نظر آرہا تھا۔ وہ گیلا تھا... بے حد گیلا۔

"زمر... کیا ہوا ہے؟" وہ ششدر سا اس پہ جھکا' اور اس کے بازو ہٹائے۔ اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ چہرہ سامنے آیا تو وہ نیچے فرش کو دیکھتی روئے جارہی تھی۔ پلکوں پہ اتنا پانی لدا تھا کہ حد نہیں۔

"کیا ہوا ہے؟ اٹھو بیٹھو۔" وہ حیران پریشان سا سہارا دے کر اسے بٹھانے لگا۔ اس نے پھر کوئی مزاحمت نہیں کی' بس ڈھیلی سی اٹھ کے بیٹھ گئی۔ گھنگھریالے بالوں کی پونی ڈھیلی پڑ چکی تھی اور شدت گریہ سے ناک اور آنکھیں گلابی ہو کے دہک رہی تھیں۔

"مجھے بتاؤ' کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟" کبھی وہ اس کو شانوں سے تھام کر اپنی طرف موڑتا' کبھی اس کا چہرہ تھپتھپاتا۔ "ادھر دیکھو۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"مجھے ہمیشہ لگتا تھا کہ میں عام نہیں ہوں۔ بلکہ عام لوگوں سے بہت مختلف ہوں۔ برتر ہوں۔" وہ روتے ہوئے ہچکیوں کے دوران بولی تھی۔ وہ فکرمندی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے لگتا تھا میں چونکہ پُراعتماد ہوں' مضبوط ہوں ایک کریڈیبلٹی ہے میری' تو ہاشم مجھے کچھ تو سمجھتا ہوگا۔ کورٹ میں مجھے لائٹ نہیں لیتا تو اسے بھی نہیں

لیتا ہو گا۔ مجھے لگتا تھا کوئی تو اہمیت ہو گی میری۔ ایک عورت ہونے کی حیثیت سے۔ ایک باہمت بہادر عورت ہونے کی حیثیت سے۔ مگر نہیں۔ میں تو ان لوگوں کے لیے ایک چیونٹی سے بڑھ کر نہیں ہوں۔"

"کیا ہوا ہے زمر؟ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔" وہ پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔ زمر نے بھیگی آنکھیں اٹھا کے اسے دیکھا۔

"اس لیے مارا پیٹا تھا تم نے میرے ڈاکٹر کو؟ اسی لیے نا؟"

فارس ایک دم بالکل گنگ سا ہو گیا۔ "کیا؟"

"مجھے پتا ہے تم نے اسے مارا تھا۔ کیوں مارا تھا؟ آج ہاشم نے بتا دیا ہے۔"

"کیوں مارا تھا؟" وہ بنا پلک جھپکے اس کو دیکھ کے بولا تھا۔

"جب تم جیل میں تھے تو اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ میرا کڈنی ناکارہ ہو چکا ہے۔ تم سمجھ گئے تھے، میں نہیں سمجھی تھی۔ مجھے لگتا تھا میں بہت عقل مند ہوں مگر میں عام سی بے وقوف سی عورت ہوں۔" وہ پھر سے بلک بلک کے رونے لگی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ بتایا ہے اس نے تمہیں؟ بس یہی کہا اس نے یا اس نے کچھ اور بھی؟" وہ سانس روکے پوچھ رہا تھا۔

"اس سے زیادہ وہ کیا کر سکتا تھا فارس؟ اس سے زیادہ کوئی کیا کر سکتا تھا؟" وہ آنکھوں پہ ہاتھ رکھے چہرہ جھکائے روئے جا رہی تھی۔ "میں نے کیا بگاڑا تھا ان لوگوں کا؟ میں نے ان کو کب نقصان پہنچایا؟ کبھی ان کا دل بھی نہیں دکھایا پھر کیوں مذاق بنایا انہوں نے میری زندگی کو؟" فارس نے گہری سانس لی اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگایا۔

"آئی ایم سوری، مجھے تمہیں بتانا چاہیے تھا، مگر میں نہیں بتا سکا۔ میرے اندر ہمت نہیں تھی تمہیں پھر سے توڑنے کی۔" وہ اس کا سر نرمی سے تھپکتے ہوئے ملال سے کہہ رہا تھا۔

"تماشا بنا دیا میری زندگی کو میں کیا ہوں ان کے لیے؟ فارس میں کیا ہوں ان کے لیے؟" وہ اسی طرح روتے ہوئے بولتی جا رہی تھی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"وہ دن بہت برے تھے۔ تم جیل میں تھے۔ میں اکیلی تھی۔ میں کسی سے اپنا مسئلہ شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ میں کتنی پریشان تھی۔ مجھے لگا میں مرنے جا رہی ہوں۔۔۔ میں مرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے پھر بھی خود کو مرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتا، دور کسی غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے کہہ رہا تھا اور وہ آنکھیں اس کندھے پہ رکھے روئے جا رہی تھی۔

"ہر روز مجھے لگتا تھا کہ میں مرنے والی ہوں۔ انہوں نے میری ساری امیدیں توڑ دیں۔ مجھے خواب دیکھنے کا موقع بھی نہ دیا۔ میں نے کیا بگاڑا تھا ان کا؟ مجھے کیوں یہ ہر دفعہ پیر تلے مسل کر چلے جاتے ہیں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میرے سر پہ تلوار لٹک رہی تھی۔ زمر مرنے والی ہے۔ ہر روز یہ الارم بجتا تھا۔ میں تمہارے ساتھ ٹھیک سے اندر سے خوش بھی نہیں ہو پاتی تھی۔ اندر ہی اندر مجھے ڈپریشن کھا رہا تھا۔ میں نئی زندگی کو پلان بھی نہیں کر پاتی تھی۔ کیوں کھیلتے رہے وہ میری صحت کے ساتھ؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ٹھیک ہو۔ تمہیں اب کچھ نہیں ہو گا۔"

"اب میں کیسے یقین کروں کہ اب میں زندہ رہوں گی! میں مرنے کے لیے تیار تھی۔ میں اپنی تیاری کو کیسے بدلوں فارس! میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔" وہ اسی طرح روئے جا رہی تھی۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے باعث اس کی آواز مدھم تھی۔ الفاظ بے ربط اور گڈمڈ سے ہو رہے تھے۔ وہ اسے دلاسا دیتے ہوئے گہری سوچ میں گم تھا۔

"کیا وہ اسے بتائے؟ کیا وہ اسے ایک دفعہ پھر سے توڑے؟ اونہوں۔ اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ زمر

کے آنسو ہنوز آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔

☆ ☆ ☆
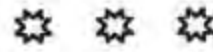
تو میرا حوصلہ تو دیکھ ' داد تو دے کہ اب مجھے
شوق کمال بھی نہیں ' خوف زوال بھی نہیں

عدالتی کمرے میں آج عجیب تناؤ زدہ ماحول تھا۔ جواہرات کاردار مطمئن سی سیاہ لباس اور ہیروں کی جیولری پہنے شاہانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ نوشیرواں بھی ہر دفعہ کی طرح تیار سا' ویران چہرہ لیے موجود تھا۔ ساتھ بیٹھا ہاشم چبھتی مسکراتی نظروں سے کٹہرے میں کھڑی حنین کو دیکھ رہا تھا جس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک پلندہ تھا۔

اس نے کھلتے ہوئے گلابی رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلابی دوپٹہ سر پہ لپیٹے' وہ قرآن پہ ہاتھ رکھ کے حلف اٹھا رہی تھی۔ آج ماتھے کے کٹے بال ماتھے پہ گرنے کے بجائے پن لگا کر پیچھے کو چوٹی میں کس دیے تھے اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ وہ تروتازہ چہرے کے ساتھ' بہت اطمینان سے کھڑی تھی۔ جج صاحب کرسی پہ پورا گھومے اس کو دیکھ رہے تھے۔ زمر کے قریب بیٹھا سعدی سر جھکائے ہوئے تھا' بار بار اٹھنے کا ارادہ کرتا مگر زمر روک دیتی۔

"اسے اکیلا چھوڑ دو گے؟" اور وہ بیٹھ جاتا۔

آخری کرسیوں پہ بیٹھے فارس نے گردن موڑ کے سیم کو دیکھا جس کی نظریں کٹہرے پہ جمی تھیں۔ فارس بے چین سے انداز میں بولا۔

"تمہیں آج نہیں آنا چاہیے تھا اسامہ۔"

اسامہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "اسے مورل سپورٹ نہ دوں؟ اکیلا چھوڑ دوں؟ ٹھیک ہے' جب وہ میری الماری سے چاکلیٹس کھا جاتی ہے اور میری کاپی پہ کور نہیں چڑھا کے دیتی تو دل کرتا ہے اس کی گردن مروڑ دوں' لیکن ہے تو وہ میری بہن نا۔"

"اوکے تھینک یو اسامہ!" وہ خفگی سے سر جھٹک کے سامنے دیکھنے لگا۔

"اچھا آپ کی عمر کیا ہے؟" جج صاحب نے اس نازک' دبلی پتلی' دراز قد مگر کم عمر لڑکی کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ عام شکل و صورت کی تھی اور کمزور سی دکھتی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں چمک دار تھیں اور پیشانی روشن تھی۔ سوال پہ اس نے نگاہوں کا رخ ان کی طرف پھیرا۔

"بائیس سال یور آنر۔" مگر جج صاحب کو وہ اب بھی "مائنر" (نابالغ) لگ رہی تھی سو سمجھاتے ہوئے بولے۔

"اچھا ایسا ہے کہ ابھی یہ مسز زمر آپ سے سوال کریں گی' اس کے بعد وکیل صفائی آپ سے جرح کریں گے اور......"

"جی یور آنر' قانون شہادت آرٹیکل 132 کے تحت پہلے جس وکیل نے مجھے بلایا ہے وہ میری examination in chief کریں گی' پھر وکیل صفائی مجھے کراس کریں گے' پھر مسز زمر مجھے دوبارہ سے re-examine کر سکتی ہیں مگر صرف ان باتوں کی وضاحت کے لیے جو کراس کے دوران سامنے آئی ہیں' اس کے بعد ہاشم کاردار مجھے دوبارہ سے ری کراس کر سکتے ہیں لیکن وہ نئے سوال پوچھنے کا بھی حق رکھتے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔" وہ ایک ہی سانس میں بولے چلی گئی۔

سیم نے فارس کے قریب ہو کر سرگوشی کی "اب یہ زیادہ اوور ہو رہی ہے۔" مگر فارس اب غور اور اچنبھے سے اسے دیکھ رہا تھا جو غیر معمولی طور پہ کمپوزڈ نظر آ رہی تھی۔ جج صاحب اب پورا گھوم کے اسے دیکھنے لگے تھے۔

"بہرحال کاردار صاحب آپ سے جرح کے دوران متعلقہ سوالات کے علاوہ کوئی ایسا سوال بھی پوچھ سکتے ہیں جو......" وہ پھر سے اسے وارن کرنے لگے۔

"جو قانون شہادت آرٹیکل 141 کے تحت میری veracity چیک کرنے کے لیے ہو' میرا بیک گراؤنڈ کام وغیرہ جاننے کے لیے ہو یا۔" نظروں کا رخ ہاشم کی طرف موڑا۔ "میرا کردار مسخ کرنے کے لیے ہو۔ اور

کورٹ ان سوالوں کی اجازت دے گی، میں جانتی ہوں۔"
جج صاحب نے کھلے لب بند کیے، پھر بولے۔ "میں صرف یہ تسلی کر رہا تھا کہ آپ کو اپنے رائٹس (حقوق) معلوم ہیں یا نہیں۔"

I know my right more than
I know my wrongs your honour

وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ دھیما، شائستہ، مسکرا کے بولنے والا انداز۔ ہاشم محظوظ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھ رہا تھا۔ سیم نے پھر سے منہ بنایا (اوور)۔ فارس بے چین تھا اور سعدی فکر مند۔ "یہ کیا کر رہی ہے زمر؟"

"وہ حنین ہے اور اس کے دماغ میں کیا چلتا رہتا ہے، میں نہیں جانتی۔" وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے سامنے آٹھہری۔

"ریکارڈ کے لیے اپنا نام بتائیے۔"

"حنین ذوالفقار یوسف خان۔" وہ زمر کو دیکھ کے گردن اکڑائے بولی تھی۔

"مدعی سعدی یوسف سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟"

"وہ میرا بھائی اور brother in arms (اچھا ساتھی) ہے۔" وہ سعدی کو دیکھ کے مسکرائی۔ وہ مسکرا بھی نہ سکا۔

اب زمر اس سے چند چھوٹے موٹے سوالات کرنے لگی۔ وہ اعتماد اور سبھاؤ سے جواب دیتی گئی۔

"بیس مئی کی شام، جب آپ میرے کمرے میں موجود تھیں تو آپ نے باہر کیا دیکھا؟"

"میں نے دیکھا، سعدی یوسف گھر کی پچھلی گلی میں چلتا آ رہا تھا، اور وہ فون پہ کسی سے بات کر رہا تھا۔ وہ مخاطب کو حلیمہ کے نام سے پکار رہا تھا، اور کہہ رہا تھا کہ وہ اس کے پاس سے ملنے کل آنا چاہتا ہے۔ یعنی وہ اپائنٹمنٹ لے رہا تھا۔"

"اور آپ کے عزیز و اقارب میں حلیمہ کس کی سیکرٹری کا نام ہے؟"

"ہاشم کاردار کی سیکرٹری ہے۔ وہ ہاشم نے مجھے اور آپ کو خود بتایا تھا جب ہمارے سامنے ان کی سیکرٹری کا فون آیا تھا۔"

"آپ کو یقین ہے کہ آپ نے یہی نام سنا تھا؟"

"جی سو فیصد۔"

"ہمیں نوشیرواں کاردار کے اغوا کے بارے میں بتائیے، تاکہ عدالت کو معلوم ہو کہ وہ کس کردار کا حامل ہے؟"

زمر سوال پوچھ رہی تھی اور وہ جواب میں پورا واقعہ بتا رہی تھی کہ کس طرح اس نے نوشیرواں کا ڈراما پکڑا۔ نوشیرواں زخمی نظروں سے اسے دیکھے گیا مگر اسے، ویسے حنین سے اب کوئی گلہ نہیں رہا تھا۔

"آخری دفعہ جب ہاشم کاردار آپ کے گھر آئے تھے، لاسٹ فرائیڈے، تو کیا کہا تھا انہوں نے؟"

"انہوں نے سب کے سامنے معافی مانگی تھی اور اقرار کیا تھا کہ نوشیرواں اور وہ ذمہ دار ہیں سعدی بھائی کے اغوا اور ارادہ قتل کے۔ انہوں نے ہم سے سب بھول کر آگے بڑھنے کی بات کی تھی۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بتاتی گئی۔

"حنین! آپ کو یقین ہے کہ انہوں نے اعتراف جرم آپ کے سامنے کیا تھا؟" زمر جج صاحب پہ ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے حنین سے پوچھ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"جہاں تک مجھے یاد ہے، انہوں نے اعتراف جرم کے ساتھ افسوس کا اظہار بھی کیا تھا۔"

"Your witness!" (آپ کی گواہ) زمر مڑی اور ہاشم کو اشارہ کیا۔ وہ مسکراتا ہوا اٹھا، عادتاً کوٹ کا بٹن بند کیا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سعدی کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ چاہ کر بھی چہرہ اٹھا نہیں پا رہا تھا۔ نظریں زمر کے کاغذات پہ رکھے کھلے پین پہ جمی تھیں جس کی نب تیز دھار پھل کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے اس پین کو مٹھی میں دبا لیا۔ نظریں ہنوز جھکی تھیں۔

"حنین یوسف!" ہاشم مسکرا کے اس کی آنکھوں

میں دیکھ کے بات کا آغاز کرنے لگا۔ "کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ۔۔۔"

"اور لینگویج کا کیا؟" وہ تیزی سے بولی۔ ہاشم رکا، جج صاحب نے بھی گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"قانون شہادت کے تحت آپ کو مجھ سے پوچھنا چاہیے کہ میں کس زبان میں زیادہ کمفرٹیبل ہوں اور میرا بیان اسی زبان میں ریکارڈ ہونا چاہیے۔ یہ میرا حق ہے اور آپ نے مجھ سے اس بارے میں نہیں پوچھا۔"

"او کے جی۔ آپ کس زبان میں آرام دہ ہیں؟"

"اردو یا انگلش۔ کسی میں بھی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ ہاشم نے مسکرا کے سر کو خم دیا۔

"حنین! آپ کے بیان کے مطابق آپ نے سعدی کو مبینہ طور پہ کسی کی سیکرٹری کا نام لیتے سنا تھا۔ حلیمہ۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی!"

"اور کیا آپ نے سرنیم بھی سنا تھا؟ حلیمہ کون؟ اگلا نام؟"

"بھائی نے صرف حلیمہ بولا تھا۔"

"حنین آپ ماشاء اللہ ایک ذہین لڑکی ہیں، اتنا تو جانتی ہوں گی کہ آفیشل capacity میں ایمپلائز کو عموماً" ان کے سرنیم کے ساتھ پکارا جاتا ہے۔ مس یوسف، مسز کاردار۔ فرسٹ نیم ٹرم نہیں یوز کی جاتیں۔ کیا ایسا نہیں ہے؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے کیونکہ باسز عموماً" اپنی سیکرٹریز کے ساتھ فرینک ہوتے ہیں اور ان کو فرسٹ نیم ٹرم کے ساتھ ہی بلاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ میرے سامنے اپنی سیکرٹری کا فون اٹینڈ کرنے کے بعد آپ نے ہمیں اس کا نام حلیمہ ہی بتایا تھا۔ نو سرنیم!"

"لیکن کیا آپ نے سعدی کو فون پہ میرا نام لیتے سنا یا نوشیرواں کا؟"

"نہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔

"اور وہ حلیمہ کوئی بھی حلیمہ ہو سکتی تھی۔ کسی کی بھی سیکرٹری رائٹ؟"

"آب جیکشن یور آنر۔" زمر تیزی سے اٹھی۔ اس سے پہلے کہ زمر اعتراض کی وجہ بتاتی یا جج صاحب رولنگ دیتے، حنین نے جج صاحب کی طرف رخ پھیر کے کہا۔

"کیا آپ مسز زمر کو کچھ دیر کے لیے خاموش رہنے کا کہہ سکتے ہیں کیونکہ مجھے ان کے سوالوں پہ کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں ہر سوال کا جواب دوں گی۔"

"وہ آپ کی وکیل ہیں۔ اور۔۔۔"

"وہ میری وکیل نہیں ہیں۔ میں اپنی وکیل خود ہوں۔ اب میں جواب ۔۔۔" اس نے سوالیہ نظروں سے ہاشم کو دیکھا۔ زمر ۔۔۔ ہچکچائی۔ وہ برہمی سے واپس بیٹھی۔ سعدی ابھی تک چین ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔

"جی، وہ کوئی بھی حلیمہ ہو سکتی تھی، میں نے صرف فرسٹ نیم سنا تھا۔"

"اور آپ پورے وثوق سے کہتی ہیں کہ آپ کے سامنے میں نے اعتراف جرم کیا تھا؟"

"جی۔" اس نے ہاشم کی آنکھوں میں دیکھ کے کہا۔ اس نے افسوس سے سر جھٹکا۔ گویا ننھی لڑکی کو دیا آخری موقع بھی ضائع چلا گیا ہو۔

"اور کیا سعدی کے واپس آنے سے قبل کیا کبھی آپ نے میرے سامنے ذکر بھی کیا کہ آپ میری سو کالڈ اصلیت سے واقف ہیں۔"

"نہیں۔" وہ قدرے آہستہ سے بولی تھی۔

"آپ کے بیان کے مطابق آپ بہت پہلے سے واقف ہو گئی تھیں لیکن کیا آپ نے کبھی مجھ سے کھل کے کہا کہ میرے بھائی نے آپ کے بھائی کو اغوا کر رکھا ہے؟"

"نہیں۔"

"کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ لوگ ایک دم سے اس سب کے لیے ہمارے خاندان کو مجرم ٹھہرانے لگے کیونکہ آپ مجھ سے بدلہ لینا چاہتی تھیں؟" وہ اس کے سامنے کھڑا بے رحمی سے جرح کر رہا تھا۔

"کس چیز کا بدلہ؟" سعدی کی گرفت چین پہ سخت

ہو گئی۔ جس کی آنکھوں میں خون اترنے لگا۔

"آپ کو اگنور کرنے کا بدلہ۔" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"کس طرح کے اگنور کرنے کا بدلہ؟" اس نے سپاٹ انداز میں دہرایا۔

"کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ چند ماہ تک مجھ سے واٹس ایپ پہ بات کرتی تھیں؟" سعدی نے آنکھیں زور سے میچیں۔ زمر نے اس کی اکڑی ہوئی مٹھی پہ ہاتھ رکھا۔ "اور میری توجہ چاہتی تھیں۔"

"میں آپ سے اپنے بھائی کے بارے میں پوچھتی تھی جیسے علینا اپنے کلاس فیلوز سے بات کرتی ہے۔"

"کیا یہ درست نہیں ہے کہ آپ اپنی فیملی سے چھپ کے مجھ سے بات کرتی تھیں۔"

"میں آپ سے فیس بک پہ بھی سب کے سامنے بات کرتی تھی جیسے علینا اپنے کولیگز سے کرتی ہے۔"

"مگر کیا یہ درست نہیں ہے کہ یہ آپ کی فیملی میں غلط سمجھا جاتا ہے؟"

"میری فیملی میں یہ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے جیسا علینا کی فیملی میں سمجھا جاتا ہے مگر جیسے علینا ضرورت کے تحت فیس بک پہ اپنے کولیگز وغیرہ سے بات کر لیتی ہے، میں بھی کر لیتی ہوں۔"

"ایکسکیوزمی یہ علینا کون ہے؟" ہاشم نے اکتا کے بات کاٹی۔

"جج صاحب کے ریڈر کی بیٹی۔" اس نے معصومیت سے کہہ کر چند کاغذ جج صاحب کی طرف بڑھائے۔ جہاں ریڈر صاحب چونکے، وہیں ہاشم ٹھہرا، اور زمر نے بے اختیار پیشانی چھوئی۔ (اف۔ اف)

"یہ یور آنر، ریڈر صاحب کی بیٹی کے فیس بک کے کچھ اسکرین شاٹس ہیں، اور یہ میری ہاشم بھائی سے کی بات کے اسکرین شاٹس۔ علینا اپنی یونیورسٹی میں ایک نہایت باعزت اور برائیٹ اسٹوڈنٹ ہیں اور جیسے وہ بولتی ہیں، میں بھی ویسے ہی بولتی تھی۔ اب ہمارے بڑے اس بارے میں کیا سوچتے ہیں، مجھے نہیں پتا۔ آپ یور آنر کے ریڈر سے پوچھ لیں کہ کیا وہ اس طرح بات کرنے کو برا سمجھتے ہیں؟"

ہاشم نے بے اختیار ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ جج صاحب نے کاغذات پہ ایک نظر ڈالی اور عینک کے پیچھے سے گھور کے حنین کو دیکھا۔

"آپ ریڈر کے بارے میں اس طرح کی بات نہیں کر سکتیں۔" انہوں نے تنبیہہ کی۔

"یور آنر! قانون میں کہیں بھی کوئی شق مجھے منع نہیں کرتی اس چیز سے، سو میں یہ لے آئی۔" معصومیت سے شانے اچکائے۔

"میری بیٹی کا یہاں کیا ذکر؟"

"میں بھی تو کسی کی بیٹی ہوں۔ میرے ذکر کی اجازت بھی تو آپ لوگ دے رہے ہیں نا۔" پھر ہاشم کو دیکھا۔ "آپ کیا پوچھ رہے تھے؟ اس چیز کو کیسا سمجھا جاتا ہے ہم جیسی عام فیملیز میں؟" ریڈر صاحب کی طرف اشارہ کیا جن کے چہرے پہ برہمی تھی۔

"میں آپ کی انٹرنیٹ ایڈکشن کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔" ہاشم نے تیزی سے پینترا بدلا۔ وہ ایک جج کے ریڈر کی طرف جانے والی گفتگو کا رخ موڑنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا، پھر ابھی بہت سے تیر ترکش میں باقی تھے۔

"کیا یہ درست ہے حنین یوسف! کہ آپ کمپیوٹر وغیرہ میں بہت اچھی ہیں؟"

"بالکل!" مسکرا کے سر کو خم دیا۔ جج صاحب اب کاغذ رکھ کے واپس ان کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔

"اور کیا یہ درست ہے کہ آپ ایک بہت اچھی ہیکر بھی ہیں؟" وہ دوبارہ سے روانی پکڑ چکا تھا۔

"جی۔"

"حنین! کیا آپ کے ارد گرد کے لوگ آپ کے پاس ہیکنگ سے متعلق فیورز لینے آتے ہیں؟"

"لوگ میرے پاس فیورز لینے کیوں آئیں گے؟"

"کیونکہ آپ بہترین ہیں، اور وہ آپ پہ زیادہ بھروسا کر سکتے ہیں۔"

"جی۔ لوگ مجھ سے فیورز لیتے رہتے ہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔ وہ پرسکون تھی۔ زمر بار بار اعتراض کرنے اٹھنے لگتی، پھر رک جاتی۔ کمرہ عدالت میں تناؤ

ہر پل بڑھتا جا رہا تھا۔

"کیا 2013ء میں ایسا ہوا کہ کسی دوست کے والد نے آپ سے کوئی فیور مانگا؟"

"جی ہاں۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔ ہاشم کی آنکھوں میں چمک ابھری۔

"اور کیا اس فیور کا تعلق ان کے خاندان کی کسی عورت کے کسی اسکینڈل سے تھا؟"

"جی ہاں۔"

"اور ان کی مدد کرنے کے لیے آپ کو غیر قانونی ہیکنگ کرنی پڑی؟"

"میرے جواب کے بعد آپ مجھ پر sue (مقدمہ) تو نہیں کریں گے نا؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔ جیسے کوئی بچہ پوچھتا ہے۔ ہاشم نے سینے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"میں آپ کو sue نہیں کروں گا، حکومت کا کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میری طرف سے بے فکر ہو کر جواب دیجیے۔"

"جی۔ مجھے ان دوست کے والد کے لیے غیر قانونی ہیکنگ کرنی پڑی تھی۔"

"اور کیا یہ درست ہے کہ بدلے میں آپ نے ان صاحب سے کوئی فیور مانگا تھا؟" فارس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ زمر فکر مندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سعدی کا سر جھکا تھا مگر وہ گردن اکڑائے جواب دے رہی تھی۔

"جی ہمیں نے ان سے فیور لیا تھا۔"

"اور یقیناً" وہ فیور خاص قسم کا ہو گا کیونکہ میری اطلاع کے مطابق وہ صاحب ایک انتہائی با اثر عہدے پہ فائز تھے۔"

"ایسا ہی ہے۔" حنہ نے اعتراف کیا۔

"کیا آپ کورٹ کو بتانا پسند کریں گی کہ وہ کون تھے اور ان کے کس کام کے بدلے میں آپ نے ان سے ایک خاص فیور لیا تھا؟"

"وہ فوت ہو چکے ہیں اور اس بات کا تعلق ان کے خاندان کی ایک عورت کی عزت سے ہے۔ مجھے اچھا نہیں لگے گا بتانا۔"

"یور آنر میں عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ گواہ کو جواب دینے کا حکم دے کیونکہ ان سوالوں سے گواہ کا کردار عدالت کے سامنے واضح کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ وہ گواہ ہے، جو کہہ رہا ہے کہ اعتراف جرم اس کے سامنے ہوا ہے۔"

"گواہ کو جواب دینا ہو گا۔" جج صاحب نے اسے ہدایت کی۔

"اور اگر میرے جواب سے ایک عورت کی عزت خراب ہوتی ہے تو ہو جائے؟ وہ فوت ہو چکے ہیں تو کیا ہم ان کا پردہ نہیں رکھ سکتے؟" وہ جذباتی سے انداز میں بولی۔

"یہ سب آپ کا کردار جاننے کے لیے ہو رہا ہے حنین یوسف، اس لیے اپنی فکر کیجیے اور جواب دیجیے۔" وہ مسکرا کے بولا تھا۔ چہرے پہ فاتحانہ چمک تھی۔

"کیا آپ واقعی اس عورت کے افیئر کو یوں ایکسپوز کرنا چاہتے ہیں؟ اس مرے ہوئے آدمی کی ساکھ کو داغ دار کرنا چاہتے ہیں ہاشم بھائی؟" وہ دکھ سے بولی تھی۔

"I don't give a damn!" اس نے چچ کی آواز نکال کے شانے جھٹکے تھے۔ "لیکن آپ اگر چاہیں تو ان کے ناموں کی جگہ ان کا عہدہ بتا دیں تو بتایئے عدالت کو کہ وہ صاحب جن کا ایک کام کیا تھا آپ نے، وہ کون تھے عہدے کے اعتبار سے۔" حنین نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں جمائے تین حرف بولے۔

"آئی بی پی۔" سعدی نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ ادھر ہاشم نے بھنویں اکٹھی کر کے اسے دیکھا۔

"میرا خیال ہے" آپ کہنا چاہ رہی ہیں او سی پی۔"

"جی نہیں کاردار صاحب! میں کہنا چاہ رہی ہوں، وہ ایک آئی بی پی تھے۔ اورنگ زیب کاردار نام تھا ان کا اور 2013ء کے دسمبر میں وہ ایک ذاتی کام لے کر میرے پاس آئے تھے۔ جب نوشیرواں کے اغوا کا پول

کھولنے کے بدلے میں انہوں نے مجھے وہ لیپ ٹاپ اور دوسرے gadgets گفٹ کیے تھے' تب انہوں نے مجھے ایک اور کام بھی کہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں مسز جواہرات کاردار کا موبائل ہیک کر کے ان کے اپنے کزن سے چلتے افیئر کا پتہ چلاؤں اور۔۔۔۔"

کمرہ عدالت کا منظر ایک دم بدلا تھا۔ سارے رنگ بدلے۔ موسم کا امتزاج بدلا۔ جہاں جواہرات کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں' وہیں ہاشم نے تیزی سے اس پٹ پٹ بولتی لڑکی کو چپ کروایا۔

"اوکے تھینک یو' دیٹس آل حنین۔"

"نہیں' مجھے بتانے تو دیں' میرے کردار کو واضح کرنا چاہ رہے تھے نا آپ' تو پھر مجھے کرنے دیں نا اپنا کردار واضح۔"

"ٹھیک ہے بہت ہو گیا۔ آپ جا سکتی ہیں۔" وہ ہاتھ اٹھا کر درشتی سے اسے خاموش کروا کے اپنی کرسی کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے ماتھے پہ پسینہ آرہا تھا۔ کنپٹی کی رگ پھڑک رہی تھی۔ ایک دم سے لوگ پرجوش انداز میں چہ میگوئیاں کرنے لگے تھے۔ پیچھے بیٹھے رپورٹرز دھڑا دھڑ لکھے جا رہے تھے۔ حنین کٹہرے سے ہلی تک نہیں۔ اسی ہٹ دھرمی سے پکار کے بولی۔

"نہیں کاردار صاحب' میں آپ کی گواہ نہیں ہوں' آپ مجھے نہیں بھیج سکتے۔ مجھے re-examine (جرح) کرنے کا حق اس وکیل کو ہے جس نے مجھے بلایا تھا۔۔۔۔"

"میں گواہ کو re-examine کرنا چاہوں گی۔ یور آنر۔" زمر تیزی سے کھڑی ہوئی۔ حنین نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ شانے اچکائے۔ جیسے اجازت دی ہو۔ جواہرات کا ہاتھ اپنی گردن پہ تھا اور وہ بالکل نیچے دیکھ رہی تھی۔ رنگت سفید پڑ رہی تھی۔ ہاشم کا رنگ سرخ ہو رہا تھا اور وہ برہمی سے احتجاج کر رہا تھا مگر جج صاحب نے اسے خاموش کرا دیا۔ صورت حال ایک دم دلچسپ ہو گئی تھی۔

"حنین یوسف! کیا آپ وضاحت کریں گی کہ اورنگ زیب کاردار نے آپ کو کیا کام کہا؟"

"یہ ہمارے دوست ہاشم کاردار کے والد اورنگ زیب کاردار اور میری ای میلز کا ریکارڈ ہے' اور یہ ٹیکسٹ میسجز کا۔" وہ کاغذات جج صاحب کے سامنے رکھتے ہوئے بولی تھی۔

"وہ چاہتے تھے کہ میں ان کی بیوی کا فون rat کر کے ان کو دے دوں' یعنی وہ اپنے فون پہ کیا کر رہی ہیں' اورنگ زیب کاردار یہ دیکھ سکیں۔ ان کو شک تھا کہ ان کی وائف کا اپنے ایک کزن کے ساتھ جو افیئر رہا ہے ماضی میں' وہ شاید دوبارہ شروع ہو چکا ہے۔ سو مسز کاردار کے فون تک میں نے ان کو ایکسس (رسائی) دی' پھر اورنگ زیب انکل کے اصرار پہ ان کو طیب مطیع نامی صاحب کے فون تک بھی۔۔۔ ایکسس دی۔ یہ طیب مطیع اور مسز کاردار کی ای میلز کا ریکارڈ ہے اور چونکہ ہاشم کاردار کو تو ایک "damn" بھی پرواہ بھی نہیں ہے' اس لیے میں یہ بھی آپ کے سامنے رکھ رہی ہوں۔ میں نے غلط کام ضرور کیا تھا مگر ان کی مدد کر رہی تھی میں۔"

آخری چند کاغذات ان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ جواہرات خاموشی سے اٹھی تھی' ہینڈ بیگ اٹھایا اور کمرہ عدالت سے باہر نکل گئی۔ چند رپورٹرز اس کے پیچھے بھاگے تھے۔ نوشیرواں سرخ چہرہ جھکا کے بیٹھا تھا اور ہاشم برہم' بے بس سا اسے بولتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ سب جھوٹ اور بہتان ہے یور آنر۔" وہ آخر میں چلایا۔ غیض و غضب سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "میں ان محترمہ پہ ہتک عزت کا دعوا کر سکتا ہوں۔ بلکہ آج ہی میں آپ کو نوٹس بھیجوں گا۔" انگلی اٹھا کے تنبیہہ کی تو زمر فوراً بولی۔

"یور آنر' ایس۔۔۔۔" مگر حنین کی آواز نے اس کا فقرہ اچک لیا۔

"ایس ٹوپل کے قانون کے تحت آپ چونکہ مجھے یقین دلا چکے ہیں کہ آپ میرے خلاف کوئی دعوا نہیں کریں گے تو اب اگر آپ کوئی دعوا کریں' تب بھی عدالت آپ کو ایسٹوپ کر سکتی ہے۔"

حنین اپنی پوری تیاری کر کے آئی تھی۔ زمر گہری

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

سانس لے کر خاموش واپس جا بیٹھی۔ اب حنین جج صاحب کو مزید اس واقعے کی تفصیل بتا رہی تھی۔ دفعتاً" کسی نے زمر کو پیچھے سے ٹھوکا دیا۔ وہ مڑی۔ پیچھے بیٹھے وکیل نے چٹ سی اس کی طرف بڑھائی۔ وہ سیدھی ہوئی اور کاغذ کھولا۔

"میرا خیال ہے آپ کو وکالت چھوڑ دینی چاہیے کوئی اور کام شروع کریں زمر بی بی۔ سلائی کڑھائی یا کوکنگ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے مڑ کے دیکھا۔ وہ مسکراہٹ دبائے بظاہر سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ زمر نے چند الفاظ کاغذ پہ گھسیٹے اور اسے مروڑ کے واپس بھیجا۔ جب فارس نے اسے کھولا تو اس پہ لکھا تھا۔

"میرا خیال ہے "آپ کو یہ دنیا ہی چھوڑ دینی چاہیے۔"

وہ چہرہ جھکا کے دل کھول کے ہنسا تھا۔ وہ چار افراد نے مڑ کے اسے دیکھا بھی تھا۔

حنین اب اپنی بات ختم کر چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ نیچے اترتی جج صاحب نے اسے روک کر پوچھا۔

"آپ وکیل ہیں؟" اس نے سادگی سے ان کا چہرہ دیکھا۔

"نہیں یور آنر!"

"لاء اسٹوڈنٹ ہیں؟"

"نہیں یور آنر!"

"پھر کیا ہیں؟"

"میں حنین ہوں اور میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔"

وہ اداسی سے مسکرا کے نیچے اتری ایسے کہ اس کی گردن اٹھی ہوئی تھی۔ سعدی اسے مسکرا کے دیکھ رہا تھا۔ اکڑی ہوئی مٹھی میں پکڑا قلم وہ کب کا چھوڑ چکا تھا۔

باہر نکلتے ہوئے حنہ ہاشم کے قریب ٹھہری جس کا چہرہ اہانت سے ابھی تک تمتمایا ہوا تھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولی۔

"میں نا ڈرامے بہت دیکھتی ہوں۔ ہاں اب میں اتنے ڈرامے دیکھنے کو اچھا نہیں سمجھتی مگر جو دیکھ رکھے ہیں "ان میں ایک دفعہ ایک قصہ سنا تھا۔ کہ ایک آدمی کے پاس ایک بدروح آئی اور اسے ڈرانے لگی۔ جب وہ نہیں ڈرا تو وہ بولی۔ جانتے نہیں ہو میں تمہاری جان لے سکتی ہوں۔ وہ آدمی بولا' سارا غم اس جان کا ہی تو ہے' جس دن یہ نہ رہی' اس دن میں تم سے بڑی بدروح بن جاؤں گا۔ آپ جیسے بلیک میلرز کو یہ جان لینا چاہیے ہاشم کاردار کہ سارا غم اس عزت کا ہی تو ہے' کیونکہ جس دن ہم لڑکیوں کی عزت چلی گئی نا' اس دن آپ سے بڑی بلا بن جائیں گی ہم!"

اور آگے بڑھ گئی۔ وہ کچھ بول نہیں سکا۔ بس اسے جاتے دیکھتا رہا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔ سب اس کو دیکھ رہے تھے۔ وہ نظریں.... وہ چہ میگوئیاں.... قیامت سی قیامت تھی۔

حنہ اپنے گروہ کی طرف آ گئی۔ زمر اسے ریڈ روالی بات پہ ڈانٹ رہی تھی۔ سیم اسے اوور کہہ رہا تھا اور سعدی اسے گلے سے لگا کے اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ اسے کبھی بھی اس سب میں گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب حنہ کے ہر طرف سناٹا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور وہ بہت ڈھیر سارا رونا چاہتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح۔

☼ ☼ ☼

عجب چیز ہے یہ گردشِ زمانہ بھی
کبھی زمیں پہ کبھی مثل آسمان گزری

قصرِ کاردار میں ایسا ہولناک سناٹا چھایا تھا گویا کوئی مر گیا ہو۔ جواہرات سپاٹ چہرے اور جھکی نظروں سے آگے چلتی جا رہی تھی اور وہ لاؤنج کے وسط میں کھڑا تھا۔ غیظ و غضب سے سرخ پڑتا چہرہ لیے' وہ بے بسی اور نفرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اندازہ ہے آپ کو میں نے کورٹ روم سے پارکنگ ایریا تک کا سفر کیسے کیا ہے ممی!" ہاشم کی چنگھاڑتی غراتی آواز پہ بھی وہ نہیں رکی' دھیرے دھیرے آگے بڑھتی گئی۔

"مجھے رسوا کر دیا آپ نے پورے زمانے میں۔ وہ ہمارے قرابت دار نہیں تھے' ہمارے طبقے سے تعلق

رکھنے والے لوگ نہیں تھے جو ان کی باتوں کو مسکرا کے ہضم کر جاتے۔ ممی وہ "عام" لوگ تھے۔ وہ وکیل تھے ' ججز تھے۔ ان کی نظریں... ان کی باتیں۔" وہ سر دونوں ہاتھوں میں لیے پاگل ہو رہا تھا۔ جواہرات چُپ چاپ آگے بڑھتی گئی۔ رُخ اپنے کمرے کی جانب تھا۔

"میرا ان دو ٹکے کے بچ لوگوں کے ساتھ روز کا ملنا تھا ممی۔ مجھے ان کا ہر دن سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ میری ورک پلیس تھی۔ میں بار الیکشنز کے بارے میں سوچ رہا تھا اور آپ نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں ان کو منہ دکھا سکوں۔ آپ نے مجھے رسوا کر دیا۔"

جواہرات نے آہستگی سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ وہ پیچھے بولتا جا رہا تھا۔

"اور میں جانتا ہوں طیب مطیع کے بارے میں۔ اسی لیے ڈیڈ نے مجھ سے کہہ کر اسے جیل کروائی تھی کیونکہ..." شدت جذبات سے وہ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ جواہرات نے دروازہ بند کر دیا اور وہیں نیچے فرش پہ بیٹھتی گئی۔ وہ گم صم سی لگتی تھی۔

"میرے مرے ہوئے باپ کو آپ روز رسوا کرتی ہیں۔ کبھی ہارون عبید کے ساتھ ' کبھی کسی تھرڈ کلاس کزن کے ساتھ۔ کیا ہیں آپ ممی! کیا ہیں آپ؟" وہ باہر کھڑا اسی طرح چلا رہا تھا۔

سیڑھیوں کے دہانے پہ کھڑی سونیا اسے یک ٹک دیکھ رہی تھی۔ اس کا وجیہہ ' بہادر باپ ایسے کیوں اپنے حواس کھو رہا تھا۔ وہ چُپ چاپ پیچھے ہٹ گئی۔

اندر بیٹھی جواہرات کا فون مسلسل تھرتھرا رہا تھا۔ اس نے اسی بے جان سے انداز میں نکال کے دیکھا تو ہارون کا نمبر اسکرین پہ جگمگا رہا تھا۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

"بولو!" گھٹی گھٹی شکست خوردہ سی آواز نکلی۔

"میں افسوس کرنا چاہتا تھا۔ سنا ہے "آج چھوٹے چھوٹے بچے تمہیں رسوا کر گئے جواہرات۔ مجھے واقعتاً" افسوس ہے۔ کیا میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟" ان کی آواز میں آنچ سی تھی۔ مسکراہٹ '

"ہاں۔ تم بولتے جاؤ۔ میں سنتی جاؤں گی۔ جو غلاظت ' جو باتیں کہنی ہیں کہہ دو۔" اس نے فون کان پر زور سے دبایا ' تاکہ صرف ہارون کی آواز سماعت سے ٹکرائے اور باہر چیختے بیٹے کی باتیں اس شور میں دب جائیں۔ تاکہ تکلیف کم ہو۔

"میری بیوی کے ساتھ بھی یہی کیا تھا تم نے۔ اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔"

وہ آنکھیں بند کیے سنتی گئی۔ گرم گرم آنسو آنکھوں سے نکل کے چہرے پہ گرتے رہے۔

"اب بھی وقت ہے جواہرات! مجھے میری بیوی کے اکاؤنٹ تک ایکسس (رسائی) دے دو۔ اس کی رقم ' اس کے زیورات مجھے دے دو۔ میں تمہیں اس سارے اسکینڈل سے نکال لوں گا۔"

"تمہیں لگتا ہے میں ڈھے گئی ہوں؟ ہار گئی ہوں؟ اونہوں۔ ابھی جواہرات کا کردار "باقی" ہے۔ اس سے بڑے طوفان سے گزری ہوں۔ ابھی نہیں ہاروں گی مگر تم بولتے رہو۔ میں سن رہی ہوں۔" وہ سپاٹ سے انداز میں بولی تھی۔ دوسری طرف سے انہوں نے کال کاٹ دی تھی۔ باہر سے بولتے ' چلاتے ہاشم کی آواز پھر سے آنے لگی تھی۔ جواہرات نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

پچھلے ہر طوفان میں اس کا یہ بیٹا اس کے ساتھ کھڑا ہوتا تھا۔ اور آج...؟؟

☼ ☼ ☼

کچھ تو ہو رات کی سرحد میں اترنے کی سزا
گرم سورج کو سمندر میں ڈبویا جائے

مارکیٹ میں معمول کا رش تھا۔ مصروف سے لوگ آگے پیچھے گزر رہے تھے۔ فاسٹ فوڈ کی دکانوں سے اشتہا انگیز خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ ایسے میں پارکنگ میں ایک کار کھڑی تھی اور وہ دونوں اگلی نشستوں پہ بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

"امیر کیانی ہر ہفتے کی شام اس میڈیکل اسٹور سے دوا خرید نے آتا ہے۔ اس کی ماں کو کوئی دائمی بیماری ہے۔ آج ہفتہ ہے اور آج وہ آئے گا' مگر مسئلہ یہ ہے سعدی! کہ وہ کل صبح کی فلائٹ سے عمرے کے لیے جا رہا ہے اور حج سے پہلے نہیں آئے گا۔ ان لوگوں کے پاس عمرہ ویزا کو حج تک بڑھانے کے بہت طریقے ہوتے ہیں۔" احمر سامنے دکانوں پہ نظر جمائے کہہ رہا تھا۔ سعدی نے اثبات میں سرہلایا۔

"یعنی ہمارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں اس سے بات کرنے کے لیے۔"

"ہمارے نہیں' تمہارے پاس۔ کیونکہ مجھ سے سخت نفرت ہے ان PMDC والوں کو۔" احمر نے جھرجھری لے کر سر جھٹکا۔

"کیوں؟ تمہارے پاس کوئی ایم بی بی ایس کی جعلی ڈگری بھی ہے؟" احمر نے جواباً" صرف گھورا۔ تردید نہیں کی۔

"اوکے۔ تو پھر اس سے بات مجھے ہی کرنی ہو گی۔" سعدی نے گہری سانس لی۔

"نہ صرف بات کرنی ہے بلکہ اسے راضی کرنا ہے' پیسے بہت لے گا مگر یہ پی ایم ڈی سی کا واحد کلرک ہے جو خفیہ طریقے سے ہمیں پاکستان کے تمام ڈاکٹرز کا ڈیٹا فراہم کر سکتا ہے اور ہم فیشل ریکگنیشن سافٹ ویئر کے ذریعے ڈاکٹر ہایا کو ان لاکھوں ڈاکٹرز میں ڈھونڈ لیں گے۔ لیکن اس شخص کے علاوہ کوئی کلرک ایسا نہیں جو کار داران کو نہ بتائے۔ ان کے بہت جاننے والے ہیں پی ایم ڈی سی میں۔ وہ محتاط ہو گئے تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔"

"اگر آپ کی نصیحت بند ہو گئی ہو تو میں جاؤں اور عمرے پہ جانے والے شخص کو رشوت کی پیشکش کروں تاکہ وہ میرا ایچ ثابت کرنے میں میری مدد کر سکے۔"

"ایک تو تم لوگوں کی اخلاقیات سے میں بہت تنگ ہوں۔" احمر نے برا سا منہ بنایا۔ "اس ملک میں کوئی کام بغیر رشوت کے نہیں ہوتا بھائی۔"

"میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس لیے پہلے میں اسے باتوں سے منانے کی کوشش کروں گا' خدا کرے مجھے رشوت نہ دینی پڑے۔" اس نے کان میں آلہ لگاتے ہوئے دروازہ کھولا اور پھر سر پہ پی کیپ جماتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اندر بیٹھے احمر نے اپنے کان میں آلے کو جمایا اور بولا۔

"شاپ کے قریب کھڑے ہو جاؤ۔ وہ جیسے ہی آئے گا میں تمہیں خبردار کروں گا۔"

"آہستہ بولو۔ میرے کان درد کرنے لگے ہیں۔" وہ کراہا تھا۔ احمر ہتھیلی پہ لگا مائیک منہ کے بالکل قریب لے کر گیا اور مزید زور سے بولا۔

"تم سے ایک بات کرنی ہے۔" وہ جو جیبوں میں ہاتھ ڈالے سڑک کنارے چلتا جا رہا تھا' انگلی سے کان میں لگے آلے کو ذرا ڈھیلا کیا اور ناسمجھی سے پوچھا۔

"کیا بات؟"

"تمہاری امی نے غازی سے کہا ہے کہ تمہیں سمجھائے اب شادی کر لو مگر اس کا خیال ہے' بندے کو ایک نہیں تین شادیاں کرنی چاہئیں' اس لیے تمہیں سمجھانے کی ذمہ داری اس نے مجھے دی ہے۔" سعدی ہلکے سے ہنس دیا۔ سر جھکائے وہ قدم آگے بڑھا رہا تھا۔

"مثلاً" کیا چاہتی ہیں امی؟"

"یہی کہ سارے پرانے تجربات بھلا کر شادی کر لو اور ان کو خوش کر دو۔"

"جب تک میں نوشیرواں کو سزا نہیں دلوا دیتا' تب تک نہیں کرنی مجھے شادی۔" اب کے وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ اس دکان کے قریب ایک اسٹال پہ رکھے میگزین دیکھنے وہ اب رکا کھڑا تھا۔

"ارے کیا مل جائے گا تمہیں اس بے چارے کو سزا دلوا کے؟ اس کی شکل نہیں دیکھی تم نے؟ مجھے تو لگتا ہے' وہ بہت افسردہ اور نادم ہے۔"

"ندامت کافی نہیں ہوتی۔ اگر اتنا ہی نادم ہے تو اعتراف جرم کیوں نہیں کر لیتا؟"

"انتقام کا چکر کبھی ختم نہیں ہوتا سعدی یوسف

خان۔"

"اسی لیے میں انصاف لینے گیا ہوں' انتقام نہیں۔" وہ تلخی سے میگزین کے صفحے پلٹتے' سر جھکائے بولا تھا۔

"خیر' تمہاری والدہ جاننا چاہتی ہیں کہ اگر وہ تمہارے لیے کوئی لڑکی پسند کریں تو تم قبول کر لو گے؟ نہیں اگر قید میں کوئی ایک آدھ پسند آ گئی ہے تو بتا دو ہم نے یہ آپشن بھی اوپن رکھا ہوا ہے۔"

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ اگر ساری ڈیلنگ اس آدمی سے مجھے ہی کرنی تھی تو پیسے کس بات کے لیے تھے آپ نے؟" وہ میگزین میں چہرہ دیے بول رہا تھا۔

"بات مت بدلو۔ خیر۔۔۔ اس تنگ لے کر تو میں ہی آیا ہوں نا۔ اچھا وہ ابھی آنے والا ہے۔ اس کا فون اسی ایریا میں پہنچ گیا ہے۔" احمر کار میں بیٹھا ٹیبلٹ پہ جی پی ایس چیک کر رہا تھا۔ سعدی اب نگاہیں ادھر ادھر دوڑاتا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ میگزین ہاتھ میں تھا اور پی کیپ نے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اور یہ وہ وقت تھا کہ اس نے وہ آوازیں سنی۔ سیٹیوں کی۔ قہقہوں کی۔ اس نے چونک کر گردن پھیری۔ پلازہ کے کونے والی دکان کے عین سامنے ایک لڑکا بیساکھی کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ ٹیڑھے سے تھے اور وہ نفی میں سر ہلاتا' کچھ کہہ رہا تھا' مگر اس کے گرد گھیرا تنگ کیے کھڑے تین لڑکے اس کو بولنے کا موقع نہیں دے رہے تھے۔ وہ تمسخرانہ انداز میں ہنستے ہوئے کچھ کہہ رہے تھے' البتہ ایک لڑکا اب غصے میں بولنے لگا تھا۔ معذور لڑکے نے جواباً" کچھ کہا تو اس نے کھینچ کے اس کے منہ پہ تھپڑ دے مارا۔

"ادھر مت دیکھو۔ اپنے کام پہ فوکس کرو۔" کان میں احمر کی محتاط آواز آئی تو وہ سر جھٹک کے آف کورس کہتا دوسری جانب دیکھنے لگا' البتہ چہرے پہ اضطراب سا پھیل گیا تھا۔ کن اکھیوں سے وہ دیکھ سکتا تھا کہ معذور لڑکا اب پیچھے ہٹنا چاہ رہا تھا مگر وہ اس کی طرف تینوں اطراف سے بڑھ رہے تھے۔ معذور لڑکے نے سامنے والے کے سینے پہ ہاتھ رکھ کے اسے پرے ہٹاتا چاہا مگر جواباً" دوسرے نے اس کی بیساکھی کو پاؤں سے دھکیلا۔ وہ رپٹ کے گرا۔

"سعدی۔۔۔ وہ آنے والا ہے۔ فوکس کرو۔ یہ آدمی آج ہمارے ہاتھ سے جانا نہیں چاہیے۔"

"مجھے پتا ہے۔"

"بار بار ان کی طرف مت دیکھو۔ وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارا کیس اور اس کی گواہیاں زیادہ اہم ہیں۔" احمر اسے یاد دلا رہا تھا۔ وہ سر ہلا کے خاموشی سے کھڑا رہا۔ کبھی کوئی کتاب اٹھا لیتا' کبھی کوئی رسالہ۔ کن اکھیوں سے جھلکتا منظر شدت پکڑ رہا تھا۔ لوگ نظر انداز کیے گزر رہے تھے' وہ اب اسے زمین پہ گرا کے مار رہے تھے۔

"وہ آ گیا ہے۔ وہ دیکھو۔ براؤن شرٹ میں' عینک والا۔"

"ہوں!" سعدی سامنے دیکھنے لگا مگر اس کا دماغ فوکس نہیں کر پا رہا تھا۔ لڑکے اسی طرح معذور لڑکے کو مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ ایسے میں اسے آنکھ کے کنارے پہ نظر آیا' ایک لڑکے نے اپنے بوٹ سے اس کے ٹیڑھے منہ پہ ٹھوکر ماری تھی۔

"بس بہت ہو گیا۔" وہ تیورا کے گھوما اور جارحانہ انداز میں ان کی طرف بڑھا۔

"سعدی۔۔۔ نو۔۔۔ واپس مڑو۔۔۔ سعدی یوسف!" احمر اس کے کان میں گرجا تھا۔

"یو نو واٹ۔۔۔" اس نے کان میں لگا آلہ دو انگلیوں سے پکڑ کر باہر نکالا' اور ہاتھ منہ کے قریب لے جا کر بولا۔ "تم میری ماں نہیں ہو۔" اور اسے جیب میں ڈالتا تیزی سے ان کی طرف لپکا۔ (احمر نے بے اختیار اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارا۔)

"کمزور سے کیوں لڑ رہے ہو؟ ادھر آؤ' مجھ سے مقابلہ کرو۔" پی کیپ کا رخ پیچھے کو موڑا تاکہ چہرہ سامنے واضح نظر آئے اور آستین اوپر چڑھاتا وہ ان کی طرف آیا۔ وہ چونکے تھے۔ ایک نے منہ بھر کے اسے گالیاں دیں۔ دوسرا اس کی طرف بڑھا' مگر اب اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ اور خاور قید خانے میں تھے' وہ کمرہ جس کی دیوار پہ ان گنت لکیریں لگی تھیں۔ اور خاور اس کو بتا رہا تھا کہ اسے کیسے کسی کو مارنا ہے۔ صرف بے ہوش کیسے کرنا ہے۔ اپاہج کیسے کرنا ہے۔ قتل کیسے کرنا ہے۔ اس کے سامنے صرف خاور تھا۔ اور وہ اپنا ہاتھ اور پاؤں گھما گھما کر اس کو مار رہا تھا۔ اردگرد خاموشی تھی۔ صرف وہ دونوں تھے اور ان کے ہاتھوں کی مہارت تھی۔ سر جھکا کے ایک طرف سے نکل جانا اور پلٹ کے وار مارنے کا انداز تھا۔ اردگرد اور کچھ نہیں تھا۔

سُرخ دھند چھٹی تو سامنے وہ تینوں اب قدرے زخمی حالت میں پیچھے کو ہٹ رہے تھے۔ بس چند لمحے لگے تھے ان کو بھگانے میں۔ چند راہ گیر جو تماشہ دیکھنے رکے تھے' اب وہ بھی مڑ گئے تھے۔ اپاہج لڑکا زمین پہ گرا ہوا تھا' اور اس کے جسم سے جابجا خون نکل رہا تھا۔ منہ کی چوٹیں سب سے زیادہ تکلیف دہ تھیں۔ وہ جھکا اور اسے ایک ہاتھ کے سہارے سے اٹھانے لگا۔

لڑکا نیم بے ہوش' مندی آنکھوں سے اسے یک ٹک دیکھتا سہارا لے کر اٹھنے لگا۔

"مجھے اس کو اسپتال لے کر جانا ہے۔" وہ دوسرے ہاتھ سے کان میں آلہ دوبارہ لگا چکا تھا۔

"ٹیکسی کر کے جاؤ کیونکہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔" وہ جلا بھنا سا بولا تھا۔ سعدی نے چونک کے دور رکھے میگزین اسٹینڈ کو دیکھا۔ "وہ چلا گیا؟"

"نہیں۔ اسے یہاں اعتکاف میں بیٹھنا تھا' اس لیے دیکھو شاید ابھی تک ہو۔" وہ بُری طرح سیخ پا تھا۔

"یا تو مجھے کام نہ کہا کرو اور اگر کہا کرو تو میرے طریقے سے عمل بھی کیا کرو۔"

"احمر!" وہ لڑکے کو سہارا دے کر چلا رہا تھا۔ "میں نے یہ جنگ، صرف ایک کیس جیتنے کے لیے یا ایک امیر لڑکے کو سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی خواہش کے لیے نہیں شروع کی تھی۔ میں نے یہ لڑائی اس لیے مول لی تھی تاکہ کوئی مغرور اور بدماغ لڑکا کسی عام کمزور لڑکے کو یوں نہ مار سکے۔ کوئی اپنے گھمنڈ میں کسی کو دھونس دھمکی نہ دے سکے نہ کر سکے اور جب بھی کوئی یہ کرے تو اس کا ہاتھ روکا جائے اور اگر روکنے سے نہ رکے تو اس کا ہاتھ توڑا جائے۔ تاکہ خاص لوگ عام لوگوں کو اپنے پیروں تلے نہ روند دیں۔ اگر میں یہ ہونے دوں تو میں کیسا انسان ہوا؟" وہ ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف جاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"بیڑا غرق تمہاری اخلاقیات کا۔ میں بتا رہا ہوں' آج سے میں نوشیرواں کے ساتھ ہوں۔ کم از کم وہ میری بات تو مان لیتا ہے۔" وہ کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا تھا۔ کم از کم اس وقت وہ اسے اس زخمی کے ساتھ ہسپتال نہیں لے جا رہا تھا۔ خود جائے اب ٹیکسی میں۔ سال نہیں ہوں میں اس کی۔ ہونہہ۔

☼ ☼ ☼

اس شام ہاشم کاردار ابھی تک اپنے آفس میں موجود تھا۔ کھڑکیوں کے آگے اندھیرا پھیل چکا تھا اور آفس کی عمارت ملازموں سے تقریباً" خالی ہو چکی تھی مگر وہ قطعاً" تکان زدہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سیٹ پہ ٹیک لگائے وہ پورے یقین اور عزم سے سامنے بیٹھے رئیس سے کہہ رہا تھا۔

"چھ دن ہیں ہمارے پاس۔ چھ دن میں تمہیں فول پروف اور ٹھوس منصوبہ بنانا ہے۔"

"میں کر لوں گا' سر۔ آپ بے فکر رہیں۔" وہ جو ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ پہ کھٹ کھٹ ٹائپ بھی کیے جا رہا تھا' تسلی آمیز انداز میں بولا۔

"مجھے خاور کی کمی محسوس نہ ہونے دینا۔" ہاشم نے تنبیہہ کی تھی' اس نے صرف سر کو خم دیا۔ تب ہی دروازہ افراتفری کے عالم میں کھلا اور ہڑبڑائی ہوئی سی حلیمہ اندر داخل ہوئی۔ "سر۔۔۔"

"تم ابھی تک یہیں ہو؟ اب چلے جانا چاہیے تمہیں۔" وہ نرمی سے بولا تھا مگر حلیمہ چہرے پہ اڑتی ہوائیوں کے ساتھ سامنے آئی۔

"سر یو نو۔۔۔ ہم سیکرٹریز ایک دوسرے سے ان ٹچ ہوتی ہیں' اور بہت سی باتیں شیئر کرتی ہیں۔" وہ پھولے سانس کے ساتھ بول رہی تھی۔

"آگے بولو۔" وہ تمہید سے بے زار ہوا۔
"سر۔۔۔ نوشیرواں صاحب کی سیکریٹری کی کال آئی ہے مجھے۔ ابھی ابھی۔ انہوں نے۔۔۔ نوشیرواں نے۔۔۔ ایک ہوٹل میں میڈیا کے نمائندوں کو بلایا ہے' اور وہ ایک ہنگامی پریس کانفرنس کرنے جا رہے ہیں۔" ہاشم بجلی کی سی تیزی سے کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ فق ہوا تھا۔
"کیسی پریس کانفرنس؟" فون اور والٹ اٹھاتے ہوئے وہ چیخا تھا۔
"کچھ نہیں معلوم سر! وہ بس کوئی اہم انکشاف کرنے جا رہے ہیں۔" اگلے الفاظ ہاشم نے نہیں سنے اسے۔ بس یہ نظر آرہا تھا کہ وہ دوڑ رہا ہے۔ رئیس اس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ راہداریاں۔۔۔ آفس کیبن۔۔۔ لفٹ' وہ پسینہ پسینہ ہوتے جسم کے ساتھ عبور کرتا بھاگتا چلا جا رہا ہے۔ یوں لگ رہا تھا ساری عمارت اس کے سر پہ گرنے والی ہے۔ ہر شے ملیامیٹ ہو کر زمین بوس ہونے والی ہے۔۔۔ ساری دنیا جل کر راکھ ہونے والی تھی۔
سڑکوں پہ گاڑیاں۔۔۔ لوگ۔۔۔ درخت بھاگ رہے تھے۔۔۔ اور اس کی زندگی پیچھے کو دوڑ رہی تھی۔ برسوں کی محنت۔۔۔ ساکھ۔۔۔ عزت۔۔۔ سب کچھ نوشیرواں کے اعترافِ جرم سے مٹی میں ملنے والی تھی۔ وہ اپنے بھائی کو کھونے جا رہا تھا۔ وہ تیز ڈرائیو کر رہا تھا۔ رئیس اسے رفتار ہلکی کرنے کو کہہ رہا تھا' مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔ اسے پسینے آرہے تھے۔
اس کا بھائی اپنی زندگی ختم کرنے جا رہا تھا۔۔۔ نظروں کے سامنے اس کے بچپن کے مناظر گھوم رہے تھے۔۔۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بار بار لڑھک کے گر جاتا' تو وہ جھک کے اسے اٹھاتا۔۔۔ اسے سنبھالتا۔۔۔ اس کی انگلی پکڑ کے اسے وہ دشوار زینے پار کرواتا۔۔۔ یہ انگلی کیسے چھوٹ گئی؟ کیسے فیصلہ کرلیا اس نے اس بے وقوفی کا؟
"اوہ نہیں شیرو۔ پلیز نہیں۔"
ہال میں رش تھا۔ بے پناہ رش۔ اسے پوڈیم پہ ڈائس کے پیچھے شیرو کھڑا نظر آیا تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ اور ٹائی میں تیار کھڑا تھا۔ بال بھی جیل سے جما رکھے تھے اور ایک ہاتھ ڈائس پہ رکھے وہ مائیک پہ چہرہ ذرا جھکائے بول رہا تھا۔ سامنے بیٹھا مجمع دھڑا دھڑ تصاویر کھینچ رہا تھا' ویڈیوز بنا رہا تھا۔ ہاشم سفید چہرے کے ساتھ آگے بڑھنے لگا مگر رئیس نے اسے بازو سے تھام کے روکا۔
"سر! ایسے مت کریں۔ تماشا بن جائے گا پوری دنیا کے سامنے۔"
"اسے روکو۔ بند کرو یہ سب۔ بجلی کاٹو' سگنلز جام کرو' کچھ کرو۔" وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ گرجا تھا۔
"سر میں کچھ کرتا ہوں' مگر آپ پرسکون رہیں۔" رئیس اسے روک کر خود دوسری طرف بھاگا تھا۔ ہاشم گہرے گہرے سانس لیتا' بے یقینی اور خوف سے پوڈیم پہ کھڑے شیرو کو دیکھے گیا۔ وہ آج بہت اونچا دکھائی دے رہا تھا' شاید اسٹیج کی اونچائی کافی زیادہ تھی۔ اس نے زینے کیسے چڑھے' وہ کیوں نہیں لڑکھڑایا؟ وہ بس اسے دیکھے گیا۔
"میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ مجھ سے پہلا سوال یہی پوچھنا چاہتے ہیں کہ میں نے سعدی یوسف پہ حملہ کیا تھا یا نہیں۔ اس لیے بتاتا چلوں کہ کیس عدالت میں ہے' اور اس پہ بات کرنا منع ہے' لیکن میں صرف وہی کہوں گا جو میں کہہ سکتا ہوں۔"
بولتے ہوئے اس کی نظریں نیچے مجمع کے درمیان کھڑے ہاشم پہ جا ٹھہریں۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ ہاشم نے دہکتے' بھیگے چہرے کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔ گویا منت کی۔ (مت کرو شیرو۔ خدارا! مت کرو میرے بھائی۔)
"اور میں آپ کو اس کیس کے بارے میں وہی کچھ کہہ سکتا ہوں جو میں نے پہلے دن عدالت میں کہا تھا۔ میں بے گناہ ہوں اور میں نے سعدی یوسف پہ حملہ نہیں کیا تھا۔ عدالت کیا فیصلہ کرے گی' یہ میں نہیں جانتا۔ لیکن میں نے یہاں آپ کو اس بات کے لیے نہیں بلایا۔"

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

شازیہ الطاف ہاشمی

میں کب سے بیڈ پر لیٹا ہوا ہوں' میرا بازو سختی سے میری آنکھوں پر جما ہے' وہ کئی بار آکر مجھے جھنجھوڑ چکی ہے' ہلا چکی ہے' مگر میں ٹس سے مس نہیں ہوا' بلکہ اس کا ہاتھ سختی سے کتنی ہی بار جھٹک چکا ہوں اور ایسے ہی جھٹکتا رہوں گا' کیونکہ مجھے اسے جھٹکنا ہے' بار بار ٹھکرانا ہے' آنکھوں کی باریک سی جھری سے میں دیکھتا ہوں کہ وہ مجھ سے الجھ کر باہر نکل گئی ہے' میں چاہتا ہوں کہ وہ افسردہ اور پریشان رہے' روئے' چیخے چلائے' کئی بار میرے بار بار تذلیل کرنے پر ایسا ہوا بھی' وہ روئی مگر پھر دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ خوش اور مطمئن سی نظر آنے لگتی۔

پتا نہیں کیوں وہ اس سختی' اشتعال اور میری بات بات پر طعنے دینے والی عادت کو میرے مزاج کا حصہ سمجھ بیٹھی ہے' اسے لگتا ہے کہ میں ہمیشہ سے ایسا ہوں'

نہیں‘ نہیں ایسا نہیں‘ میں ایسا اب بنا ہوں‘ صرف اسی کے لیے اپنا لہجہ کرخت اور انداز جان چھڑانے والا بنائے رکھتا ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ جان بھی نہ پائے بس پریشان اور دکھی رہا کرے‘ اس کی پریشانی اور تکلیف پر میں سیٹیاں مارتا ہوں‘ ان سیٹیوں کو خوب صورت مدھر دھنوں میں بدلتا ہوں‘ سکون پاتا ہوں‘ بہت عجیب سا سکون‘ میری سیٹیوں پر اس کی آنسو بھری آنکھیں حیرانی اور دکھ سے بھر جاتی ہیں‘ وہ تو اٹھ جاتی ہے شاید یہ سوچ کر کہ اب کبھی مجھ سے اپنی پریشانی شیئر نہیں کرے گی‘ مگر میں جانتا ہوں کہ وہ پھر آئے گی‘ ضرور آئے گی اور میں یونہی اسے نظرانداز کروں گا۔

میرے ذرا سے التفات پر وہ مقناطیس کی طرح کھنچی چلی آئے گی۔ میرے بار بار ٹوکنے پر بھی میرے پاس بیٹھی رہے گی‘ جب تک میں کوئی تلخ بات نہیں کہوں گا وہ نہیں اٹھے گی‘ ہر بار وہ آکر بیٹھتی ہے اور پھر منہ پھلا کر غصے سے اٹھ جاتی ہے‘ اس کے اس اٹھنے بیٹھنے میں ایک انوکھی لذت ہے۔ اسے باتیں کرنے کا بہت شوق ہے اور مجھے لگتا ہے اسے باتیں بنانے کا ہنر ہے‘ جونہی وہ اپنی باتوں کے نقطہ عروج پر پہنچی اس کا چہرہ خوشی سے چمکا‘ میں نے اسے ٹوکا اور اٹھ کر چائے بنانے کا کہہ دیا‘ وہ جھنجلا سی گئی‘ اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی اور میں غصے میں آگیا تھا۔ وہ غصے میں جو بول سکی بول کر اٹھ گئی‘ مگر میں اپنا غصہ ایک ہی بار باہر نکالنا نہیں چاہتا‘ اسے آہستہ آہستہ گیلی لکڑی کی طرح سلگانا چاہتا ہوں‘ نہ جل سکے نہ بجھ سکے۔

اگرچہ میرے اپنے اندر بھی بہت دھواں بھر چکا ہے‘ جو نکلنے کو کسی روزن کی تلاش میں ہے‘ مگر میں نے کواڑ سختی سے بند کر رکھے ہیں‘ کہیں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا نہیں‘ نہ اندر نہ باہر‘ مگر میں ایک بار جو سوچ لیتا ہوں وہ ضرور کرتا ہوں‘ مجھے اس سے نفرت تھی‘ مگر میں نے اسے بتایا نہیں بلکہ میں اپنی نفرت کے رنگ میں اسے رنگ کر اس کا رنگ بدلنا چاہتا ہوں۔

”میں پہلے اس سے محبت کیا کرتا تھا‘ وہ ہمارے اپنے تھے‘ وہ میرے ماموں کی بیٹی ہے‘ ماموں جو امی کی آنکھ کا تارا تھے تو ابو کے بازو تھے‘ ابو انہیں اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔ ماموں کے تین بچے تھے بڑا فائق اور چھوٹی عارفہ اور سب سے چھوٹا حسن۔ میں اور آپی دو ہی بہن بھائی تھے‘ امی اور ماموں نے بچپن ہی سے ہمیں رشتوں میں باندھ دیا تھا‘ میں عارفہ کا منگیتر تھا تو فائق اور صبیحہ آپی منگیتر تھے۔ میں عارفہ کے گھنگھریالے سنہرے بال دیکھتا تھا۔ وہ پڑھائی میں بہت تیز تھی۔ بڑی بڑی کتابیں پڑھتی تھی۔ بے شمار اشعار اسے یاد تھے۔ بچپن ہی سے اس کا ادبی ذوق اعلا تھا اور میں بھی تو اعلا ہی تھا جو اس سے محبت کرتا تھا۔ دل ہی دل میں اسے بسائے پھرتا تھا۔“

امی اور صبیحہ آپی کے سامنے اس کی محبت کے قصیدے پڑھتا تھا۔ عارفہ ایسے بولتی ہے‘ سرخ فراک میں کیسی لگتی ہے‘ کتنی اسمارٹ ہے‘ کتنی پراعتماد ہے۔ امی اور آپی بہت محظوظ ہوتی تھیں‘ میری آٹھ دس برس کی عمر کی محبت بس یہی کچھ سمجھتی تھی۔ یہی کچھ کہہ سکتی تھی۔ امی اور آپی ہنس سکتی تھیں بس۔

ماموں کا گھر ہمارا اپنا گھر تھا‘ وہی کچن‘ ایک جیسے کھانے ہم جو اپنے گھر میں پکواتے تھے‘ فرمائشیں کرتے تھے‘ وہی ماموں کے گھر آکر کرتے تھے۔ پکوڑے‘ کھٹی چٹنی‘ گرما گرم پلاؤ‘ رائتہ‘ سلاد‘ گاجر کا حلوہ‘ سوجی کا حلوہ‘ یہاں سب ایک جیسا تھا۔ صبح صبح لان میں ہلکی ہلکی دھند میں بیٹھ کر گرما گرم کافی اور سردی سے سمٹے سمٹائے میں اور عارفہ یہیں کھیلتے تھے۔ پودوں کے پتے توڑتے‘ چھپن چھپائی کھیلتے۔ پھول توڑتے‘ مینڈکوں کا پیچھا کرتے‘ پتا نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچتی ہو گی‘ مگر میں اسے پسند کرتا تھا‘ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔

✵ ✵ ✵

صبح ہی صبح ہلکی ہلکی پھوار نے میرا استقبال کیا تھا۔ آج ماموں لوگوں کی طرف جانے کا پروگرام تھا‘ امی اور

ابو تیار بیٹھے تھے۔ میری تیاری ابھی نامکمل تھی۔ میں لان میں پڑا فٹ بال اپنے ساتھ لے جانے کا خواہش مند تھا۔ اس سے میں اور عارفہ کھیلتے، خوب مزا رہتا، میں کسی طرح باہر نکل بھاگنے کے چکر میں تھا۔ امی اور ابو باتوں میں مشغول تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ آج کا پروگرام ملتوی کرنا پڑے گا، کیونکہ بارش مستقل تیز ہو رہی تھی، لمحے کے ہزارویں حصے میں، میں نے لان میں گرے فٹ بال تک پہنچنا چاہا تھا کہ امی نے آگے بڑھ کر مجھے گردن سے دبوچ لیا تھا۔ میرے اندازے کے عین مطابق ان کی نظر مجھ پر ہی تھی۔ سفید کاٹن کا سوٹ جس کا میں ستیاناس کرنے والا تھا۔ امی کی بروقت مداخلت پر بال بال بچ چکا تھا اور میں منہ پھلائے صوفے میں دھنسا بیٹھا تھا۔

اچانک گھنٹی بجی تھی۔ میں بھاگ کر دروازے تک گیا تھا۔ باہر فائق بھائی اپنی چھوٹی سی مہران لیے موجود تھے۔ وہ مسکرائے، آگے بڑھ کر میرے گال تھپتھپائے اور مجھے ساتھ لے کر اندر چلے آئے، میرا بازو ان کے ہاتھ میں تھا۔ یہ گرفت امی سے بھی سخت تھی، بارش میں ان کے سیٹ کیے ہوئے بال بھی بھیگ گئے تھے اور مجھے لگتا تھا کہ میرا ہیئر اسٹائل بھی بگڑ چکا تھا۔ کیونکہ فائق بھائی میرے بالوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں بکھیر چکے تھے۔ فائق بھائی امی ابو کو سلام کر کے آپی کا پوچھ رہے تھے، انہیں ممانی نے بھیجا تھا۔

وہ آپی کے کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ آپی اپنے لمبے بال کھولے ان میں برش کر رہی تھیں اور اس ڈریسنگ ٹیبل میں آپی اور فائق بھائی کے مسکراتے چہرے تھے، میں اپنے بال سیٹ کرنے کی خواہش میں دوڑ کر کمرے میں آیا تھا، آپی اور فائق بھائی مسکرا رہے تھے، پھر آپی نے میرے بال سیٹ کیے، ہم بارش کی پروا نہ کرتے ہوئے کسی نہ کسی طرح ماموں کے گھر پہنچ ہی گئے تھے۔ ممانی اور ماموں ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ کیونکہ انہیں آج پروگرام ملتوی ہونے کی قوی امید تھی۔ مگر ہم برستی بارش میں پہنچ گئے تھے۔

فائق بھائی ہمیں لے کر آئے تھے اور ممانی کو خبر بھی نہیں تھی کہ وہ ہمیں لینے گئے ہوئے ہیں، اس انکشاف پر زور کا قہقہہ پڑا تھا۔ اتنا کہ سب کے چہرے بہار میں ڈھل گئے تھے۔ یعنی کہ فائق بھائی بھی آپی سے... میں سوچتا ہی رہ گیا، اب آپی اور فائق بھائی کی محبت کا ایک راز دار میں بھی تھا جب آپی نے ایف اے کر لیا۔ کمپیوٹر کلاسز، کوکنگ کلاسز سے بھی دل بھر گیا۔ انہیں پڑھائی لکھائی کا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ یوں بھی اب فائق بھائی کی اچھی ملٹی نیشنل کمپنی میں نوکری ہو گئی تھی۔ رخصت ہو کر جانا ہی تھا۔ اب فائق بھائی ہمارے گھر کم کم آتے تھے، وجہ شاید ان کی شرم ہو گی، فون کرتے تو بہت کم بات کر کے فوراً موبائل پھوپھو کو تھما دیتے۔ ان کی اس اچانک تبدیلی کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ مصروفیت سمجھ کر بات آئی گئی ہو جاتی تھی۔

ہمارے گھر اکثر نظر آنے والے فائق بھائی کی اب شکل بھی بدلتی جا رہی تھی۔ انکل اور پھوپھو بھی پریشان رہنے لگے تھے۔ آپی کا چہرہ بھی اب پھیکا پھیکا سا لگتا تھا، میں ان دنوں میٹرک کا امتحان دینے والا تھا۔ اس ٹینشن میں، میں اچھی طرح پیپر بھی نہ دے پایا تھا۔ پھر دھماکا ہو گیا تھا، فائق بھائی اپنی کولیگ "زرمین ہمدانی" میں انٹرسٹڈ تھے۔ وہ زرمین سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ صبیحہ آپی سے نہیں بقول ان کے زرمین سے منسلک ہونے کی صورت میں وہ بہت آگے تک جا سکتے تھے۔ صبیحہ سے شادی کر کے وہ مڈل کلاس فیملی کا حصہ نہیں رہنا چاہتے۔

پھوپھو اور فائق بھائی کے درمیان شدید قسم کی لڑائی ہوئی، انکل نے انہیں گھر سے نکال دیا۔ صبیحہ آپی سے شادی کرنے کی صورت میں وہ گھر میں رہ سکتے تھے، ورنہ نہیں، مگر وہ مجبور نہیں تھے، ان کا برائٹ فیوچر سامنے تھا۔ انہوں نے اپنے راستے الگ کر لیے تھے۔ صبیحہ آپی کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔ پورے گھر پر سوگ کی کیفیت تھی ہر شے اداسی اور بے دلی کی

چادر اوڑھے چپ تھی۔ صرف سانسوں کا سسکیوں کا شور سنائی دیتا تھا۔

قصور تھا تو کس کا تھا؟ آخر کس کا؟ کہاں غلطی ہوئی تھی۔ انکل اور پھوپھو کی منت سماجت ترلے اور منانے کی لاکھ کوششیں، معذرتیں سب بے کار گئیں۔ ہماری طرف سے نہ انکار، نہ اقرار، اب باقی کیا بچا تھا روٹھنے منانے کو۔

اسی رات ابو کو دل کا دورہ پڑا تھا، کرسی پر بیٹھے ان کی گرفت ڈھیلی پڑی اور وہ زمین پر آرہے تھے، سب ختم ہو چکا تھا۔ حمید انکل نے ان کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا اور سفید چادر اوڑھادی۔

ماموں اور ممانی کا دکھ اپنی جگہ پر، مگر ہمارے دل پر دہرا عذاب اترا تھا۔ فائق بھائی آئے تھے۔ چند لمحوں کے لیے پھر واپس لوٹ گئے تھے۔ امی بیوہ ہو چکی تھیں۔ تعزیت کرنے والوں کا آنا جانا تھا تو ماموں نے امی کے پیر پکڑ لیے تھے۔ امی کا چہرہ سرد اور سفید تھا، بولتی تھیں مگر نہ بولنے جیسا۔ ابو کو گئے دن ہی کتنے گزرے تھے، ماموں ہر دفعہ امی سے ملنے آتے، ان ہی دنوں صبیحہ آپی کا اچھا رشتہ آیا اور وہ رخصت ہو گئیں۔

اب امی اور میں اکیلے رہ گئے، اس کے بعد میں نے نوکری کی تلاش شروع کردی، یاسر صاحب اچھے آدمی تھے تو میں اچھا ورکر تھا، کپڑے کی مل میں مینجر کا عہدہ اور ٹھیک ٹھاک تنخواہ سے زندگی بدل گئی تھی۔ صبیحہ آپی کچھ خاص خوش نہیں رہتی تھیں۔ فائق بھائی کے ٹھکرا دینے کا غم — ابھی بھی تازہ تھا اور یہی زخم بے چینی کا باعث تھا، ماموں اب عارفہ کے رشتے کے سلسلے میں خاموشی توڑنا چاہتے تھے کہ ہاں یا نہ کریں۔ امی کا دل ابھی بھی صاف نہیں تھا۔ وہ سوچ میں تھیں، مگر میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ۔۔۔۔۔

"میں عارفہ سے شادی کروں گا۔"

امی چپ رہیں اور یوں عارفہ میری زندگی میں شامل ہو گئی تھی، ماموں، ممانی خوش ہو گئے تھے۔ فائق بھائی کھڑے کھڑے بہن کو رخصت کرنے آئے تھے۔

ماموں نے ان سے بات تک نہیں کی، ممانی صرف دور سے دیکھتی رہیں وہ چلے گئے تھے اس منظر سے دور جیسے اس تصویر کا حصہ کبھی نہ رہے ہوں۔

اسی دن سے میں نے عارفہ کی محبت کا استحصال کرنا شروع کیا تھا۔ روٹھ جاتی، میں منانے کی بھی کوشش نہیں کرتا تھا، وہ خود ہی مان جاتی تھی، پتا نہیں وہ بے وقوف تھی یا مجھ سے کیا توقعات رکھتی تھی۔ ماموں میری وسعت قلبی کے معترف تھے تو عارفہ نے کیا شکایت کرنی تھی، ایسی چھوٹی باتوں کی بھی شکایت ہوتی ہے بھلا۔

وہ چپ تھی اور میں ذرا، ذرا سی بات پر اسے اتنی باتیں سناتا کہ خود بھی حیران رہ جاتا۔ امی کو وہ کبھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ امی زیادتی کرتی ہیں، اسے پریشان کرتی ہیں، مگر میں نے ہمیشہ امی کی حمایت کی، ہمیشہ صبیحہ آپی کو سچا مانا، کیونکہ میں ایک بیٹا ہوں، ایک بھائی ہوں، بہت قرض ہیں مجھ پر، بیوہ ماں کی توقعات کا واحد مرکز ہوں، بہن کے انتقام کا سامان مہیا کرنا اس کا ساتھ دینا میرا فرض ہے۔

ڈیڑھ سال گزر چکا ہے، ہمیشہ وہ ہی مسکرائی ہے میں ہنسنا اور دکھوں کو محسوس کرنا کب سے چھوڑ چکا ہوں۔ فائق کی اپنی بیوی سے نہیں بن سکی، وہ چند ہی دن میں تنہا ہونے کے ساتھ ساتھ نشے کا عادی بھی ہو چکا ہے، کیونکہ وہ گھر بنانے والا مرد ہی نہیں تھا۔

آپی نے تو گھر بنالیا ہے، اپنے بچوں، شوہر کے ساتھ مطمئن ہیں، صرف انتقام لینا چاہتی ہیں، اللہ کی مصلحت کو نہیں سمجھتیں۔ امی تسبیح کے دانے گراتی ہیں، ابو کے لیے دعائیں مانگتی ہیں، مگر کسی کی دعا لینے کی روادار نہیں، ماموں اور ممانی کی سانسیں بیٹی میں اٹکی ہیں، میرے اندر کا الاؤ جل جل کر راکھ میں بدل چکا، اتنی راکھ کہ اب مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

عارفہ کی محبت نے یا شاید مجھوتے نے مجھے جیت لیا ہے، میری نفرت محبت میں بدلنے لگی۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، جینا چاہتا ہوں، اگر مجھے کوئی جینے دے، سانس لینے دے تو۔۔۔!

☆

ہمارا کچن

اسماء طاہر

"آپ کا باورچی خانہ" میں چھپنے والے گھرداپنے کے قصے ہمیں اکثر اداس کر دیتے۔ کبھی ہم بھی اپنی داستان سنا سکیں گے ہم بہت حسرت سے سوچتے۔ لیکن پھر ایک دن ہم نے قلم پکڑ لیا اور کمر کس لی۔ اب عوام الناس کو اپنے علم و فضل سے مزید محروم رکھنا زیادتی تھی۔

کالم کی سگھڑ خواتین کے ہاں جب بھی مہمان آتے ہیں' وہ جلدی جلدی دو تین ڈشیں بنالیتی ہیں لیکن ہم منہ بنالیتے ہیں کیونکہ جلدی میں ہم سے تو یہی کچھ بن سکتا ہے۔

ہمارے ہاں مہمان ہمیشہ بغیر اطلاع کے کسی چھاپہ مار ٹیم کی طرح آتے ہیں اور ہمیں کہیں بھاگنے کا موقع بھی نہیں دیتے تب ہم پیر گھسیٹتے کچن کی طرف یوں روانہ ہوتے ہیں۔ جیسے تختہ دار کی طرف گھسیٹے جا رہے ہوں۔ مہمانوں کے آتے ہی ہماری گردن کے دائیں بائیں ایسا درد اٹھتا ہے جو مہمان کے جانے پر ہی ٹھیک ہوتا ہے۔

ویسے تو ہم اپنا فریز ہر وقت بھر کر رکھتے ہیں۔ مگر عجیب اتفاق ہے جب بھی مہمان آتے ہیں' ہمارا فریزر خالی اور پیٹ بھرا ہوا ملتا ہے۔

نہ کباب نہ سموسے نہ نگٹس۔

باورچی خانہ بے شک کسی بھی خاتون کی سلیقہ مندی کا ثبوت ہوتا ہے' اسی لیے ہم نے اماں کی پرانی سلیقہ مشین باورچی خانہ میں ہی لا رکھی ہے تاکہ اسے دیکھتے ہی لوگوں کو پتا چل جائے کہ یہاں بھی سلیقہ ہے۔

مندرجہ بالا گزارشات سے ہرگز یہ نتیجہ نہ نکالا جائے کہ ہمیں باورچی خانہ کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس ہمیں تمام امور کھانا داری پر مکمل عبور حاصل ہے۔ ہم نے دوسری سگھڑ خواتین کی طرح کچن میں ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے۔ جی ہاں ہر کھانے کی ہر چیز تاکہ کسی اور کے ہاتھ نہ لگے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہماری شخصیت نہایت بھرپور اور وزن دار ہے ادھر ہماری انکساری کا یہ عالم ہے کہ کبھی غرور نہیں کیا۔

ہمیں باورچی خانے سے متعلق تمام ٹوٹکوں پر نہ صرف عبور حاصل ہے بلکہ کچھ تو ہماری ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہیں' لوگ خواہ مخواہ ہر ٹوٹکا زبیدہ آپا کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً" آٹا گوندھتے ہوئے پتلا ہو جائے تو اسے محفوظ کرلیں خط جوڑنے کے کام آئے گا۔ چار پانچ سالوں تک گوندکی بچت کر کے آپ اپنے گھر میں معاشی استحکام لا سکتی ہیں۔ اور اتنے آٹے میں

تو پورے پاکستان کو خط لکھا جاسکتا ہے۔

ہمیں باورچی خانے میں رکھے تمام مسالوں کے ناموں اور کاموں سے بھی مکمل آگاہی ہے مثلاً "کس طرح کے زخم پر نمک چھڑکنا مفید رہے گا۔ کس پر مرچیں، کس پر کالی مرچ سے کام چل جائے گا۔ کس پر سفید" اس بات سے ہم بخوبی واقف ہیں۔

ویسے تو باورچی خانے میں موجود چیزوں کے کئی استعمال ہیں۔ لیکن ہماری سادہ و معصوم بہنیں ان کا ایک ہی طرح کا استعمال جانتی ہیں۔ مثلاً "چمچے، ڈوئی سے کھانا پکانے کے علاوہ لمبی زبان والی نِسائی کا دماغ بھی درست کیا جاسکتا ہے۔ پانی سے برتن دھونے کے ساتھ ساتھ اسے ان امیدوں پر بھی پھیرا جاسکتا ہے جو لوگ خواہ مخواہ ہم سے لگائے رکھتے ہیں۔

اس پانی سے اسی جرم کی پاداش میں ان ہی لوگوں کو شرم سے پانی پانی بھی کیا جاسکتا ہے۔ آگ پر کھانا پکانے کے علاوہ حاسدوں کا کلیجہ بھی بھونا جاسکتا ہے۔

ویسے تو ہم طرح طرح کے کھانے بنانا جانتے ہیں لیکن اس مہنگائی اور تیزی کے دور میں ایک آسان پلاؤ کی ترکیب بہنوں کی نذر ہے۔ جی خیالی پلاؤ کی۔ نہ خرچہ نہ محنت، صرف شیخ چلی سے تھوڑی سی مدد لینی پڑے گی اور بس۔

اب رہا یہ سوال کہ ہمیں خود کونسی ڈش پسند ہے تو ہم اس معاملے میں نہایت مرنجان مرنج اور منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں۔ ہمیں ہر وہ ڈش پسند ہے جو کوئی دوسرا بنا کر ہمارے سامنے لا رکھے۔

ہمارے کچن کی صفائی ہمیشہ بیگ صاحب کرتے ہیں۔ کیا کہا؟ آپ بیگ صاحب کو نہیں جانتیں!! ارے بھئی وہی بیگ صاحب جو لال ہوتے ہیں بعد میں بیگ ہو جاتے ہیں۔ بھئی ہم تو ان کی کارکردگی سے بڑے مطمئن ہیں آپ بھی انہیں خدمت کا موقع دیں۔

ہم کبھی کبھی باہر بھی کھانا کھاتے ہیں۔ جی ہاں، کچن سے باہر صحن میں اور جس دن کھانا ہم بناتے ہیں اس دن محلے میں بڑی رونق رہتی ہے۔ کیونکہ کھانے کے دوران اور بعد میں اہل محلہ کچھ ناقابل بیان اور ناقابل اشاعت قسم کے فرمودات سماعت فرماتے ہیں۔ اچھی خبر یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا ذرا بھی افسوس نہیں، بڑے تخلیق کاروں کے ساتھ یہ دنیا یہی سلوک کرتی ہے۔

ہماری اتنی نادر و نایاب خصوصیات کے باوجود ہماری ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہمارے گھر والے لوگوں کے سامنے ہاتھ جوڑ جوڑ کر انہیں ہم سے شادی پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ ذہانت اور قابلیت کا یہ دریا دوسروں کے گھر بہا دینا چاہتے ہیں۔ موٹا گوشت کھا کھا کر ان کی عقل بھی موٹی ہو گئی ہے۔

اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آگیا۔ چونکہ اس میں موٹے گوشت کا ذکر ہے، جس کا براہ راست تعلق کچن سے ہے لہٰذا یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک دفعہ پشاور جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتے ہیں وہاں کے قصائیوں نے موٹے گوشت کا اشتہار جا بجا بل بورڈز پر دے رکھا ہے۔ جی بڑا خوش ہوا۔ چلو! کسی شعبے میں تو ترقی ہوئی۔ اس خوشی کا اظہار ہم نے اپنے میزبان سے بھی کر دیا مگر ان پر الٹا ہی اثر ہوا۔ بڑی دیر تک حیرت اور صدمے سے ہمیں گھورتے رہے پھر جیسے ہماری لاعلمی پر ماتم کرتے ہوئے بولے

"یہ قصائی کے گوشت کا نہیں بلکہ پشتو فلم کا اشتہار ہے۔"

"کیا؟" ہم حیرت سے چیخے۔ "تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ یہ جو موٹی سفید ٹانگ نظر آ رہی ہے یہ کسی گائے کی نہیں۔" اس پر وہ کچھ نہیں بولے بس کچھ بڑبڑا کر چپ ہو رہے۔

اور اب آخر میں کالم کی روایت کے مطابق ایک ٹوٹکا پیش خدمت ہے۔ نہایت آزمودہ اور ہمارے برس ہا برس کے تجربے کا نچوڑ۔ جی تو ٹوٹکا یہ ہے کہ اگر آپ کی چائے پھیکی ہو تو اس میں چینی ملائیں میٹھی ہو جائے گی۔

☆

ہزار حادثاتِ غمِ رواں دواں لیے ہوئے
کہاں چلی ہے زندگی کشاں کشاں لیے ہوئے

مرے نصیب کی یہ ظلمتیں نہ مٹ سکیں کبھی
کوئی گزار گیا ہزار کہکشاں لیے ہوئے

یہ زندگی بدلتے موسموں کا رنگ روپ ہے
کبھی بہار کا سماں، کبھی خزاں لیے ہوئے

اگر وہ جانِ آرزو ملے تو اس کی نذر ہو
کھڑا ہوں کب سے منتظر میں نقدِ جاں لیے ہوئے

مرے وقار کا سوال تھا میں کچھ نہ کہہ سکا
گزر گئے وہ راحتوں کا اک جہاں لیے ہوئے

کسی بھی زاویے سے عرشؔ اس کو دیکھیے مگر
قدم قدم پہ زندگی ہے امتحاں لیے ہوئے

عرش صہبائی

ابھی تک اس کو مرا انتظار ہے شاید
مری نظر پہ بہت اعتبار ہے شاید

لباسِ یاس میں پہلے کبھی نہیں دیکھا
کسی کے سوگ میں اب کے بہار ہے شاید

وہ دیکھ کے مجھے مثلِ گلاب کھلتا ہے
کہ دل ہی دل میں اسے مجھ سے پیار ہے شاید

کئی دلوں کا مقدر عذاب ہوتا ہے
ہمارا دل بھی ان ہی میں شمار ہے شاید

وہ بات بات پہ اپنی مثال دیتا ہے
کچھ اپنے آپ پہ کم اعتبار ہے شاید

پریہ درشنی بھٹناگر خیال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

• خریداری کی نیت کے بغیر بولی میں اضافہ مت کرو۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ:۔

انسان کی نیت خریدنے کی نہ ہو، پھر بھی قیمت بڑھا کر بولی لگائے تو ظاہر بات ہے کہ اس سے دوسرا خریدار دھوکا کھا جائے گا اور اسے اصل قیمت سے کہیں زیادہ قیمت پر وہ چیز خریدنی پڑے گی۔ گویا یہ بھی دھوکا دہی کی ایک صورت ہے۔

کار بے سود،

تل ابیب کی ایک کمپنی کا ڈائریکٹر لامتناہی کانفرنسوں سے سخت اکتا چکا تھا۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

• اگر بنی اسرائیل کی رہنمائی حضرت موسیٰؑ کے بجائے ایک کمیٹی کر رہی ہوتی تو بنی اسرائیل ابھی تک مصر ہی میں ہوتے۔"

درجہ،

حضرت موسیٰؑ نے ایک شخص کو عرش کے سائے میں دیکھا۔ اور اس کے اس مقام کی آرزو کرتے ہوئے کہا کہ حق تعالیٰ کے پاس اس کا بڑا درجہ ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔

"الٰہی! اس شخص کا نام کیا ہے؟"

خداوند تعالیٰ نے نام ظاہر نہیں فرمایا لیکن فرمایا کہ میں اس کے عمل سے تم کو خبر دیتا ہوں کہ اس نے کبھی حسد نہیں کیا۔ ماں باپ کی کبھی نافرمانی نہیں کی اور نہ غمازی کی۔

الوینہ، نوشین۔ حیدر آباد

ساس بہو،

لڑکے نے دس لڑکیوں کو ایک قطار میں کھڑا کیا اور اپنی ماں سے کہا۔

• ان میں سے ایک لڑکی مجھے بہت پسند ہے۔ وہ آپ کی بہو بنے گی۔ بوجھیں تو وہ کون سی ہے؟"

ماں نے بہ غور سب کو دیکھ کر ایک لڑکی کی طرف اشارہ کیا کہ ان کے خیال میں یہ والی لڑکی ان کے بیٹے کی پسند ہے اور وہ اسی سے شادی کرنے کا سوچ رہا ہے۔"

لڑکا انتہائی حیرت سے بولا۔" جی بالکل آپ نے کیسے پہچانا؟"

ماں نے جواب دیا۔

" کیونکہ ان سب میں صرف یہی لڑکی مجھے زہر لگ رہی تھی۔"

مدیحہ فہمید، ایمان۔ مدینہ کالونی

پھوڑے پھنسیوں کا ایک عجیب علاج،

حضرت عبداللہ بن مبارک بڑے درجے کے علماء میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے ان سے کہا۔

" میرے گھٹنے میں سات سال سے ایک پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ ہر طرح کا علاج کرا چکا ہوں، بہت سے اطباء سے بھی رجوع کیا، لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

حضرت عبداللہ بن مبارک نے فرمایا۔" جاؤ کوئی

ایسی جگہ تلاش کرو، جہاں پانی کی قلت ہو اور لوگ پانی کے ضرورت مند ہوں۔ وہاں جا کر ایک کنواں کھود دو۔ مجھے امید ہے کہ وہاں کوئی پانی کا چشمہ جاری ہو گا تو تمہارا خون رُک جائے گا۔"

اس شخص نے ان کے کہنے پر عمل کیا تو تندرست ہو گیا۔

نادیہ، نجمہ۔ گلستان جوہر

آثارِ بڑھاپا،

- جب آپ بالوں میں کنگھی کرنے کے بجائے ان سے اپنا گنج چھپانے لگتے ہیں۔
- جب آپ کا بیٹا آپ کی تھوڑی بہت عزت کرنے لگتا ہے۔
- جب آپ کے کپڑے آپ کو فٹ نہیں آتے اور تراش خراش کی ضرورت کپڑوں کو نہیں، آپ کو ہوتی ہے۔
- جب فون پر نسوانی آواز کہتی ہے مجھے پہچانا اور آپ نہیں کہہ کر ریسیور رکھ دیتے ہیں۔
- یہ خواہش کہ کاش ہم اسی سال پیدا ہوتے اور رفتہ رفتہ اٹھارہ سال کے ہو جاتے۔
- جب آپ کو یہ پوچھنے سے پہلے کہ اپنی عینک کہاں بھول گئے، اپنی بینائی اور آلۂ سماعت کی ضرورت پڑتی ہے۔
- جب آپ اپنے موزے کی شکنیں درست کرنے کے لیے جھکتے ہیں اور آپ کو پتا چلتا ہے کہ موزے تو آپ نے پہنے ہی نہیں ہیں۔

عذرا ناصر، اقصیٰ ناصر۔ کراچی

واصف علی واصف،

- ایمان کی سلامتی شریعت ہے۔
- غلام کو غلامی پسند نہ ہو تو کوئی آقا پیدا نہیں ہو سکتا۔
- سکون کی تمنا ہے تو ضد، غصہ اور خواہش کی پرستش نکال دو۔
- بڑی سے بڑی اور آسان فقیری یہی ہے کہ ہمیں اللہ کا ہر فیصلہ منظور ہے۔
- ہم ہر حالت سے سمجھوتا کر لیتے ہیں بس انسانوں سے نہیں کرتے۔
- دولت کی محبت غریبی کا ڈر پیدا کرتی ہے۔
- اگر ظرف نہ ہو تو عطا انسان کو مغرور بنا دیتی ہے۔
- آپ لوگ ہر رات کو اپنے آپ کو توبہ کر کے معصوم کر کے سویا کرو۔
- جس شخص کو کسی پر بھروسا نہ ہو وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔

نوال افضل گھمن۔ لاہور

گھر کا بھیدی،

رضوانہ نے ایک خط پڑھتے ہوئے خواب ناک لہجے میں فرزانہ کو بتایا۔

"ماجد نے لکھا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ ذرا اندازہ لگاؤ، وہ مجھے صرف ایک ہفتے سے جانتا ہے اور لکھ رہا ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرنے لگا ہے۔ کیا اس کی بات کا یقین کر لینا چاہیے؟"

"اگر وہ تمہیں صرف ایک ہفتے سے جانتا ہے تو تمہیں اس کی بات کا یقین کر لینا چاہیے۔" فرزانہ نے جواب دیا۔

صدف عمران۔ کراچی

ڈبل منافع،

"اچھا تو گویا تم نے محبت کی اور دھوکا کھایا، اس کے ساتھ ساتھ نقصان بھی اٹھایا۔" ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔

"نہیں! میں نے محبت کی لیکن میرے خیال میں نہ تو میں نے دھوکا کھایا اور نہ ہی نقصان میں رہا۔" دوست نے جواب دیا۔

"وہ کیسے؟" اس شخص نے استفسار کیا۔

"شہلا نے میری منگنی کی انگوٹھی اور میرے دیے ہوئے تحائف واپس کیے تو غلطی سے ان میں دوسروں

کے دیے ہوئے کچھ تحفے بھی شامل کر دیے۔" دوست نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ارم ذوالفقار۔ کراچی

قیمتی،

قائداعظم جو واقعی ایک نہایت مصروف آدمی تھے مگر انہیں اتنا وقت مل جاتا تھا کہ وہ ہر رسید پر بذاتِ خود دستخط کریں۔ اس کی کوئی اہمیت نہ تھی کہ رسید دس ہزار کی رقم کے لیے تھی یا صرف چار آنے کی۔ انہیں ایک روپے سے کم کی ہزاروں رقمیں وصول ہوئی ہوں گی جن کی رسید انہوں نے خود لکھی۔

جب ان سے یہ کہا گیا کہ یہ کام وہ کسی اور کے ذمے کر دیں تو انہوں نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں۔ رسیدوں پر مجھے خود دستخط کرنے چاہئیں اس غریب شخص کے لیے جو مجھے چار آنے بھیجتا ہے یہ رقم ایسی ہی ہوگی جیسے کسی متمول انسان کے لیے دس ہزار۔ میری نظر میں اس کے چار آنے کے عطیے کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ دس ہزار۔ بلکہ دس ہزار کے عطیے کی۔ اس غریب آدمی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ میں اس کی مدد قبول کرتا ہوں۔ اور اس کے عطیے کو قیمتی سمجھتا ہوں۔"

(قائداعظم محمد علی جناح، میری نظر میں از حسین اصفہانی)

حما قریشی۔ ملتان

اسراف،

ایک حاجت مند حضرت عثمان غنیؓ کے دروازے پر غروب آفتاب کے بعد آیا۔ ابھی اس نے دستک بھی نہ دی تھی کہ حضرت عثمان کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ وہ اپنی اہلیہ سے شکایت کر رہے تھے۔

"چراغ کی بتی موٹی ہے۔ جو زیادہ تیل استعمال کرنے کا سبب بن رہی ہے۔"

حاجت مند نے جو یہ سنا تو سوچتا ہی رہ گیا کہ ایسے شخص سے حاجت براری کی کیا توقع کرے، جو تیل کے معمولی سے زیادہ خرچ پر اپنی بیوی کو سرزنش کر رہے ہے۔ پھر بھی اس نے دستک دے ہی دی۔ دستک سن کر حضرت عثمان غنیؓ باہر تشریف لائے، حاجت مند نے اپنی ضرورت بیان کی۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اس شخص کا ہاتھ تھاما اور بستی سے باہر لے گئے۔ جہاں آپؓ کا سامانِ تجارت بڑی تعداد میں رکھا ہوا تھا۔ فرمایا۔

"یہ سب تیری نذر ہے، کیا اس سے تیری ضرورت پوری ہو جائے گی؟"

وہ شخص حیران ہکا بکا دیکھتا رہ گیا پھر اس نے کہا۔

"اے حضرت ایک بات بتائیے، چراغ کی بتی ذرا سے موٹی ہو جانے پر آپ اپنی زوجہ محترمہ کو سرزنش کر رہے تھے۔ حالانکہ چراغ اس قدر روشن رکھنے میں شاید صرف ایک درہم کا تیل استعمال نہ ہوتا، وہ تو آپ کو گوارا نہ ہوا اور یہاں ہزاروں کا سامان مجھے بلا تامل دے رہے ہیں؟" تب آپ نے فرمایا۔

"بھائی، چراغ کے تیل کا زیادہ استعمال اسراف ہے اور اسراف اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں اور مجھے اللہ کے حضور اپنے اعمال کی فکر رہتی ہے۔ یہاں مجھے فکر اعمال لاحق ہے۔ اس لیے میں نے سرزنش کی۔ سامان تمہیں اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ دیا ہے اس پر اجر کی امید ہے اور وہاں پر حساب کا خوف ہے۔"

ندا فقیر۔ کراچی

غلام قوم،

غلام قوم کے معیار بھی عجیب ہوتے ہیں۔ شریف کو بے وقوف، مکار کو چالاک، قاتل کو بہادر اور مال دار کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں۔

(مولانا عبیداللہ سندھی)

صدف عمران۔ کراچی

خالدہ جیلانی

نخبہ اکرم ــــــــ گاؤں گویکی

ہر اک نے کہا کیوں تجھے آرام نہ آیا
سنتے رہے ہم لب پہ ترا نام نہ آیا
مت پوچھ کہ ہم ضبط کی کس راہ سے گزرے
یہ دیکھ کہ تجھ پہ کوئی الزام نہ آیا

عنیزہ علوی ــــــــ لاہور

گریز و رجعت و تخریب ہی سہی لیکن
کوئی تڑپ، کوئی حسرت، کوئی مراد تو ہے
تری ہنسی سے تو میری شکست ہی بہتر
مری شکست میں تھوڑا سا اعتماد تو ہے

ثنا عبدالقیوم ــــــــ بنگہ چیمہ

اداسیاں تو مرے عہد کی علامت ہیں
میں ہنس پڑا تو بہت پیچھے ٹوٹ جاؤں گا

عائشہ بابر ــــــــ کراچی

مجھے ایسا لطف عطا کیا جو ہجر تھا نہ وصال تھا
مرے موسموں کے مزاج داں تجھے میرا کتنا خیال تھا

خمائل صابر ــــــــ کویت

وہ گزرا تو اس کی ہر جفا کر دی
اس کے حق میں پھر دعا کر دی
اک لمحے میں کھو دیا اس نے ہمیں
جس کو پانے میں ہم نے انتہا کر دی

شازیہ ارشد ــــــــ قصور

دل کو رہ رہ کے یہ اندیشے ڈرانے لگ جائیں
واپسی میں ممکن ہے اسے زمانے لگ جائیں
اتنی تاخیر سے مت مل کہ ہمیں صبر آ جائے
اور پھر ہم تجھ سے نظریں چرانے لگ جائیں

مدیحہ نورین مہک ــــــــ گجرات

کتنا آسان تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی جان سے جاتے جاتے

ارم ذوالفقار ــــــــ گلستان جوہر

خود اپنے حق کے لیے بھی جھگڑ سکے نہ کبھی
دل اس طرح کا ملا کہ لڑ سکے نہ کبھی
سلامتی کا سبب ہے فقط لچک اپنی
ہوا کی زد میں رہ کر بھی اکڑ سکے نہ کبھی

گڑیا شاہ ــــــــ کہروڑ پکا

جب رات کے پردے سے پھر رات نکل آئے
اس وقت کدھر جائے، جو اہل نظر ہوگا
تاریخ کے چکر میں وہ موڑ نہیں آیا
جب شاد مکیں ہوں گے، آباد نگر ہوگا

رخسانہ شکیل ملغ ــــــــ لودھراں

تو غم حیات سے گھبرا رہا ہے اے جگر
بھلا ایسی بھی کوئی شام ہے جس کی سحر نہ ہو

مروہ مظفر ــــــــ صوابی

کس طرح سے کھایا ہے دھوکا کیسے بتاؤں میں تمہیں
اپنوں کے مشورے رہتے سازشوں کے ساتھ ساتھ
جن کو ہم اپنا کہتے تھے بڑے مان سے
صف بہ صف وہ کھڑے تھے دشمنوں کے ساتھ ساتھ

شائستہ اکبر ــــــــ گڈو کالونی

آس لگی رہنے یہ سن کے صبر کیا
جانے والے یہاں کے تھے ہی نہیں

نجمہ، نادیہ ــــــــ کراچی

ابھی اور میعادِ غم کتنی ہے
کہاں تک ملیں گے وفا کے صلے

گیلانی سسٹرز ــــــــ کہروڑ پکا

جنہیں دیکھ کر ہم جیتے تھے ناصر
وہ لوگ آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں

● **شائستہ اکبر** کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل پتا نہیں کس شاعر کی ہے۔ مجھے بہت پسند ہے۔ قارئین میں سے کسی کو پتا ہو تو شاعر کا نام ضرور بتا دیں۔

تو گزر گیا کسی موج میں، مجھے توڑ کر میرے کوزہ گر
مرے خال و خد کے نقوش تھے، اسی چاک پر مرے کوزہ گر

ترے بعد کوزہ فروش نے، مجھے طاقچے میں سجا دیا
جہاں ٹوٹ جانے کا خوف تھا، مجھے رات بھر مرے کوزہ گر

کہیں یوں نہ ہو ترے بعد میں، یونہی خاک پر ہی پڑا رہوں
مرے سوتے نقش و نگار میں کوئی رنگ بھر مرے کوزہ گر

جو ظروف خانہ بدوش تھے، مجھے کوزہ گاہ میں دیکھ کر
سبھی حیرتوں میں چلے گئے، مجھے چھوڑ کر مرے کوزہ گر

ابھی آگ سے مری گفتگو تمام ہونے میں وقت ہے
میں ہنوز نم ہوں، ابھی کہیں، ذرا دیر کر مرے کوزہ گر

مجھے شکل دے کے درود پڑھ، مرے ساتھ اسمِ وجود پڑھ
کسی صبحِ اولیں وقت میں، مجھے نقش کر مرے کوزہ گر

● **حنا سحر** کی ڈائری سے

دورِ حاضر کی مادہ پرستی نے سب ہی کو اپنے جال میں جکڑ لیا ہے۔ اس میں ہم سب ہی شامل ہیں۔ شاعر نے اس کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

دشتِ غربت میں تنہا پھرے ہمسفر
ایک میں ہی نہیں، ایک تو ہی نہیں
ایک میں ہی نہیں، ایک تو ہی نہیں
جن پہ محدود کر دی گئی یہ زمین
جن کے سر پہ گرا آسمان ٹوٹ کر

ایک میں ہی نہیں، ایک تو ہی نہیں
لوگ دنیا میں کتنے رنجور ہیں
کتنے نادار ہیں، کتنے مجبور ہیں
جن کی ساری دعائیں ہوئیں بے اثر
وہ جو ہاتھوں میں لے کر اجالے گئے
کتنے ہی ایسے تھے جو مار ڈالے گئے
وہ بھی لے کر آئے تھے پیامِ سحر
ایک میں ہی نہیں، ایک تو ہی نہیں

● **گڑیا شاہ** کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر منور جمیل کی یہ غزل آپ سب بہنوں کی نذر۔

اب کس سے کہیں اور کون سنے جو حال تمہارے بعد ہوا
اس جھیل سی گہری آنکھوں میں اک خواب بہت برباد ہوا

یہ ہجر ہوا بھی دشمن ہے اس نام کے سارے رنگوں کی
وہ نام جو میرے ہونٹوں پر خوشبو کی طرح آباد ہوا

اس شہر کے کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن پہ ناچتا گاتا تھا
اب اس سے فرق نہیں پڑتا ناشاد ہوا یا شاد ہوا

بے نام ستائش رہتی تھی ان گہری سانولی آنکھوں میں
ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا دل اب جتنا بے داد ہوا

رابعہ سلیم کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر یہ غزل آپ سب بہنوں کی نذر۔

سازو آواز خدو خال میں آجاتے ہیں
سانس لیتا ہوں تو سُر تال میں آجاتے ہیں

جنگ اور عشق میں ہارے ہوئے لوگوں کی طرح
ہم غنیمت کے کسی مال میں آجاتے ہیں

زندگی خواب ہے اور خواب کی قیمت لینے
جن کو آنا ہو کسی حال میں آجاتے ہیں

تو بھی سادہ ہے کبھی چال بدلتا ہی نہیں
ہم بھی دانستہ تیری چال میں آجاتے ہیں

شام ڈھلتے ہی کسی گوشۂ ویرانی میں
ہم پرندوں کی طرح جال میں آجاتے ہیں

عائشہ جہانگیر کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر احمد فراز کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔

روگ ایسے بھی غمِ یار سے لگ جاتے ہیں
در سے اُٹھتے ہیں تو دیوار سے لگ جاتے ہیں

کترنیں غم کی جو گلیوں میں اڑی پھرتی ہیں
گھر میں لے آؤ تو انبار سے لگ جاتے ہیں

عشق آغاز میں ہلکی سی خلش رکھتا ہے
بعد میں سینکڑوں آزار سے لگ جاتے ہیں

بے بسی بھی کبھی قربت کا سبب بنتی ہے
رو نہ پائیں تو گلے یار سے لگ جاتے ہیں

داغ دامن کے ہوں، دل کے ہوں کہ چہرے کے فراز
کچھ نشاں عمر کی رفتار سے لگ جاتے ہیں

میری بہن، میری بھابھی کے صادم

باتیں علی حسن سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"سید علی حسن۔"
2 "پیار کا نام؟"
"علی۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"خطرناک سوال پوچھ لیا آپ نے۔ (قہقہہ) 11 اپریل / کراچی۔"
4 "تعلیم؟"
"ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز ہوں۔"
5 "قد / ستارہ؟"
"5 فٹ 11 انچ / حمل۔"
6 "بہن بھائی؟"
"ایک بہن، ایک بھائی۔"

7 "شادی؟"
"ابھی نہیں ہوئی۔ ابھی تو قدم جم جائیں۔ اچھا کمانے لگ جاؤں تو پھر شادی کا سوچوں گا۔"
8 "شوبز میں آمد؟"
"ماسٹرز کرنے کے بعد آفرز آئیں۔ کچھ عرصہ نیوز پڑھی۔ پھر اداکاری کی طرف آگیا۔"
9 "آپ کا ذریعہ معاش؟"
"میرا اپنا پروڈکشن ہاؤس ہے۔"
10 "متعارف کرانے کا سہرا؟"
"میرا پروڈکشن ہاؤس ہی میرا تعارف تھا۔"
11 "پہلا پروگرام اور وجہ شہرت؟"
"پرائیویٹ چینل پہ ایک سیریل چلا تھا "آگ" اسی سے شہرت بھی ملی۔"

12 "پہلی کمائی؟"

"نیوز پڑھی تھی تو ملی تھی۔۔۔ اچھا معاوضہ تھا۔"

13 "صبح کب اٹھتے ہیں؟"

"کام کے حساب سے اٹھتا ہوں۔ البتہ چھٹی کے دن گیارہ یا بارہ بجے اٹھتا ہوں۔"

14 "اٹھتے ہی دل چاہتا ہے؟"

"کہ بیڈ ٹی مل جائے۔"

15 "لڑکپن میں گھر والوں کی جو بات بری لگتی تھی؟"

"پڑھائی کی تلقین۔۔۔ مگر یہی چیز اب ہمارے کام آ رہی ہے۔"

16 "پسندیدہ تہوار؟"

"بچپن میں تہواروں کا بہت انتظار رہتا تھا جیسے عید' بقر عید۔ اب تو جس دن چھٹی ہو وہی دن تہوار لگتا ہے۔"

17 "وہ آپ کا پسندیدہ کھانا جو مسلسل کئی دن کھا سکتے ہیں؟"

"تکہ" "بے حد پسند ہے۔"

18 "شدید بھوک کو کس طرح کم کرتے ہیں؟"

"فروٹ کھا لیتا ہوں۔ مگر ایسے فروٹ جو موٹا نہ کریں۔"

20 "کیا ملک میں تبدیلی ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے۔۔۔ سب نئے لوگ آجائیں تو کوئی پرانا سیاست دان نہ آئے۔ پڑھے لکھے عقل مند۔"

21 "ملک سے باہر جا کر کیا سوچتے ہیں؟"

"کہ ہم کس دنیا میں جی رہے ہیں؟۔۔۔ دنیا نے کتنی ترقی کرلی ہے اور ہم سب سے کتنے پیچھے ہیں۔"

22 "مطالعہ کرتے ہیں؟"

"بہت کم۔ پہلے پھر بھی کرلیتا تھا۔ اب ٹائم نہیں ہے۔"

23 "فخر کا کوئی لمحہ؟"

"جب لوگ پہچان کر سیلفی لے رہے ہوتے ہیں یا آپ سے باتیں کرتے ہیں تو بہت فخر ہوتا ہے کہ محنت وصول ہو رہی ہے۔"

24 "365 دنوں میں کون سا دن ایسا ہوتا ہے کہ آپ انتظار کرتے ہیں؟"

"کوئی خاص دن تو نہیں ہے۔۔۔ لیکن جس دن میں ٹریول کروں وہ دن مجھے اچھا لگتا ہے۔"

25 "تھکن اور نیند کو کب قربان کردیتے ہیں؟"

"کچھ اچھے دوست جن کی تعداد صرف دو یا تین ہے اگر آجائیں یا کہیں چلنے کو کہیں تو۔"

26 "بچپن کی کوئی بری عادت جو ابھی تک موجود ہے؟"

"ضد۔۔۔ کہ جو سوچ لیا ہے وہی کرنا ہے' ضد اچھے کام کے لیے ہی ہوتی ہے۔ مگر ہوتی ضرور ہے۔"

27 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"میرے خیال میں فون سے بہتر کوئی ایجاد نہیں ہے کہ آپ کا پوری دنیا سے رابطہ آسان ہے۔"

28 "غصہ آتا ہے؟"

"جی بہت کم آتا ہے۔۔۔ اور کبھی کبھی تو بندہ بڑی سے بڑی بات کو اگنور کردیتا ہے اور کبھی چھوٹی بات پر بھی غصہ آجاتا ہے۔"

29 "لڑکیوں کی اچھی اور بری بات آپ کی نظر میں؟"

"مشکل سوال ہے۔ اور سب میں ایک جیسی عادتیں نہیں ہوتیں۔"

30 "شوبز میں آکر کسی بری عادت میں مبتلا ہوئے؟"

"الحمدو للہ بالکل بھی نہیں۔ نہ سگریٹ نہ کوئی اور بری عادت۔۔۔ لوگ حیران ہوتے ہیں۔"

31 "پرائز بانڈ لیے کبھی؟"

"نہیں۔۔۔۔۔۔ سوچا کئی بار' لوگوں نے کہا بھی کہ نکلتے ہیں مگر مجھے لگتا ہے کہ اس معاملے میں میرا لک اچھا نہیں ہے۔"

32 "گھر میں کس کا غصہ تیز ہے؟"

"والد صاحب کا اور ٹین ایج میں ڈر بھی لگتا تھا۔ مگر اب نہیں۔"

33 "شادی پسند سے کریں گے؟"

"کچھ سوچا نہیں۔ لیکن جو کچھ بھی ہو گا' والدین کی مرضی سے ہی ہو گا۔"

34 "شخصیت میں کوئی کمی؟"

"نہیں 'عموماً' اعتماد کی کمی ہوتی ہے مگر والدین اور خصوصاً" والد صاحب کی تربیت نے خود اعتماد بنایا۔"

35 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"

"بالکل ہوتی ہو گی۔۔۔ مجھے بھی ہوئی' مگر تمہارے لیے مر جاؤں گا۔ والی نہیں ہوئی۔۔۔ مگر میں نے لوگوں کو محبت میں اندھا ہوتے دیکھا ہے۔"

36 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہیں گے اور تاوان میں کیا وصول کریں گے؟"

"بہت اچھا سوال ہے۔۔۔ جناب بہت ساری شخصیات ہیں کس کس کا نام لوں۔"

38 "شادی کی رسموں میں پسندیدہ رسم؟"

"مہندی۔"

39 "تحفہ دیتے ہیں یا کیش؟"

"تحفہ۔۔۔ تحفہ دینا ہی اچھا لگتا ہے۔"

40 "گھر کا کھانا خواتین پکاتی ہیں یا کک؟"

"ہمارے گھر میں تو کک ہے۔۔۔ جو ہمارے بچپن سے ہے وہ بہترین کھانا پکاتا ہے۔"

41 "آپ کا کچن سے لگاؤ؟"

"بالکل بھی نہیں۔۔۔ آپ مجھ سے دنیا کا کوئی کام کروالیں۔۔۔ مگر کھانا پکانے کے لیے کوئی نہ کہے۔"

42 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"

"نہیں بدلتا۔ دو نمبر ہیں۔ ایک بارہ سال قبل لیا تھا اور دوسرا پانچ چھ سال پہلے لیا تھا۔"

43 "قوبیا ہے؟"

"کچھ زیادہ ہی ہے۔۔۔ اونچائی سے۔۔۔"

"آپ لڑائی مت کرائیں۔ (ہنستے ہوئے)۔"

46 "گھر سے نکلتے وقت کیا کیا چیزیں لے کر نکلتے ہیں؟"

"والٹ' گاڑی کی چابی اور موبائل فونز۔"

47 "ماں کی ناراضی کس طرح دور کرتے ہیں؟"

"ماں۔۔۔ میری والدہ کا تو میرے بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا۔"

48 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں؟"

"جی۔۔۔ فوراً"۔۔۔"

49 "آپ کی اچھی عادت۔۔۔؟"

"معاف کر دیتا ہوں لوگوں کو۔"

50 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"

"جو چیز مجھے چاہیے ہے' وہ چاہیے ہے۔۔۔ اس کے لیے پیسوں کی پرواہ نہیں کرتا۔"

51 "تعریف سن کر کیسا لگتا ہے؟"

"بہت اچھا۔۔۔ بہت ہی اچھا۔۔۔ کوئی تعریف نہیں کرتا تو میں خود اپنی تعریف کرنے لگتا ہوں۔"

52 "کیا ہضم کرنا مشکل ہے؟"

"اگر فیلڈ کے حوالے سے بات کریں تو تنقید ہضم کرنا بہت مشکل کام ہے۔"

53 "کس ایئرلائن میں سفر کرتے ہیں؟"

"گلف اور امارات۔"

56 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"

"اپنے گھر پر۔"

57 "سوشل ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ میرا کہیں زیادہ آنا جانا نہیں ہے۔۔۔ پارٹیز میں نہیں جاتا۔۔۔ گھر میں رہنا بہت پسند ہے۔"

58 "کسی کی سچی محبت دیکھنی ہو تو؟"

"جس سے محبت کریں اسے آزمانا نہیں چاہیے۔۔۔ لیکن وقت انسان کو سب کچھ بتا دیتا ہے کہ کون سچی محبت کرتا ہے اور کون نہیں۔"

59 "عورت حسین ہونی چاہیے یا ذہین؟"

"حسین ہونی چاہیے۔ عورت ذہین تو ہو ہی نہیں سکتی۔ حسین مل جائے تو ذہین تو بنا ہی لیں گے۔"

60 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"صرف اور صرف اپنے کمرے میں۔"

61 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"ماہ نور بلوچ کے ساتھ۔"

62 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً دیتے ہیں؟"

"یہ سیکریٹ ہے۔"

63 "بوریت دور کس طرح کرتے ہیں؟"

"میوزک ٹریولنگ سے۔"

65 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"

"بہت بار اور ہر بار سوچتا ہوں کہ اب کسی کو نمبر نہیں دوں گا مگر پھر دینا پڑتا ہے۔"

66 "آپ کے والٹ کی تلاشی لیں تو؟"

"کوئی خاص چیزیں نہیں نکلیں گی۔ تھوڑے بہت پیسے مختلف کارڈز وغیرہ۔"

67 "راہ چلتے کتنی بار لٹے؟"

"اللہ کا لاکھ شکر ہے کہ ایک بار بھی نہیں۔"

68 "مہمان بننا اچھا لگتا ہے یا مہمانوں کی آمد؟"

"دونوں۔۔۔ بلکہ مہمانوں کا آنا مجھے زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

69 "کیا چیزیں جمع کر رکھی ہیں؟"

"کپڑے۔۔۔ کپڑوں کا بہت شوقین ہوں۔"

71 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"

"بچپن۔"

74 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"گاڑی۔"

75 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"

"اپنا بیڈ۔۔۔ بہترین جگہ ہے۔"

76 "چھری کانٹے یا ہاتھ سے کھاتے ہیں؟"

"منحصر ہے کہ آپ کس جگہ بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔"

77 "دنیا سے کیا ریوارڈ لینا چاہتے ہیں؟"

"نام۔۔۔ عزت۔"

78 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"

"بالکل ہے کیونکہ ہمارا کام ایسا ہے کہ ہمیں ہر وقت اپ ڈیٹ رہنا پڑتا ہے۔"

79 "کانٹی نینٹل کھانوں میں آپ کی پسند؟"

"چائنیز۔"

80 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"

"کہیں کہیں عورت پتھر دل ہوتی ہے کہیں مرد۔۔۔ سب کا دل اللہ نے ایک جیسا نہیں بنایا۔

81 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"

"دل کی۔۔۔"

82 "بچپن کا کوئی کھلونا جو بہت سنبھال کر رکھا ہو؟"

"میرا دل۔۔۔ جس کے اندر ابھی ایک بچہ موجود ہے۔"

83 "کبھی چھپ چھپ کر باتیں سنیں؟"

"بچپن میں بہت سنتا تھا' اب نہیں "شوق" لینے کی عادت بچپن میں ہی ہوتی ہے۔"

84 "غصے میں پہلا لفظ؟"

"دماغ تو ٹھیک ہے۔"

85 "شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"

"پہلے جب مشہور نہیں تھے تو اپنا خیال نہیں رکھنا پڑتا تھا مگر اب گھر سے نکلتے وقت ذرا ٹھیک ٹھاک ہو کے نکلنا پڑتا ہے۔"

86 "لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے؟"

"نہیں نہیں۔۔۔ کافی ٹائم لگ جاتا ہے۔"

"آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"ابھی تو ایسی باتیں نہ کریں۔۔۔ ابھی بھرپور شہرت ملنے تو دیں پھر سوچیں گے۔"

☆

خبریں وبریں

واصفہ سہیل

گیٹو

(Ghetto) گیٹو پوری دنیا میں کسی شہر کے ایسے حصے کو کہتے ہیں جہاں کوئی خاص اقلیتی گروہ اکثریتی آبادی کی نفرت' خراب رویے اور ظلم و تشدد سے تنگ آکر آباد ہو جائے یا اسے بزور طاقت اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آباد ہونے کے لیے کہا جائے۔

پوری دنیا میں اس وقت مسلمانوں کا بھی ایک بہت بڑا گیٹو ہے۔ جس کی آبادی تقریباً" سات لاکھ ہے اس کا نام "جوہا پورہ" ہے۔ یہ بھارتی شہر احمد آباد مغرب کی جانب چند کلو میٹر پر واقع ہے۔ 1973ء میں اندرا گاندھی نے یہاں سیلاب زدگان کو آباد کرنے کے لیے مکانات تعمیر کیے تھے۔ درندہ مودی... اوہ سوری... نریندر سنگھ مودی کے شہر احمد آباد میں 1985ء میں پہلا مسلم کش فساد ہوا تو کچھ مسلمان خوف کے مارے یہاں آکر آباد ہو گئے' اس کے بعد جب بھی فساد پھوٹتے' کچھ اور مسلمان گھرانے اپنے آبائی گھر چھوڑ کر اس ویرانے میں آباد ہو جاتے۔

پوری دنیا میں گجرات کو معاشی ترقی کا شان دار نمونہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر مودی نے الیکشن جیتا۔ اس خوب صورت ترقی یافتہ اور شان دار شہر کے پہلو میں خوف زدہ سات لاکھ مسلمانوں کی ایک آبادی ہے۔ جو اپنے گھروں سے صرف اس لیے نکالے گئے کہ وہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہیں۔ جن کی عورتوں کی بے حرمتی سرعام کی گئی' جنہیں گھروں میں زندہ جلا دیا گیا۔ وہ لوگ جوہا پورہ کے گیٹو میں آباد ہیں۔ جہاں گندگی ہے' تعفن ہے' بیماری ہے۔ سیوریج سسٹم نہیں' سرکاری اسکول اور اسپتال نہیں۔ ترقی اور سہولیات اس کے دروازے پر آکر ختم ہو جاتی ہیں۔

آفرز

مہوش حیات کا کہنا ہے کہ فلم "نامعلوم افراد" اور "جوانی پھر نہیں آنی" میں کام کرنے کے بعد انہیں ملکی اور غیر ملکی فلموں میں کام کی بہت آفرز آئی ہیں۔ (مثلاً" ہالی ووڈ یا بولی ووڈ میں... آپ جیسا کام کرنے والوں کی کمی نہیں تو پھر...؟) مگر اب میں بہت سوچ سمجھ کر فلمیں سائن کرنا چاہتی ہوں۔ (یعنی عقل آگئی کہ...؟) مہوش کہتی ہیں کہ میرے اندر اداکارہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک گلوکارہ بھی ہے۔ (مہوش! اسے اندر ہی رہنے دیں' ورنہ...؟) اور میں گائیکی کے ذریعے اپنی ایک منفرد شناخت بھی بنانا چاہتی ہوں۔ (بھئی جو انفرادیت دکھانی ہے وہ اداکاری میں دکھائیں گائیکی کو گلوکاروں کے لیے چھوڑ دیں' ورنہ اگر نصیبو لال نے اداکاری کی طرف قدم رکھ دیا شناخت بنانے کے لیے تو...؟)

انہوں نے کہا کہ ــــ فلم "ایکٹر ان لاء" کی تشہیری مہم نے انہیں بہت تھکا دیا۔ اب آرام کے بعد دوبارہ ڈراموں اور کمرشل کی آفرز پر غور شروع کردیا ہے۔ (یعنی کسی فلم کی آفر ہے ہی نہیں، تساں دے کول ایویں شوخیاں مار رہے سی۔۔۔)

خیرباد

من مائل کی جینا عائشہ خان کا کہنا ہے کہ میں اپنے دور عروج میں شوبز کو خیرباد کہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی اور اگر میں فی الحال ٹی وی پر (بھئی ڈراموں میں۔۔۔) نظر نہیں آرہی ہوں۔ (بھئی اس وقت آپ دو ڈراموں میں آرہی ہیں تو کیا کم ہے یہ۔۔۔؟) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے ڈراموں میں آفر ہونے والے کرداروں کی یکسانیت سے بچنا چاہتی ہوں۔ (مطلب جینا کا کردار؟ بھئی خالی جگہ آپ خود "پر" کریں نا۔) عائشہ آپ جیسی بڑی اداکارہ کو یہ بات اٹھانا چاہیے کہ ڈراموں میں یکسانیت نہ ہو۔ (کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ یکسانیت کی وجہ سے ڈراما نہ کریں اور۔۔۔؟)

ڈر

ریحام خان صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ اب ہدایت کارہ بھی بن گئی ہیں کیونکہ ان کی فلم "جانان" عیدالاضحیٰ کے موقع پر نمائش کے لیے پیش کردی گئی ہے۔ ریحام کی فلم کی کہانی ایک ایسی لڑکی کے گرد گھومتی ہے جو پختون ہے اور لندن سے اعلا تعلیم حاصل کرنے پاکستان آتی ہے اور پھر ایک پنجابی لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ (ہائیں بچی کہانی پر مبنی فلم۔۔۔ بھئی ریحام! پڑھی لکھی پختون لڑکی، جو لندن سے آتی ہے اور "پنجابی لڑکے" سے شادی کرتی ہے، پھر آگے۔۔۔؟) اس کی راہ میں کون کون سی مشکلات آتی ہیں۔ یہ اس فلم میں بتایا گیا ہے۔ (اور شادی کے بعد۔۔۔؟) ریحام خان اس بارے میں کہتی ہیں کہ فلم کی کہانی ہرگز بھی میری زندگی کی کہانی نہیں ہے مگر اس کے کردار عہد حاضر کے ہیں۔ (مطلب۔۔۔؟)

اپنی زندگی کے بارے میں ریحام کہتی ہیں کہ طلاق کے بعد مجھ پر اپنوں اور غیروں نے جو الزامات لگائے، مجھے اپنی زندگی کے مشکل بلکہ بدترین دور سے گزرنا پڑا، لیکن میں نے اپنی لڑائی لڑی اور دوبارہ سے زندگی کی طرف اپنی پوری توانائی اور حوصلے کے ساتھ لوٹ آئی۔ ریحام نے مزید کہا کہ ہمارے معاشرے میں ایک عورت کو جب طلاق ہوتی ہے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ غلطی عورت ہی کی ہوگی۔ اور میری جیسی عورت جسے دو مرتبہ طلاق ہوچکی ہو، اسے معاشرے میں کن سوالوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، یہ مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ لیکن میں نے ثابت کیا کہ عورت کو طلاق یافتہ ہونے کی وجہ سے ڈرایا نہیں جاسکتا۔ (کیا آپ کسی سے ڈرتی ہیں؟)

ادھر ادھر سے

امریکہ کو راضی کرنے کے لیے تو ہم نے پاؤں میں گھنگھرو باندھ لیے مگر وہ ستم گر مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا۔ اسے راضی کرنے کی کوئی حد نہیں، نہ اس ذلت کی کوئی حد ہے جو اسے راضی کرنے میں ملتی ہے۔

(ڈاکٹر ضیاء الدین۔۔۔ امت)

آپ کا باورچی خانہ

حرا اقتدار

کھانا بنانا ایک فن ہے اور ہم اس فن سے صحیح معنوں میں شادی کے بعد ہی آشنا ہوئے کہ جب صحیح معنوں میں مکمل گھرداری سنبھالی۔ چلیے ذرا اب آتے ہیں سوالات کی جانب!

(1) پہلا سوال ہر لحاظ سے۔ اہم ہے۔ جی بالکل کھانا پکاتے وقت لذت و غذائیت دونوں کا بھرپور خیال رکھتی ہوں۔ ہفتہ میں ایک سے دو بار مرغی اور مچھلی کے گوشت کا استعمال بھی کھانے میں ضرور کرتی ہوں۔ ویسے زیادہ تر اب ہمارے یہاں گوشت ہی بنتا ہے۔ سبزیاں اور دالیں بہت کم۔

(2) مجھے تو وہ مہمان بہت اچھے لگتے ہیں جو بنا بتائے اچانک ہی آجائیں۔ مجھے بہت مزہ آتا ہے ایسے مہمانوں کی خاطر مدارات میں۔ اچھا لگتا ہے ناں کہ جب کوئی اچانک ہی آکر آپ کو اپنی آمد سے خوش کر دے تو۔

جناب مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ فریج میں چکن۔ گوشت سب موجود ہوتا ہے تو ایسے موقع پر میں فٹافٹ چکن تکہ بنالیتی ہوں جس کی ترکیب یہ ہے۔

"چکن تکہ"

ضروری اشیاء :

چکن	آدھا کلو
کیچپ	ایک کھانے کا چمچہ
لیموں	دو سے تین عدد
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
تکہ مسالا	ایک پیکٹ

ترکیب :

چکن میں تمام چیزیں شامل کرلیں۔ ٹائم ہو تو کچھ دیر رکھ دیں ورنہ تیل پتیلی میں ہلکا سا لگا کر چکن اس پر پھیلا دیں جب چکن گل جائے تو پتیلی میں کوئلہ دہکا کر رکھ دیں۔ مزے دار چکن تکہ بالکل تیار ہے۔

اس کے ساتھ فرنچ فرائز بنالیں اور ساتھ میں لچھے دار پیاز اور چٹنی رکھ دیں۔ سادہ چپاتیوں یا پھر پراٹھوں کے ساتھ یہ چکن تکہ بے حد مزیدار لگتا ہے۔ (آزمائش شرط ہے)

(3) کھانا بناتے وقت مجھے بکھرا ہوا کچن بالکل نہیں پسند۔ میں کچن کی صفائی کا بہت زیادہ خیال رکھتی ہوں۔ صاف ستھرے چولہے صاف سنک اور تمام شیلف صاف کر کے نکلتی ہوں۔ ہر ہفتے تفصیلی صفائی تو لازمی ہے اور چاہے کتنی ہی رات کیوں نہ ہو رات میں تمام برتن دھو کر کچن سمیٹ کر نکلتی ہوں۔ آج تک کبھی بھی رات میں ایک چھوٹا چمچہ تک نہیں چھوڑا ہمیشہ کچن رات کو سمیٹ کر ہی سوتی ہوں۔

(4) ناشتہ کرنے کی مجھے عادت ہی نہیں۔ کبھی کرلیا تو کرلیا ورنہ نہیں۔ پتا نہیں کیوں سارا دن تو بہت بھوک لگتی ہے لیکن صبح کے وقت بالکل نہیں حالانکہ ناشتہ نہ کرنے پر اپنے ممی پاپا سے بہت ڈانٹ کھائی۔ شادی کے بعد شوہر صاحب نے بھی ناشتے پر بہت زور دیا مگر ہم سے نہ ہوا یہ ناشتہ اور اگر کبھی دل نے بھی چاہا ناشتے کا تو جناب ایک پیکٹ چپس کے ساتھ ایک جوس کا پیکٹ پی لیا اور ہو گیا ہمارا ناشتہ حیران مت ہوں۔ ناشتے میں ہمیں "چپس" بے حد پسند ہیں۔ رہی بات "ان" کی تو وہ ہر وہ چیز کھالیتے ہیں جو میں بنا کے سامنے رکھ دوں چاہے آملیٹ سینڈوچ چاہے فرنچ ٹوسٹ۔ کباب پراٹھا یا پھر سادہ سی بریڈ تو اتنا کوئی جھنجٹ نہیں ہے ہمارے گھر میں ناشتے کا۔

(5) مجھے اور میرے ہسبینڈ دونوں کو باہر کھانا کھانے کا بے حد شوق ہے بلکہ میرا تین سالہ بیٹا "اذان وسیم" بھی بہت شوق سے جاتا ہے ہمارے ساتھ

باہر ڈنر کرنے۔ ہمیں باہر کھانا کھانے کے لیے کسی خاص موقع یا تہوار کی ضرورت نہیں پڑتی ہم تو اکثر باہر کھانا کھانے جاتے رہتے ہیں۔

(6) یار! اچی بات تو یہ ہے کہ اس دل کا کوئی اعتبار نہیں کبھی بھی کچھ بھی کھانے کو مانگ سکتا ہے اور میرا تو حال یہ ہے کہ کبھی گرمیوں میں بھی گرم گرم چکن سوپ کا دل چاہنے لگتا ہے تو کبھی سردیوں میں کسی کی خواہش ہونے لگتی ہے لیکن ویسے یہ بات ہے کہ کچھ چیزیں وقت اور موسم کے حساب سے ہی مزیدار لگتی ہیں جیسے گرمیوں میں کڑھی۔ لوکی کا رائتہ ' دہی پھلکیاں ' سردیوں میں سوپ۔ گاجر کا حلوہ اور بارش میں گرما گرم پکوڑے۔ آلو کے پراٹھے۔ کچوریاں۔

(7) اچھا پکانے کے لیے ضروری ہے کہ پکانے میں آپ کا دل لگے۔ آپ پوری توجہ اور دلجمعی سے کھانا بنائیں۔ یہ نہ ہو کے روٹین سمجھ کر یا روز کی ڈیوٹی سمجھ کر نمٹا دیا جائے اور پھر کتنا اچھا لگتا ہے کہ جب محبت اور محنت سے کھانا بنایا جائے اور کھانا گھر کے تمام افراد کو بے حد پسند بھی آئے۔ سوا اپنے گھر والوں کی محبت میں بھی یہ کام (کھانا پکانا) محنت اور محبت سے ہی کیا جائے۔

(8) کچن کی ٹپ!!

ا۔ ٹھنڈا یخ ٹماٹر کاٹ کر چہرے پر ملنے سے بلیک ہیڈز کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ لیمن مکس لیکویڈ اور کھانے کا سوڈا پانی میں مکس کر لیں اور کچن کے ٹائلز اور سنک اس سے صاف کریں۔ کچن جگمگا اٹھے گا۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

قورمہ چکن بریانی

ضروری اشیاء:

مرغی	ڈیڑھ کلو
چاول	ایک کلو باسمتی
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک پیالی
پیاز	دو عدد
پسا ادرک لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
کالا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت کالی مرچ	دس عدد
چھوٹی الائچی	آٹھ عدد
نمک	حسب ذائقہ
زردے کا رنگ	آدھا چائے کا چمچہ
کیوڑہ	چند قطرے
بادیان کے پھول	ایک عدد
گھی یا تیل	ڈیڑھ پیالی
لیموں	دو عدد
پودینہ	آدھی گٹھی
سرخ مرچ	چھ یا آٹھ عدد

ترکیب:

تیل یا گھی کو گرم کر کے پیاز کو سنہرا کر لیں۔ پھر مرغی ڈال کر تل لیں۔ اب کالا اور سفید زیرہ شامل کریں۔ ادرک لہسن بھی ڈال کر بھون لیں۔ اب بادیان کا پھول، چھوٹی الائچی، کالی مرچ، پسا دھنیا، پسی مرچ، نمک اور دہی بھی ملا دیں۔ اور تھوڑا پانی ڈال دیں۔ مرغی گل جائے تو بھون لیں۔ ایک دیگچی میں چاول ابالنے کے لیے رکھ دیں، اس میں پودینے کے پتے، کالی مرچ، ہری مرچ بھی شامل کر دیں۔ جب چاول دو کنی ابل جائیں تو پانی چھان لیں۔ پھر چاول والی دیگچی میں نیچے چاول کی تہ لگائیں پھر مرغی کی تہ لگا کر چاول کی تہ لگائیں اوپر زردے کا رنگ، لیموں کا رس اور کیوڑہ چھڑک دیں۔

پہلے آنچ تیز کر دیں پھر ہلکی آنچ کریں اور پندرہ سے بیس منٹ ہلکی آنچ پر دم دیں۔

اسپیشل بیف حلیم

ضروری اشیاء:

گوشت	ایک کلو
گیہوں	تین پاؤ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسا دھنیا	دو کھانے کے چمچے
پسی ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
سونف	تین چوتھائی چائے کا چمچہ
پسا ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
تیل	بگھار کے لیے
چنے کی دال	دو سو گرام

ترکیب:

چنے کی دال اور گیہوں ایک دیگچی میں ڈال کر پوری رات بھگو دیں، صبح اسی دیگچی میں ابال لیں۔

بڑی دیگچی میں تیل گرم کریں اور گوشت، پسی لال مرچ، زیرہ، نمک، پسا دھنیا، ثابت سفید زیرہ، ہلدی، سونف، چھوٹی ہری مرچیں، پسا ادرک لہسن ڈال کر اچھی طرح ملا لیں ابلی ہوئی گیہوں اور دال کو پیس کر گوشت میں ڈال کر پکائیں۔ وقفے وقفے سے دال کو گھوٹتے رہیں۔ تیار ہو جائے تو ایک الگ فرائی پین

میں تھوڑا سا تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز کو بگھاریں اور حلیم پر ڈال دیں۔ تلی ہوئی پیاز، لیموں، ہری مرچیں اور چاٹ مسالا چھڑک کر پیش کریں۔

اچاری بگھاری دال

ضروری اجزا:

مونگ کی دال	ایک کپ
مسور کی دال	آدھا کپ
پسا لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

بگھار کے لیے

تیل	حسب ضرورت
تازہ ہری مرچیں	تین سے چار عدد
ثابت لال مرچیں	چار سے چھ عدد
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
کلونجی	آدھا چائے کا چمچہ
کڑی پتہ	چار سے پانچ عدد

ترکیب:

دالیں دھو کر دیگچی میں ڈالیں حسب ضرورت پانی، نمک، پسا لہسن اور پسی لال مرچ ڈال کر ڈھکن ڈھک کر دھیمی آنچ پر دالیں گلنے تک پکائیں جب دالیں گل جائیں تو انہیں گھوٹ لیں۔

فرائی پین میں تیل گرم کر کے ثابت لال مرچ، زیرہ، کڑی پتہ، کلونجی اور تازہ ہری مرچیں ڈال کر کڑکڑائیں اور دال میں تڑکہ لگا دیں سرونگ ڈش میں نکال کر ابلے چاولوں اور سلاد کے ساتھ سرو کریں۔

اسپائسی چکن رائس رول

ضروری اشیا:

مرغی کا گوشت (بون لیس)	250 گرام
چاول (ابلے ہوئے)	1 کپ
آلو	2 عدد (درمیانے سائز کے ابال لیں)
سیاہ مرچ پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچیں	2-3 عدد
ہرا دھنیا (کٹا ہوا)	1 کھانے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
بریڈ کرمبز	حسب ضرورت
کارن فلور	حسب ضرورت
انڈے (پھینٹ لیں)	2 عدد
تیل	فرائنگ کے لیے

ترکیب:

چوپر میں مرغی کا گوشت، ہری مرچیں، ہرا دھنیا، لہسن، ادرک پیسٹ اور نمک ڈال کر اچھی طرح باریک پیس کر الگ رکھ دیں۔

چوپر میں چاول، آلو، سیاہ مرچ پاؤڈر اور نمک ڈال کر اچھی طرح پیس کر نکال لیں۔ اس کے بعد ہاتھ پر تیل لگا کر تھوڑا آمیزہ لے کر ہاتھ پر پھیلائیں اس میں تھوڑا گوشت کا آمیزہ رکھ کر رول بنالیں اس طرح سارے رول تیار کر لیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں رول کو پہلے کارن فلور سے کوٹ کریں۔ اس کے بعد پھینٹے انڈے میں ڈپ کر کے بریڈ کرمبز سے کوٹ کر کے فرائی کر لیں، سرونگ ڈش میں رکھ کر گرم گرم سرو کریں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	نیلم منیر
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی	موسیٰ رضا

س۔ا۔۔۔۔۔ اسلام آباد

اچھی بہن! آپ کے ساتھ جو ہوا وہ تکلیف دہ ضرور تھا لیکن اس تکلیف کو بڑھانے میں آپ کی افتادِ طبع' آپ کے مزاج کا بڑا حصہ ہے۔ گلاس کتنا خالی ہے یہ دیکھنے کے بجائے آپ اپنی توجہ اس پر مرکوز رکھتیں کہ گلاس میں کتنا پانی ہے تو شاید آپ کو ان مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

آپ کی زندگی میں تین بچے ہیں' شوہر ہے۔ شوہر بچوں پر جان دیتے ہیں۔ خیال رکھتے ہیں۔ زندگی گزارنے کے لیے یہ سہارے بھی کافی ہیں۔ کبھی ان عورتوں کے بارے میں سوچا ہے جنہیں نہ شوہر کی محبت ملتی ہے نہ ہی وہ گھر کا خرچ دیتے ہیں۔ ان کے بچے فیس نہ ہونے کے باعث پڑھ بھی نہیں پاتے اور وہ پورا دن محنت و مشقت کرتی ہیں تب ان کا چولہا جلتا ہے۔

بہت سی خواتین کے شوہر کمانے کے لیے باہر چلے جاتے ہیں اور سالوں باہر رہتے ہیں۔ وہ بھی تو اپنی تنہائیوں سے سمجھوتا کرتی ہیں۔ اور ساتھ ساتھ سارے مسائل سے بھی نمٹتی ہیں۔ اگر آپ ان سب باتوں پر غور کریں تو شاید آپ کی تکلیف یہیں کم ہو جاتی۔

جہاں تک گناہ کا تعلق ہے تو آپ نے اللہ سے توبہ کرلی اور استغفار بھی کرتی ہیں تو اللہ تعالیٰ پر یقین رکھیں' وہ معاف کرنے والا ہے' وہ اپنے بندوں پر ستر ماؤں سے زیادہ مہربان ہے۔ جو بندہ سچے دل سے اپنے گناہ پر نادم و پشیمان ہو اور توبہ کرے' وہ اسے معاف کر دیتا ہے۔ اپنے دل سے احساسِ گناہ کو نکال دیں اور کامل یقین کے ساتھ اللہ کی عبادت کریں۔ شوہر سے نفرت اور بیزاری نہ محسوس کریں ممکن ہے کہ ان کی کوئی ایسی مجبوری ہو جس کو وہ آپ پر ظاہر نہ کرنا چاہتے ہوں۔

صائمہ نورین۔۔۔لاہور

ہمارے خاندان میں لڑکیوں کے کم عمری میں ہی رشتے طے ہو جاتے ہیں۔ شادی صحیح عمر میں ہوتی ہے لیکن منگنی پہلے کرلی جاتی ہے۔ پیشِ نظر یہ سوچ ہوتی ہے کہ خوش شکل لڑکی کا رشتہ کہیں اور نہ ہو جائے۔ میں آٹھویں کلاس میں تھی جب میرا رشتہ تایا کے ہاں ان کے بیٹے سمیع سے طے ہو گیا۔ سمیع بھی پڑھ رہا تھا۔ پھر وہ پڑھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ میں بی اے میں تھی تب ایک دن اس نے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ وہ کسی اور لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ میں پریشان ہو گئی۔ امی کو بتایا تو انہوں نے مجھے خاموش رہنے کو کہا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ عرصہ خاموشی سے گزر گیا۔ میں نے ایم اے کرلیا تو ابا امی نے تایا سے شادی کے لیے کہا۔ تب ان لوگوں نے کہا کہ سمیع نہیں مانتا۔ مجبوری ہے۔ وہ باہر شادی کر چکا ہے۔ یہ جان کر ابا امی بہت ناراض ہوئے کہ یہ بات کیوں چھپائی گئی۔ تایا کو پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔

بہرحال اب کیا ہو سکتا تھا۔ اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ میرا رشتہ کہاں کیا جائے۔ خاندان کے لڑکے شادی شدہ

تھے یا ان کی منگنی ہو چکی تھی۔ مجھے مسیج ہے بہت زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ کسی حد تک ذہنی طور پر اس صورت حال کے لیے تیار بھی تھی لیکن پھر بھی مجھے قدرتی طور پر افسوس ہوا اور رشتہ ٹوٹنے پر خاندان میں جو باتیں سننا پڑیں انہوں نے تو مجھے شدید رنجیدہ کردیا۔ اس کے اثرات میرے چہرے پر بھی ظاہر ہوئے۔ چہرہ مرجھا گیا اور کافی بال بھی سفید ہو گئے۔ خاندان سے مایوس ہو کر امی نے کچھ رشتہ کرانے والیوں سے بات کی۔ لیکن جو بھی دیکھنے آتا، خاموشی اختیار کرلیتا۔ رشتہ کرانے والیاں کہتی ہیں عمر زیادہ ہے۔ اس لیے انکار ہو جاتا ہے۔ دن بہ دن میری مایوسی بڑھتی جا رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میرا کیا قصور تھا۔ میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا...؟

ج : اچھی بہن! آپ کا کوئی قصور نہیں تھا اور آپ کے ساتھ برا بھی نہیں ہوا ہے۔ ہاں! آپ کی سوچ ضرور غلط ہے اور اسی غلط سوچ کی وجہ سے آپ پریشان ہیں۔ شادی میں دیر ہونا یا شادی نہ ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے جتنا ہمارے ہاں بنا لیا گیا ہے۔ آپ اعلا تعلیم یافتہ ہیں، قبول صورت ہیں۔ اچھے خاندان سے تعلق ہے۔ شادی میں دیر ہو رہی ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہو گی، ذرا سوچیں کہ وہ لڑکا والدین کے دباؤ میں آکر آپ سے شادی کرلیتا پھر آپ کو چھوڑ جاتا تو آپ پر کیا گزرتی۔ یہ تو شکر کا مقام ہے کہ اس نے شادی سے پہلے آپ کو بتا دیا۔

آپ ایم اے پاس ہیں۔ کسی اسکول میں یا کہیں اور جاب کرلیں تاکہ مصروف رہیں۔ اگر گھر والوں کی طرف سے جاب کی اجازت نہیں تو گھر پر ٹیوشن سینٹر کھول سکتی ہیں۔

تھوڑا سا خود پر بھی توجہ دیں۔ خوب صورتی محض سرخ و سفید رنگت اور اچھے نقش و نگار کا نام نہیں۔ جاذب نظر شخصیت زیادہ متاثر کن ہوتی ہے۔ اچھی صحت، صاف ستھرا لباس جو آپ پر اچھا لگے اور مناسب میک اپ ہی خوب صورتی ہے۔ ہر وقت پریشان رہیں گی تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ بال سفید ہو جائیں گے اور چہرہ مرجھایا ہوا نظر آئے گا۔ خوش رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں دی ہیں ان کا شکر ادا کریں۔ مناسب وقت پر شادی بھی ہو جائے گی۔ مناسب وقت سے مراد ہے کہ وہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔

شناء۔ کراچی

ہو سکتا ہے آپ کو میرا مسئلہ عجیب لگے لیکن میں بہت عجیب صورت حال میں گھر گئی ہوں۔ میری عمر بتیس سال ہے۔ شادی کے لحاظ سے ہمارے معاشرے میں یہ عمر بھی زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ میرے لیے جو رشتے آتے ہیں۔ وہ عموماً" اڑتیس، چالیس کے درمیان ہوتے ہیں، جبکہ میں جس لڑکے کو پسند کرتی ہوں وہ بائیس سال کا ہے۔ ایم اے کر رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صرف پانچ سال انتظار کرلو میں پڑھائی مکمل کر کے جاب کرلوں پھر رشتہ بھیجوں گا اس کی دو بڑی بہنیں بھی ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔

ج : اچھی بہن! آپ ہوش میں آئیں۔ پانچ سال بعد آپ کی عمر کیا ہو گی۔ کبھی حساب کیا ہے۔ پانچ سے چھ سال بھی ہو سکتے ہیں۔ اگر پانچ سال بعد اس کے خیالات بدل گئے تب آپ پر کیا گزرے گی۔ وہ ابھی میچور ایج میں نہیں ہے۔ جس عمر میں وہ ہے اس عمر کے فیصلے عموماً" پختہ نہیں ہوتے۔ اپنی پسند کو پسند ہی رہنے دیں۔ اسے اپنے لیے پچھتاوا نہ بنائیں۔ زندگی بار بار موقع نہیں دیتی اگر کوئی مناسب رشتہ مل رہا ہے تو شادی کرلیں۔

مرتبہ: شاہین رشید

بیوٹی بکس

عظمیٰ رباب..... جڑانوالہ

س: میری عمر پچیس سال ہے، لیکن میں اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی نظر آتی ہوں۔ اس کی وجہ میرے چہرے کی جلد ہے جو انتہائی بے رونق ہے۔ چھونے سے کھردری سی محسوس ہوتی ہے۔ چہرے پر ذرا سی بھی چمک نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے فیشل کرانے سے چہرے پر چمک آجاتی ہے، لیکن ہمارے گاؤں میں کوئی پارلر نہیں ہے جہاں میں فیشل کراسکوں۔

ج: شبو! فیشل کے لیے پارلر جانا ضروری نہیں ہے۔ آپ گھر میں خود بھی کرسکتی ہیں۔ فیشل کرنے سے جلد نکھر جاتی ہے۔ جلد کو دوبارہ نمی مل جاتی ہے اور وہ جوان و شگفتہ نظر آنے لگتی ہے۔ گھریلو فیشل ہر طرح کی جلد کے لیے بہترین ہے۔ کلینزنگ ملک لے کر اپنے چہرے پر پندرہ منٹ تک مساج کریں۔ (کلینزنگ ملک نہ ہو تو ایک چمچہ دودھ میں چند قطرے لیموں کا رس ملا کر اس سے بھی مساج کرسکتی ہیں۔) اب سادے پانی میں روئی ڈبو کر اس سے چہرہ صاف کرلیں۔ پھر اسکرب لگا کر مساج کریں۔ اس سے جلد ہموار ہوجائے گی۔ اسفنج سے چہرے کو اچھی طرح صاف کرلیں۔ اب فیس ماسک لگائیں۔ آپ گھریلو ماسک بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ ایک چمچہ لیموں کا رس، ایک چمچہ شہد اور ایک انڈے کی سفیدی ملا کر گھریلو ماسک تیار کیا جاسکتا ہے۔ اس ماسک کو پندرہ منٹ چہرے پر لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرہ دھولیں۔ آپ کے چہرے کے کھلے مسام بند ہوجائیں گے اور جلد کو تازگی ملے گی۔ جلد کی خوب صورتی کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ آپ اپنی غذا پر توجہ دیں۔ تازہ سبزیاں اور پھل زیادہ استعمال کریں۔ قبض نہ ہونے دیں اور صبح و شام تازہ ہوا میں چہل قدمی کریں۔ ہلکی غذائیں کھائیں۔

اسکرب اگر نہ ملے تو گھر پر بھی تیار کیا جاسکتا ہے۔ چند بادام رات کو پانی میں بھگودیں۔ صبح انہیں پیس کر اس کا پیسٹ بنائیں۔ پھر اس میں چند قطرے بادام کا تیل اور بالائی ملالیں۔ اسکرب تیار ہے۔ اسے چہرے پر لگا کر نرم اور ہلکے ہاتھ سے چہرے پر رگڑیں۔ اس سے جلد کے مردہ خلیات نکل جائیں گے۔

ساجدہ عمران..... کہروڑپکا

س: میری پلکیں بہت ہلکی ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ گھنی ہوجائیں۔ کوئی آسان سا نسخہ بتائیں۔

ج: پلکیں گھنی کرنے کے لیے آپ رات سونے سے پہلے ان پر کیسٹر آئل یا زیتون کا تیل لگائیں۔ زیتون کا تیل نہ صرف انہیں جھڑنے سے محفوظ رکھے گا، بلکہ ان کے گھنے پن میں اضافے کا باعث بھی ہوگا۔ کیسٹر آئل بھی پلکوں کو لمبا اور گھنا کرتا ہے۔

سلمیٰ نورین..... ڈوگہ

س: میرے بال لمبے اور گھنے ہیں، لیکن بے رونق اور روکھے ہیں۔ تیل لگاؤں تو چپک جاتے ہیں۔ آج کل جھڑ بھی رہے ہیں۔ کوئی ایسی ترکیب بتائیں کہ بال صحت مند اور چمک دار ہوجائیں۔

ج: عموماً خزاں کے موسم میں بال جھڑتے ہیں۔ اگر جھڑنے والے بالوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے تو یہ تشویش ناک بات نہیں ہے۔ بالوں میں چمک اور خوب صورتی پیدا کرنے کے لیے آپ دہی اور لیموں کا ماسک لگائیں۔ دو چمچے دہی میں ایک لیموں کا رس ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ پھر بالوں کی جڑوں سے لے کر نوکوں تک اچھی طرح لگائیں۔ اس کے بعد ایسے شیمپو سے جو خشک بالوں کے لیے ہو اچھی طرح سر دھو لیں۔ بال چمک دار اور صحت مند ہوجائیں گے۔

☼